کچھ فیصلے دل پر نہیں، تقدیر پر ہوتے ہیں...

منصف کی عدالت میں جیت گواہوں کی ہوتی ہے،
لیکن ضمیر کی عدالت میں فیصلہ صرف سچ کا ہوتا ہے۔

AZAM

A STORY OF LOVE, BETRAYAL & REDEMPTION

> JUSTICE
> TRUTH
> CONSCIENCE
> INTEGRITY
> HONESTY

> ACCESS DENIED
> SYSTEM ERROR
> SEARCHING...

عزم

AZM

By

ABDUL AHAD

عزم

از قلم عبد الاحد

باب اول: "راز"

کیا ہوا اگر تم ہار رہی ہو

کیا ہوا اگر تم ٹوٹ چکی ہو؟

یہ تو بس رنگ ہیں چند زندگی کے

زندگی میں اور ہزاروں رنگ ہیں ابھی

جو تم نے اب تک دیکھے ہی کہیں

کیا ہوا اگر تم کھوئی ہوئی ہو

اس زندگی کے سفر میں الجھی ہوئی ہو

انجان اپنے مقصد سے پس تم ابھی ہو

متحد اپنے عزم سے فی الوقت ہوئی نہیں ہو

مگر کیا درخت کو اگانے کے لیے

بیج کا زمین میں گڑنا ضروری نہیں؟

کیا چرند کو اڑان بھرنے کے لیے

زمین پر اترنا ضروری نہیں؟

کیا روح کو آسمانوں میں پرواز کرنے کے لیے

جسم کا قبر میں اترنا ضروری نہیں؟

پستی بھی یقینی ہے

اور زوال ہے اٹل

کیونکہ گرے گا نہیں انسان اگر

تو وہ اٹھنا کیسے سیکھے گا؟

☆☆☆

اندھیری رات تھی۔ سڑک ہلکی پھلکی بارش سے بھیگ رہی تھی۔

چاند کی دودھیا مندمل کرنوں نے اس سڑک کو روشن کیا تھا۔ وہاں بندہ تھا، نہ بندے کی ذات۔

نیلی چھت والا گودام، سڑک کی ایک طرف اپنے ساتھ، نہ جانے کن کن رازوں کو سمیٹے، کھڑا ہوا تھا۔

دفعتاً، ٹرک پوری رفتار سے اس سنسان سڑک پر دوڑا۔ سڑک کی اوٹ پر لگی جھاڑیوں پر پانی کا چھڑکاؤ ہوا۔

جھاڑیوں کے پیچھے چھپے دو بچے بھیگ گئے۔ وہ دونوں دس سے بارہ سال کی عمر کے تھے۔

کھیلتے کودتے، اپنی من مستیوں میں مگن وہاں پہنچ تو گئے تھے۔ مگر اس جگہ کے تاریک و سفاک رازوں سے روشناس ہونا ابھی باقی تھا۔

ٹرک گودام کے عین سامنے رکا۔ سیاہ رین کوٹ پہنے مرد اس میں سے بر آمد ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں فلیش لائیٹس تھیں۔

ٹرک کے اندر سے ڈھیروں انسان نکل رہے تھے۔ البتہ چہرہ کسی کا واضح نہ تھا۔

"ماما کہتی ہیں، یہ انسانوں کا گودام ہے۔ اس سے دور رہا کرو۔" ایک بچہ بولا۔

ٹرک خالی کر دیا گیا تھا۔ وہ جتنی تیزی میں آیا، اتنی ہی تیزی سے چلا بھی گیا، جیسی کوئی بلا ہو جو شکار کر کے چل پڑی ہو۔ سفید مصنوعی روشنیاں منظر سے مٹ چکی تھیں۔

ایک بار پھر چاند کی روشنی منظر پر غالب آئی۔

"میرے ساتھ ایک دفعہ چلو نا۔ مجھے بس دیکھنا ہے۔" وہ تجسس کا مارا تھا، یا شاید قسمت کا مارا تھا۔ تجسس نہ ہو، تو انسان بڑی سے بڑی آفتوں سے چھٹکارا پا سکتا ہے۔

"ماما غصہ ہوں گی۔"

کیا ماما کو غصے کے اظہار کا موقع بھی ملنا تھا؟

"بس پانچ منٹ کے لیے چلو۔ ماما کو کوئی نہیں بتائے گا۔"

ماما کو بتانے کا موقع ملنا تھا بھلا؟

وہ متجسس فطرت کے مارے تھے، موت کے اس گودام کی اور چل پڑے۔ بے ہنگم، بے فکر۔ حد سے زیادہ بے فکری بھی انسان کے منہ آجاتی ہے۔

وہ منظر سے اس طرح غائب ہوئے، جیسے وجود ہی نہیں رکھتے تھے۔

اور ہم تم کو بتاتے چلیں کہ ان بچوں کی تلاش۔

آج تک جاری ہے۔

مگر وہ بچے کسی کو نہ ملے۔

نہ ہی کبھی ملیں گے۔



کھلی کھڑکیوں کے ذریعے سورج کی کرنیں اس سفید چمکتے دمکتے فرش پر نچھاور ہو رہی تھیں۔ وہ کمرہ، اس عظیم الشان قصر کا لاؤنج لگتا تھا، اور دوسری منزل میں واقع تھا۔ جدید اور کامدار فرنیچر سے آراستہ، اس قصر کے مالک کی دولت کے کثیر ہونے کی گواہی دے رہا تھا۔

مہر گردن جھکائے صوفے پر بیٹھی تھی جب کہ نیلوفر مقابل صوفے سے کمر ٹکائے نزاکت سے کافی کے گھونٹ بھر رہی تھی۔

"تمہیں پتا چلا، آج وہ آرہا ہے۔" وہ مصروف سے انداز میں بولی۔

سلیقے سے جوڑے کی صورت بنے ہوئے گھنگریالے بال، میک اپ سے نکھرا ہوا چہرہ، جدید زیورات سے زیبائش سے اس چیز کا پتا چل رہا تھا کہ وہ کہیں جانے والی تھی۔

شکن آلود گلابی کرتے میں ملبوس مہر نے نظر اٹھا کر نیلوفر کو دیکھا۔

"کون؟" وہ تھکان زدہ آواز میں بولی۔

خوبصورت چہرہ، جو میک اپ سے پاک تھا، لاپرواہی سے کیچر میں مقید بال، جن کی بل کھاتی لٹیں ماتھے پر بکھری ہوئی تھیں، بے زاری، کوفت میں ڈوبی ہوئی سیاہ آنکھیں، اس کے ہر پہلو سے واضح ہوتا تھا کہ وہ زندگی سے کس قدر اکتا چکی ہے۔

"یعنی تمہیں نہیں معلوم۔" نیلوفر نے کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

مہر الجھ گئی۔ ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔ صبح صبح کی بن بلائی پہیلیاں کسے بھلی لگتی ہیں؟

"خیر تم سب چھوڑو۔" نیلوفر نے موضوع بدلنا چاہا۔ "کچھ تھکی تھکی سی لگ رہی ہو، خیریت تو ہے؟"

"نہیں بس۔" گردن کو اسٹریچ دیا۔ "عنایہ کا سپورٹس ڈے آنے لگا ہے۔ اس کی پریکٹس میں جانا ہے۔" وہ بے دلی سے بولی۔

"سیدھا اسپورٹس ڈے میں چلی جانا۔" نیلوفر نے بھنویں سکیڑیں۔

مہر نے لبوں کو بھینچ کر سر نفی میں ہلایا۔

"عنایہ کے اینگر ایشوز آپ سے ڈھکے چھپے تو نہیں، نیلوفر۔ کافی عرصے سے وہ ٹھیک چل رہی ہے۔ میں اسے ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی۔ چلیں، تھوڑی خواری ہو جائے گی۔" مہر کے چہرے پر پھیکی مسکراہٹ تھی۔

نیلو فر کی آنکھوں میں اُداسی چھانے لگی۔ اس نے ہمدردی سے اٹھائیس سالہ مہر کو دیکھا۔

''مہر، اب شاید وقت آگیا ہے کہ تم اپنی زندگی کو سنجیدگی سے لینا شروع کرو۔''نیلو فر کی کافی ختم ہو چکی تھی۔ اس نے جھک کر کپ میز پر رکھ دیا۔

مہر نے تھکی ہوئی سانس خارج کی۔

''پلیز نیلو فر میرے سر میں بہت درد ہے۔ میں ابھی کسی پیپ ٹاک کے موڈ میں نہیں ہوں۔''مہر نے بہت محتاط سا انداز اختیار کیا، گویا نیلو فر کو ہرٹ کرنا نہ چاہتی ہو۔

''مجھے بس تمہاری فکر ہے، مہر۔ تمہاری ایم بی اے کی ڈگری بھی ضائع ہو رہی ہے۔''

''میں ڈیڈ کے آفس جاتی تو ہوں۔''مہر نے وضاحت دینے کی کوشش کی۔

یہ پہلی بار نہیں تھا، جب وہ دونوں اس موضوع پر بحث کر رہے تھے۔ اور ہر بار مہر پر یہی کیفیت طاری ہوتی تھی۔

''اور کیا کرتی ہو وہاں جا کر؟''اس نے وقفہ لیا۔''کچھ بھی نہیں۔''

''تم کیسی زندگی گزار رہی ہو، مہر؟''

کچھ لمحے، مہر بنتِ عبداللہ سلطان جہاں تھی وہیں تھم گئی۔ وہ زندگی گزار بھی رہی تھی کیا؟ اس نے تو زندگی کو گزارنا اور جینا، نہ جانے کب سے چھوڑا ہوا تھا۔ بغیر عزم کے زندگی انسان کے لیے سزا بن جاتی ہے۔

”ٹھیک ہے میں آج ہی آفس کا چکر لگاؤں گی۔“ مہراب کی بار بولی تو انداز پہلے سے بھی زیادہ بجھا ہوا تھا۔

نیلوفر نے بس سر کو مختصر سی جنبش دی۔

”مجھے امید، بلکہ یقین ہے کہ تم بھی جی اٹھو گی۔ تم ماضی کی تمام تر تلخیاں بھلا کر سرخرو ہو گی۔“ کھڑے ہوتے ہوئے، اس نے مہر کی جانب مسکراہٹ اچھالی۔

مہر نے سر اٹھا کر، بے جان سا مسکرانے پر اکتفا کیا۔ کوئی گھاؤ تھے جو کریدے گئے تھے۔ زخموں کو بروقت مرہم نہ ملے تو وہ یونہی تنگ کرتے ہیں۔

”ہسپتال کے لیے دیر ہو رہی ہے۔ میں چلتی ہوں۔“ اپنا شنیل بیگ میز سے اٹھا کر، خود سے جنگ لڑتی، زندگی سے بےزار مہر کو تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔

قصر کے باہر، نیلی ویگن اس کا انتظار کر رہی تھی۔ ویگن کے گلاسز ٹنٹڈ تھے، جس باعث کوئی بھی اندر کا منظر دیکھ نہیں سکتا تھا۔

جوں ہی ویگن کا دروازہ آپ ہی کھلتا چلا گیا۔ لبوں کو مودب مسکان میں ڈھالا، اور اس میں سوار ہو گئی۔

☆☆☆

سیاہ لینڈ کروزر ایئرپورٹ سے واپسی کے راستوں پہ دوڑ رہی تھی۔ پچھلی نشست پہ مرینا اپنے بیٹے حسام کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ مرینا پچاس سے پچپن برس کے درمیان کی عمر کی ایک بوڑھی سی خاتون

تھیں۔ بال تقریباً سفید ہو چکے تھے اور ان کے چہرے پہ جھریاں صاف نمایاں تھیں، جو کہ ان کی شخصیت میں تمکنت کا باعث بنتی تھیں۔

حسام ان کے برابر میں بیٹھا کچھ بوجھل سا نظر آرہا تھا۔ وہ ایک عام سی شکل کا مرد تھا جس کے چہرے پہ موٹا چشمہ تھا۔ اس کی آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے تھے۔ چہرہ بالکل سوکھ چکا تھا اور جسم بھی کافی کمزور تھا۔

"آخر کار تمہاری ریہیب مکمل ہو گئی حسام۔" مرینا سیدھ میں دیکھتے ہوئے بولیں۔

(ریہیب ایک ایسا پراسس ہے جس سے ڈرگ ایڈیکٹس کی ایڈیکشن کو توڑا جاتا ہے۔ اس کے دو مرحلے ہوتے ہیں۔ ایک ڈی ٹاکسی فیکیشن اور دوسرا اپر ریہیب۔ ڈی ٹاکسی فیکیشن میں جسم میں موجود ڈرگز کے باعث پیدہ ہونے والے زہریلے مادے کو نکالا جاتا ہے۔ ریہیب میں ایڈیکٹس کو پھر ٹرین کیا جاتا ہے کہ اپنی حسرتوں سے کیسے لڑا جائے۔ حسام نے پانچ ماہ لندن کے ایک rehabilitation Centre میں صحتیاب ہونے کے لیے گزارے تھے۔)

"حسام اب تمہیں اپنی زندگی کی طرف واپس لوٹنا ہو گا۔ میں جانتی ہوں ماضی تم پر بھاری تھا۔ وہ اب بھی تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ لیکن اگر اس دفعہ بھی تم نے زندگی میں کچھ نہ کیا تو پچھلے سارے سال ضائع جائیں گے۔" مرینا پر اطمینان لہجے میں اسے سمجھاتی گئیں۔ اس نے محض گردن ہاں میں ہلائی۔

وہ اس وقت ایک الگ سی کیفیت میں مبتلا تھا۔ اس کے دل میں خلش سی تھی، کوئی خالی پن، جو کہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ شدت اختیار کرتا جارہا تھا۔

”اپارٹمنٹ میں جانے سے پہلے کہیں جانا تو نہیں چاہو گے؟ میں نے تمہارے بنگلے سے سارا سامان منتقل کروا دیا تھا۔ اب ہم صرف دو ہیں، اتنے بڑے بنگلے کی ضرورت نہیں۔“ مرینا نے رخ موڑ کر نرمی سے پوچھا۔

”مجھے بس ایک دفعہ عنایا سے ملنا ہے، امی۔“ حسام کا حلق خشک تھا۔

مرینا کے سر پر ایک سایہ سا گزرا۔ وہ ڈرائیور کو کچھ ہدایات دینے لگیں۔

گاڑی اسلام آباد کی دھوپ میں نہائی سڑکوں پر سے رستہ بناتے، ایک پوش علاقے میں جا پہنچی۔ عبد اللہ سلطان کے قصر کے سامنے ڈرائیور نے گاڑی کھڑی کر دی۔

”تم یہیں رکو حسام! میں ذرا بات کر کے آتی ہوں۔“ مرینا گاڑی سے اترتے ہوئے بولیں۔

اُسے بس ایک دفعہ اپنی بیٹی کو دیکھنا تھا۔ آٹھ ماہ سے وہ اس سے نہیں ملا تھا اور اب اس کی آنکھیں ایک دیدار کے لیے ترس گئی تھیں۔

کچھ دیر بعد مرینا مایوس چہرہ لیے گاڑی کے اندر بیٹھی۔ حسام مضطرب نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کہ کہیں اسے عنایا نظر آ جائے۔ اسے کہیں نہ پا کر بے چینی انتہا کو پہنچی۔ وہ خالی الذہن حالت میں مرینا کو گھورنے لگا۔

”عنایا کے سپورٹس ڈے کی پریکٹس ہے اس لیے وہ ابھی گھر میں نہیں ہے۔ ہم کسی اور وقت مل لیں گے، ٹھیک؟“ ماں نے بیٹے کی دل جوئی کرنا چاہی۔ مگر کیا فائدہ؟ جس شے کے لیے وہ تڑپ رہا تھا اسے حاصل کیے بغیر دل جمعی ناممکن تھی۔

قلبی اضطراب میں اضافہ ہوا۔اس نے تکلیف کے مارے آنکھیں بند کر دیں۔باقی سفر خاموشی میں کٹا۔

☆☆☆

سکول کا میدان وسیع و عریض تھا۔تپتی دھوپ سے بچنے کے لیے میدان پہ ہرا چھپرا لگایا ہوا تھا۔عنایا باقی بچوں کے ساتھ اپنے ٹیچر کی نگرانی میں پریکٹس کر رہی تھی۔ان سے ذرا سے فاصلے پر والدین کے لیے کرسیاں لگائی گئی تھیں،انہی کے درمیان مہر بھی ایک کرسی پر براجمان تھی۔وہ بیزار سی نظر آتی تھی۔اپنی نظریں ادھر ادھر دوڑانے لگی۔اس کی نظر دو بیڈ منٹن کھیلتے نوجوانوں پر پڑی۔ایک کی پشت اس کی جانب تھی لیکن دوسرے مرد کو وہ دیکھ سکتی تھی جو بہت پر جوش انداز میں بیڈ منٹن کھیل رہا تھا۔مہر اس نوجوان کو دیکھ کر اداس سا مسکرائی۔ماضی کی کسی یاد نے جوش لیا۔

آہستہ آہستہ بنجر میدان اس کی نظروں سے تحلیل ہونے لگا۔

سبز چھپرا اس کے سر سے غائب ہوا۔

بچوں کی کھکھلاہٹیں فنا ہوئیں۔

وہ ماضی کے ایک منظر میں جا چکی تھی۔

اس منظر میں جس میں وہ نو سال کی لڑکی تھی۔زندگی کا نقشہ ان دنوں مختلف تھا۔

آسمان پہ بادلوں کا بسیرا تھا۔ نو سالہ مہر کے ہاتھ میں بیڈ منٹن کا ریکٹ اور شٹل کارک تھی۔ وہ اپنے چہرے پر پر جوش مسکراہٹ لیے شمائلہ کی طرف جا رہی تھی جو سہانا سا گیت گنگنا کر—پودوں کو پانی دے رہی تھیں۔

"دل نا امید تو نہیں۔۔۔ ناکام ہی تو ہے۔۔۔ لمبی ہے غم کی شام۔۔۔ مگر شام ہی تو ہے۔" مہر کو وہ آواز دنیا کی سب سے سریلی آواز معلوم ہوتی تھی۔

"ماں آپ کون سا گانا گا رہی ہیں؟" مہر نے پوچھا۔

شمائلہ کا ارتکاز ٹوٹا۔ مڑ کر ریکٹ تھامی ہوئی لڑکی کو دیکھا۔

"گانا نہیں ہے، جان۔ غزل ہے، فیض احمد فیض کی۔"

"اور آپ بیڈ منٹن ریکٹ بھی لے آئیں؟"

"ہاں ماں! آپ نے کہا تھا آپ مجھے سکھائیں گی ناں۔" مہر نے نخریلے انداز میں کہا۔ شمائلہ نے نرمی سے مہر کے ہاتھ سے ایک ریکٹ لیا۔ آنکھوں میں ٹوٹی ہوئی آس لیے ریکٹ کا بغور جائزہ لینے لگیں۔

"آپ کو پتا ہے جب ہم چھوٹے تھے تو ہم اپنی بہنوں کے ساتھ ہر وقت بیڈ منٹن کھیلا کرتے تھے ۔ ہم ایک بہترین کھلاڑی تھے۔ ہم بچپن میں اپنے ملک کے لیے بیڈ منٹن کھیلنے کا خواب دیکھا کرتے تھے۔" شمائلہ کی آنکھوں میں چمک تھی۔

"تو ماں آپ مصنفہ کیوں بن گئیں؟" مہر کو تعجب ہوا۔

”بس پھر ہم بڑے ہونے لگے۔ گھر والوں نے ہم پر اور ہماری بہنوں پر سختیاں لگائیں کہ ہم باہر یوں نہ کھیلیں۔ اور اس طرح سے ہمارا یہ ارمان کہیں دور رہ گیا۔ بہت دور۔“ وہ آسودگی سے بولیں۔ مسکراہٹ ان کے چہرے پر بہت جچتی تھی۔

”تو اس کا مطلب آپ اپنے کام سے خوش نہیں ہیں؟“ مہر نے آواز میں معصویت لیے پوچھا۔ شمائلہ ہنس دیں۔

”نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ہم مصنفہ کے بجائے ایک بیڈمنٹن کے کھلاڑی ہوتے تو ہرگز زیادہ خوش نہ ہوتے۔ اور ویسے بھی ہم نے شکایتیں کرنا چھوڑ دی ہیں۔“ آخری فقرہ شمائلہ نے آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔ مہر کو اپنی ماں سے یہ فقرہ سننے کی عادت تھی۔

”ویسے ماں آپ کو اپنا کام اتنا کیوں پسند ہے؟“ مہر کے سوال تھے کہ ختم ہی نہیں ہو رہے تھے۔ مگر شمائلہ کو برا نہیں لگا۔ وہ بہت صابر خاتون تھیں اور مہر کے ہر سوال کا جواب ہمیشہ بڑے تحمل سے دیا کرتی تھیں۔

”کیونکہ کہانیاں ہمیں تلاش کرتی ہیں نہ کے ہم کہانیوں کو۔ ہمارے قلم میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ ہمارے پڑھنے والوں نے بھلے ہمیں دیکھا نہیں ہوتا، مگر وہ پھر بھی ہمارے لیے دعا کرتے ہیں۔ ہم سے محبت کرتے ہیں۔ ہمیں پیار بھرے پیغامات بھیجتے ہیں۔ ملے بغیر ہمارے درمیان ایک بندھن سا بنا ہوا ہے، مضبوط بندھن۔ ہے نا خاص بات؟“

مہر کے کچھ پلے تو نہ پڑا۔ بہر حال اس نے سر اثبات میں ہلایا۔

دونوں ماں بیٹی اس حسین سی شام میں بیڈمنٹن کھیلتی گئیں۔ دونوں کی کھکھلاہٹوں نے ساری شام سبزہ زار میں رقص کیا۔

مہر کی یادوں کا سلسلہ تمام ہوا تھا۔ یادیں خوبصورت تھیں، مگر تکلیف دہ۔ اور اگر مہر بنتِ عبداللہ سلطان کے اختیار میں ہوتا تو وہ اپنی ماں سے منسلک تمام یادوں کو کب کا مٹا چکی ہوتی۔ مگر یہ یادیں ہی تو ہیں جو ہمارے اختیار میں نہیں ہوتیں۔

وہ دونوں نوجوان اپنا کھیل ختم کر کے چلے گئے۔ مہر اردگرد کچھ دلچسپ تلاش کرنے لگی۔ اسے عنایا کی پریکٹس کے ختم ہونے کا بے صبری سے انتظار تھا۔

☆☆☆

مہر نے اپنی آلٹس آفس کی عمارت کے سامنے پارک کی۔ وہ عنایا کو گھر چھوڑ کر سیدھا آفس آگئی۔ حالانکہ اس کا موڈ نہیں تھا مگر وہ جانتی تھی اگر وہ نہیں گئی تو نیلوفر نے رات میں اس سے ضرور کچھ نہ کچھ ملامتی کہنا تھا۔ عمارت کے سامنے کھڑے ہوئے اس نے سیاہ چشمہ اتارا اور اوپر سے نیچے اس کا جائزہ لیتے ایک سانس خارج کی۔

کندھے پر بیگ لٹکا ہوا تھا۔ اس نے سفید کرتا پہنا تھا جس کے دامن کی طرف نیٹ کا نازک کام تھا۔ وہ سیدھ میں چلتی گئی۔ تمام ایمپلائیز چوکنا ہو گئے۔ وہ آتی تو کم ہی تھی مگر جب بھی آتی کسی نہ کسی کو ڈانٹ لگا کر ضرور جاتی تھی۔ اس لیے مہر کی موجودگی میں ایمپلائیز زیادہ ہوشیار رہتے تھے۔ اس کے چہرے پر تناؤ حائل رہتا تھا۔ وہ بغیر کسی کی پرواہ کیے ڈیڈ کے کمرے تک پہنچی۔

عبداللہ سلطان کسی نوجوان کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے۔ اس نوجوان نے سفید شرٹ پر سرمئی کوٹ پہنا ہوا تھا۔ بالوں کو نفاست سے سیٹ کیا ہوا تھا۔ مہر کے نمودار ہوتے ہی گفتگو ٹوٹ گئی۔ عبداللہ سلطان نے گرمجوش مسکراہٹ سجائے اس کا استقبال کیا۔ اس مداخلت پر انہیں کوئی اعتراض نہ تھا۔

"احمد، اس سے ملو۔ یہ مہر ہے۔ میری بیٹی۔" عبداللہ سلطان کے چہرے پر فخریہ مسکراہٹ تھی۔

دونوں کی نظریں ملیں۔ احمد یوسف نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سر کو ذرا سا خم دیا۔ مہر نے آنکھوں کی سختی برقرار کیے اسے اندر تک گھورا۔ ہاں وہ پر کشش تھا، کافی سمارٹ بھی تھا۔ مگر زندگی کے مشاہدے نے اسے اتنا سکھا دیا تھا کہ ہر خوبصورت اور دلکش چہرہ بھلے دل کا مالک نہیں ہوتا۔

"اور مہر یہ ہیں احمد یوسف۔ ہماری کمپنی کی آئی ٹی سائڈ یہی دیکھتے ہیں۔ اور ابھی یہ محافظت کے سلسلے میں آئے ہیں۔"

"کون سی فرم سے ہیں یہ؟" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے سپاٹ لہجے میں بولی۔

"کسی فرم سے نہیں۔ البتہ، احمد کے سٹوڈنٹ کی ایک ٹیم ہے۔ مگر سچ بولوں تو بڑے بڑے سوفٹ ویئر ہاؤسز بھی میری امیدوں پر پورا نہیں اترتے، مگر احمد یوسف کا کام بہترین ہے۔" عبداللہ سلطان ہنس ہنس کر بتائے جا رہے تھے۔

مہر کی آنکھوں میں ستائش ابھری۔ احمد سر جھکائے تعریف سنتا گیا۔ کیا وہ واقعتاً عاجز تھا یا بننے کی اداکاری کر رہا تھا؟ اس نے سوچ کر آہ بھری۔ وہ دھوکہ کھائی ہوئی عورت تھی، ظاہری شخصیت کے فریب میں آنا چھوڑ چکی تھی۔

"اچھا لگا آپ سے مل کر۔" مہر کا انداز روکھا سا تھا۔ "امید ہے آئندہ بھی ملاقات ہوتی رہے گی۔
"

"ضرور۔" اس نے تکلفانہ انداز میں جواب دیا اور عبداللہ سلطان کی طرف رخ موڑ گیا۔

مہر نے دروازہ بند کیا اور باہر آگئی۔ اب اس کا رخ اپنے کمرے کی جانب تھا۔ کمرے میں داخل ہوئے ایک پل نہ بیتا تھا کہ موبائل تھرتھرانے لگا۔ اس نے سکرین پر اجاگر ہوتا نام پڑھا اور فون کان سے لگایا۔

"کیسی ہو مہر؟" مرینا نے خوشگوار انداز میں پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔" انداز حتی الوسع عامیانہ رکھا۔

"اچھا میں نے ایک ضروری بات کرنی تھی۔" مہر نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا۔

"جی آنٹی، کہیے۔" مہر اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ آفس کا کمرہ اے سی کے باعث بہت ٹھنڈا اور پرسکون تھا۔ اس نے گہری سانس خارج کی۔

"مہر ایک دفعہ میری بات تحمل سے سننا۔ دراصل حسام آج واپس آگیا ہے۔"

چہرے کے سخت تاثرات میں تکلیف نمایاں ہونے لگی۔ اس کی دھڑکنوں نے رفتار پکڑلی۔ تنفس تیز ہونے لگا۔ ماتھے پر ناجانے کتنی لکیریں نمودار ہوئیں۔ تو آج ان زخموں نے بار بار چھلنے کے فیصلہ کیا تھا؟

”میں جانتی ہوں ماضی بہترین نہیں تھا۔ لیکن اس بات کو جھٹلایا نہیں جاسکتا مہر کہ حسام عنایا کا باپ ہے۔ حسام عنایا کو دیکھنے کے لیے تڑپ رہا ہے۔ کیا تم تھوڑی دیر کے لیے دونوں کے ملنے دے سکتی ہو؟“ مرینا کا لہجہ نرم تھا۔

مہر کی انگلیوں میں لرزش پیدا ہوئی۔ ٹھیک اسی لمحے اس کا کال کاٹنے کا جی چاہا۔

”کبھی نہیں!“ مہر نے غصے کے کڑوے گھونٹ پیے۔ ”حسام عنایا کو ڈیزرو نہیں کرتا۔ اگر وہ تڑپ رہا ہے تو اسے تڑپنا ہی چاہیے۔“ مہر کی آنکھیں سرخ پڑنے لگی تھیں۔ ہر لفظ میں کڑواہٹ گھلی تھی۔

”مگر مہر۔۔۔۔“ مرینا کچھ بولنا چاہ رہی تھیں۔

——— ”دیکھیے آنٹی، میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں۔ اور آئیندہ بھی کرنا چاہوں گی۔“ ایک آنسو مہر کی گہری سیاہ آنکھوں سے نکلا۔ زخم صرف چلے نہیں تھے، ان سے تازہ خون بھی رس رہا تھا۔

”مگر مجھے وہ کرنے کے لیے نہ کہیں جو میرے بس میں نہیں۔ میری عنایا، حسام سے کبھی نہیں ملے گی۔ اور مجھ پر کوئی جبر نہیں کر سکتا۔“ مہر نے کال کاٹ دی۔

اس کی سانسیں بے ترتیب ہو چکی تھیں۔ وہ ہاتھوں سے اپنی کنپٹی مسل کر اپنے آپ کو پر سکون کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر بے فیض۔ مہر کا سارا چین برباد ہو چکا تھا۔

تو آخر کار حسام آ گیا تھا۔

”میں تمہیں کبھی بھی معاف نہیں کرنے والی حسام۔ تم نے میری زندگی کے اہم ترین سال ضائع کیے ہیں۔ تم نے میرا محبت سے ایمان چھینا ہے۔ تمھیں تڑپتے رہنا چاہیے۔“ وہ زیر لب بولی۔ آنکھیں متوحش تھیں۔

☆☆☆

رات نے اپنی کالی چادر پورے اسلام آباد پہ اوڑھادی تھی۔ یہ عافیت زندگی نامی ہسپتال کا منظر ہے جہاں نیلوفر نے مینجر کی پوسٹ سنبھالی ہوئی تھی۔ یہ ہسپتال کافی بلند وبالا اور پر تعیش تھا۔ باہر کی دیواروں پر سفید پینٹ تھا۔ بتیوں کے باعث وہ اس وقت چمک رہا تھا۔

نیلوفر اپنے آفس کی نرم وملائم کرسی پہ ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ چہرے پر تھکان تھی۔ دروازے پر دستک نے اسے چوکنا کیا۔ آیا اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈبا تھا۔

”میم۔ آپ کے لیے کسی فلاحی تنظیم کی طرف سے تحفہ آیا ہے۔“ آیا کی جھکی گردن اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ وہ نیلوفر سے خاصی مرعوب تھی۔

نیلوفر کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری۔ ہاتھ سے اشارہ کیا۔ آیا تحفہ میز پر رکھ کر کمرے سے چلتی بنی۔ وہ پتلا سا ڈبا تھا جس پر نیلا گفٹ پیپر چڑھایا گیا تھا۔ اس نے ریپ کے ساتھ چپکا ہوا نوٹ پڑھا۔

”نیلوفر! ہم آپ کو فالو کرتے ہیں۔ آپ اس معاشرے کے لیے جو کر رہی ہیں اس پر ہماری تنظیم کو آپ پر فخر ہے۔ یہ چھوٹا سا تحفہ آپ کے سماجی اور فلاحی کاموں کے سامنے کچھ نہیں۔ اسے قبول کی جیے گا۔ امید ہے آپ خدمتِ خلق کے لیے یونہی برسرپیکار رہیں گی۔“

نیلوفر زیر لب ہنس دی۔ تھکاوٹ زائل ہو چکی تھی۔ اس نے موبائل اٹھایا اور ترنت تنظیم کی نگراں کو پیغام بھیج ڈالا:

”مجھے آپ لوگوں کا خلوص اور محبت بھرا تحفہ ملا۔ سچ بولوں تو ایک انسان جو کوئی نیک کام کرتا ہے اسے کسی قسم کے تحائف کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ یہ سب صرف اور صرف معاشرے کے لیے کرتا ہے۔ اسی لیے اس تحفے سے زیادہ یہ الفاظ تھے آپ کے جنہوں نے میرے دل کو چھوا۔ آپ لوگ بھی بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ امید ہے آگے بھی ہم معاشرے کی خدمت کے لیے یونہی یکجا رہیں گے۔“

موبائل واپسی ڈیسک پر دھرا۔ اپنے ایکریلک نیلز کی مدد سے وہ تحفے کا ریپ پھاڑنے لگی۔ اندر ایک بہت ہی خوبصورت سُرخ ڈبا تھا۔ ڈبے کے اوپر ویلوٹ کے کپڑے کا کام تھا جس پر موتی جڑے ہوئے تھے۔ نیلوفر نے ڈبا کھولا۔ اس میں ہیرے کا نہایت خوبصورت بریسلٹ تھا۔ اس نے بریسلٹ کو اپنے ہاتھ میں اٹھایا اور آنکھوں کے قریب کیا۔ وہ ہیرا آس پاس کی روشنی کی وجہ سے چمکتا تھا۔ نیلوفر اس نازک سے بریسلٹ کو بے تاثر چہرے کے ساتھ بغور دیکھ رہی تھی، جیسے اس کی خوبصورتی سے خاص متاثر نہ ہوئی ہو۔

ٹھیک اسی وقت کمرے کے اندر ایک بھاری جسامت والا مرد داخل ہوا۔ نیلوفر نے سرسری نظر اس مرد پر ڈالی۔ نیلوفر ہنوز محویت سے اس بریسلیٹ کو گھور رہی تھی۔ مرد اس کے مقابل کرسی پر بیٹھ گیا۔

”ہم کب جا رہے ہیں، شمس۔“ بے تاثر لہجہ۔

”ٹھیک دس دن بعد۔ اس کے بیوی بچے گھر میں موجود نہیں ہوں گے۔ میں نے چھان بین کر لی ہے، نیلوفر۔“

آنکھوں کی سرد مہری ٹوٹی۔ وہاں چمک در آئی۔ لبوں پر مسکراہٹ بکھری۔

"تمہیں یقین ہے وہ اکیلا ہو گا؟" نیلوفر نے اس بریسلٹ کو ٹیبل پر رکھا۔ اس کے چہرے پہ تشکر آمیز تاثر تھا۔

"جی۔ میں نے کال ٹریس کی تھی۔ اس کی بیوی اپنی بہن کے ساتھ سنیما جائے گی۔ بچے بھی ساتھ جائیں گے۔ مووی دو گھنٹے کی ہے۔ ہمارے پاس کافی وقت ہو گا۔" شمس نیلوفر کو بتاتا گیا۔

نیلوفر نے سر کو اوپر نیچے جنبش دی۔ بریسلیٹ کے اوپر اس نے اپنا خوبصورت ہاتھ رکھا۔ اسے شمس کی جانب کھسکایا۔ وہ ممنوع نگاہوں سے شمس کو دیکھ رہی تھی۔

"تم یہ رکھ لو۔"

"مگر میں اس کا کیا کروں گا۔" شمس نے ہاتھ ہوا میں بلند کیے۔

"بیچ دینا اور پیسے رکھ لینا۔ تم میرا بہت بڑا کام کرنے جا رہے ہو شمس۔"

اس کے چہرے پر مشکور تاثرات شمس کے دل میں الگ نوع کی خوشیاں گھول رہے تھے۔

"میں نے کچھ بھی پیسوں کے لیے نہیں کیا، نیلوفر۔ اور آپ یہ جانتی ہیں۔ ہم سب ایک ٹیم ہیں۔ ہم سب ایک دوسرے کے گھر والوں سے بڑھ کر ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ایک دوسرے کی ان چھوٹے موٹے کاموں میں مدد کریں۔" وہ خلوص سے بولا۔

نیلوفر اپنا سر دائیں بائیں ہلانے لگی۔

”نہیں شمس! تم ہمیشہ میرے لیے آگے سے آگے بڑھ کر کام کرتے ہو۔ تم یہ ڈیزرو کرتے ہو۔ منع مت کرنا، میں ناراض بھی ہو سکتی ہوں۔“ لہجے میں مصنوعی خفگی تھی اور دلکش آنکھوں میں ادا۔

شمس ناں نہ کہہ سکا۔ شکست تسلیم کی۔ بریسلیٹ اپنے کوٹ کی جیب میں بھر دیا۔

”یہ پہلی اور آخری بار تھا۔ آپ کے کام مجھ پر فرض ہیں۔ میں اسے کسی قرض یا احسان کی طرح نہیں کرتا۔“ شمس نے نرمی سے کہا اور اٹھ گیا۔

”تمہارا بڑا اپن ہے۔“ وہ ازلی نرمی سے بولی۔

نیلوفر اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں نرم تاثر برقرار رہا۔ دروازہ ٹھپ سے بند ہوا اور شمس نظروں سے اوجھل۔ نیلوفر کی احسان مندانہ سی مسکراہٹ معدوم ہوئی۔ آنکھوں کا ممنوع تاثر فنا ہوا۔ اب اس کی آنکھوں میں حقارت ٹپک رہی تھی۔

”اف بیوقوف آدمی۔ اِسے تو میں نے سستے میں نبٹا دیا!“ نیلوفر آنکھیں گھماتے بولی۔

وہ اپنی کرسی پر پھر سے آنکھیں بند کرکے، ٹیک لگائے سکون سے بیٹھ گئی۔

☆☆☆

وہ دو سو چالیز گز کا گھر احمد یوسف اور اس کی بہن درفشاں کا آشیانہ تھا۔

مکان کارنر کا تھا۔ اس کے اردگرد ایک حسین گرین بیلٹ تھی جس پر طرح طرح کے پودے لگے تھے۔

درِّ فشاں تیس سال کی تھی۔اس کے اسٹریٹ بال ترتیب سے پونی میں بندھے ہوئے تھے۔اس کے نقوش عام، مگر پرکشش تھے۔ماتھے پر عمر کی لکیر تھی۔اس کی ظاہری شخصیت ہی ایسی تھی کہ دیکھنا والا فوراً سمجھ جاتا تھا کہ وہ ایک تجربہ کار اور سمجھدار عورت تھی۔

فی الحال تو وہ بہت پرجوش نظر آرہی تھی۔اسے جیت کی خوشبو آرہی تھی۔وہ عموماً اپنے بھائی سے شطرنج کے کھیل میں ہار جایا کرتی تھی، مگر آج احمد کی تقریباًہر گوٹی وہ گرا چکی تھی۔

"یہ شہ،" احمد بولا اور بیدق کا مہرا کر درے کے شہنشاہ کو گرایا۔"یہ مات!"

چہرے کی خوشی حیرانی میں بدلی۔

کچھ وقت لگا اس کے دماغ کو ہضم کرنے میں کہ آخر ہوا کیا تھا،اور جیسے ہی اسے سمجھ آئی وہ تالیاں پیٹنے لگی۔احمد کرسی پر ٹیک لگائے چہرے کو فاتحانہ مسکراہٹ میں ڈھالے حیران و پریشان درے کو تالیاں پیٹتے دیکھ رہا تھا۔

"واہ، ! مجھے حیران کر دیا تم نے، احمد!"

"ہاں، ان تعریفوں کے پیچھے تمہارے آنسو دیکھ سکتا ہوں، آپا۔" احمد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

درے کا تعجب بھرا تاثر فنا ہوا۔اس نے ایک ہاری ہوئی سانس ہوا میں خارج کی۔وہ کیسے اپنے بھائی کو یوں نیچا دکھانے کا موقع دے سکتی تھی؟ ہونہہ۔

"خیر، بتاؤ تو، آخر کیسے جیت گئے تم؟ مجھے تو لگا تھا تم اپنے گھوڑے سے میرا رُخ گرانے والے تھے۔" درے کھڑے ہو کر کچن سنک کی طرف بڑھی۔

”یہی تو دشمن کو ہرانے کا بہترین طریقہ ہے۔ اسے یہ تاثر دو کو وہ جیت رہا ہے اور پھر پوری کی پوری بساط ہی الٹ دو۔ میں نے بس تمہیں بھٹکایا تھا آپا، میں نے تمہیں یہ تاثر دیا کہ میں اپنا گھوڑا استعمال کرنے والا ہوں مگر میرا پلان کچھ اور تھا۔“ درے برتن دھونے میں مصروف تھی۔ اس کی پشت احمد کی جانب تھی۔

”تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے نہ جانے کتنی جنگیں لڑ رہے ہو۔“ اور درے بولتی گئی۔

اس نے آگے بھی بہت کچھ کہا، مگر مڑ کر اپنے بھائی کو نہ دیکھا۔ اس کی فاتحانہ مسکراہٹ مدھم پڑ گئی تھی۔ چہرے پر تناؤ حائل ہوا۔

وہ واقعی لاعلم تھی،

ان جنگوں سے جو اس کا بھائی لڑ رہا تھا،

اور درِفشاں کی اس لاعلمی میں ہی،

اس کی خیر و عافیت تھی۔۔

”آج افشہ خالہ آئیں تھیں۔“ درے برتن دھو کر فارغ ہوئی۔ دوبارہ سے اپنی جگہ پر آ بیٹھی۔

احمد اس وقت موبائل میں مگن تھا۔ اسے لگا کوئی خاندانی سیاست کی باتیں ہوں گی۔ چونکہ اسے خاندانی سیاست میں دلچسپی نہ تھی اس لیے اس نے درے کی بات کو سننے کے بجائے موبائل میں مگن رہنے کو ترجیح دی۔

”اور وہ کہہ رہی تھیں کہ میں تمہارے رشتے کا کب سوچوں گی۔“ درے کا انداز شرارتی تھا۔

اب یہ ایسی بات تھی جس میں احمد کو دلچسپی تھی، مگر وہ دلچسپی ظاہر کر کے اپنا مذاق نہیں اڑوانا چاہتا تھا اس لیے ہنوز موبائل میں مگن رہا۔

"تم نے کیا کہا پھر؟" احمد نے جتنا ہو سکتا تھا اتنا سرسری سا انداز رکھا۔ درے اپنے بھائی کی کمپوزر رہنے کی کوششیں دیکھ کر محظوظ ہوئی۔

"میں نے کہہ دیا کہ بس، آپ کوئی اچھی سی لڑکی دکھا دیں تو ضرور سوچوں گی۔ اور پتا ہے انہوں نے کہا وہ ایک سے بڑھ کر ایک رشتہ دکھائیں گی مجھے۔" درِ فشاں پُرجوش نظر آرہی تھی۔

"ہونہہ" احمد نے بظاہر لاپرواہ سا انداز رکھا مگر اس کے گال سرخ پڑنے لگے تھے۔ دل نے رفتار پکڑی تھی۔ موبائل پر چلتی انگلیاں نم ہو گئیں۔ جی کی یہ رنگین خواہشات زبان پر امڈتے کہاں بھلی لگتی تھیں؟

"اب بھئی تم ہو اٹھائیس کے، الحمدللہ تمہارا بزنس ہے۔ جلد تم اپنی ورک پلیس میں شفٹ ہو جاؤ گے۔ سب سیٹ ہو جائے گا۔ اب پرفیکٹ ٹائم ہے تمہاری شادی کا۔"

احمد نے اپنا موبائل اب ایل شیپڈ ٹیبل پر رکھا اور نظر اٹھا کر درے کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سنجیدگی تھی۔

"آپا ویسے تم شادی کیوں نہیں کر لیتی۔" اس نے بہت اطمینان سے کہا۔ درے ایک دم سے چونکی۔

"پہلے تم سیٹ ہو جاؤ پھر میرا بھی دیکھ لیں گے، احمد۔" درے نے تحمل سے کہا۔

”مگر مجھ سے پہلے کیوں نہیں؟“

درنے ایک گہری سانس اندر کو لی۔

”دیکھو احمد! صرف ہم دونوں ہی اس دنیا میں ایک دوسرے کے لیے ہیں۔ جس طرح میں تمہاری ذمہ داری ہوں اسی طرح تم بھی میری ذمہ داری ہو اور فی الحال میں اس طرح سے تمہیں اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔“ درے نے بہت سکون سے کہا۔

”میں کوئی دودھ پیتا بچہ تھوڑی ہوں۔“ احمد نے منہ بناتے کہا۔

”احمد شادی ایک بہت بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔ تم جانتے ہی ہو۔ میرے اوپر تمہاری ذمہ داری پہلے سے ہے۔ اور اس ذمہ داری کے ہوتے ہوئے میں کسی رشتے کے ساتھ انصاف نہیں کر سکوں گی۔ ایک دفعہ تم سیٹل ہو جاؤ پھر میں بھی ضرور سوچوں گی۔“ درے نے اپنا موقف پیش کیا۔ احمد نے اپنا سر ہلایا۔

”ویسے احمد، فیروز بھائی بھی ساتھ ہوتے آج تو وہ بھی کتنا خوش ہوتے۔“ درے کے اچانک اس ذکر پر احمد کے چہرے کے تاثرات نرم پڑے۔

”آخر کیوں وہ اتنی جلدی چلے گئے، احمد۔ کیا ضرورت تھی انہیں جانے کی۔“ درے کی آواز میں تکلیف تھی۔

”کاش! وہ ہمیں چھوڑ کر استنبول نہ گئے ہوتے۔ کاش وہ ہماری خوشیاں دیکھتے۔ تمہاری شادی دیکھتے تمہارے بچے دیکھتے۔ ہماری زندگیوں کو مکمل ہوتے دیکھتے۔ مگر ہم ان سے شکایت بھی نہیں کر سکتے۔ آخر احسانات ہی اتنے ہیں۔ تم اٹھارہ کے تھے اور میں بیس کی جب ماما اور بابا کا کار ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ ہمارا یہ گھر نیا

نیا بنا تھا اور ہمارے اوپر کتنے قرضے تھے۔ ہمیں لگا تھا ہمیں گھر بیچنا پڑے گا، پڑھائی چھوڑنی پڑے گی۔ مگر نہیں۔ فیروز بھائی نے سب سنبھال لیا۔ آج میں ایک ماہرِ نفسیات ہوں اور تم ایک سافٹ ویئر ڈیولپر۔ یہ صرف اور صرف ان کی وجہ سے ہے۔ مگر احمد کاش ایک دفعہ وہ آ جائیں۔ ایک دفعہ ہماری خوشیوں میں شامل ہو جائیں۔" درے کی آنکھیں نم پڑیں۔

احمد ڈسٹرب سا لگتا تھا مگر اس کے تاثرات عام تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنے جذبات اور احساسات کو چھپا کر رکھا کرتے تھے۔ احمد کھڑا ہو کر درے کی جانب بڑھا۔

"ایک دن خوشیاں ضرور لوٹیں گی، آپا۔" احمد نے بس اتنا کہا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

احمد کا کمرہ بالائی منزل میں تھا۔ کمرے کی دیواروں پر گریفائٹ پینٹ ہوا تھا۔ فرنیچر بھی گریفائٹ کے شیڈ کا تھا۔ وہ سیدھا سیدھا اپنے بستر پہ لیٹ گیا اور جھولتے ہوئے پنکھے کو دیکھنے لگا۔ وہ یک لخت حال سے منقطع ہوا اور پرانے وقتوں میں کھو گیا۔

یہ تین سال پہلے کا منظر تھا۔

وہ تینوں اپنے گھر کے لاؤنج کے صوفوں پہ براجمان تھے۔ درِفشاں ناراض سی نظر آ رہی تھی اور احمد کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ فیروز تقریباً بتیس سال کا خوش شکل مرد تھا۔ وہ ہاتھ ہلا ہلا کر درِفشاں کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"دیکھو درِفشاں، بس کچھ عرصے کی بات ہے، ایک دفعہ میں سیٹل ہو جاؤں گا پھر میں تم سب کو بھی بلا لوں گا استنبول۔"

درے منہ موڑے بیٹھی رہی۔ اس کے انداز میں نروٹھا پن تھا۔

"بھائی ہم سب ٹھیک ٹھاک ہیں۔ اتنا خوبصورت گھر ہے۔ میں کلینک میں کام کر رہی ہوں اور ماشاء اللہ سے احمد بھی اپنے اخراجات دیکھ رہا ہے۔ ہمارا مستقبل تو محفوظ ہے پھر آپ کیوں جا رہے ہیں۔" آنکھوں میں ناز و نخرہ لیے وہ فیروز سے بول رہی تھی۔

"کتنی بڑی ڈرامے باز ہے یہ۔" احمد نے دل ہی دل میں سوچا۔

"دیکھو درے، زندگی کو مزید بہتر بنانے کی کوشش کرنے میں کوئی برائی نہیں۔"

درے کا نروٹھا پن ہنوز برقرار رہا۔

"یعنی آپ نہیں رکنے والے؟" کچھ دیر بعد درے منہ موڑ کر بولی۔ وہ اب ہار مان چکی تھی۔ ویسے بھی اپنے محبوب بڑے بھائی سے زیادہ ناراض بھلا کون بہن رہ سکتی تھی؟ فیروز کے چہرے پر اپنائیت بھری مسکراہٹ در آئی۔

"ہاں درے۔" اب فیروز احمد کی طرف متوجہ ہوا۔ "تمہیں تو کوئی اعتراض نہیں، احمد؟" فیروز نے پوچھا۔ اسے کم سے کم احمد سے سمجھداری کی امید تھی۔

"نہیں بھائی۔ بس کوئی اسکیم وغیرہ نہ ہو۔" احمد نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔ فیروز تیزی سے اپنا سر نفی میں ہلانے لگا۔ اس نے اپنا موبائل نکالا اور انسٹاگرام کھول کر ایک پیج احمد کو دکھایا۔

"یہ دیکھو، سیٹل ان ترکی نام کا یہ پیج ہے۔ ان کا آفس بھی ہے، میں پوری تسلی کر چکا ہوں۔ بے فکر رہو۔"

احمد سوچتے سمجھتے سر ہلاتے ہوئے پیچھے بیٹھ گیا۔ فیروز نے دونوں کو آفس کا اڈریس سمجھایا۔

"کب تک جانا ہے پھر بھائی؟" احمد نے سرسری سا پوچھا۔

"بس اگلے مہینے ہم نکل جائیں گے۔"

آنے والے دو ہفتے تینوں بہن بھائی نے ایک ساتھ گزارے۔ وہ ایک دوسرے کو زیادہ سے زیادہ وقت دیتے۔ روز رات کو گھومنے جاتے۔ درِفشاں فیروز بھائی کے لیے شاپنگ کرتی رہی۔ وہ استنبول کے موسم کے مطابق کپڑے خرید رہی تھی۔ سب نے فیروز سے جدائی کو تقدیر سمجھ کر قبول کیا۔

یہ فیروز کے استنبول جانے کی اطلاع دینے کے دو ہفتے بعد کا واقعہ ہے۔۔۔

فیروز کے چہرے پر اداس مسکراہٹ تھی، وہ کسی گہری سوچ میں گم، اپنے گھر کے ٹیرس میں بیٹھا چائے کے گھونٹ بھر رہا تھا۔ پیچھے سے احمد اور درے بھی آئے اور کرسی لگا کر بیٹھ گئے۔ درے کے ہاتھ میں چائے تھی اور احمد کے ہاتھ خالی۔

"ویسے احمد چائے بھی پینا شروع کر دو۔ اف بہت بڑی نعمت سے محروم ہو تم۔" درِفشاں نے چائے کا گھونٹ بھرتے کہا۔ احمد نے سر نفی میں ہلایا۔

"بس تم دونوں ہی اس نعمت کے مزے لو۔ میں یوں ہی خوش ہوں۔" درِفشاں نے ایسا منہ بنایا جیسے احمد کی اس بات کا اسے بہت برا لگا تھا۔ اپنے بھائیوں کے سامنے وہ یونہی بچگانہ بن جاتی تھی۔

فیروز دوسری طرف کچھ کھویا سا تھا۔ اس نے جیسے دونوں کی کوئی بات سنی ہی نہ تھی۔ احمد اور درے کی پریشان نگاہوں کا تبادلہ ہوا۔

”بھائی کیا ہوا سب ٹھیک تو ہے۔“ درے نے فکر مندانہ انداز میں پوچھا۔ فیروز نے گردن تک نہ ہلائی۔ بس یوں ہی کھلے آسمان کو تکتا رہا۔

”تم دونوں بہت یاد آؤ گے مجھے۔“ فیروز نے سرد سے لہجے میں کہا۔

احمد کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی۔ کچھ تھا جو اسے کھٹک رہا تھا۔ درِفشاں کا دوسری طرف رنگ مرجھا گیا تھا۔

”ابھی دو ہفتے ہیں بھائی۔ ابھی وقت ہے۔“ درِفشاں اپنے دل میں چھائی اداسی کے باوجود بہت گرم جوشی سے بولی۔ وہ ان دنوں ماحول کو کسی بھی قسم کی رنجش سے پاک رکھنا چاہتی تھی۔

”تم لوگ میرے بغیر رہ تو لو گے نا؟“ فیروز کا یہ کہنا احمد کو یقین دلا گیا تھا کہ کچھ گڑبڑ تھی۔ درِفشاں اور احمد نے ایک دوسرے کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”بھائی سب ٹھیک تو ہے؟ اگر کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتائیں۔ ہم مل جل کر حل تلاش کریں گے۔“ احمد نے بھنویں سکیڑ کر کہا۔

”بھائی آپ ہمیشہ کے لیے تھوڑی جا رہے ہیں۔ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔“

فیروز نے ایک جھٹکا لیا۔ وہ جذبات میں آ کر کچھ زیادہ ہی بول گیا شاید۔

”ارے میرا مطلب وہ نہیں تھا۔“ فیروز نے اپنے آپ کو نارمل کیا۔ ”اب تین چار ماہ لگیں گے مجھے تم لوگوں کو بلانے میں۔ تب تک کیا کرو گے؟“

درے کی جان میں جان آنے لگی۔ مگر احمد اب تک مطمئن نہ تھا۔ کچھ تو ضرور تھا جو فیروز ان دونوں سے چھپا رہا تھا۔

اگلی صبح جب درِفشاں فیروز کو اٹھانے گئی تو وہ اپنے کمرے میں موجود نہ تھا۔ اس نے گھر میں طوفان برپا کر دیا۔ احمد بھی بہت پریشان ہو گیا تھا۔ مگر فیروز کا کوئی اَتا پتا نہ تھا۔ ان کو کمرے میں زمین بوس پرچہ ملا تھا، جس پر لکھا تھا:

"کاش کہ میں تم لوگوں کو بتا سکتا میں کتنا مجبور ہوں۔ مگر فکر نہ کرو میں تم دونوں کے ساتھ ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔ میں تم دونوں سے بہت محبت کرتا ہوں اور سب کچھ صرف تم دونوں کے لیے کر رہا ہوں۔ قسمت نے چاہا تو ہم جلد ملیں گے۔"

درے کے سینے پر تو جیسے سانپ لوٹ گئے۔ ان دونوں فیروز کو ڈھونڈنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا، ایئرپورٹ چیک کیے ہر جگہ چھان ماری مگر فیروز کہیں نہیں تھا۔ انہوں نے انسٹاگرام پر اس پیج کو ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر وہ ڈلیٹ ہو چکا تھا۔ ان دونوں نے سیٹل ان ترکی کے آفس ڈھونڈے پر وہ بھی نہیں ملے۔ یہ معاملہ بہت الجھا ہوا تھا، جتنا سلجھانے کی کوشش کرلو سلجھتا ہی نہیں تھا۔

ایک جھٹکا کھا کر احمد حال میں لوٹا۔ پنکھا ہنوز اپنی عام رفتار کے ساتھ چل رہا تھا۔

سب بدل گیا تھا۔ اب انہیں فیروز بھائی کے بغیر رہنے کی عادت ہو گئی تھی مگر۔ مگر ان یادوں کا کیا کیا جائے جو

اب تک باقی تھیں؟ وہ یادیں جو ان کو اب تک تکلیف دیتی تھیں۔

کاش یادوں کو بھلانے کی کوئی دوا میسر ہوتی۔



رات حسام پر بہت بھاری تھی۔ اس کا دل بوجھل تھا۔ بے چینی اور بے قراری شدت اختیار کر چکی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اپنے دل کی کیفیت سے کیسے جان چھڑائے۔ اسے بس اپنی بیٹی کو دیکھنا تھا، بس ایک مرتبہ اسے محسوس کرنا تھا۔ وہ کتنا بدلی ہو گی؟ وہ کتنی بڑی ہوئی ہو گی؟ وہ اب کس طرح کی باتیں کرتی ہو گی؟

ڈر گز نے حسام کی زندگی تباہ کر دی تھی۔ وہ جو بچپن سے لے کر یونیورسٹی تک ٹاپ کرتا تھا۔ لوگ اسے ایول جینیس کہتے تھے، آج وہ اپنی زندگی ضائع کیے بیٹھا تھا۔ آج بھی بے چینی اور بے قراری مقدر بنی ہوئی تھی۔

حسام سے برداشت نہ ہو سکا۔ اس نے مہر کو کال ملانے کا فیصلہ کیا۔ وہ نہیں جانتا تھا وہ اس کا سامنا کیسے کرے گا لیکن اس وقت وہ مجبور تھا۔ شاید مہر اسے عنایا کی آواز ہی سنا دے۔

پہلی رنگ پر مہر نے کال کاٹ دی۔ حسام چونکا۔ آخر مہر ایسا کیوں کر رہی تھی؟ حسام نے دو مزید رنگز دیں لیکن جواب ندارد۔ مہر نے دونوں دفعہ کال کاٹ دی۔ بالآخر چوتھی رنگ پر کال اٹھا لی گئی۔

"کیا ہے؟" فون کی دوسری طرف سے بد لحاظ آواز گونجی تھی۔

حسام اس آواز کو پہچانتا تھا مگر وہ انداز؟ اس انداز سے وہ مانوس نہ تھا۔ اس نے موبائل اپنے کان سے جدا کیا اور فون پر نمبر کو دیکھا جیسے تصدیق چاہتا ہو کہ یہ مہر ہی تھی۔ وہ واقعی مہر کا نمبر تھا۔

"اب واپس آگئے ہو تو کیا یوں کال کر کر کے زندگی مشکل بناؤ گے؟ ہاں؟" مہر کی آواز بلند تھی مگر وہ چلا نہیں رہی تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی جو کم چلایا کرتے تھے۔

دوسری طرف حسام دم سادھے کھڑا تھا۔ مہر کو کیا ہو گیا تھا؟ وہ اس انداز میں بات کب سے کرنے لگی تھی؟ وہ تو جس مہر کو جانتا تھا وہ تو انتہائی نرم مزاج تھی۔ ہر کسی کو آپ سے مخاطب کرتی تھی۔ وہ مہر آخر کہاں کھو گئی؟ اس وقت حسام فاروق کو احساس ہوا کہ اس کی ڈرگ ایڈکشن نے خود سے زیادہ نقصان تو مہر کو پہنچایا تھا۔

”مہر بس۔۔“ حسام شرمسار تھا۔ اس سے کچھ کہا بھی نہیں جا رہا تھا۔ آنسوؤں کا پھندا حلق میں پھنسا۔ ”بس عنایا۔۔ ملوا دو۔۔ تھوڑی دیر۔“ حسام کی آنکھ سے ایک آنسو ٹوٹا۔ پھر آنسوؤں کی رسی کھل گئی۔ وہ زار و قطار رونے لگا۔

”کبھی نہیں“ مہر غرائی تھی۔ ”تمہیں کیا لگتا ہے میری زندگی ضائع کرنے کے بعد تم ایک دن آؤ گے اور تمہیں سب کچھ مل جائے گا؟ نہیں حسام، تم تڑپو گے۔ تم رات رات بھر عنایا کی یاد میں رو گے۔ تم سونا چاہو گے مگر تمہاری بے چینی اور بے قراری تمہیں نیند سے بھی محروم کر دے گی حسام! تم۔۔۔ تم ۔۔۔تم“ مہر کو جیسے حسام کی شان میں کہنے لائق الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ حسام کی گردن مزید جھک گئی۔

”بس ایک دفعہ۔“ حسام نے ہمت کر کے کہا۔

”نہیں! جو چاہے کر لو۔ اور ہاں اب کال نہ کرنا ورنہ ایف بی آئی میں کمپلین لانچ کر دوں گی۔ دوبارہ جانا پھر جیل میں!“ مہر نے تلخی سے کہہ کر فون رکھ دیا۔

حسام لاجواب سا وہیں کھڑا رہا۔ آنسو اب بھی نہ رکے تھے۔ وہ اپنے بیڈ پر بیٹھ گیا۔ روح پر ناقابلِ برداشت تکلیف آن چمٹی۔ اس کے ذہن میں ماضی کی آوازیں گونجیں۔

”یہ آخری بار تھا مہر، میں وعدہ کرتا ہوں اب کچھ نہیں کروں گا۔“

”مہر میں کمزور پڑ گیا تھا۔ بس ایک آخری موقع۔ میں سب ٹھیک کر دوں گا۔“

”مہر میں وعدہ کرتا ہوں اپنی بیٹی کے لیے یہ سب چھوڑ دوں گا۔“

حال کا حسام سر جھکائے پھوٹ پھوٹ کر روتا گیا۔ وہ آج تک کوئی وعدہ پورا نہ کر سکا۔ اور مہر بھی ایک دن اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ اس کی بیٹی بھی اس سے کوسوں دور تھی۔ وہ ہر طرف سے گھاٹے میں تھا۔

”حسام آ کر کھانا۔۔“ مرینا دروازہ کھول کر داخل ہوئیں۔ روتے ہوئے حسام کو دیکھ کر رک گئیں۔ ان کا کلیجہ پھٹنے لگا تھا۔ وہ تیزی سے حسام کی طرف لپکیں۔

”حسام، کیا ہوا ہے۔ بتاؤ۔“ مرینا نے حسام کا کندھا سہلاتے ہوئے پوچھا۔

”امی! مہر مجھے عنایا سے ملنے نہیں دے رہی۔ آپ پلیز اس سے بات کریں۔“

مرینا کا چہرہ نرم پڑا۔

”میرے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں ایک دفعہ پہلے کر چکی ہوں۔ مہر بہت بدل گئی ہے حسام۔ مگر اس میں اس کا بھی قصور نہیں۔ خیر میرے پاس ایک حل ہے۔“ مرینا کے کہتے ہی حسام کی آنکھوں میں امید جھلکی۔

”میں اکرم صاحب سے کہہ کر مناج سے تمہارا اپوائنمنٹ لے لوں گی۔“ مرینا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”کون مناج؟“ حسام الجھ گیا۔

”مناج ایک قابل وکیل ہے۔ اب یہی طریقہ ہے عنایا سے ملنے کا۔“

حسام کی الجھن میں اضافہ ہوا۔ آخر ایک وکیل ان صورتحال میں کیسے مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔

''مگر امی وہ ہماری مدد کیسے کرے گی؟'' حسام نے اپنی الجھن کا اظہار کیا۔

''ہم کورٹ سے درخواست کریں گے کہ مہر تمہیں عنایا سے ملنے دے۔ اور مناج سے زیادہ بھروسہ میں کسی پر نہیں کر سکتی۔ وہ بہت ہوشیار ہے۔ بہت تیز۔ صرف وہ یہ معاملہ سنبھال سکتی ہے۔''
حسام کو جیسے اب کچھ کچھ سمجھ آنے لگا۔

''وہ پکا کوئی حل نکال لے گی ناں؟'' حسام کا دل اب بھی پوری طرح سے مطمئن نہیں تھا۔

''ہاں، میں پچھلے سال سے اس کے ساتھ کام کر رہی ہوں۔ وہ بہت پروفیشنل ہے۔ وہ سب معاملات سنبھال لیتی ہے۔ مجھے یقین ہے وہ یہ سب بھی دیکھ لے گی۔''

حسام تھوڑا ٹھنڈا پڑا۔ اگر مناج ہی اس کی واحد امید تھی تو وہ اسے بھی آزما لے گا۔

☆☆☆

صبح کا وقت تھا۔ آسمان پہ ہلکے پھلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ سورج کسی بادل کے پیچھے چھپا اس گھر کو دیکھ رہا تھا۔

وہ چار سو گز کی زمین پر بنا حسین گھر تھا، جس کے ارد گرد رنگ برنگے پھول اور ہری بھری گھاس سے آراستہ سبزہ زار پھیلا ہوا تھا۔

اندر سب سے کونے والے کمرے میں وہ نظر آئے گی۔۔ مناج!

وہ اپنے بستر پر ٹیک لگائے مدہوش سے عالم میں بیٹھی تھی۔ اس کے کھلے بال بکھرے ہوئے تھے اور کچھ لٹیں اس کے چہرے پر آتی تھیں۔ رنگ اس کا سانولا تھا۔ عموماً لڑکیوں کے برعکس اس کی پلکیں بڑی بڑی تھیں۔

وہ بیگانوں سی حالت میں سگریٹ کے کش بھر رہی تھی۔

"مناج بیٹا، جاگ گئی ہو؟" مناج کی خالہ رضیہ دروازے کے اس پار سے بولی تھیں۔

مناج اپنے بستر پر یوں ہی بت بنی بیٹھی رہی۔ وہ ہلی نہ ہی اس کے بے تاثر چہرے پر کوئی تبدیلی آئی۔

"جی خالہ۔"

اگر کوئی اس کی آواز سن لے تو کچھ لمحے سوچ میں پڑ جائے کہ کیا کوئی انسان بھی یوں بات کر سکتا تھا؟ آواز ہر جذبے اور ہر احساس سے پاک تھی۔ انداز مشینی تھا۔

"تو بیٹا باہر آ کر ناشتہ کر لیتی، خالو بھی ساتھ ہیں۔" رضیہ کا لہجہ التجا گو تھا۔

مناج نے ایک تھکی ہوی سانس خارج کی۔ اس نے آدھی جلتی سگریٹ سائڈ ٹیبل پر رکھی اور دروازے کی طرف چلتی بنی۔

"لیں میں آ گئی۔" وہ مشینی انداز میں بولی۔

رضیہ مسکرادیں۔ مناج ان کے پیچھے کھانے کی میز تک پہنچی جہاں سربراہی کرسی پہ امجد براجمان تھے۔ سب نے ایک ساتھ کھانا شروع کیا۔ وہ خالہ اور خالو کے نگاہوں کے تبادلے دیکھ کر اندازہ لگا چکی تھی کہ آج کون سی بات ہونے والی تھی۔

”مناج تمہارے خالو بہت ضروری بات کرنا چاہ رہے تھے۔“ رضیہ نے ناشتے کے دوران کہا۔

مناج نے رخ موڑا اور لاشوں جیسی آنکھوں سے اپنے خالو کو دیکھا۔ امجد نرمی سے مسکرا رہے تھے۔

”دیکھیے مناج۔ آپ کے لیے بہت اچھا رشتہ آیا ہے۔ ہم چاہ رہے تھے کہ آپ کی رضامندی ہو تو بات کو آگے بڑھائیں۔ آپ اس بار کم از کم اس لڑکے سے مل لیں۔“ مناج کے خالو امجد کا لہجہ پر خلوص اور نرم تھا۔

کوئی اور لڑکی ہوتی تو ضرور اس بات پر کوئی نہ کوئی ردعمل دیتی مگر وہ مناج تھی، جذبات اور احساسات اس پر حرام ہوئے تھے۔

”خالو آپ جانتے ہیں میں نے شادی نہیں کرنی۔“ بدستور مشینی انداز۔ وہ ہر لفظ پر زور دے کر بولتی تھی۔ تلفظ خالص تھا۔

”آپ میں کیا کمی ہے؟ آپ ایک ترقی یافتہ وکیل ہیں۔ آپ کا کریئر بلندیوں کو چھو رہا ہے۔ آپ ماشاءاللہ شکل وصورت کی اچھی ہیں۔ پھر آپ کو کون سی شے روک رہی ہے؟“

”خالو! میرے اچھے کریئر اور میری اچھی تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے میرے بارے میں اور بھی بہت کچھ بھول رہے ہیں، جس کے ہوتے ہوئے میں کسی رشتے میں بند نہیں ہو سکتی۔“ مناج نے بلا تاثر سا انداز اختیار کیا۔ الفاظ سادہ تھے، خالی۔

”شاید آپ غلط سمجھ رہی ہوں۔ شاید شادی کے بعد آپ ٹھیک ہو جائیں، مناج۔“ امجد صاحب کی امیدیں دم توڑ گئی تھیں۔

”نہیں خالو! یہ ایک جوئے سے کم نہیں ہو گا۔ اور میں جوا نہیں کھیلتی۔“

امجد خاموش ہو گئے۔ مناج جب کھانا کھا کر اٹھی تو رضیہ نے فکر مندی سے امجد سے کہا:

”میں بہت پریشان ہوں ہماری مناج کے لیے۔ وہ ستائیس کی ہو گئی ہے مگر وہ اب تک اپنی زندگی کے تلخ پہلو کو نہیں بھلا سکی، امجد۔“

”دعا کیا کرو رضیہ، صرف دعائیں ہی مناج کو ٹھیک کر سکتی ہیں۔“ امجد کی آواز میں تکلیف تھی۔

مناج جب اپنے کمرے میں لوٹی تو سائیڈ ٹیبل پہ پڑی سگریٹ پوری طرح سے جل کر راکھ ہو چکی تھی۔ اس نے دراز سے نئی سگریٹ نکالی ا۔ کو نا لائیٹر سے جلا کر آہستہ آہستہ اس کے کش بھرے۔ یکبارگی اس کے موبائل پر رنگ ہوئی۔ چیکو اکرم کالنگ۔ مناج موبائل ہاتھ میں پکڑے اسکرین کو گھورتی رہی، پھر تھکی ہوئی سانس خارج کر کے کال اٹھائی۔

”ہیلو مس مناج۔ کیسی ہیں آپ؟“ اکرم صاحب چہک کر بولے۔

مناج کے چہرے کے تاثرات ٹس سے مس نہ ہوئے۔

”جی، بتائیے کیوں کال کی ہے۔“ مناج نے اپنے مشینی انداز میں کہا۔ ساتھ ہی سگریٹ ہونٹوں سے لگائی اور ایک اور کش بھرا۔ دھواں اس کے لبوں کی سمت سے باہر آیا۔

”مس مناج، دراصل مرینا میڈم کے بیٹے حسام کو آپ سے کسی سلسلے میں ملنا ہے۔“ اکرم صاحب نے سنجیدگی سے کہا۔

- ”تھوڑا واضح کیجیے، کس سلسلے میں ملنا ہے۔“ مناج نے ایک اور کش بھرا۔ کمرے میں کڑوی مہک پھیلی ہوئی تھی۔

”حسام صاحب کی ایکس انہیں ان کی بیٹی سے ملنے نہیں دے رہی ہے بس وہ اسی سلسلے میں ملنا چاہ رہے تھے۔“ اکرم صاحب نے کہا۔

”کون ہے یہ ایکس۔ کیا کرتی ہے؟“ مناج جو سگریٹ کا کش بھر رہی تھی وہ کچھ دیر کو تھمی، مگر انداز اب بھی ویسا ہی تھا۔ مشینی۔

”جی مہر۔ مہر بنتِ عبداللہ سلطان۔“ اکرم صاحب نے ٹھہر کر بتایا۔

”بچی کی عمر کیا ہے؟“

”شاید چار سال۔“ مناج بے نیاز سا مسکرا دی۔

تو اب یہ کیس کوئی تین سے پانچ سال کورٹ میں چلے گا، یعنی تین سے پانچ سال کی لگاتار فیس۔ مناج نے سوچا۔ یہ کیس اسے لینا ہی لینا تھا۔

”آج پانچ بجے حسام صاحب کو میرے آفس بھیج دیں۔ مگر اکیلے۔“ مناج نے اکیلے پر زور دیا۔

”جی ٹھیک ہے۔“ اکرم صاحب نے فون رکھ دیا۔ مناج اپنے بستر پر آرام دہ ہو کر بیٹھ گئی اور باقی کی سگریٹ کے آہستہ آہستہ کش بھرے۔ اس کا سر ہلکا ہونے لگا۔ اور وہ آنکھیں بند کر کے کچھ دیر لیٹ گئی۔

☆☆☆

دوپہر کا وقت تھا۔ سورج کی تپش اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ اسلام آباد میں اس وقت بادلوں کا راج تھا سو شہر گرمی سے محفوظ تھا۔ احمد اپنے انسٹیٹیوٹ میں موجود تھا۔ وہ دن کے وقت سکول میں پڑھاتا تھا اور دوپہر سے رات تک اپنے انسٹیٹیوٹ میں کام کرتا تھا۔ قائدِ اعظم کا قول ہے ”کام، کام اور صرف کام“ احمد یوسف نے اس قول کو اپنی زندگی پر لاگو کیا تھا۔ اور پھر جب خواب آسمانوں کو چھونے کے ہوں تو انسان کو اپنی ضرورتوں کو بالائے طاق رکھ کر کام کرنا پڑتا ہے۔ وہ کام میں خوشیاں تلاش کرنے والا انسان تھا۔

وہ اپنے آفس میں پر سکون سا ہو کر بیٹھا ہوا تھا۔ یہ جگہ اس کے لیے سکون کا دوسرا نام تھی۔ دروازے پر دستک نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

”کیا میں اند آجاؤں سر؟“ حماد کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبا بھی تھا۔ احمد کے چہرے پر مدھم سی مسکراہٹ بکھری۔

”آجاؤ حماد!“ احمد خوشگواری سے کہتا ہوا اپنی کرسی سے کھڑا ہوا۔ اس نے ہاتھ ملا کر حماد کو سلام کیا۔ اور پھر سینے پر ہاتھ رکھ کر اپنے سر کو خم دیا۔ یہ احمد کا انداز تھا۔ وہ ہر کسی سے ایسے ہی ملا کرتا تھا۔

”سر یہ لیجیے۔“ حماد نے مٹھائی کا ڈبا احمد کی طرف بڑھایا جسے احمد نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”سر آپ کا بہت شکریہ۔ بالآخر آپ کے ریفرنس سے میری جاب لگ ہی گئی۔“ حماد کے انداز میں خلوص تھا۔ احمد نے اپنے سر کو اوپر نیچے جنبش دی۔

”چلو بہت بہت مبارک ہو۔ لیکن صرف مٹھائی سے کام نہیں بنے گا۔ ٹریٹ تو دینی پڑے گی۔“ احمد کے انداز میں نیم سی شرارت تھی۔ حماد زیرِ لب ہنس دیا۔

”وہ بھی ضرور سر۔ بس آپ کا جتنا شکریہ ادا کروں کم ہو گا سر۔ اس وقت مجھے جاب کی اشد ضرورت تھی۔“ حماد پھر ٹھہرا۔ ”سر ویسے آپ کے اتنے لنکس کیسے نکل آتے ہیں؟“

احمد نے اس سوال پر اپنی بھنوؤں کو اوپر نیچے کیا۔ حلق میں مٹھاس گھلی۔

”فیروز بھائی کہا کرتے تھے کہ باہر کی دنیا میں رابطے بنانا بہت ضروری ہے۔ ضرورت کے وقت یہی رابطے کام آتے ہیں۔ اور اب دیکھو علاقے کا پولیس افسر ہو یا کسی بلڈنگ کا گارڈ، میرے سب سے اچھے تعلقات ہیں۔“ احمد کے چہرے پر مدھم مسکراہٹ تھی مگر اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ اس کا انداز ہر قسم کی شودے گری سے پاک تھا۔

”تو سر ہم آخر کانٹیکس کیسے بنائیں؟“

”لوگوں سے گھل مل کر، ان سے بات چیت کر کے، ان پر احسانات کر کے۔ بس کسی بھی طرح سے وہ تمہارے نام کو اور تمہاری شخصیت کو یاد کر لیں۔“ احمد نے سرسری سا کہا۔ حماد نے سر اثبات میں ہلایا۔

”سر ویسے آپ بھی اس سے پہلے جاب کرتے تھے۔ وہ جاب آپ نے کیوں چھوڑی تھی؟“ حماد نے ایک اور سوال کیا۔

”یہ جابز ساری کی ساری ایک جیسی ہوتی ہیں۔ آپ ایک بندے کے انڈر کام کر رہے ہوتے ہیں اور آپ کا اپنا ذہن کم ہی استعمال ہو رہا ہوتا ہے۔ اور مجھے لگا کے جو جاب میں کر رہا تھا وہ میری سو فیصد صلاحیتوں کا استعمال نہیں کر رہی تھی اس لیے میں نے وہ جاب چھوڑ دی۔“ احمد نے آخر میں شانے اچکا دیے۔ حماد نے اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ پھر عام سی گفتگو کے بعد حماد چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی خاموشی لوٹ آئی۔ اس میں نیم سی سوگواریت گھلی ہوئی تھی۔ احمد نے دراز کھولی۔ ایک تصویر نکال کر آنکھوں کے سامنے کی۔ فیروز اس تصویر میں مسکرا رہا تھا۔ کئی یادیں ایک ساتھ ذہن میں دوڑیں۔

آنکھوں کے رنگ تبدیل ہوئے۔ وہاں آگ لگ چکی تھی۔ اسے کل رات درے سے ہونے والی گفتگو یاد آئی۔ اس کا پریشان چہرہ، اس کی دکھ بھری آواز۔ اس سب نے آگ میں ایندھن کا کام کیا۔ وہ اتنی شاہانہ ہوگئی کہ جسم تپنے لگا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں جھلکیں۔

وہ انتقام کے سفر کا مسافر تھا۔ یہ آگ عزمِ انتقام کے تکمیل ہو جانے تک بجھنی نہیں تھی۔

”میں جلد حساب لوں گا۔ میں جلد لوٹوں گا۔ احمد یوسف کی واپسی یقینی ہے۔“ اس نے خود کلامی کی اور تصویر مٹھی میں جکڑ لی۔

☆☆☆

شام کے پانچ بج چکے تھے۔ مناج اپنے آفس میں تیار بیٹھی تھی۔ اس نے ایک سادہ سفید پھولی ہوئی آستینوں والا کُرتا پہنا ہوا تھا۔ اپنے کندھے پر پشیمینہ شال گرائی ہوئی تھی جو خاصی پرانی لگتی تھی۔ گرمی ہو یا سردی مناج اپنی پشمینہ شال ہر جگہ اوڑھ کر جاتی تھی۔

دفعتاً حسام آفس میں آیا۔ اس نے شیو کرلی تھی۔ البتہ چہرہ کافی سوکھ چکا تھا۔ مناج نے اسے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

”جی حسام صاحب۔ اکرم نے تھوڑا بریف کیا تھا مگر ایک دفع آپ خود تفصیل سے بتائیں کہ بات کیا ہے۔“

اس کا لب ولہجہ سن کر حساب کو جھرجھری آئی۔ کچھ معیوب تھا اس کے انداز میں۔

”مس مناج، میری اور میری ایکس کی طلاق آٹھ ماہ پہلے ہوئی تھی۔ میں نے طلاق کے بعد تین ماہ جیل میں گزارے مگر پھر میری طبیعت اتنی بگڑی کہ مجھے رہا کر دیا گیا تھا۔ پانچ ماہ علاج کہ سلسلے میں میں نے انگلینڈ میں قیام کیا۔ واپس آیا تو میں نے فوراً سے اپنی بیٹی سے ملنا چاہا مگر میری ایکس مجھے عنایا سے ملوانے پر راضی نہیں ہے۔“ آنکھیں بے قرار تھیں۔ الفاظ جگہ جگہ لڑکھڑا رہے تھے۔

مناج اندر ہی اندر مسکرا دی۔ وہ جانتی تھی حسام بہت سی تفصیل گول کر گیا تھا۔

”جیل کیوں گئے تھے؟ اور کونسی بیماری ہوئی تھی؟“ نظریں جھکائے نوٹ پیڈ پر کچھ لکھ رہی تھی۔

حسام لمحے بھر کو ٹھہرا۔ اسے ندامت کے احساس نے گھیرا۔

”ڈرگ اسمگلنگ کے کیس میں پھنسا تھا۔ جیل میں بھی ڈرگ کے وتھڈراولز (withdrawals) کی وجہ سے مجھے رہا کیا گیا تھا۔ میں نے انگلینڈ میں پانچ ماہ ریہیب میں گزارے ہیں۔“

”نکل آئیں تفصیل۔“ وہ دل ہی دل میں بول کر ہنسنے لگی۔

”طلاق ڈرگز کی وجہ سے ہوئی؟“ انداز قدرے بے نیاز تھا۔

''جی۔'' حسام نے سر جھکا کر کہا۔ کمرہ اے سی کی وجہ سے ٹھنڈا تھا، مگر شاید گناہوں کی حرارت تھی جو اس کی پیشانی سے پسینے کی بوندیں پھوٹ کر ناک کی پر لڑھک رہی تھیں۔

''مجھے بتائیں۔ کیا چاہتے ہیں آپ مجھ سے؟'' مردہ آنکھیں نادم آنکھوں سے ملیں۔

اس عورت کو دیکھ کر ہی وہ غیر آرامدہ سا محسوس کرتا تھا۔ اس کی شخصیت میں ایسا فسوں چھپا تھا جو لمحے بھر کے لیے گنگ کر دیتا تھا۔

''ایک باپ کیا چاہے گا سوائے اس کے اسے اس کی بیٹی مل جائے؟'' آواز میں اداسی گھلی۔

''وہ سب تو ٹھیک ہے مگر۔'' حسام کے جذبات سے بھرپور فقرے سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔ ''مگر آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ اتنا آسان نہیں۔''

''مہر کے مام اور ڈیڈ کی بھی طلاق ہوئی تھی۔ اور انھیں کسٹڈی مل گئی تھی۔'' حسام نے اپنے تئیں ایک مناسب جواب دیا۔

''اُف یہ تو بہت ہی بے وقوف ہے۔'' وہ دل ہی دل میں بولی۔

''وہ وقت الگ تھا۔ عبداللہ سلطان اپنے اثر ورسوخ کی وجہ سے اس وقت یہ کیس جیت گئے ہوں گے، مگر اس وقت آپ اور مہر بالکل برابر ہیں بلکہ عبداللہ سلطان آپ لوگوں سے زیادہ ہی اثر ورسوخ والے ہیں۔ اوپر سے آپ کا ماضی۔ وہ آپ کے لیے بہت مسئلے کھڑے کرے گا، حسام۔'' مناج نے بڑے عام انداز میں بتایا۔

حسام کے اوپر سے مایوسی کا گزر ہوا۔

''عنایا مائنر ہے، یعنی وہ بالغ نہیں ہوئی، اور مائنرز کی کسٹڈی ماں کو ہی دی جاتی ہے۔'' مناج نے ایک اور مایوسی بھرا پیغام حسام کو بڑے آرام سے دیا۔ وہ زہر بھی شہد کی طرح دیتی تھی۔

''تو پھر کیا کیا جائے؟'' حسام امید ہارنے لگا تھا۔

''کیا تو بہت کچھ جا سکتا ہے۔ ہم کسٹڈی کا کیس کورٹ میں دائر کر دیں گے۔ کورٹ کی پروسیڈنگ ہر ماہ میں ایک بار ہو گی۔ آپ اپنی بیٹی سے مل سکیں گے۔''

کوئی اتنے تلخ حقائق اتنی بے حسی سے کیسے بتا سکتا ہے؟ حسام کو حیرت ہوئی۔

''صرف ایک بار؟'' اس نے بے یقینی کے عالم میں پوچھا۔

مناج نے بلا توقف سر اوپر نیچے ہلایا۔

''کوئی اور طریقہ نہیں ہے؟'' حسام ہمت ہارنے لگا تھا۔

''آؤٹ آف کورٹ سیٹلمنٹ!'' مناج نے کہا کچھ نہیں بس سوچا۔ وہ بے وقوف نہیں تھی کہ آؤٹ آف کورٹ سیٹلمنٹ کروا کر اپنی پانچ سے چھے سال کی فیس کو مٹی پلید کر دیتی۔

''کیا عنایا مجھے ملے گی بھی؟'' وہ شکست خوردہ سے انداز میں بولا۔

''ہم عدالت میں ہر حربہ استعمال کریں گے، حسام۔ ایسے بہت سے مواقع ہوتے ہیں جب مائنر کی کسٹڈی باپ کو دی جاتی ہے۔ اس کے لیے ہمیں آپکی ایکس کے کردار کو سوالیہ نشان بنانا ہو گا۔'' مناج بالکل پر سکون تھی۔

''مطلب؟'' حسام الجھا۔

"مطلب ہم مہر کی کردار کشی کر سکتے ہیں۔ماں کا کردار جب مشکوک ہو جائے تو بچی باپ کو دی جا سکتی ہے۔اور ایک امیر عورت کی کردار کشی کرنا تو بالکل بھی مشکل نہیں۔"

حسام کو ایک دھچکا لگا۔

"پھر عدالت میں کسی طرح سے یہ ثابت کروا سکتے ہیں کہ مہر کسی ذہنی مرض میں مبتلا ہے تب بھی بچی آپ کو دی جا سکتی ہے۔"

حسام نے اب کی بار جھرجھری لی۔کوئی کیسے کسی عورت کے بارے میں ایسی باتیں گڑنے کے بارے میں سوچ بھی سکتا تھا؟کیا سارے وکیل ایسے ہی ہوتے ہیں؟

"ہم کورٹ میں یہ بھی ثابت کر سکتے ہیں کہ مہر ایک غیر ذمہ دار ماں ہے۔بس یہی کچھ طریقے ہیں۔بہر حال ان کے بعد بھی جیت یقینی نہیں۔"بات ختم کرکے گہری سانس لی اور حسام کا بغور جائزہ لیا۔

حسام نے اپنا سر نفی میں ہلایا۔

"نہیں۔یہ سب کیسے ہو سکتا ہے۔مہر ایسی بالکل نہیں ہے!"حسام جذبات میں آ گیا تھا۔

"چلو شروع ہو گئے ایموشنل ڈرامے۔ابھی بس ایک فقرہ کہنا ہے میں نے اور وہیں پر ساری اچھائی کا خون ہو جانا ہے۔"مناج نے سوچا۔

مناج نے قلم ہاتھ سے چھوڑا۔ہاتھ میز پر جمائے اور آگے جھک کر سرگوشیانہ انداز میں بولی:

"تو پھر کیا آپ کو اپنی بیٹی نہیں چاہیے؟"

"چاہئے مگر۔۔۔"آنکھیں پر سوچ ہوئیں۔دل زور و شور سے دھڑک رہا تھا۔

”تو پھر ویسا ہی کرنا ہوگا جیسا میں نے کہا ہے۔“

حسام خاموش رہا۔ مناج کی ترغیب کو واحد راستہ جان کر احتجاج نہ کیا۔ مناج سر جھکائے موہوم سا مسکرائی۔

”بدھ کو آکر مجھ سے مل لیجیے گا۔ میرے لیے آپ کی شادی شدہ زندگی کی ہر تفصیل کا جاننا ضروری ہے۔ اٹارنی کلائنٹ پریولج کے تحت یہ سب راز رہے گا تو اس کی آپ نے فکر نہیں کرنی۔ پھر ہم آگے کا لائحہ عمل طے کریں گے۔“ وہ نوٹ بوک پر کچھ لکھنے لگی۔

”ٹھیک۔“

یوں جیسے شمع کی لو ہواؤں کے اثر پھڑ پھڑائی ہو اور بجھ گئی ہو۔ حسام کے اندر بھی کچھ بجھ گیا تھا۔

☆☆☆

دوپہر کا وقت تھا۔ مہر اپنے آفس میں بے مقصد بیٹھی سکرین کو گھور رہی تھی۔ اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ آخری مرتبہ کب یہ سر درد اسے محسوس نہیں ہوا تھا؟

دفعتاً کمرے میں اس کا اسسٹنٹ پیٹر داخل ہوا۔

”میم! آپ کے لیے ڈاک آئی ہے کورٹ سے۔“

مہر کی پلکیں یکدم وا ہوئیں۔ دل ہی دل میں وہ جان گئی تھی کہ کون سی آفت سر پر ناچ رہی تھی۔ ستواں ناک پر غصہ نازل ہوا۔ دل ہی دل میں حسام کو ملامتیں بھیجیں۔

”ٹھیک ہے پیٹر، آپ جائیں۔“ مہر نے سخت سے لہجے میں کہا۔

لفافے میں کوٹ کی طرف سے درخواست آئی تھی جس پر حسام اور اس کی وکیل کے دستخط تھے۔ اسے جمعرات کو مطلوب کیا گیا تھا۔

”تم واپس آئے نہیں اور سب کچھ درہم برہم ہونے لگا۔“ وہ تلخی سے بولی۔ ”تم کیوں آ گئے؟“ چہرہ رندھنے لگا۔

اس نے عجلت کے عالم میں موبائل پر ایک نمبر ملایا اور کان سے لگایا۔

”جی ولید صاحب، ابھی اسی وقت میرے آفس آیئے۔ میں انتظار کر رہی ہوں۔“ مہر نے حکم صادر کیا اور کال کاٹ دی۔

انتظار میں وہ انگلیاں چٹخاتی پھر بے زار آ کر نوٹس پڑھ لیتی۔ یہاں تک کہ اسے وہ رٹ چکا تھا۔ ولید صاحب جب پہنچے اس نے بلا تمہید انھیں وہ ڈاکیومنٹ تھما دیا۔ پین کو میز پر کلک کرتے ہوئے ان کے بولنے کا انتظار کرنے لگی۔

”نو وے! مناج طارق! نارمل کسٹڈی کیس ہوتا تو ہمیں اتنا فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ عدالت ماں کے حق میں ہوتی ہے، مگر یہ مناج۔ میں نے اسے اچھے بھلے کیسز کی بساط پلٹتے دیکھا ہے۔“ ولید سومرو کی بات سن کے مہر کا موڈ مزید بگڑنے لگا۔

”آپ مناج کی شان میں قصیدے بعد میں پڑھ لی جیے گا۔ صرف اتنا بتائیں کہ آگے کیا کرنا ہے۔“ ولید اسے زہریلے معلوم ہوئے۔

”قصیدے؟ استغفر اللہ! میرے اتنے برے دن نہیں آئے کہ۔۔۔“ ولید نے مہر کی غصیلی آنکھیں دیکھ لیں تو فوراً سے بات بدلی۔ وہ بلاوجہ اس کے غصے کو دعوت دینا نہیں چاہتے تھے۔

"کرنا کیا ہے کورٹ میں بس مس مناج کے ہر وار کا جواب دینا ہو گا۔ ساتھ ساتھ آپ کے ایکس کی کردار کشی کرنی ہو گی۔ جیسے وہ ڈرگ لیتا تھا؟ ہاں ہم اس بات کا بھرپور استعمال کریں گے۔ ساتھ ساتھ ڈومیسٹک ابیوز کا بھی اقدام اس پر ڈال دیں گے۔"

مہر کے دل پر پھندا سا لگا۔ ڈومیسٹک ابیوز؟

"ڈومیسٹک ابیوز۔۔۔ یہ کچھ زیادہ نہیں ہو جائے گا؟" مہر کے چہرے پر تشویش تھی۔

ولید نے وہی گھسا پٹا حربہ استعمال کیا جو اس صورتحال میں ہر وکیل کرتا تھا۔

"کیا آپ کو اپنی بیٹی اس حسام کے حوالے کرنی ہے؟"

مہر خاموش پڑ گئی۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے آنکھیں گھمائیں۔ "آپ نے اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ یہ کیس کورٹ میں زیادہ دیر نہ چلے۔ میں نہیں چاہتی میری عنایا کورٹ کچہری کے دھکے کھائے۔" مہر نے اکتاتے ہوئے کہا۔

"اس بارے میں تو بے فکر ہو جائیں۔" ولید نے اطمینان سے مہر کو جھوٹی تسلی دی۔

☆☆☆

وہ سڑکوں پر تیز رفتار میں گاڑی بھگا رہا تھا۔ جس منزل کی طرف رواں تھا وہاں پہلی مرتبہ نہیں جا رہا تھا۔ کوئی تھا جس سے اسے ملنا تھا۔

سورج پہاڑوں کے پیچھے اپنی قیام گاہ میں آرام کے لیے جا چکا تھا۔ آسمان اس دریا کی طرح تھا جس میں سیاہ روشنائی گھولی گئی ہو۔ تیر تا ہوا چودھویں کا چاند فضا کو پر سکون مگر اداس کیے ہوئے تھا۔ اور یہی اداسی اس کے چہرے پہ بھی جھلک رہی تھی۔

وہ جس سڑک پر تھا وہاں روشنی کے قمقمے کم تھے۔ اس کے دونوں اطراف ہرے بھرے پہاڑوں کے جم غفیر تھے۔ اس نے اپنی گاڑی روکی۔ گاڑی جہاں رکی تھی، وہ منظر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کی اور اپنی گاڑی سے اترا۔ ڈگی سے فلیش لائیٹ نکالی۔ اس کی آنکھوں پر پٹی بھی بندھی ہوتی تو وہ با آسانی وہاں پہنچ جاتا جہاں جانا چاہتا تھا۔

وہ مارگلہ کی پہاڑیوں میں تراشے گئے راستوں کو عبور کر رہا تھا۔ جہاں رات کے وقت انسان ان پہاڑیوں پہ قدم رکھنے سے گریز کرتے تھے وہاں وہ، بے خوف آدمی پہاڑیاں پھلانگ رہا تھا۔ سانسیں پھول رہی تھیں۔ نم آلود فضا اس کے پسینے میں بھیگے بالوں کو نچا رہی تھیں۔

رات کے اس پہر جنگلی جانوروں کی مختلف آوازیں اس کی سماعت سے ٹکراتیں۔ ہوا سے جھلملاتے پتوں کے گیت ماحول کی دہشت میں اضافہ کر کے روح سنسنا دیتے۔ اس کی گردن کے بال کھڑے ہونے لگا۔

اس کی منزل آگئی تھی۔ وہ ایک چھوٹی سی زمین تھی جو کہ بنجر تھی۔ آس پاس چار درخت تھے۔ زمین کا ایک مختصر سا حصہ ابھرا ہوا تھا۔ ابھرے ہوئے حصے کے ساتھ ایک پتھر زمین میں گاڑا گیا تھا۔ وہ پتھر کو گھورتا گیا۔ دل میں لگی آگ زور و شور سے بھڑک رہی تھی۔ اس کا پورا جسم دہکا۔ برفیلی ہوا بھی اس کی

تپش میں افاقہ نہ کر سکی۔ راہِ انتقام میں ہر طرف انگارے تھے، وہ ان انگاروں پر لوٹنے کا عادی ہو چکا تھا۔ جلن ہوتی تھی۔ مگر وہ جلن جنون کے آگے کچھ نہ تھی۔

وہ سست قدم بڑھانے لگا۔ تاریکی ہی تاریکی تھی، اور وہ ٹھہرا ان ہی تاریکیوں کا ایک گمنام مکین۔ وہ اس پتھر کے سرہانے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ آنکھیں بند کیں۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کو اندر اتارا۔

وہ تنہا تھا۔ وہ جس سے ملنے آیا تھا وہ بھی تنہا تھا۔ اس نے اپنی فلیش لائیٹ زمین پر رکھی۔ وہ مدھم سی آواز میں سورہ فاتحہ کی تلاوت کر رہا تھا۔ جوں ہی تلاوت ختم ہوئی، اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ دل ہنوز ہچکولے مار رہا تھا۔

"اللہ آپ کو جنت نصیب کرے۔ فیروز بھائی۔" وہ زیر لب بڑبڑایا تھا۔ اس راز کی حفاظت کرنے کا اس قدر عادی تھا کہ تنہائی میں بھی وہ اتنی بلند آواز میں بولا کہ آواز صرف اس کے کانوں کو بمشکل چھو سکی۔

پلکیں موندیں۔ اپنے آپ کو دلاسا دیتے ہوئے، مغموم مگر معنی خیز آواز میں احمد نے یہ آیت پڑھی:

"قُلۡ اِنۡ تُخۡفُوۡا مَا فِیۡ صُدُوۡرِکُمۡ اَوۡ تُبۡدُوۡهُ یَعۡلَمۡهُ اللّٰهُ ؕ وَ یَعۡلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ"

"۔تم فرمادو کہ اگر تم اپنے دلوں کی بات چھپاؤ یا ظاہر کرو اللہ کو سب معلوم ہے، اور وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے"

اب کی بار اس نے آنکھیں کھولیں تو اس کے چہرے کے تاثرات نرم پڑے۔ ملاقات ختم ہونے کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی فلیش لائیٹ اپنے ہاتھوں میں تھامی اور جانے کے لیے کھڑا ہوا۔

وہ قبر اکیلی رہ گئی۔ اندھیروں نے اسے تھپکی دی۔ وہی خوفناک اندھیرے جن سے جیتے جاگتے انسان بھی ڈر جائیں۔

وہ قبر اپنے اندر سموئے ہوئے ان تاریک دلدوز رازوں کو آج بھی چھپانے میں کامیاب ہو گئی۔

یہ وہی راز تھے جو عنقریب۔۔

سب کی زندگیوں کا کانٹا بننے والے تھے!



باب دوم: "تلاشِ خود"

میں سوچتا ہوں کہ آخر،
کچھ ایسا ہے دنیا میں جو باقی رہ جاتا ہے؟
محبت؟ میں نے محبت کو مرتے دیکھا ہے،
خوبصورتی؟ میں نے خوبصورتی کو بھی ڈھلتے دیکھا ہے،
رشتے؟ مگر میں نے رشتوں کو بھی ٹوٹتے دیکھا ہے،
پھر کیا کچھ باقی نہیں رہتا؟
کیا سب کچھ تخلیق ہی اس لیے ہوتا کہ وہ ایک دن،
زمانوں کے ہاتھوں،

وقت کی لپیٹ میں آکر،

مسخ ہو جائے؟

اور کچھ باقی رہ بھی کیسے سکتا ہے،

جب انسان خود بھی باقی نہیں رہتا!



گزرتے دنوں کے ساتھ موسمِ گرما کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ نم آلود ہوائیں اسلام آباد پر راج کر رہی تھیں۔ بادلوں کی عدم موجودگی میں سورج کی کرنوں کو زمین پر وار کرنے کا خوب موقع مل رہا تھا۔ قصر کی دیواریں طلائی کرنوں تلے سنہری نظر آ رہی تھیں۔

حسبِ معمول مہر اور نیلوفر ناشتہ کرنے میں مشغول تھے۔

"مہر میری بات مانو، اور عنایا کو یوں کورٹ میں نہ گھسیٹو۔" نیلوفر نے سمجھانے بجھانے والا انداز اختیار کیا۔

کانٹے چھری سے ٹوسٹ توڑتی مہر تھم گئی۔

"پھر کیا کروں؟ عنایا کو حسام کے حوالے کر دوں۔" آواز دھیمی تھی، لہجے میں احترام برقرار رکھنے کی حتی الوسع کوشش کی۔

"عنایا بہت چھوٹی ہے مہر۔ تم کیوں اسے کورٹ کے دھکے دلوانے پہ بضد ہو؟"

مہر کی آنکھوں میں بے یقینی پھیلنے لگی۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔

"مجھے امید ہے یہ معاملہ زیادہ عرصہ نہیں کھینچے گا۔" وہ واضح طور پر اکتائی ہوئی تھی۔

اس عورت کا یہ حال دیکھ کر ہمیشہ دل کا کوئی گوشہ نرم پڑنے لگتا تھا۔ جھبرے بال۔ سوکھا چہرہ۔ تنے ہوئے تاثرات۔ اسے یاد نہیں آ رہا تھا آخری مرتبہ مہر بنتِ عبداللہ سلطان کو خوش کب دیکھا تھا؟

"اور یہ بات بھی تمھارے وکیل نے کہی ہو گی۔ ہے نا؟" نیلوفر طنزاً بولی۔

”تم کتنی بھولی ہو، مہر۔ یہ سارے وکیل ایک جیسے ہوتے ہیں۔ تمہاری ترجیح اس وقت عنایا کا ذہنی سکون، اس کی خوشحالی ہونی چاہیے۔“

مہر کے ہاتھ سے چھری اور کانٹا چھوٹا۔ ناشتہ کرنا محال ہو چکا تھا۔ اس نے شکوہ کناں نظریں نیلوفر کی جانب مرتکب کیں۔

”آخر سب لوگ حسام کی حمایت کیوں کر رہے ہیں؟“ سیاہ آنکھوں میں کرب امڈ آیا۔

”میں نہیں بھول سکتی کہ کس طرح سے اس نے میری زندگی برباد کی۔ بار بار نیلوفر۔ بار بار اس نے میرے اوپر ان ڈرگز کو ترجیح دی۔ میں اس کے ساتھ مخلص تھی۔ میں اسے بدلنا چاہتی تھی۔ مگر وہ نہیں سدھر سکا۔“ مہر سانس لینے کو رکی تھی۔

چہرہ سُرخ ہو گیا تھا۔

”اب غور کروں تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بدلنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اگر اتنی ہی محبت تھی اپنی بیٹی سے تو اس کی پیدائش پر ڈرگز کو کیوں نہیں چھوڑ سکا؟ میں ایسے انسان کو اپنی بیٹی کیوں دوں؟“ جذباتی ابال کے باوجود وہ چلا نہیں رہی تھی، نہ ہی اونچا بول رہی تھی۔ اس کے انداز میں فطرتاً ٹھہراؤ استدعا تھا۔

”تمہاری بات اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہے۔ اس کی طرفداری کرنا میرا مقصد نہیں۔ میں صرف عنایا کی بات کر رہی تھی۔ کیا وہ یہ سب جھیل سکے گی؟“ نیلوفر نے کچھ بھی برا نہ مناتے ہوئے بات جاری رکھی۔

مہر نے ہاتھ ہوا میں بلند کیا۔ سیاہ آنکھیں نیلوفر سے کہہ رہی تھیں کہ وہ کسی بحث کے موڈ میں نہیں۔

''یہ ممکن نہیں۔ وہ میری بیٹی ہے، میں جانتی ہوں مجھے اسے کیسے پالنا ہے۔'' انداز اٹل تھا۔

نیلوفر نے ہار تسلیم کرتے ہوئے سانس خارج کی۔

''ٹھیک ہے۔ میں تمہارے فیصلے کا احترام کرتی ہوں۔'' نیلوفر کا انداز ہر قسم کی تلخی سے پاک تھا۔

نیلوفر کے لبوں پر رقص کرتی مسکراہٹ نے مہر کو یقین دلایا کہ وہ اس کے اوپر بھروسہ کرتی ہے۔ مہر کے اندر سکون اترنے لگا۔ ان پیچیدہ لمحات میں اسے بس سہارا ہی تو درکار تھا۔

خاموشی کا راج قائم ہوا۔ وہ دونوں ناشتے میں مگن رہیں۔

''میم یہ آپ کی والدہ نے بھیجا ہے۔'' ملازمہ کی اطلاع نے خلل پیدا کی۔ اس نے میز پر ڈبا رکھ دیا جس پر سنہرا ریپ لگا ہوا تھا۔ ریپ کے ساتھ گلابی کارڈ چسپاں تھا۔

مہر نے وہ باکس اپنے ہاتھوں میں تھاما۔ آنکھوں میں اپنائیت ابھری۔ محرومیوں نے زور لیا۔ محرومیاں پوری نہ ہوں تو بے سکونی مقدر بن جاتی ہے۔

''ماں نے کوئی خط نہیں بھیجا؟'' اس نے آنکھوں میں آس لیے سوال پوچھا۔ ملازمہ نے گردن نفی میں ہلائی۔

مہر کا دل خالی ہو گیا۔ آنکھوں میں چمکتی آس ٹوٹ گئی۔ اس نے برے دل سے گلابی کارڈ کھولا۔

''اب تو جیسے ہمارے الفاظ کے یہ ذخائر بھی ختم ہونے لگے ہیں۔ سمجھ سکتی ہیں ایک مصنف کے لیے کس قدر اذیت ناک بات ہو گی، کہ جن الفاظ کے سہارے وہ سانسیں لیتا ہے وہی اس کا ساتھ چھوڑ جائیں۔ آپ ہم سے ملنے نہیں آتیں۔ اور ہم اپنی امیدیں ہارنے لگے ہیں۔ شاید خدا کو یہی منظور ہے۔ اور

ویسے بھی ہم نے شکایتیں کرنا چھوڑ دی ہیں۔ یہ تحفہ جو ہم نے بھیجا ہے، یہ اب تک کا سب سے قیمتی تحفہ ہے۔ یہ تحفہ انمول ہے۔ بہت ہی زیادہ انمول۔ آپ نے ہماری قدر نہیں کی اس پر ہمیں کوئی شکوہ نہیں، مگر یہ تحفہ جس ذات سے منسوب ہے اس کی قدر کرنا ہم سب پر فرض ہے۔"

مہر کی آنکھ کے کونے میں آنسو لڑھک گیا۔ ہتھیلی کی پشت سے آنسو رگڑا۔ نیلوفر خاموشی سے سارے مناظر کا جائزہ لیتی گئی۔

"تمہیں ایک دفعہ اپنی ماں سے مل لینا چاہیے۔ دل ہلکا ہو جائے گا۔" فرنچ آملیٹ کا لقمہ حلق میں اتارا۔

"مجھے بہت تکلیف ہو گی۔ اتنی تکلیف کہ شاید میں برداشت نہیں کر پاؤں گی۔" مہر نے خواب سی کیفیت میں جواب دیا۔

"ہر تکلیف برداشت ہو جاتی ہے، مہر۔ کبھی کبھار ہمیں دکھ بڑے لگتے ہیں۔ ہم ان سے ڈرتے ہیں، چھپتے ہیں۔ مگر یہ وہم کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ غموں سے آگے بڑھنا ممکن ہے۔ ہم سب بڑھتے ہیں۔"

سیاہ آنکھیں رنج میں ڈوبیں۔

"ڈر لگتا ہے نیلوفر۔ ان سے ملنا دنیا کا مشکل ترین کام لگتا ہے۔" اس پر رنجوری طاری ہوئی۔

"کوشش تو کرو۔ ایک قدم تو بڑھاؤ۔" نیلوفر نے نرمی سے کہا۔

مہر نے گردن سست روی سے نفی میں ہلائی۔

”اگر میرے اختیار میں ہوتا تو پلک جھپکتے ان کے پاس پہنچ جاتی۔“ سینے پر بوجھ آن وارد ہوا۔ پر تعیش لاؤنج کی فضا پر فسوں ہوئی۔

مہر نے باکس ہاتھوں میں جکڑ لیا۔ وہ مڑ گئی۔ ناشتہ ادھورا رہ گیا تھا۔ ناشتے ادھورے چھوڑ دینا اس کے لیے عام سی بات تھی۔

”آخر کیوں؟ کیا تمہیں اپنی ماں سے محبت نہیں؟“

مہر پر سکوت طاری ہوا۔ ہر طرف دنیا تھم گئی۔ اندر کہیں جذبات کے سمندر میں لہریں ابھریں۔ آنکھوں کی پتلیاں کپکپائیں۔ وہ صرف سوال نہیں تھا، وہ نقطہ تھا جس پر مہر بنتِ عبداللہ سلطان کی ساری زندگی تھم گئی تھی۔

”سمندر کی اتنی وسعت نہیں، جتنی مجھے ان سے محبت ہے۔ اتنے سالوں میں ایک دن ایسا نہیں گزرا جب ان کی یاد نہیں ستاتی۔ روز رات کو سونے سے پہلے ان کی تصویریں دیکھنا مجھ پر فرض ہے۔ مگر ہمارے درمیان ایک دیوار قائم ہے۔ وہ اتنی مضبوط ہے، اتنی اونچی ہے کہ میری محبت کافی نہیں اسے پھلانگنے کے لیے، اسے توڑنے کے لیے۔“ آواز نم تھی مگر آنکھیں صحرا کی مٹی کی مانند خشک۔ اس نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا اور کمرے میں جا کر بند ہو گئی۔

☆☆☆

وہ بستر پر بیٹھی تھی۔ گود میں سنہری ریپ میں مقید ڈبا تھا۔ آنکھوں میں تجسس جوش لے رہا تھا۔ ماں کے تحفے جب بھی آتے تھے اس کی زندگی میں مسرت گھول دیتے تھے۔ مگر وہ مسرت دائمی نہیں ہوتی تھی۔ سچ تو یہ تھا کہ مہر بنتِ عبداللہ سلطان نے ان عارضی خوشیوں کے ساتھ جینا سیکھ لیا تھا۔

اپنے ناخن کی مدد سے اس نے وہ سنہرا پیپر چیر دیا۔ تانبے کا خوبصورت ڈبا نمایاں ہوا۔ اس ڈبے کے کناروں پر خوبصورت نقش کاشت کیے گئے تھے۔ مہر کی آنکھوں کو وہ ڈبا بھایا تھا۔ وہ مدھم سا مسکرا کر ڈبے کے نقوش کو اپنی پوروں پر محسوس کرنے لگی۔

وہ ڈبا کھل چکا تھا۔ آنکھیں چھوٹی کیے اس کتاب کو دیکھے گئی۔ سیاہ سرورق والی حسین سی کتاب جس پر سنہرے حروف سے "القرآن" لکھا تھا۔ سیاہ آنکھوں میں تعجب گزرا۔ اس نے سرورق پہ ہاتھ پھیرا۔ وہ نہایت نرم و ملائم تھا۔ تعجب تفتیش میں بدلا۔

مہر نے وہ ڈبا سنگھار میز پر چھوڑ دیا۔ گلابی کارڈ ہاتھ میں دبوچتے کلازٹ کی اور چلی گئی۔ وہ سب سے اخری الماری کے سامنے چوکڑی مار کر بیٹھی۔ سامنے سے سرمئی رنگ کا بکسا نکالا۔ اس بکسے کے اندر ڈھیروں خطوط تھے۔ کچھ پرانے لگتے تھے اور کچھ نئے۔ لبوں پر آزردہ مسکراہٹ سجائے اس نے وہ کارڈ ان ہی کے درمیان چھوڑ دیا۔

وہ کوئی معمولی بکسا نہیں تھا۔ وہ مہر کی یادوں کا مخصوص حصہ تھا جن سے وہ بھاگتی تھی۔ مگر نہ ان سے چھٹکارا پا سکتی تھی، نہ انہیں مکمل طور پر قبول کیا جا سکتا تھا۔

اسے بے اختیار پرانی مہر یاد آئی۔

جو مہربان ہوا کرتی تھی۔

جو ہمدرد ہوا کرتی تھی۔

نہ جانے وہ کہاں کھو گئی تھی؟



یہ آڈیٹوریم تھا، بہر حال کسی یونی ورسٹی کا۔ محفل کا وقت سر پر تھا سو سامعین کا رش اپنی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ اسی کے ساتھ مدھر بھنبھناہٹ آڈیٹوریم کے چکر کاٹ رہی تھی۔ دفعتاً سٹیج پر عمر رسیدہ خاتون نے مائیک کے پیچھے اپنی جگہ پکڑ لی۔ اپنی موجودگی باور کروانے کے لیے مائیک پر انگلیاں تھپتھپائیں۔ رفتہ رفتہ شور چھٹنے لگا۔

’’خوش آمدید اسٹوڈنٹس۔ آپ سب کا ہمارے سالانہ اسٹوڈنٹ

انسپریشن (inspiration) پروگرام میں تشریف لانے کا شکریہ۔ مجھے اچھا لگا یہ دیکھ کر کہ ہماری نوجوان نسل کچھ نیا سیکھنے کے لیے، کچھ نیا جاننے کے لیے اس قدر پرجوش ہے۔ اسٹوڈنٹ انسپریشن کی محفل میں ہم ہمارے ملک کی جانی مانی شخصیات کو دعوت دیتے ہیں، تاکہ وہ ہمیں اپنے سفر کے بارے میں آگاہ کر سکیں۔ اور ہم ان کے سفر سے سیکھ حاصل کر سکیں۔ میں تو آج بہت ہی خوش ہوں کیونکہ آج ہماری اس محفل کو پاکستان کی سب سے بڑی میڈیکل آئکن زینت بخشنے والی ہیں۔ آپ لوگ اپنے اندازے لگاتے رہیں کہ ہماری مہمانِ خصوصی آخر ہیں کون۔‘‘

پرنسپل صاحبہ پیچھے دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئیں۔ ایک دبلے پتلے سٹوڈنٹ نے سورہ شمس کی تلاوت کی۔ اس کے جاتے ہی وہ اپنی جگہ پر لوٹ آئیں۔ تجسس اپنی انتہاء کو پہنچا ہوا تھا۔ جوان طلباء کی آنکھوں میں جوش بھرا ہوا تھا۔

”میں آج، اس اسٹیج پر جس شخصیت کو بلوانے لگی ہوں وہ میڈیکل کی دنیا کا ایک ستارہ ہیں۔ ان کے لاکھوں، بلکہ کڑوڑوں پرستار ہیں۔ انہوں نے طب کی دنیا میں ترقی کے جھنڈے اس طرح گاڑے کہ پاکستان ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں ان کے کارناموں کا چرچہ کیا جاتا ہے۔“

☆☆☆

وہ بیک سٹیج کمرے میں بیٹھی تھی۔ ملکاؤں جیسے ٹھاٹھ باٹھ تھے اس عورت کے۔ عمر پچاس کی دہائی پار کر چکی تھی۔ چہرے پر عمر کی لکیریں تھیں، البتہ خوبصورتی اس کی انمول تھی۔ اس کے عین سامنے دیوار پر شیشہ چسپاں تھا۔ وہ اپنے چہرے کا بغور جائزہ لے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کو یہ حسن بھایا تھا۔ لب مبہم سی پراسرار مسکراہٹ میں ڈھل گئے۔

☆☆☆

”وہ جنہیں ”بے خود طبیب“ بھی کہا جاتا ہے۔ وہ جو اسلام آباد کے جانے مانے ہسپتال کی مالک ہیں۔ ملک بھر میں نہ جانے کتنے ہسپتال تعمیر کروا چکی ہیں۔ ہسپتال جو معمولی نہیں، بلکہ اپنی جدیدیت کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔ جدید مشینری، جدید سہولتیں میسر ہیں۔“

☆☆☆

اس کی آنکھوں میں بے نیازی رقم تھی۔ اس نے آئینے میں عکس کو دیکھتے ہوئے لبوں پر لپ سٹک لگائی۔ پھر ڈیسک پر پڑا لوز پاؤڈر برش کی مدد سے آنکھوں کے نیچے لگایا۔ چہرے پر ہلکے میک اپ نے مزید نکھار پیدا کیا۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی سمجھ جائے کہ جوانی کے دنوں میں یہ حسن تباہیاں برپا کرتا ہو گا۔

☆☆☆

”یہ شخصیت اپنی فیاضی کی بدولت جانی جاتی ہیں۔ یہ چاہتیں تو اپنے ہسپتالوں کو امراء کے لیے مختص کر دیتیں، لیکن نہیں۔ انہوں نے اپنے ہسپتال کے دروازے ملک بھر کے غرباء کے لیے کھول رکھیں ہیں۔ یہاں جو لوگ اپنے علاج کے اخراجات نہیں اٹھاسکتے ان کو مفت علاج فراہم کیا جاتا ہے۔ نہ صرف ایک ذہین خاتون ہیں بلکہ ایک نرم دل کی مالک بھی ہیں۔“



کمرے میں نیلوفر داخل ہوئی۔ اس نے سفید شرٹ پر بغیر آستینوں والا کوٹ پہن رکھا تھا جو گھٹنوں تک آتا تھا۔ ملکاؤں جیسی شخصیت کی مالک اس عورت نے بس شیشے میں اس کا عکس دیکھا۔ اس کی ذات میں شان و شوکت تھی، ہر انداز نہایت مکرم تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کے لہو میں بادشاہوں کا خون دوڑتا ہے۔

”لیڈی اقتدار، آپ کو بلایا جا رہا ہے۔“ نیلوفر کی آنکھوں میں اس ہستی کے لیے احترام ہی احترام تھا۔

وہ سست روی سے کھڑی ہوئی۔ عمر کے باوجود اس کی گردن بھرپور اکڑی ہوئی تھی۔ اس نے نیلوفر کو دیکھتے ہوئے سر کو خم دیا۔ وہ اشارہ سمجھ کر کمرے سے رُخصت ہو گئی۔

لیڈی اقتدار نے کالی بنارسی ساڑھی پہنی ہوئی تھی جس کی آستینوں پہ سنہری بیل لگی ہوئی تھی۔ سفید بالوں کو اس نے جوڑے میں باندھا ہوا تھا۔ کانوں سے باریک آویزے لٹک رہے تھے۔ گردن پہ ہار تھا، جس پر قیمتی نایاب پتھر جڑے گئے تھے۔ چال اس قدر گرجدار تھی کہ کوئی پاس سے گزر جائے تو لمحے بھر کے لیے پتھرا جائے۔



”اب تک تو آپ سب لوگوں نے بھی انہیں پہچان لیا ہو گا۔ بھرپور تالیوں کے ساتھ استقبال کیجیے لیڈی اقتدار کا۔“ پرنسپل صاحبہ دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئیں۔

سامعین کی پرجوش تالیوں سے ہال جی اٹھا۔ بے تحاشہ قہقہے گونجے۔ لیڈی اقتدار کی آمد کا خیال ہی سب کو دیوانہ بنا رہا تھا۔

اس عورت نے بس ایک قدم ہی رکھا تھا۔ تالیوں کی آواز اپنی انتہاء کو پہنچی۔ لیڈی اقتدار کا ایک قدم لاکھوں قدموں پر بھاری تھا۔ گردن تنی ہوئی تھی البتہ نگاہیں فرش پر جمی تھیں۔ آنکھیں سرد تھیں۔ وہ مائیک کے عین پیچھے کھڑی ہوئی۔ ہاتھ اٹھانے کی دیر تھی اور سارا شور چھٹ گئی۔

”بڑے بزرگ کہا کرتے تھے کہ، جو نسل اپنے بزرگوں کی عظمت کو سراہتی ہے، ان سے نصیحت لیتی ہے، اور ان کی موجودگی کو کسی جشن کی طرح مناتی ہے، وہ نسلیں فلاح پاتی ہیں۔“ انداز اس قدر ٹھنڈا تھا کہ سننے والا برف ہو جائے۔

”اور آج اس محفل میں آپ سب کا جوش و جذبہ دیکھ کر، میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ میں مستقبل کے فاتحین کے درمیان موجود ہوں۔“ لیڈی اقتدار نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور اس کی مٹھی بنائی۔

سامعین جوش میں آکر تالیاں پیٹنے لگے۔ لیڈی اقتدار نے ہاتھ بلند کیا، آوازیں تھم گئیں۔

”میں نے زندگی سے ایک بات سیکھی ہے، انسان دنیا میں جتنا بھی اعلیٰ مقام حاصل کر لے۔ جتنی بھی ترقی کر لے، اگر اس کی ترقی اور اس کی پرواز اس کے وطن کو ہی فائدہ نہ پہنچائے تو اس کی ساری ترقی بے کار ہے۔ دنیا کے اس کارخانے میں کوئی چیز اگر اپنا کردار نہ ادا کرے تو وہ فالتو ہے، دنیا پر ایک بوجھ

ہے۔ دنیا کے کسی کونے میں کیوں نہ چلے جائیں، عظیم سے عظیم ریاستوں کی سیر کیون نہ کرلیں مگر اپنی جڑوں سے دستبردار کبھی نہ ہوں۔''

اب کی بار تالیوں کی آواز گونجی اور آپ ہی ڈھل گئی۔

''میں نے انگلینڈ میں اپنا بچپن گزارا اور جوانی بھی۔ میں نے اپنی تعلیم وہیں سے حاصل کی ہے۔ اگر میں چاہتی تو ایک بہترین طرزِ زندگی کا چناؤ کر سکتی تھی۔ مگر نہیں میں نے ایک پر سکون لائف اسٹائل کے اوپر اس جدوجہد کو ترجیح دی۔ صرف اور صرف اپنے ملک کے لیے۔ مجھے اس انتخاب پر کوئی پچھتاوا نہیں۔ جب اس ملک کے بچے، عورتیں یہ غربت میں جھلستی عوام مجھے مسکرا کر دیکھتی ہے، میرے ہاتھ چومتی ہے، مجھے دعائیں دیتی ہے، تب مجھے اپنے اس فیصلے پر فخر محسوس ہوتا ہے۔ اور یہ تو حقیقت ہے کہ انسان دل سے مطمئن تب ہی ہوتا ہے جب اس کے لوگ اس سے خوش ہوں۔''لیڈی اقتدار نے وقفہ لیا۔ اس کی باتیں کئی آنکھوں کو چمکا رہی تھیں، کئی چہروں پر مسکراہٹیں بکھیر رہی تھیں اور کئی دلوں میں نئے خوابوں کو جنم دے رہی تھیں۔

''بس آخر میں میں یہ کہنا چاہوں گی کہ، آپ لوگوں نے ہمیشہ اپنے آپ سے مخلص رہنا ہے، اور اپنے لوگوں سے مخلص رہنا ہے۔ یہ جو غرباہیں، یہ جو ضرورت مند ہیں یہ ہم سب کی ذمہ داری ہیں۔ آپ لوگوں نے اس ذمہ داری کو بھرپور طریقے سے سرانجام دینا ہے۔ اپنا خیال رکھیے گا۔ مستقبل کے قابل ڈاکٹرز سے بات کر کے مجھے بہت اچھا لگا۔''تقریر ختم کر کے لبوں پر موہوم مسکراہٹ بکھری۔ یہ مسکراہٹ بھی ان سب کے لیے کسی عنایت سے کم نہ تھی۔ شور و غل کے ساتھ طلباء نے اسے الوداع کہا، اور وہ ان سے بے نیاز بیک سٹیج روم میں پہنچی۔

وہاں نیلوفر اس کی منتظر تھی۔

”کیسی گئی تقریر۔“لبوں پر شاطر مسکراہٹ تھی۔

”خلافِ توقع، اچھا تجربہ تھا۔ تم نے مجھے قائل کر ہی لیا آخر کار۔ ورنہ پچھلے دو سالوں سے مجھے دعوت نامے بھیجے جا رہے تھے۔“ وہ نخوت سے کہتے ہوئے اس کے سامنے بیٹھی۔

”میں کہتی ہوں نا لیڈی، برائی کا بہترین پردہ اچھائی کرتی ہے۔ اپنے اعمال نامے کی حفاظت ہر انسان کو آپ کرنی ہوتی ہے۔“ اس نے ٹیک لگائی۔

لیڈی اقتدار کے چہرے پر ستائش ابھری۔

”تمھاری باتیں سن کر تمھیں اپنے ہسپتال کی نظام دینے کے فیصلے پر ناز ہوتا ہے۔ تم اسی دنیا کے لیے بنی تھی۔ کہتی تھی نا میں؟“ آنکھوں میں البیلی چمک تھی۔

نیلوفر زیرِ لب ہنس دی۔

”ملکہ کا اعتماد حاصل ہے مجھے۔ میرے لیے یہ اعزاز سے کم نہیں۔“

کمرے میں زوردار قہقہے گونجیں۔ نیلوفر اپنا پرس اٹھا کر کھڑی ہوئی۔ وہ مڑ کر دروازہ کھولنے لگی تھی۔ لیڈی اقتدار کی آواز نے اسے روک لیا۔

”مسئلے کا کیا کرنا ہے، نیلوفر؟“لہجہ سنجیدہ تھا۔ نیلوفر کے چہرے پر تناؤ حائل ہوا۔ اس نے واپسی رُخ لیڈی اقتدار کی طرف مبذول کیا۔

"ہم کچھ نہ کچھ کرلیں گے۔ ویسے بھی یہ مسئلے "اس" مسئلے سے بڑا نہیں۔" دو قدم آگے بڑھی۔ آنکھوں میں کچھ رازدارانہ ابھرا۔

"وہ مسئلہ جس کا نام لینا بھی ممنوع ہے۔" سرگوشیانہ انداز میں تنبیہ دے کر وہ چلی گئی۔

لیڈی اقتدار کسی گہری سوچ میں گم اپنے عکس کو دیکھتی گئی۔



آسمان پر بادلوں کی ٹولیوں یوں تیر رہی تھیں جیسے پانی کے تالاب پر روئے کے گولے ہوں۔ البتہ وہ برس نہیں رہے تھے۔ موسم حبس زدہ تھا۔

آج حسام کی مناج سے ملاقات کا دن تھا۔ وہ قدرے گھبرایا ہوا تھا۔ پیشانی سے پسینے کی بوندیں صاف کرتا وہ آفس میں داخل ہوا۔ پچھلے دنوں سے خود کو اس مشکل گھڑی کے لیے تیار کر رہا تھا۔ آج اسے اپنی شادی شدہ زندگی کو پرت در برت ایک اجنبی کے سامنے کھولنا تھا۔ گڑے مردے اکھاڑنے تھے، غلطیوں کا اعتراف کرنا تھا۔

وہ گردن جھکائے بیٹھا تھا۔ کسی مجرم کی طرح۔ مناج نوٹ بوک تیار کر رہی تھی۔

"جی حسام صاحب! آپ شروع سے مجھے سب کچھ بتائیے۔" نہ کوئی سلام۔ نہ دعا۔ وہ سیدھا مدعے پر آگئی تھی۔

حسام نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ اب اس کی نظر مناج کے کندھے پر پڑی پشمینہ شال پر گئی۔ اس قدر نم موسم میں کوئی شال کیوں پہنے گا؟ مناج کا کردار دن بہ دن اس کے لیے مشکوک تر بنتا جارہا تھا۔

"اگر وقت درکار ہے تو بتائیں۔ ہم کل کر سکتے ہیں۔" جواب نہ ملنے پر وہ بوجھل سے انداز میں بولی۔

حسام نے گردن جھٹکی۔

"نہیں نہیں۔ میں تیار ہوں۔" اس نے ایک سانس اندر کھینچی۔

"مہر اور میری پہلی ملاقات سات سال پہلے ہوئی تھی۔" یکبارگی سات سالہ پرانا منظر کسی فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے چلنے لگا۔

"وہ آج والی مہر کی طرح کڑوی اور تلخ نہ تھی۔ بلکہ کافی معصوم، سادہ اور زندگی سے بھرپور تھی۔ اس کی اسی سادگی نے پہلی ملاقات میں ہی میرا دل موہ لیا۔۔۔"

لبوں کو ہلکی مسکراہٹ نے چھوئے رکھا۔۔۔

ندامت کا احساس دل کو کاٹتے گیا۔۔۔

اور دماغ ان یادوں میں جی رہا تھا۔

☆☆☆

مرینا حسام کو بازو سے پکڑتے ہوئے اسے پارٹی میں گھسیٹ رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر خوشیوں کا راج تھا۔ حسام دوسری طرف کچھ بے زار تھا۔ شاید اسے یہاں زبردستی لایا گیا تھا۔

"آج عبد اللہ سلطان سے ملواؤں گی، بہت اچھے سے ملنا تم، سمجھے؟" تئیس سالہ حسام بری طرح سے الجھا۔ اس کی ماں آخر کیا کھچڑی پکا رہی تھی؟

”ہیں؟ مگر کیوں؟“ نگاہوں میں استفہام ابھرا۔

مرینا نے حسام کے اوپر ”کیا کروں میں اس کا“ والی نظر ڈالی۔ وہ غیر آرامدہ سا ہو کر نظریں چرانے لگا۔

”میں نے تمہارے لیے لڑکی دیکھ لی ہے، حسام۔ عبداللہ سلطان کی بیٹی، مہر۔ اس سے چند ہفتے پہلے میری بزنس ٹرپ پر ملاقات ہوئی تھی۔ اف بہت ہی پیاری اور معصوم سی بچی ہے۔“ وہ اپنی دھن میں بولتی گئیں۔

حسام کو دو سو چالیس والٹ کا جھٹکا لگا۔ اس نے شاکی نگاہوں سے مرینا کو دیکھا۔

”امی میں صرف تئیس سال کا ہوں!“ حسام نے چڑ کر اپنا بازو مرینا کی گرفت سے آزاد کروایا۔

”تم چپ کرو۔“ ماں نے بیٹے کو کھا جانے والی گھوری سے نوازا۔ ”جیسا میں کہتی ہوں ویسا کرتے رہنا۔ سمجھے۔“ مرینہ مشتعل لہجے میں متنبہ کرتیں اسے تقریباً بچوں کی طرح گھسیٹتے ہوئے عبداللہ سلطان سے ملوانے لے گئیں۔

اس دن حسام مہر سے پہلی مرتبہ ملا۔ اور پہلی ملاقات ہی کافی تھی اس کے لیے بہت سے فیصلے آسان بنانے کے لیے۔

مہر نے سفید شفون کا کرتا پہنا ہوا تھا۔ ہلکے سے میک اپ نے اسے کے قدرتی حسن کو نکھارا ہوا تھا۔ اس کو دیکھتے ساتھ پہلا خیال جو حسام کے ذہن میں ابھرا وہ یہی تھا کہ سفید رنگ اس پر خوب جچتا تھا۔ جس طرح دونوں کے مابین گفتگو ہوئی اسے اپنا دل سرکتے ہوئے محسوس ہوا۔ اس کی شخصیت میں کشش تھی۔ وہ نہ چاہ اس کی جانب مائل ہو رہا تھا۔

"آپ کا آگے کا کیا پلان ہے۔ آپ کی بی آرک کی ڈگری تو آپ کو مل گئی ہے۔" مہر متبسم چہرہ لیے بولی۔

اس نے نزاکت سے ماتھے پر جھولتی آوارہ لٹوں کو کان کے پیچھے کسا۔ حسام کے دل نے رفتار پکڑ لی۔ اس کی معمولی ادائیں بھی جان لیوا لگ رہی تھیں۔

"پتا نہیں۔ شاید مام کے ساتھ کام کروں۔ آپ کا کیا ارادہ ہے؟ دو سال میں آپ کی ڈگری بھی ختم ہو جائے گی۔" حسام دل کی کیفیت کو دبانے میں کامیاب ٹھہرا تھا۔

"ہاں بس تین سیمسٹر باقی ہیں۔ ڈیڈ کے کہنے پر میں نے ایم بی اے کر تو لیا، مگر مجھے نہیں پتا میں آگے کیا کروں گی۔ کیا ضروری ہے کہ ہم پڑھنے لکھنے کے بعد کچھ کریں؟ ہم آرام سے بیٹھ بھی تو سکتے ہیں ناں۔" مہر آواز میں تشویش لیے معصومانہ سے انداز میں بولی۔ حسام اس انداز پر زیر لب ہنس دیا۔

"ہاں آپ چاہیں تو آرام سے بیٹھ جائیں۔ اس میں کوئی حرج تو نہیں۔" اس نے گلاس لبوں سے لگا کر کولڈ ڈرنک کا سپ بھرا۔ "مگر پھر بھی فارغ رہ کر شاید آپ کو زندگی بور لگے۔"

"مجھے زندگی اب بھی بور ہی لگتی ہے۔ میرے ارد گرد سب لڑکیاں زندگی سے نہ جانے کیا کیا منسلک کرتی ہیں۔ اور مجھے پتا ہی نہیں میں نے کرنا کیا ہے۔" تشویش شدت اختیار کر رہی تھی۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ ابھی دو سال باقی ہیں۔ مجھے یقین ہے آپ فگر اوٹ کر لیں گی۔" پریشانی کم کرنا مقصود تھا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ لوٹ آئی۔

"کیا آپ کو ہمیشہ سے معلوم تھا آپ نے کیا کرنا ہے؟"

حسام نے سر اثبات میں ہلایا۔

"بچپن سے مجھے آرکیٹیکٹ بننے کا شوق تھا۔ میں بچپن سے آرٹ میں بہت انوالوڈ ہوں۔ میرا کینوس اور میرے برشز میری اولادوں جیسے ہیں۔"

مہر حسام کی بات پہ اتنا زور سے ہنس دی جیسے نہ جانے اس نے دنیا کا سب سے مزاحیہ لطیفہ عرض کر دیا ہو۔ حسم نے اس بات کا بالکل برا نہ منایا۔ اتنا پیارا سا انداز، بھلا کیسے برا لگ سکتا تھا؟

☆☆☆

"میں چوبیس سال کا تھا اور وہ اکیس کی جب ہماری شادی ہوئی۔"

اس نے سانس لینے کو وقفہ لیا۔ فضا بھاری ہو رہی تھی۔ سانسیں لینا دشوار تھا۔

"اتنی چھوٹی عمر میں مہر کی شادی آپ سے کیوں کروادی؟" مناج نے پیپر پہ کچھ لکھتے ہوئے پوچھا۔ "عبداللہ سلطان کی کیا مجبوری تھی؟"

"کیونکہ عبداللہ سلطان کو ہمارا رشتہ مناسب لگا۔ ان دونوں کے تعلقات بھی تلخ تھے۔ عبداللہ سلطان کو لگا کہ مہر شادی کر کے کسی دوسرے گھر جائے گی تو بہتر ہو جائے گی، سو کچھ مہینے سوچنے کے بعد انہوں نے رشتہ قبول کر لیا۔" اس نے ٹھہر ٹھہر کر مناج کو بتایا۔

مناج کو شک ہوا کہ حسام کچھ چھپا رہا تھا۔

"کیا آپ جانتے ہیں ان کے تعلقات کیوں خراب تھے؟"

اسے معلوم تھا۔ البتہ وہ مہر کے ذاتیت کو مناج کے سامنے کھولنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے سر نفی میں ہلایا۔

''ٹھیک ہے آگے بتایئے۔'' مناج نے سرسری سا کہا۔

''ہماری شادی کے بعد مہر نے اپنی پڑھائی جاری رکھی۔ وہ لاہور میں لمس میں پڑھتی تھی۔ وہ وقت بہت خوبصورت تھا۔ میں اس سے ہفتے میں کئی مرتبہ ملنے آتا تھا اور ویک اینڈز ہم ساتھ گزارتے تھے۔ ہم دونوں کے درمیان فاصلہ ضرور تھا مگر ہمارے دل بہت قریب تھے۔ شادی کے بعد مجھے مہر سے صحیح معنوں میں محبت ہوئی۔ اور میں نے اسے درحقیقت شادی کے بعد جانا۔'' آنکھوں کے سامنے دھند چھاگئی، اور اس دھند میں ماضی کے وہ رنگ برنگے منظر نمودار ہو رہے تھے۔

''آپ نے اپنی ایڈکشن مہر سے کیسے چھپائی۔''

''جب وہ یونی میں تھی تب تو یہ مشکل نہ تھا۔ مگر جب وہ گھر آئی تھی تب میں نے ڈرگ کی مقدار کم کردی جس کی وجہ سے اسے شک نہیں ہوتا تھا۔ اور پھر ایک دن میں نے بداحتیاطی کا مظاہرہ کیا اور ڈرگز کی کچھ زیادہ ہی مقدار لے لی۔۔''

☆☆☆

بالائی منزل کا کمرہ بند پڑا تھا۔ اندر جھانکو تو برہم سی مہر فون پر باتیں کرتی دکھائی دے گی۔ چہرہ سُرخ انگارہ ہو رہا تھا۔

''ڈیڈ اگر آپ نے تیسری شادی کرہی لی ہے تو اب مجھے بتانے کا فائدہ؟ مجھے کون سا فرق پڑنا تھا؟'' مہر کا انداز دھیما مگر تلخ تھا۔

”مہرو، مجھے دوبارہ شادی کرنی ہو تو میں کر سکتا ہوں۔ میں بس اطلاع دے رہا تھا مگر تمھارا ردِ عمل بہت سخت ہے۔“عبد اللہ سلطان سختی سے بولے۔

”آپ کو اپنے حقوق اچھے سے یاد ہیں۔“ مہر کی آنکھیں نم ہونے لگتی ہیں۔ ”اور میری ماں کے کیا حقوق تھے؟ ان پر بات کرنا چاہیں گے آپ؟ اس وقت تو آپ کو میری ماں سے زیادہ فلم انڈسٹری کی اداکارہ اور ماڈلز میں دلچسپی تھی نا، ڈیڈ۔“ آنکھوں سے شرارے پھوٹ رہے تھے۔

عبد اللہ سلطان سٹپٹا گئے۔

”وہ سب تو پرانی باتیں ہیں۔ آخر تم اپنی ماں کو بھولتی کیوں نہیں؟–“ وہ بحث ہارنے لگے تھے۔

”پرانی بات ہے بھی تو کون سا آپ بدل گئے؟ اب بھی ویسے ہی ہیں۔ اور جہاں تک ماں کو بھولنے کا سوال ہے، یہ میرے بس میں نہیں۔ میں ان سے کوسوں دور سہی، لیکن انہیں آج تک نہیں بھلا سکی۔“ آواز میں غصے کے ساتھ کرب اترا۔

”مہرو، ٹھنڈے دماغ سے سوچو جو میں نے جو کیا وہ غلط نہیں ہے، اگر تمہیں پہلے بتاتا تو تمہارا تب بھی یہی ردعمل ہونا تھا۔“عبد اللہ سلطان کو کوفت محسوس ہوئی۔

”جو بھی ہے ڈیڈ۔ بس آپ کا بہت شکریہ ہمیشہ کی طرح مجھے مایوس کرنے کے لیے۔“کال کاٹ دی۔

وہ کسی بھی قسم کی بحث کے موڈ میں نہیں تھی۔ غصہ اس کے اوپر بری طرح حاوی ہو رہا تھا۔ گہری سانسیں لیتے ہوئے اس نے اعصاب کو قابو کیا۔ دفعتاً دروازے پر دستک ہوئی۔ سہمی ہوئی ملازمہ اندر داخل ہوئی۔

”کیا ہوا ہے؟ کوئی مسئلہ ہے؟“ انداز قدرے نرم تھا۔

”بی بی۔ وہ حسام صاحب نیچے آئے اور گر۔۔۔۔۔“

ملازمہ نے بس اتنا ہی کہا تھا۔ مہر کے پاؤں چپلوں میں گھس گئے۔ وہ بجلی کی رفتار میں سیڑھیاں پھلانگنے لگی۔ حسام داخلی راہداری میں گرا ہوا تھا۔ مہر کے دل نے رفتار پکڑ لی۔ ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔

”ناصرہ، ایمبولینس کو بلواؤ جلدی۔“ وہ عادت کے برعکس اونچا بولی۔

مہر نے حسام کے سرہانے بیٹھ کر اس کا ہاتھ تھاما۔ اس کے حلق سے سفید جھاگ نکل رہا تھا۔

”کچھ نہیں ہو گا۔ کچھ نہیں ہو گا۔“ اس نے خود کو تسلی دی۔

☆☆☆

”ہسپتال گئے تو اسے بتایا گیا۔“ حسام کی گردن جھکتی چلی گئی۔ گناہوں کا بوجھ کندھوں کو شل کر رہا تھا۔

”کہ مجھے ڈرگ اوور ڈوز ہوا تھا۔ وہ مجھ سے ناراض رہی مگر پھر میرے وعدوں نے اسے مجھے معاف کرنے پر مجبور کر دیا۔“

پچھتاوؤں کا مارا انسان شیشے میں اپنا آپ تب تک نہیں دیکھ سکتا جب تک وہ خود کو معاف نہ کر دے۔

”وہ سمجھتی ہو گی میں نے کوشش نہیں کی۔“ حسام کے آنسوؤں نے بہنے کی ضد کی۔ آواز گیلی ہونے لگی۔

”میں نے بہت کوشش کی تھی، مس مناج۔ مہر کے لیے۔ اپنی بیٹی کے لیے۔ مگر میں کامیاب نہ ہو سکا۔“

مناج جو روانی سے لکھتی چلی جارہی تھی یکدم تھم گئی۔

”جب عنایا پیدا ہوئی تھی تب میں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح سے میں ڈر گزنہ لوں۔ کیا ہے کہ مس مناج میں ایک کمزور انسان ہوں، ایک کمزور مرد۔ میں ہمیشہ سے آخری لمحات میں ہار جایا کرتا تھا۔ مجھے میری بیٹی تک اس شر سے نہ نکال سکی۔“

اپنے غموں میں ڈوبا ہوا مرد انجان تھا اس بات کے کہ وہ کسی کے مدفن غموں کو مٹی کی دبیز تہہ سے نکال چکا تھا۔ مناج کے دل میں کسی مردہ جذبے نے جوش لیا۔ آنکھیں اداس ہوئیں۔ مگر جذبات تو اس پر حرام ہوئے تھے، پھر؟

”بابا آپ اپنی بیٹی کے لیے یہ سب چھوڑ دیں بس۔“ مناج کے دماغ میں کسی چھوٹی بچی کی شکوہ انگیز آواز گونجی۔ اس نے ایک جھٹکا کھایا اور ماضی کے سمندر سے باہر نکلی۔ لمحے بھر کے لیے اسے حیرانی ہوئی۔ پھر اپنی ذات پر غصہ آیا۔ یہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

سب کچھ پسِ پشت دھکیلتے اس نے نوٹ بوک پر قلم چلایا۔

”پھر ایک دن مہر نے تنگ آکر اپنے ڈیڈ کو کال کر دی۔ یہ سب شادی کے تین سال بعد ہوا تھا۔ اس نے بہت برداشت کیا۔ بہت صبر کیا تھا۔ وہ مجھے صحتیاب ہوتے دیکھنا چاہتی تھی۔ اور اس لیے وہ انتظار کرتی گئی، اس امید کے ساتھ کہ میں ایک دن اپنے وعدے پورے کر دوں گا۔ لیکن کاش وہ انتظار کر کے اپنا وقت ضائع نہ کرتی۔ کاش وہ پہلے دن ہی مجھے چھوڑ دیتی۔ اسے اپنی توانائی مجھ جیسے لوزر پر ضائع نہیں

کرنی چاہیے تھی۔ اس کے ڈیڈ نے اسے طلاق کا مشورہ دیا مگر وہ اس وقت نہ مانی۔ اور پھر عبداللہ سلطان نے میری امی کو سب کچھ بتا دیا۔ اور وہ دن۔۔۔" حسام کے چہرے پر خوف اترنے لگا۔

"وہ بھیانک دن مجھے آج تک یاد ہے۔"



حسام اپنے بنگلے کے ہال میں کھڑا سر جھکائے رو رہا تھا۔ مہر ذرا فاصلے پر اس کے پیچھے سر جھکائے کھڑی تھی۔ مرینا حسام کی طرف بڑھیں۔ اس کے رخساروں پر زناٹے دار چماٹا مارا۔ حسام کی روح کانپ اٹھی۔ وہ رکیں نہیں، بلکہ آگے بڑھ کر ایک اور تھپڑ دے مارا۔ حسام یہ وار جھیل نہ سکا اور زمین پر ڈھیر ہوا۔ وہ بچوں کی طرح بلک رہا تھا۔

"تم!" مرینا کی نظروں کا رخ اب مہر کی جانب ہوا۔ "کب سے جانتی ہو یہ سب تم؟" وہ شدید آگ بگولہ تھیں۔

"دو سال سے۔" مہر ہکلائی۔

اسے اپنے ڈیڈ کو شکایت کرنے پر شرمندگی محسوس ہوئی۔

"دو سال سے؟" مرینا کو زوردار جھٹکا لگا۔

انہیں اس وقت اپنے حسام اور مہر کو الگ کرنے کے فیصلے پر پچھتاوا ہو رہا تھا۔ وہ اپنا سر پکڑتے رہ گئیں۔ شدت بھرے غصے نے رُخ مہر کی جانب کیا۔

”میں اس نشئی کی ماں تھی، مہر۔ یہ سب جاننے کا پہلا حق میرا تھا۔ تم یہ سب کیسے چھپا سکتی ہو؟ “مرینہ چلائیں۔

مہر خوفزہ ہو کر مزید آنسو بہانے لگی۔ یکبارگی مرینا کو اپنے کیے پر شرمندگی محسوس ہوئی۔ وہ لڑکی ان کے بیٹے کی لت کو سالوں سے برداشت کر رہی تھی۔ اسے اس رشتے سے کتنی امیدیں وابستہ ہوں گی جو وہ آج بھی اس کے ساتھ کھڑی تھی۔

”تم حسام۔“ مرینا حسام کی طرف مڑیں۔ ”تمہاری اس لت کو میں فوراً نکالتی ہوں۔ مہر تم عنایا کے ساتھ اپنے گھر جاؤ گی۔ اور جب تک میں نہ بلاؤں تم واپس نہیں آؤ گی۔“ مرینا نے بارعب انداز میں اپنا حکم سنایا۔

جب چھوٹے نادانیاں کرتے ہیں تو بڑوں کو چارج لینا پڑتا ہے۔



”مہری چلی گئی۔“

حلق میں کانٹے پیوست ہو رہے تھے۔ آواز ہموار رکھنا مشکل تھا۔

”امی نے مجھے اسلام آباد کی ایک ریہیب میں داخلہ دلوایا۔ مگر پاکستان میں ریہیب اتنی معیاری نہ تھے۔ ڈیٹاکسی فلیکشن کے بعد ہی میں ریہیب سے بھاگ گیا۔ مجھے لگا تھا کہ میں صحتیاب ہو گیا ہوں۔ مگر میں غلط تھا۔ صرف ڈیٹاکسی فلیکشن کافی نہیں تھی۔ ایک سال بعد میں نے اپنی حسرتوں کے آگے پھر گھٹنے ٹیک دیے۔ مہر میری زندگی میں ڈرگز کے واپسی کے متعلق جان کر کم بکارہ گئی تھی۔ وہ تھک چکی تھی۔ ہار چکی تھی۔ مجھ جیسے آدمی پر کوشش کرتے کرتے۔ اس کے باوجود اس نے آخری دم تک کوشش کی۔ شاید

قدرت کو مہر پر ترس آگیا تھا۔ میں ڈرگ سمگلنگ کے کیس میں پھنس گیا اور یوں مہر کو طلاق لینے کا موقع بھی مل گیا۔ ہمارا رشتہ بس یہیں تک تھا۔"

ڈھلتی ہوئی شام کے ساتھ حسام کی کہانی اپنے اختتام کو پہنچ گئی تھی۔ مناج کے اندر کوئی ڈوریاں ہل چکی تھیں۔ اسے سینے کے گرد دباؤ محسوس ہوا۔

حسام نے گہری سانس خارج کر کے سینے سے بوجھ نکالنا چاہا۔ مگر جس بوجھ نے اس پر اپنی تسلط قائم کی ہوئی تھی وہ بڑا ڈھیٹ تھا۔ اتنی آسانی سے اس کا پیچھا چھوڑنے والا نہ تھا۔

"مس مناج۔ میں اپنی بیٹی سے ملنے کے لیے در بدر کی ٹھوکرے کھانا نہیں چاہتا۔"

کاغذات پر قلم روانی سا چلاتا ہاتھ تھمنے پر مجبور ہوا۔ اس کا بنجر ویران دل کسی نے مٹھی میں دبوچا۔

"ہاں میں نے مہر کے ساتھ انصاف کیا نہ عنایا کے ساتھ۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ یہ دوری اس کی یاد داشت سے میرا نام ونشان ہی نہ مٹا دے۔" شرم سے گردن جھکتی چلی گئی۔

وہ مناج کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ اگر دیکھ لیتا تو گنگ رہ جاتا۔

وہ اس آفس میں نہ رہی تھی۔

وہ ماضی کے سمندروں میں ایک دفعہ پھر ڈوبی۔

وہ چھوٹی سی بچی تھی۔ اس وقت وہ آنکھیں زندگی کی رونقوں سے اس قدر غافل نہ تھیں۔ گھر کے کچے پکے سے صحن میں وہ ہاتھ باندھے ہوئے تھے۔ چہرے پر ناراضگی تھی۔ سامنے کھڑا شخص اسے اپنائیت سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کی طرف جھکا۔ اس کے منہ سے بدبو اٹھ رہی تھی۔

"کیا ہوا میری مہارانی کو؟" انداز مشفق تھا۔

مناج نے اپنے چہرے کا رخ اس شخص کی طرف موڑا۔ خفگی ہنوز برقرار رہی۔

"امی آپ کی وجہ سے بہت روتی ہیں ابو!" وہ کسی بڑی خاتون کے انداز میں بولی۔ "آپ مجھے صرف ایک بات بتائیے۔ کیا آپ کو اپنی بیٹی سے پیار ہے؟" آواز میں بے بسی بھرا غصہ در آیا۔

اپنی کرسی پر بیٹھی مناج کے چہرے پر بھی وہی تاثر ابھرا۔ بے بسی بھرا غصہ۔ کرب۔ اداسی۔ وہ یادیں دل کی تاریک کوٹھیوں سے رہائی پا چکی تھیں۔ اس کا بدن جل رہا تھا۔ وہ بے اختیار نہایت مدھم آواز میں بولی:

"کیا آپ کو اپنی بیٹی سے پیار ہے؟"

حسام نے تعجب آمیز نگاہ مناج پہ ڈالی۔ یہ پہلی بار تھا جب حسام کو مناج کی آواز مشینی نہ لگی تھی۔

مناج ایک جھٹکا کھاتے ہوئے حال میں لوٹی۔ پشمینہ شال کندھوں سے سرکنی لگی۔ اس نے ترنت اسے درست کیا۔ کیا وہ کچھ بول گئی تھی؟ آج چودہ سال بعد مناج کو کسی جذبے نے گھیرا تھا۔ یہ جذبہ آخری مرتبہ اس نے اپنی ماں کے لیے محسوس کیا تھا۔

یہ جذبہ ہمدردی کا تھا۔

"بے انتہاء۔" حسام نے جواب دیا۔ مناج اب تک خود کو نارمل کر چکی تھی۔

عام گفتگو کے بعد حسام رُخصت ہو گیا۔ عرصے بعد مناج کے بوسیدہ باطن میں ہوائیں چلی تھیں۔ گرد و غبار کی موٹی تہیں اڑنے لگیں۔ یہ کیس اس کے لیے معمولی نہ رہا تھا۔ مناج نے پہلی مرتبہ کسی کیس سے اس قدر ذاتی لگاؤ محسوس کیا تھا۔ اندر ہی اندر یہ تبدیلی اسے کاٹ رہی تھی۔

☆☆☆

رات نے طوالت اختیار کی۔ بادلوں کے جم غفیر سیاہ آسمان پر جمع ہو چکے تھے۔ بادلوں کے ٹکرانے کا عمل جاری ہوا اور وہ موسلادھار بارش کی صورت برس پڑے۔

بارش کی برفیلی بوندیں کھڑکی کو بوسہ دے کر پھسل کر دیواروں میں جذب ہو جاتیں۔ وہ سٹڈی ٹیبل سے اٹھا۔ کھڑکی کھول کر منظر کا جائزہ لیا۔ گرین بیلٹ بھیگ چکی تھی۔ ہر سو ہر دم میٹھی سی خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ اس نے سانس اندر کھینچی۔ جسم میں سکون سرائیت کر گیا۔ کھڑکی بند کر کے وہ سٹڈی ٹیبل پر لوٹ آیا۔

وہاں ترجمے والا قرآن مجید رکھا ہوا تھا۔ یکبارگی موبائل بج اٹھا۔ عثمان جونیئر کالنگ۔ لبوں پر موہوم مسکراہٹ بکھری۔ دل میں آسودگی کے ساتھ کچھ چبھنے لگا۔ اس نے فون کانوں سے لگایا۔

”کیا حال ہے جمشید؟“ احمد کا انداز عام سا تھا۔

”اللہ کا شکر ہے بھائی۔ بھائی آپ کو کچھ بتانا تھا۔“ جمشید فون کی دوسری طرف سے بولا۔

احمد نے دلچسپی لیتے ہوئے گردن کو جنبش دی۔

”ہاں بولو۔“

”بھائی۔ میرا ایم کیٹ کا امتحان ہوا تھا۔ میرے بہت اچھے مارکس آئے ہیں۔ اور میرا راولپنڈی میڈیکل کالج میں ایڈمیشن ہو گیا بھائی۔“ جمشید کا لہجہ مشکور کن تھا۔

وہ خوش ہوا تھا۔ مگر پھر کوئی یاد آیا۔ اور اس کے یاد آتے ہی دل چھلنے لگا۔

”چلو یہ تو بہت اچھا ہو گیا۔ اب بھرپور محنت کرنا بس۔“ وہ مختصر باتیں کرنے پر اکتفا کرتا تھا۔

”احمد بھائی۔ میں آپ کا دل سے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کی وجہ سے میں آج اس مقام تک پہنچا ہوں۔“

احمد کی مسکراہٹ مدھم پڑی۔ اداسی دل سے ہوتے ہوئے بھوری آنکھوں میں اتر آئی۔ وہ تنہا تھا۔ نہ ہوتا تو کبھی اداسی آنکھوں میں اترنے نہ دیتا۔

”چلو کوئی نہیں۔“ احمد نے جیسے سب کچھ جھٹکنا چاہا۔

”بھائی میں نے بتانا تھا کہ اب میں اپنا خرچہ خود اٹھالوں گا۔ میں نے چھوٹا سا کام شروع کیا ہے۔ میں اپنے گھر والوں کی خود سے کفالت کرنا چاہتا ہوں۔“

احمد نے سوچتے سمجھتے سر اثبات میں ہلایا۔ معاشی خود مختاری کے لیے قدم بڑھانے میں کوئی برائی نہیں۔ کسی زمانے میں اس نے بھی اٹھائے تھے۔ تو وہ کیوں جمشید کو روکتا؟

”ٹھیک ہے جمشید۔ میں سمجھ سکتا ہوں۔ مگر پھر بھی، کوئی بھی ضرورت ہو تو میں موجود ہوں۔“ انداز حتی الوسع سرسری رکھا۔

”جی بھائی، بہت شکریہ۔“ کال کٹ گئی۔

احمد کا دل خالی ہو گیا۔ ایک دفعہ پھر دل میں چنگاریاں لگیں۔ روح دہکی۔ آنکھیں بے قرار ہوئیں۔

اس نے سر جھٹکتے توجہ مصحف کی جانب متوجہ کی۔ ورق پلٹتے اس نے سورہ رعد کھولی اور تلاوت شروع کی۔

☆☆☆

بارش کی رفتار تیز ہو رہی تھی۔ کمرے کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ مہر سٹڈی ٹیبل کے سرہانے کرسی رکھ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ بارش اسے پسند نہ تھی۔ کیونکہ بارشیں اسے ماں کی یاد دلاتی تھیں اور ماں کی یادیں تکلیف کے سوا کچھ نہ دیتیں۔ عنایا لمبی تان۔ وہ بے خبر تھی اس طوفان سے جو شہر کے اوپر برپا تھا۔ وہ بے خبر تھی اس طوفان سے جو اس کی ماں کے اندر برپا تھا۔

کاغذ اس کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ ہاتھ میں قلم تھا۔ مہر لکھنے کے لیے تیار تھی۔

"پیاری ماں،

پتا نہیں کہ یہ خط میں آپ کو پوسٹ کر بھی سکوں گی یا نہیں۔ شاید یہ ان ہی خطوط میں سے ہو گا جو کہ میں نے لکھے تو تھے مگر بھیجنے کی ہمت نہ کر سکی۔ میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ آپ میرے ساتھ ہو تیں۔ میں کاش آپ کی گود میں سر رکھ کر رو سکتی۔ ٹھیک اسی طرح جیسے بچپن میں زندگی سے بے زار ہو کر اکثر آپ کی گود میں سر رکھ کر دل کھول دیا کرتی تھی۔ اور کاش میں آپ کو بتا سکتی ماں، کہ میں کس قدر بے سکون ہوں۔ میں کس قدر بے چین ہوں۔ مجھے اپنا آپ کسی لاش جیسا معلوم ہو رہا ہے۔"

☆☆☆

اور اس اندھیری رات میں جہاں مہر اپنی بے سکونی کے ساتھ سمجھوتہ کرنے میں لگی تھی وہاں احمد اپنی اسٹڈی ٹیبل پر سر جھکائے بیٹھا اپنے خوبصورت سے مصحف کو پڑھنے میں مصروف تھا۔ اس کا دل آہستہ آہستہ ہلکا ہونے لگا تھا۔ سکون نے اس کی روح کو گھیر لیا تھا۔ قرآن کا ذکر دلوں کو سکون بخشتا ہے۔ تلاوت سے فارغ ہو کر وہ ترجمہ پڑھنے لگا۔

"ایسے ہی لوگ ہیں جنہوں نے (اس نبی کی دعوت کو) مان لیا اور ان کے دلوں کو اللہ کی یاد سے اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ خبر دار رہو! اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے"

احمد نے نظر اٹھا کر دیوار کو گھورا۔ اس کی آنکھوں میں متانت بھرا تاثر تھا۔

"اس آیت میں تطمعن کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ تطمعن جو کہ طمان سے نکلا ہے۔ اس کا مطلب اطمینان ہوتا ہے۔ مگر کوئی سادہ سا اطمینان نہیں بلکہ کامل اطمینان۔" وہ دل ہی دل میں خود کلام ہوا۔ "اور یہ آیت نہایت سبق آموز ہے۔ جو اللہ کی طرف لوٹتا ہے اسے واقعی اطمینان ملتا ہے۔ وہ اگر تنگی کا شکار ہوگا تب بھی وہ یہی سوچے گا کہ اسے یہ تنگی اللہ نے دی ہے۔ وہ تنگی کو اللہ کی مرضی جان کر خود کو مطمئن کرلے گا۔ اگر وہ بیماری میں ہو گا تو وہ اس وقت بھی دل سے مطمئن ہو گا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ بیماری اللہ نے دی ہے۔ اسلام اپنے آپ کو اللہ کے آگے جھکانے کے علاوہ آخر ہے ہی کیا؟ اللہ کے ہر احکام کے سامنے اپنے سر کو خم دینا اور اس کے ہر احکام کو بغیر کسی شکایت کے تسلیم کرلینے کے علاوہ ہے ہی کیا؟"

"اس آیت میں خاص کر نبی کی دعوت کو ماننے والوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اب یہ بات ہمیں ذرا ماضی میں جانے کی تلقین دیتی ہے۔ آخر کیا وجہ تھی جو نبی کریم ﷺ کے زمانے میں جو صحابہ اکرام تھے وہ اللہ کے اتنے قریب تھے؟

غور کرنے پر ایک بات سمجھ آتی ہے، کہ اس وقت تو قرآن بھی پورا نہیں اترا تھا۔ حضور ﷺ پہ وہی نازل ہوئی اور سورہ مدثر کی آیت میں حضور ﷺ کو حکم دیا گیا کہ وہ اسلام کا پیغام پہنچانا شروع کریں۔ اس وقت جو لوگ اسلام میں داخل ہوئے وہ اللہ کا ہر حکم جوں کے توں مان لیتے۔ اللہ نے فرمایا جنت ہے، وہ مان گئے۔ اللہ نے فرمایا دوزخ ہے وہ مان گئے۔ اگر ہم اپنا موازنہ کریں۔ ہم کہاں کھڑے ہیں؟ ہمارے پاس تو پوری کی پوری کتاب موجود ہے۔ اس کے باوجود ہم اس پر عمل کرنے سے کتراتے ہیں۔ اس کے احکامات کو سوالیہ نشان بناتے ہیں۔"

☆☆☆

ایک روح تھی جو سکون حاصل کر رہی تھی۔

دوسری روح بے سکونی کو قلم بند کرنے میں مگن تھی۔

"یہ دل مرجھا گیا ہے ماں۔ اسے دنیا میں کوئی ذوق رہا ہے نہ شوق۔ وہ رنگینیوں سے نا آشنا ہو چکا ہے۔ جس رشتے کو میں نے اپنا سب کچھ دیا وہ رشتہ نہیں چل سکا۔ جس محبت کو میں نے اپنا مستقل ساتھی مانا اس نے مجھے لات مار کر گرا دیا۔ میری زندگی مہینوں سے ایک جگہ پر رک گئی ہے۔ میرا دماغ ٹھیک سے کام نہیں کرتا۔ میں سکون کی تلاش میں ہوں، ماں۔ مجھے زندگی کی طلب ہے، ماں۔"

اس کی آنکھوں میں پانی جمع ہونے لگا۔ جہاں بادل برسے جا رہے تھے وہاں مہر کی آنکھیں بھی برسنے کے لیے تیار بیٹھی تھیں۔

آسمان میں گرجدار آواز کے ساتھ بجلی چمکی، اس کے آنسو کی رسی کھلی اور وہ بغیر آواز کے رونے لگی۔



”خبر دار رہو! اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے“

اس آیت کے دوسرے حصے پہ احمد ایک مرتبہ پھر سے غور کرنے لگا۔

”اس آیت کا دوسرا حصہ بہت دلچسپ ہے۔ اللہ کی یاد اللہ کا ذکر اگر خلوص سے کیا جائے، اور صرف اللہ کو راضی کرنے کی نیت سے کیا جائے تو اس سے زیادہ اطمینان بخش بھلا کیا ہو سکتا ہے؟ انسان سب کچھ بھولنے لگتا ہے۔ اس کے لیے دنیا ایک نقطے پر رک جاتی ہے۔ جہاں صرف وہ ہوتا ہے اور اس کا رب۔ دلوں کا سکون تو واقعی اللہ کی یاد میں ہے اور کی کتاب القرآن میں ہے۔“



آنسو رخساروں سے پھسل کر کاغذ میں ٹپکتی۔ نمکین پانی کاغذ میں جذب ہوا۔

”میری زندگی اس قدر بے معنی کب سے ہو گئی، ماں؟ اتنی بے مقصد۔ اس قدر اذیت ناک؟ کیوں میرے مقدر میں تباہی لکھی ہوئی ہے۔ دل جلتا ہے ماں۔ دل کچھ طلب کرتا ہے۔ مگر کیا؟ مجھے سمجھ نہیں آتا۔ اگر میری عنایا زندہ نہ ہوتی تو میں کب کا خود کو ختم کر چکی ہوتی۔“



بارش کی رفتار میں کمی آنے لگی۔ وہ آس پاس کے ماحول سے بیگانہ، ترجمہ پڑھنے میں مصروف تھا۔

”پھر جن لوگوں نے دعوت حق کو مانا اور نیک عمل کیے۔ وہ خوش نصیب ہیں اور ان کے لیے اچھا انجام ہے۔“

”اس آیت میں جو لفظ ان لوگوں کی خوش نصیبی بیان کر رہا ہے وہ لفظ طوبیٰ کا ہے۔ اس کا مطلب ہوتا ہے کہ ایسا جذبہ جس میں انسان کی روح کا کونا کونا پر سکون ہو جائے۔ یہ سب سے اونچے درجے کی خوشی کا نام ہے۔ یہ کیفیت ان لوگوں پر طاری ہوگی جو کہ نیک اعمال کرتے ہیں۔ اللہ کے دین کو استقامت کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ اللہ کے دین اسلام کو ماننا۔ اس کے ایک ہونے پر ایمان اور اس کے حکم کی اطاعت۔ اور یہی تو انسان کا مقصد ہے۔ خدا کی اطاعت زندگی کو نیا معنی دیتی ہے۔“



الجھنیں کاغذ کے سپرد ہو رہی تھیں۔ ہلکی ہوتی بارش کے ساتھ دل بھی ہلکا پھلکا ہو رہا تھا۔

”کتنی دوریاں آگئی ہیں ہمارے درمیان۔ جو باتیں آپ سے روبرو کہنا چاہتی ہوں وہ اس کاغذ کے سپرد کر رہی ہوں، جو کبھی آپ کو بھیجنے کی ہمت نہیں ہوگی۔ آپ کی مہر ٹوٹ چکی ہے، ماں۔ وہ بری طرح زخمی ہے۔ دنیا اسے نہیں سمجھتی۔ وہ خود بھی خود کو نہیں سمجھتی۔“

ہاتھ سے قلم چھوٹا۔ تھمتی ہوئی بارش کے ساتھ اس کے آنسو بھی تھم گئے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ بہتر محسوس کر رہی تھی یا نہیں۔ بلکہ وہ یہ تک بھول چکی تھی کہ بہتر محسوس کرنا ہوتا کیسا ہے؟ انسان اپنا آپ کھو جائے تو جذبات سے غافل ہو جاتا ہے۔

وہ کاغذ کو چھوڑ کر اپنے بستر پر لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ مگر اب یہ بے چین راتیں قسمت بن چکی تھیں جیسے۔ اور قسمت سے بھلا کون جیت سکتا ہے؟

وہ انجان تھی اس بات سے کہ اس کی تمام الجھنوں کا جواب تو اس کی سنگھار میز پر پڑے تانبے کے بکسے میں قید سیاہ سرورق والی کتاب میں موجود تھا۔



وہ آسمانی مصحف کے خزانوں سے اب تک فیضیاب ہورہا تھا۔

’انسان کی ترجیح کیا ہونی چاہیے؟ اس دنیا میں اچھے اعمال کرنا۔ خدا ان کے بدلے ہمیں روزِ محشر ایک اچھا انجام دے گا۔ یہ تو کتنا بہترین سودا ہے نا۔ بس دنیا میں اپنے نفس کے بت توڑنے ہے۔ اپنی بری عادتوں کو دان کرنا ہے۔ خلوصِ دل سے نیک اعمال کرنے ہے۔ پھر کیوں ہم دوسری چیزوں میں اپنا وقت ضائع کررہے ہیں؟ خدا کے حکم کو ماننے کے بجائے اپنی من مانیاں کررہے ہیں؟“

بارش تھم چکی تھی۔ احمد نے ذہن میں چبھتے ہوئے سوال کے ساتھ مصحف بند کیا تھا۔



آج کورٹ کی پہلی سنوائی تھی۔ آسمان صاف تھا۔ اسلام آباد کے مضافات پر پُر تپش دن لوٹ آئے تھے۔

”آخر اتنا وقت کیوں لگ رہا ہے مس مناج؟“

حسام اور مناج فیملی کورٹ کے سبزہ زار میں کھڑے تھے۔ حسام مضطرب تھا۔ البتہ وہ صحت پکڑ رہا تھا۔ مناج نے جمائی لی۔

”اب تو عادت ڈال لیجیے۔ یہ پاکستان ہے اور یہ پاکستان کا کورٹ ہے۔ یہاں کوئی چیز وقت پر نہیں ہوتی۔“ مناج اپنے ازلی مشینی انداز میں بولی۔

اس نے سفید کرتے پر سیاہ کوٹ پہن رکھا تھا۔ پشمینہ شال تہہ کر کے فائلز سمیت ہاتھ میں تھامی ہوئی تھی۔ ہمیشہ کی طرح اس کا رہن سہن لاشوں جیسا تھا۔ حسام کی نظر اس کے ہاتھ پر گول سیاہ نشان پر پڑی۔ وہ متجسس ہوا۔ مگر اس کے متعلق کچھ پوچھنے سے گریز کیا۔

"اسے دیکھ رہے ہیں؟" وہ بے زاری سے بولی۔

حسام چونکا۔ اس کی نظریں اس نشان پر ٹکی رہیں، مگر بولا کچھ نہیں۔

"میں تیرہ سال کی تھی جب میرے سوتیلے باپ نے مجھے یہاں جلایا تھا، ایک موٹی لوہے کی تار سے۔ تب سے یہ نشان میرے ساتھ ہے۔" مناج نے اپنے کندھے اچکائے۔ ایسے جیسے یہ کوئی معمولی بات ہو۔

حسام نے بے اختیار جھرجھری لی۔ اس نے کچھ تسلی بخش کہنے کو لب کھولے۔ پھر ٹھٹک کر رک گیا۔ مناج کا چہرہ عامیانہ تھا۔ آنکھیں پر سکون۔ اسے دیکھ کر لگتا نہیں تھا کہ اسے کسی دلاسے کی ضرورت تھی۔ وہ وکیل اس کے لیے معمہ بنتی جا رہی تھی۔

کچھ دیر بعد کورٹ کی کاروائی شروع کرنے کے لیے مناج اور حسام کو کورٹ روم میں بلوایا گیا۔ مہر ولید کے ساتھ دیر سے آئی تھی۔ عنایا کا کورٹ روم میں کوئی کام نہ تھا اس لیے اسے ملازمہ کے ساتھ صحن میں چھوڑا ہوا تھا۔ گارڈین کورٹ روم زیادہ بڑا نہیں تھا۔ عام کورٹ روم جیسا تو ہرگز نہ تھا۔

کمرے میں ایک بڑی سی ٹیبل تھی جس کے پیچھے جج بیٹھی ہوئی تھیں۔ گارڈین کورٹ میں عموماً جج کا عہدہ عورتیں ہی سنبھالتی تھیں۔ جج کی ٹیبل کے سامنے دو ٹیبل کچھ فاصلے سے رکھی گئی تھیں۔ ایک طرف استغاثہ (یعنی مقدمہ کورٹ میں دائر کرنے والے جنہیں انگریزی میں prosecution بھی کہا جاتا ہے۔)

اور ایک طرف مدعا علیہ (یعنی مقدمے کا دفاع کرنے والے جنھیں انگریزی میں defendant کہا جاتا ہے) بیٹھتے تھے۔ کورٹ روم میں کوئی بھی منہ اٹھا کر نہیں آ سکتا۔ فیملی کورٹ کی کاروائی رازداری میں کی جاتی ہے۔ گواہان بھی صرف گواہی دے کر چلے جاتے ہیں۔

کورٹ کی کاروائی بالآخر شروع ہو گئی۔ جج تمکنات اپنی روایتی تقریر دینے لگیں، جس میں کیس کا پورا احوال بیان کیا۔

"استغاثہ اپنا موقف پیش کریں۔" جج اپنی تقریر مکمل کر کے بولیں۔

مشینی نما عورت کھڑی ہوئی۔ ایک ہاتھ میں نوٹ بوک تھی، دوسرے میں قلم۔ وہ تیار لگتی تھی۔

"یور آنر! میں معزز عدالت سے درخواست کروں گی کہ میرے موکل کی کہانی کو ایک مرد کی کہانی کے بجائے ایک انسان کی کہانی سمجھ کر سنا جائے۔"

حسام کا دل زور و شور سے دھڑک رہا تھا۔ مہر کا حلق خشک ہونے لگا تھا۔

"وہ انسان جسے غلطیوں کا پتلا کہا جاتا ہے۔ اور میرے موکل سے بھی غلطیاں ہوئیں۔ سنگین غلطیاں۔ میرے موکل کے اوپر پچھلے سال ڈرگ سمگلنگ کا اقدام ثابت ہوا تھا۔ جس کے بعد انہیں تین سال کی سزا سنائی گئی۔ مگر طبیعت کی خرابی کی وجہ سے انہیں تین ماہ کے اندر ہی رہا کر دیا گیا۔ پانچ ماہ انہوں نے لندن میں اپنا علاج کروایا۔ کل ملا کے ہوئے آٹھ ماہ۔ میرے موکل نے پورے آٹھ ماہ اپنی بیٹی سے دوری برداشت کی ہے۔"

کورٹ روم میں مناج کی آواز کے علاوہ کوئی دوسری آواز نہیں تھی۔ مناج خاموش ہوتی تو کچھ لمحے کاٹ دار خاموشی کورٹ روم میں پھیل جاتی۔ نوٹ بوک کے صفحے پلٹتے اس نے سلسلۂ کلام جوڑا۔

''بات صرف اتنی ہے کہ میرے موکل نے جو غلطی کی تھی اس کی سزا انہوں نے بھگت لی ہے۔ ایک مجرم جب رہا ہوتا ہے تب اس کے پاس اپنی زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزارنے کا پورا حق ہوتا ہے۔ میں آپ کے سامنے ایک سادہ سوال رکھوں گی۔ کیا ایک سابقہ مجرم کے پاس یہ حق نہیں کہ اسے باقی عوام جیسے حقوق دیے جائیں؟ پھر کیوں میرے موکل کو اپنی بیٹی سے ملنے نہیں دیا گیا؟ کیوں انہیں ان کے جرم کی اب تک سزا دی جا رہی ہے؟'' مناج ٹھہری۔

مہر کے تن فن میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔ وہ گالوں کو اندر کھینچتے ہوئے دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔

''مہر بنت عبد اللہ سلطان۔'' مناج با آواز بلند بولی۔

مہر چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''مہر بنتِ عبد اللہ سلطان عنایا کو ڈیزرو نہیں کرتی، یور آنر۔ میں یہ دعوی کرتی ہوں کہ میرے موکل کا کرمنل ریکارڈ ہونے کے باوجود، اس بچی کے حق میں ان کا ساتھ ہی بہتر ہے۔ بھلا کیوں؟'' مناج نے ایک چور نظر مہر پر ڈالی۔ وہ شدید آگ بگولہ لگ رہی تھی۔

''کیونکہ مہر بنت عبد اللہ سلطان عنایا کی پرورش کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ آپ ذرا پوچھیے گا مدعا علیہ سے کہ آخر طلاق کے بعد ہی عنایا کو کیا مسئلہ ہوا تھا جو کہ اسے ایک سائیکولاجسٹ کے پاس لے جانے کی نوبت آگئی؟ صاف بات ہے، مہر بنت عبد اللہ سلطان ایک لاپرواہ ماں ہے جس سے اپنی بچی نہیں سنبھل سکتی۔ جب حسام اور مہر ایک ساتھ تھے ہم تب کا عنایا کا میڈکل ریکارڈ دیکھیں تو ایسے مسئلے اُسے کبھی درپیش نہیں ہوئے۔ یہ بھی نوٹ کیجیے یور آنر! طلاق کے بعد مہر بنتِ عبد اللہ سلطان عنایا کو کل ملا کر

پندرہ مرتبہ ڈاکٹر کے پاس لے کر جا چکی ہیں۔ تو کیا معزز عدالت ایسی ماں کو ایک معصوم بچی سونپے گی؟ ایسی ماں جو کہ شاید اپنا خیال تک ٹھیک سے نہیں رکھ سکتی۔" مناج نے بات مکمل کی اور بیٹھ گئی۔

آخری جملہ گولیوں کی طرح اس کے جسم پر لگا۔ اس کی سانسیں تیز ہونے لگیں۔

"آپ کو اس سب کے لیے تیار کیا تھا، پر سکون ہو جائیں۔" ولید سومرو نے مہر کے کان میں سرگوشی کی۔ گہری سانسیں لیتے اس نے خود کو پرسکون کرنا چاہا۔

"مدعا علیہ اپنا موقف پیش کرے۔" جج تمکنت نے کچھ دیر بعد کہا۔ ولید سومرو کے چہرے پر کھسیانی مسکراہٹ بکھری۔ اپنی داڑھی کھجاتے ہوئے وہ کھڑے ہو گئے۔

"اور معزز عدالت کو گمراہ کرنا تو جیسے مس مناج کی پرانی عادت ہے۔" ولید سومرو نے بولنا شروع کیا۔

مناج کا مشینی تاثر ہنوز برقرار رہا۔ اسے ولید کے حملوں سے جیسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

"یہ مظلوم بننے کی تکنیک، اُف یور آنر یہ بہت پرانی ہو گئی ہے۔ اب ظالم جب مظلوم بننے کی اداکاری کرتا ہے تو وہ خود سب سے بڑا بے وقوف معلوم ہوتا ہے۔ یور آنر یہ کس طرح سے حسام فاروق جیسے درندے کو فرشتہ بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ حسام فاروق کسی قسم کی ہمدردی کے لائق نہیں۔ حسام فاروق وہ درندہ ہے جو کہ اپنی بیوی کو تشدد کا نشانا بنایا کرتا تھا۔ آئے دن اُسے دھمکیاں دیا کرتا تھا۔"

مہر کی گردن میں گلٹی بننے لگی۔ یہ سب غلط تھا۔ بہت غلط۔ مگر وہ ضبط کیے سب سنتی رہی۔ حسام دوسری طرف مہر کو بے یقینی کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔

”آپ خود ہی سوچیے یور آنر، ایک پڑھی لکھی، امیر، باوقار لڑکی اپنی زندگی کے پانچ سال ایک ڈرگ ایڈکٹ کے ساتھ کیوں ضائع کرے گی؟ اس کا ایک ہی جواب ہے۔ مہر بنتِ عبداللہ سلطان کے پاس دوسرا راستہ چھوڑا ہی نہ گیا۔ میری موکل کو حسام فاروق دھمکیاں دیا کرتا تھا، قتل کی دھمکیاں جس کی وجہ سے وہ ڈر گئی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کو حسام جیسے درندے کے سپرد کر کے مرنا تک نہیں چاہتی تھی۔ کیا عدالت استغاثہ کے ہاتھوں گمراہ ہوگی یور آنر؟“ ولید سومرو نے تقریر مکمل کر کے دانت سے اپنا نچلا ہونٹ دبایا۔

مہر کا سر شرمندگی سے جھک چکا تھا۔ ولید سومرو نے اس کی سوچ سے بھی زیادہ حسام کو برا بنا کر پیش کیا تھا۔

”عدالت اب استغاثہ اور مدعا علیہ کے درمیان صلح کی کوشش کرے گی۔“ جج تمکنت نے اپنی رعبدار آواز میں کہا۔ ”بتائیں حسام صاحب۔ آپ عدالت سے کیا چاہتے ہیں۔“

”میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ مجھے میری بیٹی سے ملنے کی اجازت مل جائے۔“ وہ اب تک ان سنگین الزامات کو ہضم نہیں کر سکا تھا۔ سوبو جھل سے انداز میں بولا۔

”مہر بنتِ عبداللہ سلطان۔ کیا آپ شرط ماننے کے لیے تیار ہیں؟“

حسام مہر کو پر امید نظروں سے دیکھے گیا۔ شاید وہ نرم پڑ جائے۔ مہر کا چہرہ سرد و سپاٹ رہا۔

”نہیں یور آنر۔ میں صلح نہیں کرنا چاہتی۔“ وہ صاف گوئی سے بولی۔

حسام مایوس ہوا۔ اذیت ناک آزمائش اتنی آسانی سے ختم ہونے والی نہ تھی۔

”عدالت کو آنے والے ہفتے میں گواہان کی لسٹ جمع کروائی جائے گی۔ استغاثہ اور مدعا علیہ کورٹ کی اگلی سماعت کا انتظار کریں۔ حسام فاروق کو اپنی بیٹی سے دو گھنٹے کے لیے ملنے دیا جائے۔“ جج اٹل سے انداز میں کہہ کر اٹھ گئیں اور کمرے کے پچھلے دروازے سے وہ رُخصت ہو گئیں۔ حسام کے دل میں کھلبلی مچ گئی۔ اس نے مناج کے کان میں سرگوشی کی:

”یہ سب کیا تھا؟ انہوں نے مجھے کیا کچھ نہیں بنا دیا۔“

مناج پھیکا سا مسکرائی۔

”اور یہ تھی ان کی پہلی بڑی غلطی۔ ایک سادہ سے کیس کو پیچیدہ بنا دیا۔ مائنر کے کیسز میں عدالت ماں کے ساتھ ہوتی ہے۔ ان کو بس ہماری طرف سے اٹھائے جانے والے اقدامات کا مقابلہ کرنا چاہیے تھا۔ اب انہوں نے اپنی توانائی دو چیزوں میں صرف کرنی ہو گی۔ پہلے ہمارے الزامات کو غلط ثابت کرنا، پھر اپنے الزامات کو درست ثابت کرنے میں۔“

وہ دونوں ہم قدم ہو کر چل رہے تھے۔ مناج کے انداز میں اعتماد دیکھ کر وہ پر سکون ہونے لگا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ میں کچھ کاغذات پر دستخط کر کے آئی۔ آپ صحن میں انتظار کیجیے۔“ وہ مصروف سے انداز میں بولی۔ دھوپ ان دونوں پر پڑ رہی تھی۔

”عنایا؟“ دل کو دھڑکا سا لگا۔ مناج نے گردن اوپر نیچے ہلائی۔

”انتظار کیجیے۔ دو گھنٹے کے لیے ملنے دیا جائے گا۔ اور کوئی آپ کو روک نہیں سکتا۔“ وہ آخر میں مسکرا دی۔

اور اسی لمحے کا تو اسے بے صبری سے انتظار تھا۔ اذیت میں افاقہ ہونے والا تھا۔ حالات کی سولی چڑھتے ہوئے حسام فاروق کو بالآخر چند پل کا آرام نصیب ہونے والا تھا۔

☆☆☆

چھت سے عالی شان فانوس لٹک رہا تھا۔ کھڑکی سے آتی سنہری کرنوں کو فرش انعکاس کر رہا تھا۔ قدرتی روشنی نے اس لاؤنج کے حسن کو چار چاند لگائے گئے تھے۔

سربراہی صوفے پر لیڈی اقتدار بیٹھی تھی۔ مخملی زمرد کے رنگ کا گلاف اس کی کمر کو آرام پہنچا رہا تھا۔ ہاتھ میں چائے کی پیالی کو نزاکت سے تھاما ہوا تھا۔ سرمئی آنکھوں میں رعب و دبدبا جابجا قائم تھا۔

نیلوفر اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ آنکھیں پر سوچ تھیں۔ لاؤنج کی فضا پر اسرار تھی۔ کچھ تھا اس خاموشی میں جو برائی کا اندیشہ دیتا تھا۔

”تم جانتی ہو میں نے تمہیں کس لیے مدعو کیا ہے۔“ ملکاؤں کی طرح گردن کو جنبش دی اور چائے کی پیالی لبوں سے لگائی۔

”ہاں۔ شمس نے مجھے بتایا تھا۔“ نیلوفر کا انداز نرم تھا۔ ”البتہ میں سب کچھ آپ سے سننا چاہوں گی۔“

لیڈی اقتدار نے آہستگی سے چائے کی پیالی میز پر رکھی۔ زمرد صوفے سے ٹیک لگائی اور ٹانگ پر ٹانگ جمائی۔

"تم جانتی ہو وہ ہمارے لیے مشکلات کھڑی کر رہا ہے۔" گردن کا رُخ موڑا۔ ہاتھ گردن پر پڑی ہیرے کی مالا کو چھونے لگا۔

"اس لیے، ہم اسے مار دینا چاہتے ہیں۔" واپسی نیلوفر کو دیکھا گیا۔ سرمئی آنکھیں سفاک تھیں۔

ایک جان لینے کی بات چھڑی۔ مگر کسی کا دل نہ کانپا۔ کیا جانیں لینا ان دونوں عورتوں کے لیے اتنا آسان تھا؟

"ٹھیک ہے۔ جیسی آپ سب کی مرضی۔" نیلوفر نے محتاط سا انداز اختیار کیا۔

لیڈی اقتدار کی آنکھوں میں شاطرانہ تاثر ابھرا۔ لبوں پر ستائشی مسکراہٹ تیر گئی۔

"میں نے تمہیں یہ جواب دینے کے لیے نہیں بلایا۔ مجھے تمہاری اجازت چاہیے۔ یہ قتل تمہاری مرضی کے بغیر نہیں ہو گا۔" لیڈی اقتدار دبے دبے تمسخر سے بولی۔

ہوا کا سرسراتا جھونکا کمرے میں داخل ہوا۔ شرپسند عورتوں کے بال لہرائے۔

"میں نے سالوں پہلے ایک دوسرے مسئلے کو ختم کرنے کی ترغیب دی تھی۔ آپ کو یاد ہونا چاہیے۔ تب کسی نے نہیں سنی۔ اب میری اجازت سے کسی کو سروکار نہیں ہونا چاہیے۔" آواز میں نیم سی تلخی تھی۔

لیڈی اقتدار کی مسکراہٹ بجھ گئی۔ سرمئی آنکھوں میں سختی در آئی۔

"تم احمد کی بات کر رہی ہو؟ تم اب تک ماضی کو یاد کرتی ہو۔ احمد ایک پرانا مسئلہ ہے۔ اور اس کا اس مسئلے سے کوئی لینا دینا نہیں۔" وہ کاٹ دار لہجے میں بولیں۔

نیلوفر نے استہزاء سے گردن کو جنبش دی۔

”یہ تو وقت ہی بتائے گا وہ ہمارا کتنا پرانا مسئلہ ہے۔“ آنکھوں میں تنفر تھا۔

”تم اس سے اب تک ڈرتی ہو۔“ لیڈی اقتدار نے چوٹ کی۔

نیلوفر کے اندر ابال پیدا ہوا۔ لیڈی اقتدار واپسی مسکرائی۔ جھک کر چائے کی پیالی اٹھالی۔

”اس کی وجہ سے تمہاری گردن میرے پنجوں میں آگئی تھی۔ تم اب تک کچھ نہ بھول سکی۔ خیر تمہارا قصور نہیں، تمہیں چوٹ ہی ایسی لگی تھی۔“

نیلوفر کو تضحیک کا احساس ہوا۔ گال تمتائے۔

”درد ہوا نا؟ اس لیے جو پوچھا ہے صرف اتنا بتاؤ، نیلوفر۔ تم اس قتل میں ہمارے ساتھ ہو یا نہیں۔“ وہ مدعے پر لوٹ آئی۔

نیلوفر نے گردن جھکائے ضبط کے کڑوے گھونٹ پیے۔

”اس کو مارنے سے ہمارا مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ آپ جانتی ہیں۔“ وہ لاپرواہی سے بولی۔

”لیکن دھمکیوں کا سلسلہ رک جائے گا۔ اسے سالوں کا کاروباری ناطہ بھول چکا ہے۔ اسے ختم ہو جانا چاہیے۔ ویسے بھی میرے دربار میں بے وفائی کی سزا صرف موت ہے۔ صرف اور صرف موت!“ گردن اکڑتی چلی گئی۔ آواز سخت ہوتی گئی۔

”نیلوفر صاف صاف جواب دو۔ ہاں یا ناں۔ اگر منع کرو گی تو ہم دوسرا راستہ اختیار کر سکتے ہیں۔“ لہجہ نرم کیا۔ ”ہم سب ٹیم ہیں۔ ہمارے گھر والے بعد میں آتے ہیں۔ سب سے پہلے ہم ایک دوسرے کا سوچتے ہیں۔“

(جس کے گھر والے نہیں ہوتے وہ ایسی باتیں ہی کہتا ہے۔) نیلوفر نے دل ہی دل میں سوچا۔

”یاد رکھنا نیلوفر۔ جب تک ہماری درمیان اتحاد ہے دنیا کی کوئی طاقت ہمیں روک نہیں سکتی۔ اور جس دن ہمارے درمیان دڑاڑ پیدا ہو گئی اس دن سے ہماری تباہی یقینی ہے۔“ اس نے ٹھہر کر نیلوفر کا جائزہ لیا۔

وہ سوچ میں ڈوبی رہی۔

”اور اگر میں اب بھی کہوں کہ جیسا آپ چاہیں ویسا کریں۔ تو اس بات سے آپ کیا اخذ کریں گی؟“ آنکھوں میں مکاری اتری۔

”میں سمجھوں گی کہ تم اس قتل کے لیے رضامند نہیں۔“ کان کھڑے کیے۔ دل تھام کر نیلوفر کے جواب کا انتظار کیا۔

شاندار سے لاؤنج میں بیٹھی چھوٹی ملکہ نے بڑی ملکہ کو اپنا جواب سنایا۔

دونوں کے لب شیطانی مسکراہٹوں میں ڈھل گئے۔

☆☆☆

باب سوم: ''شناخت''

میں نے ہر قانون کی پابندی کی

میں ہمیشہ اپنی حد میں رہی

میں نے کبھی بھی وہ نہیں مانگا جو میرا نہ تھا

میں نے اپنے وقت کا صبر کے ساتھ انتظار کیا

اور جب وہ وقت آیا، اس نے اس کا نام پکارا

اب میرے اوپر یہ شدت بھری تکلیف حاوی ہے

جو میری رگوں میں دوڑتی ہے

جو میرے دماغ پر سوار ہے

میرے خیالات ایک دائرے میں چکر کاٹ رہے، کسی ریل گاڑی کی طرح

میں ایک مکمل تصویر کی طرح ہوں جس کا بس فریم ٹوٹا ہوا ہے

اور میں جانتی ہوں اس کا الزام کس کو جاتا ہے

میں نے کبھی اپنے آپ کو برا تصور نہیں کیا تھا

میں ہمیشہ سے سمجھتی تھی کہ میں ہی ملکہ بنوں گی

اور کوئی بیچ میں نہیں آئے گا

کیونکہ اگر مجھے وہ سب نہ ملا (جو میں چاہتی ہوں)

تو میں اندھیرے اور بدی کی ملکہ بن جاؤں گی

میرے کندھے پر اب ایک شیطان ہے

ٹھیک اس ہی جگہ پر جہاں فرشتہ ہوا کرتا تھا

اور وہ مجھے ملکہ پکار رہا ہے

(ڈیسینڈنٹ کی آڈری)



وہ ایک انسان تھا۔

انسان جس نے غلطیاں کیں۔

وہ خمیازہ آج تک بھگ تھا۔ نہ جانے کب تک بھگتنے والا تھا؟

صحن میں کھڑا احسام انتظار کی گھڑی اذیت میں بتا رہا تھا۔ مختصر دورانیہ اسے صدیوں جتنا طویل معلوم ہوا۔ ماضی کی ہر غلطی یاد آئی۔ وہ سب یاد آیا جو وہ کھو چکا تھا۔ وہ چاہے دعائیں کرتا، گڑ گڑاتا، بھیک مانگ لیتا، مگر جو کھو چکا تھا اب اس کی دسترس سے کوسوں دور جا چکا تھا۔

اور جو چیزیں ایک دفعہ دسترس سے چلی جائیں لوٹتی نہیں ہیں۔

حسام فاروق وہ بدبخت تھا جس نے اپنے زوال کی داستان آپ تحریر کی۔

مناج اس کے عقب میں سپاٹ تاثرات لیے کھڑی تھی۔ وہ کوٹ اتار چکی تھی۔ پشمینہ شال کندھوں پر اوڑھ لی تھی۔

تپتے ہوئے سبزہ زار میں ان دونوں کی نظر اس پر پڑی۔ معصوم بچی کا ہاتھ ملازمہ کے ہاتھ میں تھا۔ مہر جیسی سیاہ آنکھوں میں جوش و خروش بھرا ہوا تھا۔ حسام کو لگا کہ اس کی روح جسم سے پرواز کر لے گی۔ وہ پلک تک نہ جھپک سکا۔ جو آگ عرصے سے اس کے اندر پل رہی تھی، وہ عنایا کے دیدار پر ٹھنڈی پڑنے لگی۔

جذبات نے شدت اختیار کی۔ وہ گھٹنوں کے بل زمین پر جا گرا۔ جسم سے جیسے جان نکل رہی تھی۔ رگ و پے پر سکون اتر رہا تھا۔

عنایا اس کے عین سامنے کھڑی تھی۔ آنکھوں میں سوالیہ تاثر رقم تھا۔

''ڈیڈ، آپ رو کیوں رہے ہیں؟'' چھوٹی عنایا انداز میں معصومیت لیے بولی۔

معصوم بچی کے کہنے پر اسے احساس ہوا۔ ہاں، وہ رو رہا تھا۔ کچھ چیزیں ہمارے اختیار میں نہیں ہوتیں۔ حسام کے آنسو توفی الوقت اس کے اختیار میں بالکل نہ تھے۔

اور اگر تم اس وکیل کے چہرے پر غور کرو۔۔۔

تو لمحے بھر کے لیے کانپ جاؤ گے۔۔۔

ایک بار پھر سے اندر کہیں ہمدردی نے انگڑائی لی۔ عنایا سے لپٹے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے حسام کو دیکھ کر بے اختیار اسے اپنا باپ یاد آیا۔ دل ٹہنی پر جھولتی ہوئی سوکھی پتیوں کی طرح لرزا۔ آنکھ کی گہرائیوں میں رنج والم کی پرچھائی قابض ہوئی۔

رونے دھونے کی آوازیں تحلیل ہوئیں۔ صحن کا سبزہ زار قدموں کے نیچے سے سرک گیا۔ کھلا آسمان فنا ہوا۔

وہ ماضی کی جس یاد میں جی رہی تھی اس میں وہ دس سالہ لڑکی تھی۔

اور وہ وقت تھا جب زندگی کی تلخیوں نے زور پکڑنا شروع کیا تھا۔

وہ ہسپتال کے چھوٹے سے کمرے میں کھڑی تھی۔ اس کے سامنے بستر پہ پڑا، اس کے باپ کا بے ہوش وجود تھا۔ بستر کے عقب میں ایک مانیٹر لگا ہوا تھا جس میں کچھ لکیریں اس کے باپ کی نبض کے بارے میں آگاہ کرتی تھی۔ مشین سے باریک سی آواز وقفے وقفے سے جاری ہوتی۔ اس منظر سے زیادہ اذیت ناک اس لڑکی نے کچھ نہ دیکھا تھا۔ وہ بلک رہی تھی۔ دل ہی دل میں دعائیں کر رہی تھی، کہ کاش زندگی الٹی دشاء میں گھومنے لگے۔ کاش سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے۔

مگر یہ زندگی کسی کے لیے اپنے طور طریقے بدلتی نہیں ہے۔

"ابو نہ جائیں!" الفاظ اٹک اٹک کر ادا ہو رہے تھے۔

"ابو نہ جائیں!" ان کے کمزور چہرے پر اپنا ہاتھ پھیرا۔

وفعتاً بے ہوش جسم تڑپنے لگا۔ دس سالہ مناج خوفزدہ ہوئی۔ دعاؤں کے رد ہونے کی گھڑی آن پہنچی تھی۔ الوداع کہنے کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ اور اپنوں سے الوداع کہنا آسان کہاں ہوتا ہے؟

''ابو آپ نہیں جاسکتے!''

موت برحق ہے۔ وہ کسی کی آہ وبکا کو خاطر میں نہیں لاتی۔ جب وقت ہوتا ہے جھپٹ جاتی ہے بھوکے شکاری کی طرح۔

تڑپتے ہوئے وجود نے آخری ہچکی لی۔ آخری سانس حلق سے نکلی اور گویا ساری دنیا خاموش ہوگئی۔ کچھ لمحے پہلے تک جس جسم میں جان تھی وہ برفیلہ ہو چکا تھا۔

''ابو، آپ نہیں جاسکتے۔۔۔ابو، آپ نہیں جاسکتے۔۔۔ابو آپ نہیں جاسکتے۔''

''ابو آپ نہیں جاسکتے۔''کورٹ کے صحن میں موجود مناج کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

آواز اس قدر مدھم تھی اور شور اس قدر کہ کسی نے اسے نہ سنا۔ ماضی کے منظر کہر آلود ہوئے۔ وہ حال میں لوٹ آئی۔ اس کا چین غارت ہوا۔ جو تبدیلی اس کے اندر رونما ہو رہی تھی وہ اسے اندر ہی اندر مار رہی تھی۔ جذبات اس کے دشمن تھے۔ ایسا دشمن جسے وہ عرصہ پہلے خاکستر کر چکی تھی۔ پھر کیوں وہ واپس آرہے تھے؟

وہ بے ساختہ دو قدم پیچھے ہوئے۔ پھر ایک لمحے میں وہاں سے چلی گئی۔ وہ اب اس جگہ پر ایک پل بھی نہیں رک سکتی تھی۔



کمرے کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ پردوں سے چھن چھن کر دھندھلی روشنی کمرے میں مدھم زرد روشنیاں پھیلائے ہوئے تھی۔ ہر سو ہر دم سگریٹ کی کڑوی مہک بکھری ہوئی تھی۔ فضا پر سوز تھی۔

اپنے جذبات سے روٹھی ہوئی لڑکی سنگھار میز کے عین سامنے کھڑی تھی۔ وہ آگ بگولہ تھی۔ آنکھیں درشت تھیں۔ اس کے ماتھے پر نسیں بھڑک رہی تھیں۔ جبڑے کپکپا رہے تھے۔

اس نے عکس کی طرف انگلی اٹھائی۔

"تم!" اس نے چبا چبا کر کہا۔ آنکھوں میں جنون اترا۔

"تم مر چکی ہو۔ تم مر چکی ہو، مناج۔" آواز بلند ہو رہی تھی۔ دل کپکپا رہا تھا۔

کمرے کی دیواروں کو دھڑکا لگا۔ انہوں نے اپنی مالک سے منہ موڑ لیا۔

"تم اسی دن مر گئی تھی جس دن تمہاری ماں نے اپنی جان لی تھی۔ آئی سمجھ؟" وہ تقریباً چلائی۔ بال چہرے پر بکھر چکے تھے۔ آنکھیں پپوٹوں سے کود جانے کو تیار تھیں۔

وہ وحشی درندے جیسے لگتی تھی۔ آنکھوں میں شیشے میں ابھرتے ہوئے عکس سے بے پناہ نفرت پنپ رہی تھی۔

"تم کیا کر رہی ہو؟ تمہاری ہمت کیسے ہوئی کچھ محسوس کرنے کی؟" اس نے بالوں کو ہاتھوں میں جکڑ لیا۔ پوری قوت سے انہیں نوچا۔ سر میں درد بھری ٹیس ابھری۔

لب وا ہوئے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ گلہ پھاڑ کر چلا کر اپنے اندر کا سارا غبار نکال دینا چاہتی تھی۔

یکبارگی بے ترتیب سانسوں کو ترتیب ملی۔ دماغ میں ایک ابھرتے خیال نے اس کے اعصاب بحال کیے۔ اس نے پلکیں وا کیں۔ بالوں کو چھوڑا۔ نفرت، رقابت، گھن آلود نظروں سے اپنے عکس کو گھورا۔

کمرے کی ہر شے پر سکوت نے اپنی مہر ثبت کی۔ اس نے عکس کو جتاتی نظروں سے دیکھا۔ کرتے کی آستین اوپر کی۔ یہاں تک کہ پورا بازو نمایاں ہوا۔

"بہت شوق چڑھا ہے ہمدردیاں پالنے کا۔" وہ چبا چبا کر بولی۔

"تمہیں میں ابھی سبق سکھاؤں گی۔" متنبہ کیا۔

اس نے دراز سے سگریٹ اور لائیٹر نکالا۔ سگریٹ کا کونا لائیٹر کی مدد سے دہکایا۔ کڑواہٹ سارے کمرے میں گھلی۔ مگر اس نے سگریٹ کا دوسرا کونا لبوں سے لگا کر کش نہ بھرا۔ نہ جانے کیوں؟

سگریٹ اس کے بازو کی طرف بڑھ رہی تھی۔ دل چیخ رہا تھا۔ چلا رہا تھا۔ مزاحمت کر رہا تھا۔ مگر وہ بے دردی، بے رحمی اور سفاکی سے دل کی صداؤں کا گلہ گھونٹ کر سگریٹ بازو کے قریب کیے گئی۔

سلگتے ہوئے کونے نے اس کے بازو کو چھوا۔ بازو پر مرچیں لگیں۔ تکلیف شدت اختیار کرنے لگی۔ اس نے کستی سے سگریٹ بازو پر گاڑے رکھی۔ آنکھیں بند کر لیں، اور تکلیف کو روح کی گہرائیوں میں اتارا۔

"جذبات تم پر حرام ہیں۔" وہ چبا چبا کر بولی۔

دیواریں یاسیت سے اس لڑکی کو خود پر ظلم کرتے دیکھتی گئیں۔ وہ بھی تھک چکی تھیں۔ نہ جانے ظلم کی یہ داستان مزید کتنی مرتبہ دہرائی جانی تھی؟



بادلوں کی آمدورفت کے باعث موسم کافی خوشگوار تھا۔ اسلام آباد کے باشندے اس خوشگواری کا فائدہ اٹھاتے صبح سویرے سڑکوں پر چہل قدمی کرتے دکھیں گے۔

مگر یہ خوشگوار صبح سب کے لیے یکساں نہ تھی۔

سورج طلوع ہونے کی دیر تھی اور عبداللہ سلطان کے قصر کے اندر افراتفری پھیل گئی۔ لاؤنج سے چیخنے چلانے کی آوازیں نکل کر پورے قصر کا دورہ کر رہی تھیں۔

تلملائی ہوئی عنایا سربراہی صوفے کے ساتھ کھڑی تھی۔ مشتعل آنکھوں سے وہ اپنی ماں کو دیکھے گئی۔

"آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں، عنایا۔" مہر نے نرمی اختیار کی۔ دروازے پر کھڑی نیلوفر نے پر فسوں سانس خارج کی۔

"آپ نے مجھے ڈیڈ سے کیوں نہیں ملنے دیا، مام!" عنایا حلق کے بل چلائی۔ اس کا جسم لرز رہا تھا۔

مہر کے دل میں سوزش پیدا ہوئی۔ اس کے بدترین خدشات سچ کا روپ اختیار کر رہے تھے۔ عنایا کے اینگر ایشوز لوٹ رہے تھے۔

"عنایا میری جان۔" مہر نے ایک قدم آگے بڑھایا۔

"اسکول کا وقت ہے، تیار ہو جائیں۔" جبراً مسکراتے ہوئے اسے قائل کرنا چاہا۔

عنایا کے اوپر مہر کی نرمی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کا غصہ آخری سطح کو چھو رہا تھا۔ اس کا انگ انگ غصے میں بے طرح ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ ہوا میں بلند کیے۔ مٹھی بنائی، لب بھینچے اور باقاعدگی سے کپکپائی۔ مگر یہ اشتعال ٹھنڈا ہونے کا نام ہی نہ لیتا۔ اگلے لمحے عنایا نے میز پر پڑا شیشے کا گلدان اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ کرچیاں سارے لاؤنج میں پھیل گئیں۔ اب کہ چھوٹی بچی کے غصے کو راحت ملنے لگی۔ چہرے سے سُرخی زائل ہوئی۔

مہر حواس باختہ سی ہو کر عنایا کی طرف دوڑی۔ ننگے پیروں میں کانچ کے ٹکرے چبھے۔ خون رسا۔ مگر وہ اس سب کی پرواہ کیے بغیر عنایا کا تفصیلی معائنہ کرنے لگی۔ اس کے جسم کو کسی بھی طرح کی خراش سے پاک پا کر اس نے سکھ کا سانس لیا اور ڈھیلی ہو کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

"نادیہ، عنایا کو لے کر جائیں۔" مہر نے بلند آواز میں کہا۔ ملازمہ حکم بجا لیتے عنایا کو گود میں پکڑ کر لے گئی۔

مہر نے جھک کر اپنے پاؤں کو دیکھا۔ خون رس کر ٹائیلز پر ٹپک رہا تھا۔

"فکر نہ کرو، میں فرسٹ ایڈ لے کر آتی ہوں۔" نیلوفر مصروف سے انداز میں کہتے ہوئے لاؤنج سے نکلی اور فرسٹ ایڈ کے ساتھ ہی لوٹی۔

"مجھے یقین ہے سب ٹھیک ہو جائے گا۔" نیلوفر نے پٹی کرتے ہوئے دلاسہ دینا چاہا۔

مہر گہرے صدمے میں تھی۔ جس آفت سے وہ خود کو بری سمجھ رہی تھی وہ لوٹ آئی تھی۔ اور اس کے تجربات کہتے تھے کہ لوٹی ہوئی آفتیں زیادہ خطرناک ہوتی ہیں۔

"عنایا کے اینگر ایشوز ٹرگر ہونے لگے ہیں۔" وہ ہارے ہوئے انداز میں بولی۔

''سب کتنا اچھا چل رہا تھا، لیکن پھر وہ آگیا۔'' مہر کی آنکھوں میں بے بسی اترنے لگی۔ ''وہ آخر کیوں آگیا نیلوفر؟''

نیلوفر نے نظریں جھکا لیں۔ اس کا پٹی کرتا ہاتھ کچھ لمحے کے لیے سست ہوا۔ سر جھٹکتے نیلوفر نے بات جاری رکھی۔

''فی الحال، تم عنایا کا اپائمنٹ لو، مہر۔ اینگر ایشوز شدید ہونے سے قبل ان کو روک لو۔'' نیلوفر نے موضوع بدلنا چاہا۔

مہر نے کچھ سوچتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا۔ علاوہ ازیں کوئی راستہ نہ بچا تھا۔

☆☆☆

گاڑی پارک ہو چکی تھی۔ سیاہ آنکھوں میں آفس کی عمارت کو دیکھتے ہوئے سہم ابھری۔ ذہن عنایا کی وجہ سے بے طرح الجھا ہوا تھا۔ مگر یہ نیلوفر کی ترغیب تھی کہ اسے دھیان بھٹکانے کے لیے آفس جانا چاہیے سو نکل آئی۔ اس نے گاڑی سے قدم باہر نکالا۔ دروازہ بند کیا۔

یکبارگی بادلوں کے ٹکرانے کا عمل جاری ہوا۔ اس سے پہلے وہ گاڑی کے اندر جاتی تیز بارش شروع ہو گئی۔ آس پاس چلتے لوگوں نے چھتریاں کھول لیں اور شیڈز کی طرف دوڑنے لگے۔

''اوہ نو!'' وہ زیر لب بڑبڑائی۔ وہ تو چھتری لانا ہی بھول گئی تھی۔ اس کے چہرے پر کوفت ابھری۔ کیا دن اور بھی بگڑ سکتا تھا؟ اس نے پیشانی مسلتے گردن جھکائی۔ بارش بالوں پر برستے گردن پر پھسل رہی تھی۔

یکدم بارش رکنا بند ہو گئی۔ وہ چونکی۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ سیاہ چھتری پانی سے اس کی حفاظت کر رہی تھی۔ دم بھر وہ حیران ہوئی۔ اس نے روبرو کھڑے اس مرد کو دیکھا۔ وہ چھتری تھامے اسے سایہ فراہم کر رہا تھا۔ خود وہ بارش میں پور پور بھیگ چکا تھا۔ سیاہ کوٹ پینٹ میں سے پانی رس رہا تھا۔ بال ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے۔

”آج شدید بارش کی پیش گوئی تھی۔ آپ چھتری لانا بھول گئیں؟“ وہ احمد یوسف تھا۔

وہ دم بخود رہ گئی اور لمحے بھر اسے دیکھے گئی۔ اس کی آنکھیں بھوری تھیں اور کنارے سے گہری بھوری۔

”مجھے زندگی کی خبر نہیں، موسم کی خبر کیونکر ہو گی؟“ بولی کچھ نہیں۔ بس اسے دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں سوچا۔

چند ثانیے بھوری اور سیاہ آنکھیں ایک رہیں۔ ہر طرف ٹھہراؤ پھیلنے لگا۔ اسے بارش میں بھیگتے ہوئے ادیکھ کر وہ شرمندہ ہونے لگی۔

وہ چھتری سے اس کی حفاظت کرتے ہوئے عمارت تک لے جانے لگا۔

”آپ خواہ مخواہ میری وجہ سے بھیگ گئے۔ چھتری میں بھولی تھی۔ سزا مجھے بھگتنی تھی۔“ چہرے پر سختی حائل تھی۔

وہ سر جھکائے زیر لب ہنسا۔

”فکر نہ کریں۔ مجھے بارش پسند ہے۔ البتہ آپ کو شاید بارشیں پسند نہیں۔“

اب کی بار وہ چونکی۔ بھنویں سکیڑتے اسے گھورا۔

”آپ کو کیسے پتا چلا؟“ اس مرد کا جائزہ لیا۔

اسے دیکھ کر ذہن میں بس ایک لفظ ابھرتا تھا: ”سادگی“

وہ آدمی سادگی کا پرتو تھا۔

”مجھے چہرے پڑھنے آتے ہیں۔“

اسی اثناء میں وہ عمارت کے دروازے تک پہنچ گئے۔ مہر نے اسے ممنوع نظروں سے دیکھا۔

”بارش رک جانے کا انتظار کر لیں۔“ اس نے بے جان آنکھوں کے سنگ تجویز پیش کی۔

”میں نے کہا نا۔ مجھے بارشیں پسند ہیں۔“ وہ شخص گردن جھکائے بولا۔

مہر نے بس سر کو ہلکی سی جنبش دی۔ وہ مڑنے لگی، مگر احمد کی آواز نے اسے روک دیا۔

”کیا میں آپ سے کچھ کہہ سکتا ہوں؟“ بھوری آنکھوں میں سنجیدگی اتری۔

مہر نے سر اثبات میں ہلایا۔

”خود کو مضبوط کر لیں۔ جلد حالات آپ کی مضبوطی آزمائیں گے۔“

یکبارگی مہر کے رونگٹے کھڑے ہوئے۔ اس مددگار مرد کا خاکہ مشکوک ہوا۔

”کیا مطلب؟“ وہ الجھی۔

وہ دو قدم پیچھے بڑھا۔ لبوں پر مخفی مسکراہٹ سجی۔

”آپ کی جان کو خطرہ ہے، مہر۔“ آواز مدھم، سرد اور سرگوشی نما تھی۔

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نے اس کا جسم سرسرایا۔ وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

”آپ کے بہت طاقتور دشمن ہیں۔ جو کسی بھی وقت آپ پر جھپٹنا چاہیں گے۔ مشکل وقت آنے والے ہیں۔“ اور وہ قدم پیچھے بڑھاتا گیا۔

مہر کے الفاظ ڈگمگ ہونے لگے۔ وہ اتنے یقین کے ساتھ یہ سب کیسے کہہ سکتا تھا؟

”رکیں! رکیں!“ وہ بولی۔

وہ شخص جو تحفظ کے احساس کے ساتھ اس سے ملنے آیا تھا ایک معمہ بن کر اس کی پکار کو ان سنی کیے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

مناج اپنے کمرے میں بے خبر سو رہی تھی۔ یکبارگی الارم کی آواز نے اسے بیدار کیا۔

غیر حاضر طور پر اس نے سائیڈ ٹیبل پر ہاتھ مارا۔ موبائل سے ہاتھ ٹکرایا۔ اس نے مڑ کر وقت دیکھا۔ صبح کے نو بج رہے تھے۔ وہ پلکیں موندتے اٹھ بیٹھی۔ بازو پر اب بھی مرچیں لگ رہی تھیں۔ اس نے سر ہاتھوں میں گرایا۔

اس دفعہ تو سزا بھی کارآمد ثابت نہ ہوئی۔ ذہن کے پردے پر بار بار حسام کا خاکہ اترتا۔ روتا ہوا حسام۔ اپنی بچی سے لپٹا ہوا۔ اسے بارہا ہمدردی محسوس ہوتی۔ مگر دماغ ان جذبات نامی بلا کی نفی کر دیتا۔

تھک ہار کر اس نے یہ کیس یہیں پر چھوڑنے کا ارادہ باندھ لیا۔ وہ حسام کو کوئی بھی وجہ بتا دے گی اور نیا وکیل ریفر کر لے گی۔ اگلے لمحے وہ فون پر حسام کا نمبر ملا رہی تھی۔ حسام نے کال اٹھائی تو وہ فوراً بول اٹھی:

”حسام۔ میں نے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“ وہ جیسے عجلت میں تھی۔

”جی مس مناج ضرور۔ میں نے آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا۔ اس دن آپ بغیر بتائے چلی گئیں اس لیے کچھ کہہ نہ سکا۔“ حسام کا انداز تشکر آمیز تھا۔

مناج کی آنکھوں میں سائے گزرے۔ کچھ دیر پہلے جو کام آسان لگ رہا تھا اب دنیا کا سب سے مشکل کام معلوم ہو رہا تھا۔

”میں بتا بھی نہیں سکتا میں نے پچھلے چند مہینے کس اذیت میں گزارے ہیں۔ کل جا کر میری بے چینی نے دم توڑا تھا۔ امی ٹھیک کہتی ہیں، آپ ایک بہترین وکیل ہیں۔“

مناج مجسم ہوئی۔ چہرے پر کراہٹ ابھری۔ وہ انکار تو کر دیتی۔ لیکن کوئی اور وکیل اس کا کیس سنجیدگی سے نہ لے تو؟ ذہن کے پردوں پر بارہا اپنے باپ کا چہرہ اترتا۔ اس نے ہاتھوں سے پیشانی کو چھوا۔

”آپ بتائیں۔ کیا کہنا تھا آپ کو؟“

مناج کو اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ وہ ایسی تو نہ تھی۔ وہ تو بے حس تھی۔ اپنی بے حسی پر فخر کرتی تھی۔ یہ کیا ہو رہا تھا؟

"میں کہہ رہی تھی کہ۔" ایک سانس اندر کھینچی۔ اور ایک باہر۔ ارادہ کیا کہ اب انکار کر کے ہی دم لے گی۔

"ہم آؤٹ آف کورٹ سیٹلمنٹ کر لیتے ہیں۔" وہ ناکام ٹھہری۔

اس نے بے بسی کے مارے آنکھیں میچیں اور پیشانی مسلی۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے؟" حسام کی آواز میں حیرت عیاں تھی۔ دل میں لڈو پھوٹنے لگے۔

"کیوں نہیں۔ میں مہر سے بات کروں گی۔ اسے ہمارے ساتھ ٹیبل پر بیٹھنے پر آمادہ کروں گی۔ مل جل کر باہمی رضامندی کے ساتھ ہم معاملات سلجھا سکتے ہیں۔"

اب اسے یہ ترغیب اتنی بری بھی نہ لگی۔ وہ جلد از جلد آؤٹ آف کورٹ سیٹلمنٹ کروائے گی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کیس سے دستبردار ہو جائے گی۔

"مس مناج۔ آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے۔ ٹھیک ہے۔ ہم ایسا بھی کر کے دیکھ لیتے ہیں۔"

معمول کی گفتگو کے بعد مناج نے کال کاٹ دی۔ چہرے پر تناؤ پھیلا۔ اس نے گردن موڑ کر آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔ آنکھوں آنکھ خود سے شکوہ کیا۔

"یہ تمہارے ساتھ کیا ہو رہا، مناج؟" اس نے سر ہاتھوں میں گرایا اور زیر لب بڑبڑائی۔

ایسا لگتا تھا جیسے کوئی نوکیلے شے دماغ میں لکیریں کھینچ رہی ہو۔ ہر طرف نہ جانے کون کون سے خیالات بکھرے ہوئے تھے۔



مدھم زرد روشنیاں سارے میں بکھری ہوئی تھیں۔ شیشے کی دیواروں سے سیاہ آسمان نظر آرہا تھا۔ سبزہ زار قصر کی روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ مہر کسی کتاب میں سر کیے بیٹھی تھی۔ نیلوفر ہرے نائیٹ گاؤن میں ملبوس اس کے سامنے بیٹھی۔

''عنایا کیسی ہے؟''

مہر نے کتاب بند کر کے گود میں رکھی۔ چہرہ تکان زدہ تھا۔

''بہت مشکلوں سے سلایا ہے۔ کل ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا ہے۔'' خفگی سے سانس خارج کی۔

نیلوفر نے کچھ دیر کے لیے چپ سادھ لی۔ آنکھیں پر سوچ ہوئیں۔

''مہر۔ تم برا مان جاتی ہو جب ہم تمہیں سمجھاتے ہیں۔ مگر اس سب سے بچا جا سکتا ہے۔''

مہر نے لب وا کیے۔ وہ اس قدر بوجھل تھی کہ نیلوفر کی بات پر کچھ بھی محسوس کرنے سے قاصر تھی۔

''پلیز نیلوفر۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔'' اس نے ہاتھ سے پیشانی کو چھوا۔

''یہ بحث اوائڈ کرنے سے معاملہ سلجھے گا نہیں۔ مہر وہ بیٹی ہے تمہاری۔ اولادوں کے لیے انا کو مارنا پڑتا ہے۔ چھوڑ دو ضد۔'' نیلوفر سنجیدگی سے بولی۔

مہر نے گردن نفی میں ہلائی۔

"حسام کی سزا اتنی چھوٹی نہیں ہو سکتی۔ اس نے میرے سال ضائع کیے۔ میں اس سے حساب بھی نہیں لے سکتی؟" وہ ٹھہر ٹھہر کر بولی۔

"کہیں حسام کو سزا دینے کے چکر میں تمہیں اپنی بیٹی کو ہی سزا نہ دے بیٹھو، ان چیزوں کے لیے جس میں اس کوئی قصور نہیں۔"

مہر نے آنکھیں گھماتے ہوئے سرد سانس خارج کی۔

"کبھی کبھار اپنی اولاد کے لیے کڑوے گھونٹ پینے پڑتے ہیں۔" نیلوفر جان گئی تھی کہ مہر کے اوپر اس کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

مہر نے کچھ کہنے کو لب کھولے۔ یکبارگی موبائل تھرتھرایا۔ ان نون نمبر سے کال موصول ہو رہی تھی۔ اس نے فون کانوں سے لگایا۔

"ہیلو مہر۔ کیسی ہو۔ رات کو کال کی اس کے لیے معذرت۔"

مہر آنکھوں میں تفتیش لیے اٹھ کر بیٹھی۔

"کون بات کر رہا ہے؟" لہجہ حتی الوسع پر سکون رکھا۔

"اتنی جلدی بھول گئی؟"

مہر کو دھڑکا سا لگا۔ یہ مشینی انداز، یہ تیور اسے شناسا معلوم ہوئے۔ وہ غصے سے بھڑک اٹھی۔

"حسام کی وکیل۔ آپ کو میرا نمبر کیسے ملا؟" وہ کھڑی ہوئی۔ بالوں کو پیچھے کسا۔ نیلوفر اشتیاق سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''آپ فارغ کب ہوں گی۔ کیا ہم کبھی مل سکتے ہیں؟'' مہر کا سوال نظر انداز کیا گیا۔

اس کے لاپرواہ سے انداز پر مہر کا خون سیدھا کھوپڑی میں پہنچا۔

''آپ اس خوش فہمی میں کیوں مبتلا ہیں کہ میں آپ سے ملنے میں دلچسپی رکھتی ہوں؟'' اس نے طیش میں کہا۔

''گڈ۔ پھر میں خود کسی دن آجاؤں گی۔'' مناج سرسری سا جواب دیا۔

وہ عورت مہر کو بڑی ڈھیٹ معلوم ہوئی۔

''جرات بھی مت کرنا۔'' اب مہر سے برداشت نہ ہوا۔ وہ برس پڑی۔

''تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے بارے میں اناب شناب کہہ کر مجھ سے ملنے کی درخواست کرنے کی؟''

نیلوفر پر حیرت کا گزر ہوا۔ کم ہی ہوتا تھا کہ مہر کسی سے اس طرح بات کرے۔

''وہ تو میری جاب کا حصہ ہے۔ جس طرح تمہارے وکیل نے میرے موکل کو برا بھلا کہا۔ ٹھیک اسی طرح میں نے بھی کہہ دیا۔ کورٹ کچہری میں یہی سب ہوتا ہے۔'' شانِ بے نیازی تھی اس کے انداز میں۔

''میں تم سے نہیں ملوں گی۔''

''ہمارا ملنا ضروری ہے۔ تمہاری بیٹی کے مستقبل کا سوال ہے۔''

''بڑی ڈھیٹ ہو تم۔'' چبا چبا کر کہتے کال کاٹ دی۔

مہر کے اعصاب بھاری ہو چکے تھے۔ وہ نا محسوس انداز میں پیر پٹختے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

دوسری طرف مناج کے کمرے کی تمام بتتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ کھڑکے کے ذریعے چاند کی سفید کرنیں مدھم روشنی بکھرے ہوئے تھیں۔

وہ کراؤن سے ٹیک لگائے پر سکون سی بیٹھی تھی۔ کمرے میں دھند پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے لبوں سے سگریٹ لگائی۔ آنکھیں بند کر کے کش اندر لیا اور لبوں کی سمت سے ڈھیر سارا دھواں باہر نکالا۔

''دیکھتے ہیں کیسے نہیں ملتی تم مجھ سے۔'' دماغ میں سکون اترا۔ حلق کڑوا ہوا۔

اس نے کندھے اچکا کر ایک اور کش بھرا۔

مہر نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ مناج طارق ڈھیٹوں کی سردار تھی۔

☆☆☆

دِرفشاں کا کلینک ایک غیر آباد علاقے میں واقع تھا۔ آبادی نہ ہونے کی صورت میں آب و ہوا صاف ستھری تھی۔ قدرتی حسن کے باعث نہ صرف عنایا بلکہ مہر بھی کافی پر سکون محسوس کرتی تھی۔

وٹینگ روم میں دِرفشاں کی اسسٹنٹ بیٹھی تھیں۔ ان کا نام نورے تھا۔ عنایا انہیں دیکھتے ہی اچھلتے کودتے ان کی گود میں بیٹھ گئی۔ عنایا سے گلے ملتے ہوئے انہوں نے ایک نظر مہر کو دیکھا۔

''ڈاکٹر آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔''

مہر سر اثبات میں ہلاتے ہوئے درِفشاں کے آفس میں چلی گئی۔

درِفشاں کے کمرے میں ہر چیز ترتیب سے رکھی گئی تھی۔ اس کی کرسی کے پیچھے گلاس وال تھی، جہاں سے خوبصورت منظر دیکھنے کو ملتا تھا۔ اس نے مہر کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ چہرے پر مودب تاثر سجایا۔

"مہر۔" مخملی بال ڈھیلی ڈھالی پونی میں بندھے تھے۔ اس نے بھوری چیکس والی شرٹ کے ساتھ جینز کی سکرٹ پہنی ہوئی تھی۔ آستینیں کہنیوں تک موڑی ہوئی تھیں۔ بازو بھرے بھرائے تھے۔

"میں صاف بات کروں گی۔" درے کی سنجیدگی مہر کو مضطرب کر گئی۔ "جہاں تک تم نے مجھے بتایا تھا، عنایا کے اینگر ایشوز تمہارے ایکس کی واپسی پر ٹرگر ہوئے۔" اس نے گلاسز اتار کر میز پر رکھے۔

"کیا کوئی مجبوری ہے جو تم اسے اپنے ایکس سے ملنے نہیں دے سکتی؟ آئی مین، اگر وہ خطرناک ہے تم نگرانی میں ملاقات کروا سکتی ہو۔" اس نے ٹھہر ٹھہر کر بات کی۔ ساتھ ساتھ مہر کے تاثرات کا بغور جائزہ لیا۔

"نہیں نہیں۔ خطرے کی کوئی بات نہیں۔" اس نے گردن نفی میں ہلائی۔ "بس عنایا کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ حسام سے دور رہے۔"

درے فشاں نے مایوسی سے سانس خارج کرتے کرسی سے ٹیک لگائی۔

"پھر میں تمہیں اس سب کے نتائج سے آگاہ کرنا اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ عنایا کے حق میں فیصلہ لینا، بہر حال تمہارا کام ہے۔" درے کی ہلکی بھوری آنکھوں کی چمک دم توڑنے لگی۔

"میں نے ایسے بہت کیسز دیکھے ہیں۔ ماں بچے کو باپ سے ملنے نہیں دیتی تو کبھی باپ ماں سے۔ ہو سکتا ہے تمہاری وجوحات اپنی جگہ برحق ہوں۔ مگر تمہیں ایک دفعہ عنایا کی ذہنی صحت کو مدِ نظر رکھنا ہو گا۔" درفشاں نے توقف لیا۔

مہر کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے۔

"پی اے ایس، یعنی parent alienation syndrome۔ یہ طلاق یافتہ جوڑوں کے بچوں میں بہت عام ہوتا ہے۔"

مہر کو جھٹکا لگا۔ الجھن اپنا دم توڑ گئی۔

"اس کورٹ کے اسٹرکچر کو سمجھو ذرا۔ تمہارا ایکس یہ کیس روکنے نہیں والا۔ اور کم سے کم بھی ہر ماہ ایک ٹرائل ہونی ہے، جس میں دو گھنٹے کے لیے عنایا کو تمہارے ایکس سے ملنے دیا جائے گا۔ یہ سب عنایا کی ذہنی صحت کو بری طرح خراب کر سکتا ہے۔"

وہ الفاظ عنایا کے لیے کہے گئے تھے۔ مگر مہر کی زندگی میں پزل کے ٹکڑوں کی طرح فٹ ہو رہے تھے۔

"یہ ابھی صرف اینگر ایشوز سے شروع ہوا ہے۔ میں اس سے بات چیت کر کے ان کا حل نکال لوں گی، مگر یہ حل عارضی ہے۔ یہ ٹرائلز کم سے کم بھی تین سال چلیں گی۔ اس دوران میں ہر ماہ عنایا تمہارے ایکس سے ملے گی۔ وہ اسے بھولتی جائے گی مگر ٹھیک سے کبھی بھولے گی نہیں۔ پی اے ایس میں یہی ہوتا ہے۔ آپ اپنے اس کھوئے ہوئے پیرنٹ سے انجان ہونے لگتے ہو۔ مکمل بھولتے کبھی بھی نہیں نہ ہی محبت میں کمی آتی۔ وسیع فاصلہ بچے اور پیرنٹ کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ یہ اینگر ایشوز، انزائیٹی

(anxiety) کی صورت میں بھی لوٹ سکتے ہیں اور خدانخواستہ ڈیپریشن بھی۔ تم سمجھ رہی ہو میں کیا کہہ رہی ہوں؟"

مہر دنیاومافیہا سے بیگانہ ہو گئی۔ اسے اپنا بچپن یاد آیا۔ آنکھ کے کنارے سے آنسو ٹوٹا۔

"میں کیسے نہیں سمجھ سکتی۔" وہ خواب سی کیفیت میں بولی۔ "میرے ساتھ بھی یہی ہوا تھا، درِ فشاں۔" آنکھوں کی محویت چھٹنے لگی۔

"میں نے کئی تکلیف دہ راتیں کاٹی ہیں۔ اور اس کورٹ کچہری کی وجہ سے اپنی ماں سے کوسوں دور ہو گئی ہوں۔ دل میں محبت بے انتہاء ہے مگر ان سے ملنے کی ہمت نہیں۔" لبوں پر زخمی مسکراہٹ تیر گئی۔

درے کی آنکھوں میں چمک لوٹ آئی۔

"مہر۔ آخری فیصلہ تمہارا ہو گا۔ تم عنایا کی ذہنی صحت کو بہتر سمجھ سکتی ہو۔ بس جو بھی فیصلہ لیناسوچ سمجھ کر لینا۔" درے نے زیادہ باز پرس نہ کیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں اس بارے میں ضرور سوچوں گی۔" مہر نے سر اوپر نیچے ہلایا۔ درے نے مہر کی طرف الوداعی مسکراہٹ اچھالی۔

جانے سے قبل، درے نے مہر کو عنایا کو پانچ منٹ تک بھیجنے کو کہا۔ تب تک اس نے دراز سے میگنیٹک لڈو نکالا اور میز پر سجایا۔ چہرے پر شوخ تاثر سجایا۔

ٹھیک پانچ منٹ بعد چھوٹی عنایا دوڑتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔

"ڈاکٹر!" عنایا چہکی۔

درے نے گرمجوش مسکراہٹ کے ساتھ اس بچی کا استقبال کیا۔ اسے گلے سے لگایا اور گود میں اٹھایا۔ درے کے آغوش میں عنایا پرسکون ہونے لگی۔ صوفے پر بیٹھ کر دونوں نے خوب باتیں کیں۔ پھر درے لڈو کھیلنے کے غرض سے اسے ڈیسک پر لے آئی۔

"عنایا آپ کل سکول گئیں؟"لڈو کھیلنے کے دوران درے نے پوچھا۔

وہ عنایا کے چہرے کو بغور دیکھنے لگی۔ عنایا کا سر جھک سا گیا تھا۔ اس کے انداز میں جھجک عیاں تھی۔

"نہیں ڈاکٹر۔"عنایا نے شانے اچکا دیے۔

"اچھا؟ وہ کیوں؟" درے نے ایک اور سوال کیا۔

عنایا درے سے نظریں چرانے لگی۔

"وہ میرے سر میں درد تھا۔"چھوٹی عنایا کے منہ میں جو آیا وہ بول گئی۔ اس کے چہرے پر شرمندگی تھی۔

تیر نشانے پر لگا تھا۔ دل ہی دل میں سوچ کر، درِفشاں مسکرا دی۔

"اچھا؟ ٹھیک ہے۔ آپ میری بیسٹ فرینڈ ہیں اس لیے مجھے آپ کی ہر بات پر بھروسہ ہے۔ آپ یقیناً سر کے درد کی وجہ سے ہی سکول نہیں گئی ہوں گی۔" درے نے ہر لفظ پر زور دیا۔

بچی کا حساس دل بوجھل ہوا۔

”اصل میں ڈاکٹر۔ میری مام مجھے ڈیڈ سے ملنے نہیں دیتیں۔ اس لیے میں ان سے ناراض تھی اور سکول نہیں گئی۔“ اپنے دل سے بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ایک جھٹکے میں سچ اگل دیا۔ درِفشاں زیرلب ہنس دی۔

”مام سے ناراضگی اپنی جگہ۔ سکول سے کیوں ناراض ہوئیں؟“

عنایا ایسے ہنسی جیسے درے نے صدی کی بونگی بات کہہ دی ہو۔

”اسکول سے کوئی کیسے ناراض ہو سکتا ہے، ڈاکٹر۔“ چہرہ سُرخ ہوا۔ ”اسکول کی فیلنگز نہیں ہوتیں۔“

درے بھی مدھم سا ہنس دی۔

”اچھا اگر اسکول کی فیلنگز ہوتیں اور ہماری عنایا اسکول سے ناراض ہو جاتی تو اسکول کو کیسا لگتا؟“

عنایا سوچ میں پڑ گئی۔

”شاید سکول کو برا لگتا۔“ بچی نے اپنے تئیں ایک مناسب جواب دیا۔

”تو سوچیے، آپ کی مام کو کتنا برا لگا ہو گا جب آپ ان سے ناراض ہوئی ہوں گی۔ وہ تو آپ سے سب سے زیادہ پیار کرتی ہیں۔“

”مگر ڈاکٹر وہ مجھے میرے ڈیڈ سے ملنے نہیں دیتیں۔“ عنایا کی بڑی بڑی آنکھوں میں خفگی اتری۔

”تو پھر آپ ان سے پیار سے بات کرتیں۔ ان کو منانے کی کوشش کرتیں۔ آپ کی مام سے زیادہ آپ کو کوئی پیار نہیں کرتا عنایا۔ اگر پیار سے منائیں گی تو کیوں نہیں مانیں گی وہ۔“ درے نے وقفہ لے کر عنایا کو دیکھا۔ عنایا کسی گہری سوچ میں لگتی تھی۔ درے نے اگلہ جملہ ذہن میں ترتیب دیا۔

”اور مجھے یقین ہے ہماری عنایا نے اپنی مام سے پیار سے ہی بات کی ہو گی۔ ہے نا؟“ حساس سی عنایا کو ایک مرتبہ پھر سے شرمندگی نے گھیر لیا تھا۔ اس کا سر باعث ندامت جھکتا چلا گیا۔

”آپ عنایا کو غلط سمجھتی ہیں، ڈاکٹر۔ میں نے گلدان اٹھا کر پھینک دیا تھا۔ جس کی وجہ سے مام کا پاؤں زخمی ہو گیا۔ ان کے پاؤں پر خون بھی تھا۔ میں نے مام کو بہت ہرٹ کیا ہے۔“ وہ مغموم ہو گئی۔

درے کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ بکھری۔

”نہیں۔ میری عنایا بہت اچھی ہے۔ اچھے لوگ وہ نہیں ہوتے جو کچھ غلط نہیں کرتے۔ بلکے اچھے لوگ وہ ہوتے ہیں جو برا کر بھی لیں تو اس کے بعد شرمندہ ہوتے ہیں۔“ درے نے گرم جوش انداز میں کہا۔

عنایا نے چہرہ اٹھا کر درے کو دیکھا۔ چہرے پر ایک بار پھر سے چمک در آئی تھی۔

”سچ میں؟“

”ہاں بالکل۔ آپ کی ڈاکٹر آپ سے جھوٹ کیوں بولیں گی۔“ عنایا مسکرا کر تیزی سے سر اوپر نیچے ہلانے لگی۔ ”تو آپ اپنی مام سے معافی مانگ لیں گی نا؟“ عنایا نے سر اثبات میں ہلایا۔

چھوٹے بچے پھول کی طرح ہوتے ہیں۔ خوبصورت اور نازک۔ ایک پھول، جو کہ ہوا کے رخ پہ اپنا رخ موڑ لیتا ہے۔ اگر آس پاس وہ سختی دیکھیں گے تو خود بھی سخت ہو جائیں گے۔ لیکن اگر وہ آس پاس نرمی دیکھیں گے تو ان کی شخصیت میں بھی نرمی نمودار ہو گی۔ ہم اکثر اپنے بچوں کو اچھی نصیحتیں دیتے ہیں۔ کبھی سوچا ہے کہ کیوں یہ نصیحتیں ان کے اندر تبدیلیاں پیدا نہیں کرتیں؟ کیونکہ ہم ان پہ خود عمل نہیں کرتے۔ اگر ہم اپنے بچوں میں کوئی اچھی چیز پیدا کرنا چاہ رہے ہیں تو سب سے پہلے وہ چیز ہمیں خود اپنانی ہو گی۔

عنایا اپنے سیشن سے فارغ ہو کر جب باہر آئی تو مہر وٹینگ روم کی نرم کرسی پہ بیٹھی سو رہی تھی۔ چہرے پر معصومانہ مسکراہٹ لیے مہر کی جانب بڑھی اور اس کا ہاتھ ہلایا۔ مہر بوکھلا کے اٹھی۔

"عنایا آپ کا سیشن ختم ہو گیا؟" مہر نے عنایا کے گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی آنکھوں میں غنودگی بھری ہوئی تھی۔ عنایا نے اپنا سر اثبات میں ہلایا۔

"مجھے معاف کر دیں مام۔ آئندہ آپ کو ہرٹ نہیں کروں گی۔" وہ شرمسار سے انداز میں بولی۔

مہر مسکرائی اور اپنے بیٹی کو اپنے آغوش میں لیا۔ عنایا بہتر تھی۔ زندگی کی ساری تلخیاں پسِ پشت رک گئی تھیں۔

"everyone deserves a Durre Fishan in their life" چہرے پر پر سکون سی مسکان سجائے وہ مشکور ہو کر زیر لب بڑبڑائی۔

اس نے سچ ہی تو کہا تھا۔ ہر کسی کی زندگی میں ایک نہ ایک درِ فشاں تو ہونی ہی چاہیے۔

☆☆☆

ہماری کہانی ایک ہفتہ آگے بڑھتی ہے۔

سنابل ہسپتال کا شمار راولپنڈی کے بدنام ترین ہسپتالوں میں ہوتا تھا۔ عمارت کو ایک نظر دیکھ کر ہی متلی آنے لگتی تھی۔ بوسیدہ دیواریں، جن پر جگہ جگہ سیلن لگی ہوئی تھی۔ اندر کا حال تو باہر سے کئی گنا افسوس کن تھا۔ میلا کچیلا کائی زدہ فرش، کچرے اور دواؤں کی سخت بدبو۔

ہسپتال کے ناظم کے کمرے میں جاؤ تو کچھ لمحے کے لیے ٹھٹک کر رک جاؤ گے، اور سوچنے لگو گے کہ کیا یہ اسی ہسپتال کا حصہ ہے؟ نیا نویلا سفید پینٹ۔ چمکتے دمکتے ٹائلز۔ اے سی کی ٹھنڈک۔ اس کمرے میں ہر سہولت مہیا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ ہو جائے گا۔'' لیڈی اقتدار ہسپتال کے ناظم سے گفتار تھیں۔

وہ لگ بھگ پینتیس سالہ مرد تھا۔ چست سیاہ شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ کسرتی بازو جھلک رہے تھے۔ چہرے کے نقش پرکشش تھے۔ وہ اپنی مالکن کی باتیں سن کر ادب سے سر کو خم دیتا اور مسکراہٹ اچھالتا۔

''اور کچھ؟ کوئی کیڑا تو تنگ نہیں کر رہا، درانی؟''

درانی لیڈی اقتدار کے خاص وفاداروں میں سے ایک تھا۔ وہ اسے اپنے دائیں ہاتھ کا درجہ دیتی تھی، اس لیے کافی بے تکلفی سے بات کرتی تھی۔

''رہا نہیں۔ رہی۔'' درانی نے آبرو اچکائے۔ ''آپ تو جانتی ہیں جذباتی جرنلسٹ کو۔ آئے دن کوئی نیا ڈراما کھڑا کرتے رہتے ہیں۔''

لیڈی اقتدار کے چہرے پر پہلے تو مسکراہٹ بکھری۔ پھر زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ درانی ان کی تقلید میں ہنستا گیا۔

''بس اتنی سی بات؟ چینل کا نام بتاؤ؟'' ڈیسک سے اپنا آئی فون اٹھایا۔ معاً اپنی طاقت باور کرواتی نگاہ درانی پر ڈالی۔

''آواز نیوز۔''

''کون سی بلڈنگ میں ہے ہیڈ کوارٹر؟'' لیڈی اقتدار نے یاددہانی چاہی۔

''ارشد صاحب کی بلڈنگ، سن ٹاپ ٹاور کی دوسری منزل میں۔''

سرمئی آنکھیں تحقیر آمیز ہوئیں۔

''آواز نیوز کے سی ای او۔ مراد؟'' گردن تنی۔ مغرور ناک سکیڑی۔

''جی لیڈی۔ آپ نے کیسے یاد کیا مجھے؟'' مراد نے متانت بھرے انداز میں جواب دیا۔

''زیادہ لمبی بات نہیں کروں گی، بس اتنا کہوں گی کہ تمہیں اپنا بوریا بستر باندھ کر اپنے آفس سے نکلنا ہوگا۔'' لیڈی اقتدار کا انداز لاپرواہ سا تھا۔

درانی اپنے لبوں کو بھینچ کر ہنسی قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''لیڈی اقتدار۔ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ کوئی خطا ہوئی ہے ہم سے؟'' دن دہاڑے اس کے چھکے چھوٹ گئے۔

"میں نے تمہاری بک بک نہیں سننی۔ اور ویسے بھی میں نے بلڈنگ کی انتظامیہ سے بات کرلی ہے۔ وہ تمہیں دھکے دے کر نکال دیں گے اگر تم خود نہ گئے۔ اور میں اس بات کو یقینی بناؤں گی کہ تمہارا آفس کہیں آباد نہ ہوسکے۔ تمہارے چینل کی بربادی اب میری ذمہ داری۔ خوش رہو۔" لیڈی اقتدار نے ادا سے اپنے انگلی پر پہنی انگوٹھی دیکھی۔

درانی ہسنی قابو کرنے کی کوششوں میں ناکام ٹھہرا تھا۔ وہ بنا آواز کے ہنس دیا۔

"ہم نے کچھ غلط کیا ہے، تو ہمیں بتائیں بھی تو، لیڈی؟"

لیڈی اقتدار نے اپنا موبائل کان سے جدا کیا۔ بے رحمی سے کال کاٹ دی۔ چہرے پر تفاخر لیے درانی کی طرف متوجہ ہوئی۔ درانی دل کھول کر ہنس رہا تھا۔ لیڈی اقتدار نے لبوں پر ہاتھ رکھ کر نزاکت سے قہقہہ بلند کیا۔

"اور اب دیکھتے جاؤ۔ یہ کالز پر کالز کرے گا۔ بہت تڑپانے کے بعد میں اس کی کال اٹھالوں گی۔ یہ مجھ سے بھیک مانگے گا۔ میری ناراضگی کی وجہ دریافت کرے گا۔" لیڈی اقتدار کے چہرے پر معانی خیز مسکراہٹ تھی۔

درانی پر معنی خیز نگاہ ڈالی، گویا چاہ رہی ہو کہ آگے کا جملہ وہ کہے۔

"پھر آپ اس فسادی جرنلسٹ کی خبر دیں گی۔ وہ نہ صرف اسے کام سے نکالے گا، بلکہ۔۔۔"

لبوں پر شاطر مسکراہٹ رونما ہوئی۔

"بلکہ۔" لیڈی اقتدار نے بات جاری رکھی۔ "اس بات کو یقینی بنائے گا کہ وہ آئندہ کے لیے کام کرنے لائق نہ بچے۔"

ایک اور شیطانی قہقہہ کمرے میں گونجا۔

لیڈی اقتدار شہادت کی انگلی پر موجود انگوٹھی گھمانے لگی۔

”یہ سب چیونٹیاں ہیں درانی۔“ آواز سرد تھی۔ کمرے کی فضا تناؤ سے دوچار ہوئی۔

”کمزور چیونٹیاں۔ جن کو اپنی جوتی کی نوک پر کچلنا میرا فرض ہے۔ جو بھی میرے کاروبار کو تباہ کرنا چاہے گا اس کا یہی انجام ہو گا۔“ لہجے میں کاٹ تھی۔

آنکھیں تکبر سے لبالب تھیں۔ گردن اب بھی پوری شان سے اکڑی ہوئی۔ درانی کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ اس نے سرعت سے اپنا سر اثبات میں ہلا کر اپنی مالکن کی تائید کی۔



عنایا کے سکول میں کوئی محفل تھی جس میں اس نے حصہ لیا ہوا تھا۔ مہر کا جانے کا دل تو نہ تھا، مگر عنایا کے اصرار پر وہ اسے مایوس نہ کر سکی۔ وہ سب سے پچھلی نشست پر بیٹھی ہوئی، بوریت دور کرنے کے لیے موبائل استعمال کر رہی تھی۔ سٹیج پر ایک طالبِ علم مائیک تھام کر بولنے لگا۔

”میں تمام طلباء، اساتذہ اکرام کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے وقت نکال کر تقریری مقابلے میں شرکت کی۔ مقابلہ شروع کرنے سے پہلے میں تلاوت کے لیے ہمارے سکول کے ایک معزز ٹیچر، حافظ احمد یوسف کو بلانا چاہوں گا۔“

مہر بری طرح سے چونکی۔ اس نے موبائل پرس میں گھسیڑا۔ احمد یوسف؟ نہیں وہ کیسے ہو سکتا تھا۔ اس نے سٹیج پر نظریں دوڑائیں۔ ہاں! وہ احمد ہی تھا۔ مگر کیا حافظین کی ناف تک داڑھی نہیں ہوتی تھی؟ احمد تو حلیے سے دینی بھی معلوم نہ ہوتا تھا۔

مہر کی پوری توجہ سٹیج کی جانب متوجہ ہوئی۔ کوئی اور ہوتا تو اسے خاص دلچسپی نہ ہوتی۔ مگر وہ احمد تھا۔ وہ آج بھی اسے اتنا ہی پر کشش لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر سادگی تھی۔ آپس میں جڑی ہوئی بھنویں، سیاہ شرٹ اور جینز کی پینٹ پہنے وہ پر دلکش لگ رہا تھا۔ اس نے مائیک تھام کر تلاوت شروع کی۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو مہربان نہایت رحم فرمانے والا ہے۔)

وَ الۡفَجۡرِ

(قسم ہے فجر کی)

وَ لَیَالٍ عَشۡرٍ

(اور دس راتوں کی)

وَّ الشَّفۡعِ وَ الۡوَتۡرِ

(اور جفت اور طاق کی)

وَ الَّیۡلِ اِذَا یَسۡرِ

(اور رات کی جب وہ چلنے لگے)

ہَلۡ فِیۡ ذٰلِکَ قَسَمٌ لِّذِیۡ حِجۡرٍ

(کیاان میں عقلمند کے واسطے کافی قسم ہے؟)

وہ آنکھیں بند کر کے سر جھکائے سورہ فجر کی تلاوت کر رہا تھا۔ اس کی آواز نرم صحبت اور بے حد خوبصورت تھی۔ اس کی دلکش آواز نے مہر کے دل کو موم کی طرح پگھلایا۔ اس کے دماغ پر چھایا ہر خیال تحلیل ہونے لگا۔ ان آسمانی لفظوں نے اس کے رگ وریشے پر سکون کی تسلط قائم کی۔ اسے تعجب ہونے لگا کہ خدا کا ذکر اتنا ہی سکون دیتا ہے؟

اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِعَادٍ

(کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے رب نے عادیوں کے ساتھ کیا کیا؟)

اِرَمَ ذَاتِ الۡعِمَادِ

(ستونوں والے ارم کے ساتھ)

الَّتِیۡ لَمۡ یُخۡلَقۡ مِثۡلُہَا فِی الۡبِلَادِ

(جس کی مانند کوئی قوم ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی)

وَ ثَمُوۡدَ الَّذِیۡنَ جَابُوا الصَّخۡرَ بِالۡوَادِ

(اور ثمودیوں سے جنہوں نے وادیوں میں بڑے بڑے پتھر تراشے تھے)

وَفِرۡعَوۡنَ ذِی الۡاَوۡتَادِ

(اور فرعون کے ساتھ جو مینخوں والا تھا)

الَّذِیۡنَ طَغَوۡا فِی الۡبِلَادِ

(ان سبھوں نے شہروں میں سر اٹھا رکھا تھا)

صرف اس کی آواز ہی نہیں تھی جو خوبصورت تھی۔ انداز تلاوت بھی اتنا ہی حسین تھا۔ ہر الفاظ جیسے دل سے ادا ہوتا تھا۔ اس کے لیے دنیا ختم ہو گئی تھی۔ وہ کہاں تھی، کیا کر رہی تھی اسے ہوش نہ رہا تھا۔ آنکھیں بند تھیں، اور کانوں سے بس احمد کی آواز ٹکرا رہی تھی۔

فَاَکۡثَرُوۡا فِیۡہَا الۡفَسَادَ

(اور بہت فساد مچا رکھا تھا۔)

فَصَبَّ عَلَیۡہِمۡ رَبُّکَ سَوۡطَ عَذَابٍ

(اور تیرے رب نے ان سب پر عذاب کا کوڑا برسایا)

اِنَّ رَبَّکَ لَبِالۡمِرۡصَادِ

(یقیناً تیرا رب گھات میں ہے)

فَاَمَّا الۡاِنۡسَانُ اِذَا مَا ابۡتَلٰىہُ رَبُّہٗ فَاَکۡرَمَہٗ وَ نَعَّمَہٗ فَیَقُوۡلُ رَبِّیۡۤ اَکۡرَمَنِ

(انسان (کا یہ حال ہے کہ) جب اسے اس کا رب اسے آزماتا ہے اور عزت دیتا و نعمت دیتا ہے تو وہ کہنے لگتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دار بنایا)

وَ اَمَّاۤ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَیْهِ رِزْقَهٗ ﳔ فَیَقُوْلُ رَبِّیْۤ اَهَانَنِ

(اور جب وہ اسے آزماتا ہے اور اس کی روزی تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہنے لگتا ہے کہ میرے رب نے میری اہانت کی)

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْیَتِیْمَ

"(ایسا ہر گز نہیں بلکہ (بات یہ ہے کہ) تم لوگ یتیموں کی عزت نہیں کرتے)

وَ لَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ

(اور مسکینوں کو کھلانے کے ایک دوسرے کو ترغیب نہیں دیتے)

وَ تَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا

(اور میراث سمیٹ کر کھاتے ہو)

وَّ تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا

(اور مال جی بھر کر عزیز رکھتے ہو)

كَلَّاۤ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا

(یقیناً جس وقت زمین کوٹ کوٹ کر برابر کر دی جائے گی)

وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا

(تیرا رب آجائے گا اور فرشتے صفیں باندھ کر)

وَجِيءَ يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْإِنسَانُ وَأَنَّىٰ لَهُ الذِّكْرَىٰ

(اور جس دن جہنم بھی لائی جائے گی اس دن انسان کو سمجھ آلے گی مگر آج اس کے سمجھنے کا فائدہ کہاں؟)

يَقُولُ يَا لَيْتَنِي قَدَّمْتُ لِحَيَاتِي

(وہ کہے گا کہ کاش میں نے اپنی زندگی کے لئے کچھ پیشگی سامان کیا ہوتا)

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهُ أَحَدٌ

(پس آج اللہ کے عذاب جیسا عذاب کسی کا نہ ہوگا)

وَلَا يُوثِقُ وَثَاقَهُ أَحَدٌ

(نہ اس کی قید و بند جیسی کسی کی قید ہوگی)

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ

(اے اطمینان والی روح)

ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً

(تو اپنے رب کی طرف لوٹ چل اس طرح کہ تو اس سے راضی وہ تجھ سے خوش)

فَادْخُلِي فِي عِبَادِي

(پس میرے خاص بندوں میں داخل ہو جا)

وَادْخُلِي جَنَّتِي

(اور میری جنت میں چلی جا)

احمد کے چہرے پر اطمینان تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے بہترین تلاوت کی تھی۔ وہ سٹیج سے رخصت ہو گیا۔ مہر نے ایک جھٹکا لیا جیسے وہ کسی خواب سے جاگی ہو۔ تلاوت اتنی جلدی کیوں ختم ہو گئی؟ مہر نے ہڑبڑا کر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ کہاں چلا گیا؟ کیا قرآن کی تلاوت اتنی طاقتور ہوتی ہے کہ وہ انسان کو دنیا سے بیگانہ کر دیتی ہے؟ مہر اس لمحے بہت کچھ سوچنے پہ مجبور ہو گئی تھی۔

اور یہ تھا مہر بنت عبد اللہ سلطان کا القران سے پہلا تعارف۔

اس کی آنکھیں نم پڑنے لگیں۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی کہ کہیں کوئی اسے اس حال میں دیکھ نہ لے۔ یہ سب اس کے لیے غیر معمولی تھا۔ جو بے قراری اور بے چینی اس کے وجود پر آٹھ ماہ سے سوار تھی وہ صرف کچھ دیر کی تلاوت کیسے ختم کر سکتی تھی؟ مہر کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس نے آنکھ کی سطح پہ جھلکتے آنسو اپنے ہاتھوں کی پشت سے پونچھے۔

☆☆☆

نیلی ویگن اسلام آباد کی کشادہ سی سڑکوں پر سفر کر رہی تھی۔ ٹنٹڈ گلاسز کی وجہ سے کوئی بھی اندر کا منظر دیکھ نہیں سکتا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پہ شمس براجمان تھا۔ ریئر ویو مرر کے تحت وہ وقتاً فوقتاً پچھلی نشست پر بیٹھی نیلوفر پر نظر ڈالتا۔

نیلوفر شیشے سے باہر دیکھ رہی تھی۔ دل عجیب نوع کی کیفیت سے دوچار تھا۔ آنکھوں میں ٹھہراؤ قائم تھا۔

”آپ نے بتایا نہیں۔“ شمس نے موت سی خاموشی کو توڑا۔ ”آپ نے لیڈی اقتدار کو کیا جواب سنایا؟“

نیلوفر ہنوز شیشے کے باہر دیکھتے گئی۔ تاثرات کرخت تھے۔

”میں اس قتل کے لیے مان گئی۔“ اس نے سرد سانس اندر کھینچی۔ ”جب کہ سالوں پہلے انہوں نے میری تجویز رد کی تھی اور ”اسے“ قتل نہیں کیا۔“

شمس نے بھنویں اٹھائیں۔

”کسے؟ وہ جس کا نام لینا ممنوع ہے؟“ شمس کا انداز محتاط ہوا۔

”ہاں۔“ نیلوفر نے ہاتھ باندھے۔ ”احمد۔“

شمس کے رونگٹے کھڑے ہوئے۔

”آپ کیا پرانی باتیں لے کر بیٹھ گئیں۔ وہ اب ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“ شمس نے آدھا لب اٹھاتے کہا۔

”میں بے کار میں پریشان نہیں ہو رہی۔“ وہ اب تک گم صم سی تھی۔ ”وہ عبد اللہ کا چہیتہ سافٹ ویئر ڈیولپر ہے۔ روز مرہ کی بنیاد پر آفس آتا جاتا ہے۔“ وہ جل بھن کر بولی۔

شمس پر حیرت کا گزر ہوا۔

”اتفاق بھی ہو سکتا ہے۔ وہ پروگرامر ہے۔ کام کے سلسلے میں آتا ہو گا۔“ خود کو پر سکون کرنا چاہا۔

نیلوفر کے چہرے پر استہزاء ابھری۔

”وہ سب جانتا ہے۔ وہ ہیروں کی حقیقت سے باخبر ہے۔ اس کے باوجود اسے ہم نظر انداز کر رہے ہیں۔ تم دیکھنا شمس، ایک دن لیڈی اقتدار اسے وقت پر قتل نہ کرنے کے فیصلے پر پچھتا رہی ہوں گی۔“

نیلوفر کی باتوں کی وجہ سے اسے طرح طرح کے خدشات ستانے لگے۔

نیلی ویگن ایک سوسائیٹی میں داخل ہوئی۔ موسمی بارش کی وجہ سے سڑکیں گیلی تھی۔ چھے سو گز کے سفید گھر سے تھوڑا دور شمس نے ویگن پارک کی۔ نیلوفر کا دل پسلیوں سے ٹکرایا۔ آنکھوں کی تپش انتہاء کو پہنچی۔ برسوں پرانی آس پوری ہونے والی تھی۔ باطن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔

”لگ رہا ہے ابھی بیوی بچے نکلے نہیں۔“ شمس نے گھڑی دیکھی۔ ”وقت ہو گیا ہے۔ بس نکلتے ہوں گے۔“

نیلوفر نے سر کو ہلکی سی جنبش دی۔ بولی کچھ نہیں۔ وہ خاموشی سے انتظار کرنا چاہتی تھی۔

”ایک بات پوچھنی تھی آپ سے۔“ شمس نے نیلوفر کی خاموش رہنے کی آرزو کا احترام نہ کیا۔

"آپ کے مہر بنت عبداللہ سلطان سے کیسے تعلق تھے؟یعنی اس کو آپ پر شک تو نہیں ہو گا؟"

نیلوفر کی نگاہیں اب بھی کھڑکی سے باہر، اس گھر پر منجمد تھیں۔

"کبھی شک نہ ہو، اس لیے میں نے ہمیشہ اس سے اچھے تعلقات قائم کیے تھے۔ اس قتل کے بعد وہ ہمارے بہت کام آنے والی ہے۔" وہ تقریباً بڑبڑائی۔

شمس نے سر کو مختصر سا خم دیا۔ چہرے پر کمینی سی مسکراہٹ تھی۔

کچھ لمحے مزید اس خاموشی میں کٹے۔ گھر میں سے ایک عمر رسیدہ عورت نکلی۔ اس کے ساتھ، تقریباً تیرہ سال کا لڑکا اور سولہ سال کی لڑکی بھی تھی۔ عمر رسیدہ عورت بچوں سمیت گاڑی میں سوار ہو گئی۔ گاڑی سڑکوں پر بھاگ رہی تھی۔

نیلوفر کا دل برق رفتاری سے دھڑکنے لگا تھا۔ انتظار کی گھڑی ختم ہونے والی تھی۔ انتقام کی آگ بجھنے والی تھی۔

"میں جاتا ہوں۔ جب آپ کو میسج کروں تو آجایئے گا۔" شمس گاڑی سے اترا۔

اس نے محتاط ہو کر سڑک پار کی۔ گارڈز نے اسے گھر کے اندر قدم رکھنے سے نہ روکا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ انہیں خرید چکے تھے۔ آج کے زمانے میں لوگوں کی وفاداریاں خریدنا کوئی مشکل کام نہیں۔

شمس نیلوفر کی نظروں سے غائب ہوا۔ کچھ دیر مزید خاموشی کی نذر ہوئے۔ اور پھر نیلوفر کا موبائل تھرتھرایا۔ نیلوفر کی آنکھوں میں چمک در آئی۔ اس نے موبائل کھول کے میسج پڑھا:

"ہم اوپر والی منزل میں آپ کے منتظر ہیں۔"

نیلوفر زیر لب ہنس دی۔ آخر کار، آج وہ سالوں پرانہ وعدہ پورا کرنے والی۔

اس نے برابر سے لکڑی کا ڈبا اٹھایا اور گاڑی سے باہر نکلی۔ وقت ضائع کیے بغیر گھر کے اندر چلی گئی۔ وہ وہاں پہلی مرتبہ آئی تھی سو گھر کا تفصیلی جائزہ لے رہی تھی۔ لبوں کو تلخ مسکراہٹ نے چھوا۔

یہ دنیا کیوں مکافاتِ عمل کی رٹ لگاتی تھی؟ اگر مکافاتِ عمل حقیقت میں وجود رکھتا تو کیوں اسے انتقام لینے کے لیے خود میدان میں اترنا پڑ رہا تھا؟ وہ گھر کا عالی شان فرنیچر، صاف ستھرا پینٹ دیکھ کر قدرت سے دل ہی دل میں شکوہ کر رہی تھی۔

دوسری منزل میں کمرے کے باہر شمس کھڑا تھا۔ نیلوفر کو دیکھ کر وہ ناز سے مسکرایا۔

"یہ آپ کا ہوا۔" تابعداری سے کہا اور نیلوفر کے لیے دروازہ کھول دیا۔

نیلوفر نے ایک گہری سانس اندر کھینچی اور ایک باہر۔ وہ اندر چلی گئی۔ شمس نے دروازہ بند کیا۔

کمرے میں گپ اندھیرا تھا۔ کسی کی آواز مسلسل آرہی تھی۔ کسی کے تکلیف کے مارے کراہنے کی آواز۔ اور ٹھیک اسی آواز کو سننے کے لیے وہ اس راہ پر چل پڑی تھی۔ اندھیری راہ پر، جس نے اس کے جسم کا انچ انچ سیاہی میں رنگ دیا تھا۔

اس نے کمرے کی بتیاں جلائیں۔ ماسٹر بیڈ کے سامنے ایک کرسی پر اس عمر رسیدہ شخص کو رسی سے باندھا گیا تھا۔ اس کے منہ کے اندر رومال ٹھونسا ہوا۔ وہ اپنے ہاتھ پاؤں کو جنبش دے کے اپنے آپ کو رسی کی گرفت سے آزاد کرنا چاہتا تھا۔ نیلوفر کو دیکھ کر وہ اپنی جگہ پر تھم گیا۔ اس عورت سے شناسائی کا احساس ہوا۔

نیلوفر ہاتھ میں وہ ڈبا تھامے اسے دیکھ رہی تھی۔ نگاہوں میں طیش تھا۔ وہ اپنی آنکھوں میں سوال لیے پھر سے اپنے ہاتھوں اور پیروں کو جنبش دینے لگا۔ نیلوفر نے وہ ڈبا سنگھار میز پر رکھا۔ سست قدم بڑھاتے وہ اس آدمی کے عین سامنے پہنچی۔ وہ ساکن ہو گیا۔

اگلے لمحے کمرے میں چانٹے کی زوردار آواز گونجی۔ نیلوفر کی انگلیوں کے نشان اس کے دائیں رخسار پر چھپ چکے تھے۔ وہ آگ بگولہ ہوا۔ مزاحمت انتہا کو پہنچی۔

"ایسے مارا تھا نہ تم نے میرے ماں کو۔ یاد ہے؟ انسپیکٹر عادل۔" یہ پہلا جملہ تھا جو وہ بولی تھی۔ عادل کی آنکھوں میں مزید سوالات ابھرے۔ ماضی کی یادیں کریدیں مگر وہ چہرہ اب بھی یاد نہ آیا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں یاد نہیں۔ میں اپنا تعارف خود کرواتی ہوں۔ میں وہ چودہ سالا لڑکی تھی جس کو اپنی ماں سمیت گھر سے نکالنے میں تم نے ظالموں کا ساتھ دیا تھا۔"

اب اس کمرے میں صرف نیلوفر کی آواز تھی۔ عادل مزاحمت کی کوششوں کو ترک کیے اسے بت بنا سن رہا تھا۔

"یاد کرو تم۔ کیسے تم نے میرے چچاؤں کا ساتھ دیا تھا۔ جو دولت، جو گھر مجھے ملنا تھا وہ انہوں نے چھینا۔ اور تم نے ان کا ساتھ دیا۔ ہم انصاف کے لیے بھٹکتے رہے۔ اور تم نے ہمیں کبھی بھی انصاف نہ لینے دیا۔ میری ماں نے احتجاج کیا تو تم نے اسے لاک اپ میں ڈال کر تشدد کا نشانہ بنایا۔ میں وہ چودہ سالہ لڑکی تھی عادل۔ میں وہ کمزور اور نادان چودہ سالہ لڑکی تھی جسے اپنا حق لینا نہیں آتا تھا۔" نیلوفر نے توقف لیا۔ شیطانی آنکھوں میں جوش و جنون کے ساتھ انتقام کی بھڑکتی آگ نمایاں تھی۔ اس کے چہرے پر حیوانگی پھیلی ہوئی تھی۔

"مگر اب دیکھو۔ اٹھارہ سال گزر گئے۔ میں بھی بدل گئی۔ میں اپنا انتقام آپ لینے کے قابل بن گئی ہوں۔" وہ مدھم سا ہنس دی۔ ہنسی بھی اس کی شخصیت کی طرح خوفناک تھی۔ عادل کے کانوں میں ہنسی چبھی۔ وہ اس رومال کے پیچھے بہت کچھ بڑبڑا رہا تھا۔

"میں نے کہا تھا میں واپس آؤں گی۔ میں نے کہا تھا کہ ایک دن تمہیں تمہارے زوال تک پہنچاؤں گی۔ کاش تم اس وقت میری دھمکی کو سنجیدگی سے لیتے۔" عادل کے چہرے پہ خوف دیکھ کے اس کی روح کو تسکین ملنے لگی۔ اس نے عادل کے منہ میں ٹھونسا ہوا رومال کھینچ کے نکالا۔ عادل تیز سانس لینے لگا۔ وہ نیلوفر کو عجیب نظروں سے دیکھے جا رہا تھا۔

"تم میرے ساتھ کچھ نہیں کرو گی۔ سمجھی۔ میں بتا رہا ہوں۔" عادل ہکلاتے ہوئے بولا۔ مگر کوئی فائدہ نہ تھا۔ نیلوفر کی مسکراہٹ اور بھی گہری ہوئی۔

"اور تڑپو۔ تڑپتے رہو۔ میں نے بھی تم سے اس وقت انصاف کی بھیک مانگی تھی۔ مگر تم نہ مانے۔ تمہارے پتھر دل پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اور اب دیکھو، میرا دل بھی سخت ہو گیا۔" وہ محظوظ ہو رہی تھی۔ "تمہاری وجہ سے میرا انصاف کے تصور سے بھروسہ اٹھ گیا۔"

عادل کو سانپ سونگھ گیا۔

"دیکھو۔ بیٹی۔" عادل نے نرمی اختیار کی۔ "ہم آرام سے بات کر سکتے ہیں۔"

وہ کیوں نرم پڑتی جب اس دنیا نے اس کی نرمی کا لحاظ نہ کیا تھا؟

"اب بہت دیر ہو گئی ہے۔ تم تو انصاف کے نمائندے تھے۔ تمہارے نام میں ہی عدل تھا۔ کاش تم نے اپنے عہدے کا احترام کیا ہوتا، تو یہ سب تمہارے ساتھ نہ ہوتا۔ یہ انتقام صرف میرا نہیں، ان

سب کا ہے جن کے ساتھ تم نے ظلم کیا ہو گا۔ تم جیسے بھیڑیے اس ہی طرح کے انجام کے مستحق ہیں۔" عادل کا تنفس تیز ہوا۔ نسیں پھڑکنے لگی تھیں۔ چہرہ خوف کے مارے مزید سرخ ہو گیا۔ عادل کی سانسیں اتنی اونچی تھیں کی نیلوفر تک کو سنائی دیں۔

"تم سب کی وجہ سے میں ایسی ہوں۔ تم سب ہو نیلوفر کے مجرم۔" وہ جذبات کے مارے چلائی۔" تم سب نے مجھے برا بنایا۔ یہ میرا معاشرے سے انتقام ہے۔" سینہ پھول گیا۔

"اس معاشرے سے جس نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ مجھے وہ حق نہیں دیا جس کی میں مستحق تھی۔ تم سب نے کیا میرے ساتھ ایسا۔" وہ ہاتھوں کو مٹھی میں بھینچتے ہوئے چلا کر بول رہی تھی۔ وہ اس وقت غیر انسانی معلوم ہو رہی تھی۔ گھنگریالے بال ماتھے پہ بکھرنے لگے تھے۔ وہ خوفناک اور المناک لگ رہی تھی۔ چہرے پر جو وقار ہر وقت قائم رہتا تھا اس جنون کے پیچھے کہیں چھپ گیا تھا۔

وہ سنگھار میز کی طرف بڑھی۔ وہ ڈبا کھولا۔ اندر ایک سرنج تھی جس میں رقیق مائع تھا۔ مستقبل سے انجان عادل اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

"میں تمہیں ماروں گی نہیں۔ میں اتنی نیک نہیں کہ اتنی چھوٹی سزا دوں۔" نیلوفر اس طرح سے مسکرا رہی تھی کہ دانتوں کے ساتھ ساتھ اس کی بتیسی کی نمائش ہوئی۔

عادل کا دل بند ہونے لگا۔ کمرے کی فضا ہیبت ناک ہو چکی تھی۔

"میں بس تمہیں یہ انجیکشن لگاؤں گی۔ تمہیں ایک اسٹروک آئے گا۔ تمہارے اعضاء مفلوج ہو جائیں گے۔ جب بھی تمہیں تکلیف ہو گی، تمہیں میں یاد آؤں گی۔" نیلوفر نے انگلی سے اپنے سینے پر دستک

دی۔ ”نیلوفر یاد آئے گی تمہیں۔“ ایک اور شیطانی قہقہہ اس کمرے میں گونجا۔ عادل کا اضطراب بڑھنے لگا۔ وہ پسینے میں بھیگ چکا تھا۔

”مجھے چھوڑ دو۔“ وہ گڑگڑانے لگا تھا۔ نیلوفر آہستگی سے قدم اس کی طرف بڑھا رہی تھی۔

”پلیز مجھے چھوڑ دو۔“ وہ باقاعدگی سے رو رہا تھا۔ اور یہی تو وہ چاہتی تھی۔ اسے رلانا۔ وہ رویا تو نیلوفر کی روح کا گوشہ گوشہ سرشار ہوا۔ اس کی آنکھوں کے ارد گرد سرخی در آئی تھی۔ کنپٹی پہ موجود نس بھڑکنے لگی۔

”مجھے معاف کر دو۔“ وہ چہرہ اوپر کر کے بولا۔

نیلوفر کا وحشت ناک سراپا اس کی آنکھوں کے بالکل سامنے تھا۔ اس نے عادل کو گردن سے دبوچا۔ انجیکشن گردن کی پشت میں لگایا۔ لمحوں کا کھیل تھا، وہ زہریلا مادہ عادل کے جسم میں منتقل ہوا۔ عادل چلانے لگا۔ نیلوفر نے سرنج نکالی۔ آنکھوں کا جنون چھٹنے لگا۔ اس کی شریانوں میں ٹھنڈ اترنے لگی۔

نیلوفر نے آگے بڑھ کر رسیاں کھول دیں۔ عادل کرسی سے کھڑا ہوا۔ اس نے دروازے کی طرف جانے کے لیے قدم بڑھائے مگر تکلیف کی زوردار لہر اس کے جسم میں ابھری۔ وہ زمین پر گر گیا۔ وہ بلک رہا تھا۔ تکلیف کے مارے تڑپ رہا تھا۔ نیلوفر چہرے پر مسکراہٹ سجائے اسے دیکھے جا رہی تھی۔ تڑپتا وجود ساکن پڑا۔ نیلوفر نے اس کے بے ہوش وجود پہ زوردار لات ماری۔

وہ جنون کے آغوش سے باہر آچکی تھی۔ انتقام پورا ہوا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے ایک پرسکون سانس خارج کی۔ بالوں کو اپنی آنکھ کے رستے سے ہٹایا۔ وہ عادل کے بے ہوش وجود کو اس کمرے میں چھوڑ کر باہر نکل آئی۔

باہر دیوار سے ٹیک لگائے شمس بے نیاز سا کھڑا تھا۔ نیلوفر کے آتے ہی وہ چوکنا ہو گیا۔

”میں جا رہی ہوں۔ سب کام صفائی سے ہو جانا چاہیے۔ جس ہسپتال میں بھی جائے اس کی انتظامیہ کو خرید لینا۔ یہ صرف ایک اسٹروک ہی لگنا چاہیے۔“ حکم جاری کر کے وہ وہاں سے رخصت ہو گئی۔ اس کی چال شاہانہ ہو گئی تھی۔ گردن مزید اکڑنے لگی تھی۔

گارڈز اسے دیکھ رہے تھے۔ کہیں سے نہیں لگتا تھا وہ ایک انسان اور اس کے بیوی بچوں کی زندگی تباہ و برباد کر کے آئی تھی۔



جو الفاظ اسے سمجھ تک نہ آئے، وہ اس قدر سکون کیسے دے سکتے تھے؟ عنایا کے انتظار میں سکول کے صحن میں کھڑی مہر نے سوچا۔ ایسا لگتا تھا اس کے اندر نئی روح پھونک دی گئی ہو۔ وہ اب تک ان تبدیلیوں کو ہضم کرنے سے قاصر تھی۔ دماغ بے طرح الجھا ہوا تھا۔

وہ خیالوں میں ڈوبی ہوئی تھی جب اسے احمد نظر آیا۔ کندھے پر بستہ لٹکائے، گردن جھکائے موبائل استعمال کر رہا تھا۔

”مسٹر احمد یوسف؟“ وہ بے اختیار بولی۔

وہ مڑا تھا۔ مہر کا دل بے اختیار ہوا۔ اس کے دل میں الگ نوع کا احساس جگمگایا۔ کیا تھا یہ احساس؟ وہ اسے کوئی نام نہ دے پا رہی تھی۔

”آپ یہاں پر بھی کام کرتے ہیں؟“ ازلی سختی زائل ہو چکی تھی۔ وہ نرم پڑی۔

احمد نے موبائل اپنی جیب میں ڈالا اور اس کی طرف مسکراہٹ اچھالی۔ وہ مسکراتا تو گالوں میں گڑھے پڑتے۔ دل کے کسی کونے کو یہ نظارہ بہت حسین لگا۔ اس کی پیشانی کشادہ اور روشن تھی۔ اس کی شخصیت میں ایسی کشش تھی کہ مہر خود بہ خود اس کی طرف راغب ہو رہی تھی۔

"صبح سے دوپہر یہیں کام کرتا ہوں۔ مگر جلد یہ جاب چھوڑنے لگا ہوں۔" وہ نظریں جھکائے سادگی سے بولتا تھا۔

مہر نے آج سے پہلے کسی مرد کے آنکھوں میں اتنی حیا نہ دیکھی تھی۔

"کوئی خاص وجہ۔" اسے اپنی نرمی کا احساس ہوا۔ اوہ خدایا، یہ کیا ہو رہا تھا؟

"میں اپنی ذاتی فرم کھولنے لگا ہوں۔ اس لیے اس جاب کی ضرورت نہیں ہو گی۔" ادب، خلوص، تحمل۔ سب کچھ تھا اس کے انداز میں۔ وہ کسی تپتی ہوئی زمین پر چلتی ٹھنڈی ہواؤں کی مانند تھا۔ وہ پلک جھپکاتے اسے دیکھے گئی۔

"اللہ آپ کو کامیاب کرے۔" یہ دعا اس نے احمد کو دل سے دی تھی۔

"مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا ہے۔" مسکراہٹ دھیمی پڑی۔

"وہ کیوں؟" احمد الجھا۔

"آپ کی تلاوت نے میرے دل پر ایک الگ اثر چھوڑا ہے۔ میں بے سکون تھی۔ بے چین تھی۔ اور اب ان الفاظ میں پور پور ڈوبی ہوئی ہوں۔"

احمد کے چہرے پر مدھم مسکراہٹ ابھری۔ آنکھیں چمکیں۔ مہر کا دل زور و شور سے دھڑکا۔ وہ مسکراتا تھا تو ہوائیں ساکن ہو جاتیں، دنیا کی ہر پیشِ رفت لحظے بھر کو تھم جاتی۔

”مجھے سن کر اچھا لگا۔“

اس کی مختصر سی باتیں بھی کس قدر تسلی بخش ہوتی تھیں نا؟

”سنیں!“ وہ جانے لگا تو مہر نے اسے پیچھے سے پکارا۔ وہ جیسے اتنا جلدی اس ملاقات کو ختم کرنا نہیں چاہتی تھی۔ احمد اس کی پکار سن کر مڑ گیا۔

”آپ ایک وقت مجھے سکون دیتے ہیں، اور ایک وقت مجھے ڈراتے بھی ہیں۔“

احمد زیرِ لب ہنس دیا۔

”میری تنبیہ کی طرف تو نشاندہی نہیں کر رہیں؟“ آنکھوں میں کچھ رازدارانہ ابھرا۔

”اسی کی بات کر رہی ہوں۔ کیا چھپا رہے ہیں مجھ سے؟“ مسکراہٹ مندمل پڑی۔ آنکھوں میں بے چینی اتری۔

”کچھ راز وقت کے سپرد کر دینا بہتر ہوتا ہے۔ وقت آنے پر آپ کو علم ہو جائے گا۔“ اس نے تسلی بخش نگاہ مہر کی جانب اچھالی، پھر نظریں جھکا لیں۔

”میں بے چین رہوں گی۔“ وہ ہارے ہوئے انداز میں بولی۔

”سکون دائمی ہوتا ہے نہ بے چینی۔ یہ دنیا ہے مہر، یہاں ہر جذبے اور احساس کے سنگ جینا پڑتا ہے۔“

مہر پلک جھپکاتے اسے دیکھے گئی۔ پھر سر جھٹکا۔ باز پرس کرنے کے ارادے ترک کیے۔

”میں آج سے آپ کی مقروض ہوں۔ آپ کو کوئی بھی مدد چاہیے ہو۔ کوئی بھی کام نکالنا ہو۔ میں حاضر ہوں۔“ مہر نے اپنے چہرے پہ اپنائیت بھری مسکراہٹ سجائی۔ احمد نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور اپنے سر کو خم دیا۔

اپنی بائیک پر سوار ہوتے ہوئے اس نے یہ آیت دہرائی:

رَبِّ اِنِّیۡ لِمَاۤ اَنۡزَلۡتَ اِلَیَّ مِنۡ خَیۡرٍ فَقِیۡرٌ

(یا اللہ ! میں محتاج ہوں ہر اس اچھائی کا جو تو نے مجھ پر نازل کی)

سورہ قصص آیت ۲۴

دوسری طرف مہر بنت عبداللہ سلطان کو اپنا آپ بدلتا محسوس ہوا۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ پرانی مہر واپس آنے لگی تھی۔

وہ جو مہربان ہوا کرتی تھی۔

وہ جو ہمدرد ہوا کرتی تھی۔

وہ شاید ایک دفعہ پھر سے لوٹنے لگی تھی۔



جب ساری دنیا خوابِ خرگوش ہو گئی۔ تب وہ جاگی۔ سٹڈی ٹیبل پر تانبے کا وہ باکس تھا۔ وہ اسے دیکھے گئی۔ آنکھوں میں لاتعداد سوال تھے۔ دل میں ڈھیروں وسوسے۔ اس نے ڈبے کے نقوش کو انگلیوں کے ذریعے محسوس کیا۔ بالآخر سیاہ سرورق والی کتاب نکالنے کا فیصلہ کیا۔

لیمپ کی روشنی میں کتاب کی سطح دمکی۔ مہر کے تپتے ہوئے دل میں برف کی سلاخیں داخل ہوئیں۔ اسے تو یہ بھی یاد نہ تھا کہ آخری مرتبہ اس نے یہ کتاب کب پڑھی۔ بچپن میں ماں کی نگرانی میں تلاوت کرتی تھی۔ ماں سے دور ہوئی تو اس کتاب سے بھی دوری اختیار کر لی۔ اس نے شروع سے پڑھنا شروع کیا۔ ہر آیت کے نیچے ترجمہ کندہ تھا۔

"الم" وہ بہت طویل عرصے بعد القرآن کی تلاوت کر رہی تھی اس لیے انداز میں روانگی نہ تھی۔

"ذٰلِکَ۔" وہ اٹک اٹک کر پڑھ رہی تھی۔

"ذٰلِکَ الکِتٰبُ لَارَیبَ۔" ایسی پڑھ رہی تھی جیسے کوئی بچہ ابتدائی دنوں میں پڑھتا ہے۔

"ذٰلِکَ الکِتٰبُ لَارَیبَ فِیہِ ہُدًی لِّلمُتَّقِینَ۔" مہر مسکرائی۔ ایک آیت مکمل کرنے پر دل سرشار ہوا۔

آیت کا ترجمہ پڑھنا شروع کیا۔

"وہ بلند رتبہ کتاب (قرآن) کوئی شک کی جگہ نہیں، اس میں ہدایت ہے متقین کو۔" مہر نے بھنویں اکٹھا کی۔

"متقین کو؟ مگر یہ متقین، ہوتے کون ہیں؟" مہر نے دل ہی دل میں سوچا۔

سوال ذہن میں محفوظ کیے وہ آگے پڑھتی گئی۔

"الَّذِینَ یُؤمِنُونَ بِالغَیبِ وَیُقِیمُونَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّارَزَقنٰھُم یُنفِقُونَ۔" پہلے سے کم مشکل در پیش ہوئی۔ البتہ اس جد وجہد کا بھی اپنا مزہ تھا۔

"جو غیب پر ایمان لاتے اور آداب کے ساتھ نماز پڑھتے اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا فرمایا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔" مہر کے لب "اوہ" میں ڈھل گئے۔ اس کو جواب بھی مل گیا تھا۔

"تو یہ ہوتے ہیں متقین۔" اس نے دل ہی دل میں خود کلامی کی۔ وہ آگے پڑھنا چاہتی تھی، مگر دل سے آواز آئی کہ اسے چھوڑ دینا چاہیے۔ یکبار گی اسے ماں کی باتیں یاد آئیں۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ جب انسان کوئی نیک کام کرتا ہے تو شیطان اس کے دل میں وسوسے ڈالتا ہے۔ اس نے تمام وسوسوں کو جھٹکتے آگے پڑھا۔

رات گہری ہوتی گئی۔ مہر نہ جانے کتنی دیر اس کتاب کو پڑھتی گئی۔ دنیا کے تمام غم وجو دکھو رہے تھے۔ س کا دل بالآخر مطمئن ہونے لگا تھا اور روح پر سکون۔

اور آخر کار پرانی مہر بنت عبد اللہ سلطان واپس آہی گئی تھی۔

وہ جو مہربان ہوا کرتی تھی۔

وہ جو ہمدرد ہوا کرتی تھی!

اسے دنیا سے چھپنے کی ضرورت نہ تھی۔



باب چہارم: ”اٹل اور یقین“

وہ لوگوں سے تو چھپ جاتے ہیں

(لیکن) اللہ سے نہیں چھپ سکتے

وہ راتوں کے وقت جب اللہ کی ناپسندیدہ باتوں

کے خفیہ مشورے کرتے ہیں

اس وقت بھی اللہ ان کے پاس ہوتا ہے،

ان کے تمام اعمال کو وہ

گھیرے ہوئے ہے۔

(سورہ نساء آیت ۱۰۸)



رات کے وقت زیادہ تر آبادی اپنی خواب گاہوں میں نیند کے آغوش میں ڈوبی ہوئی تھی، کچھ تھے جو رات کے اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، اس آبادی کی نیند کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، اپنے شیطانی منصوبے بنانے میں لگے ہوئے تھے۔ یہ وہ تھے جو اپنے آپ کو کامل طاقت سمجھ بیٹھے تھے۔ تکبر کی بھینٹ چڑھنے والے، انسانوں کے روپ میں درندے، یہ لوگ سیاہ تھے، ان کی روحیں سیاہ تھیں۔

رات کے اس پہر عافیتِ زندگی کا رُخ کرتے ہیں، جہاں ملاقات ہونی تھی ان انسانوں کی، جو شیطانوں کی پیروی کو اپنا مقصدِ حیات بنا چکے تھے۔

لفٹ کا دروازہ مخصوص آواز کے ساتھ کھلا۔ لیڈی اقتدار نے سیاہ لانگ ڈریس اور چاندنی رنگ کی ہیلز پہنی ہوئی تھیں۔ آنکھوں میں ملکاؤں جیسی شان وشوکت تھی۔ چھت پر لگی مصنوعی بتیوں نے خالی ہال کو چمکا رکھا تھا۔ آخری دیوار پر تین دروازے تھے۔ ہر دروازے کے پیچھے نیا راز چھپا ہوا تھا۔

آج تمہیں ہم ان تین دروازوں میں سے ایک دروازے کے پار لے جاتے ہیں۔

وہ دائیں طرف کے دروازے کی اور گئی۔ دروازہ کھولنے سے قبل چہرے پر نیم برہمی طاری کی۔

دروازے کی چرچراہٹ نے چیلوں کو اپنی ملکہ کی آمد کی خبر پہنچائی۔ وہ چوکنا ہوئے۔

چار کرسیاں گول دائرے کی صورت لگائی گئی تھیں۔ دیوار کے ساتھ ایک میز تھی جس پر پانی کی بوتل دھری تھی۔ لیڈی اقتدار نے ایک ایک کر کے سب کو گھوری سے نوازا۔ پھر شانِ بے نیازی سے اپنی کرسی پر براجمان ہوئی۔ گردن اکڑا لی، ہاتھ نزاکت سے گود میں دھرے۔

اندھیرے اور بدی کی ملکہ اپنے چیلوں سے کلام کرنے کے لیے تیار تھی۔

"ہمیں اس مدعے پر بات کرنے کے لیے، آخر کار جمع ہونا ہی پڑا۔" گرجدار آواز فضا میں مرتعش ہوئی۔

سرمئی آنکھیں، جو ہمیشہ سنجیدہ رہتی تھیں آج اپنی گہرائی میں سوچ سجائے ہوئے تھیں۔

"صرف میرا خدا جانتا ہے کہ میں نے کتنا چاہا کہ یہ قتل نہ ہو۔ مگر میرے چاہنے یا نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ قتل اٹل اور یقینی ہے۔" اس کے انداز میں مصنوعی بوجھل پن تھا۔

درانی کے چہرے پر ناگواری سی تھی۔ بلاشبہ قتل کی ترغیب سے اسے اعتراض تھا۔

"نیلوفر! تم سب کے سامنے اعتراف کرو کہ اس قتل میں تمہاری برابر کی شراکت داری ہے۔" تکبر آمید نگاہ نیلوفر پر ٹھہری، جو گردن جھکائے بیٹھی ہے۔

"یہ سب میری اجازت سے ہو رہا ہے۔" نیلوفر نے سادگی سے گردن اوپر نیچے ہلائی۔ آنکھیں پرسوچ تھیں۔

درانی کی الجھن میں اضافہ ہوا۔ کچھ تھا جو اسے کھل رہا تھا۔

"لیڈی اقتدار۔ وہ مر گیا تو ہم اپنے ہیرے کیسے حاصل کریں گے؟" درانی نے الجھن کا اظہار کیا۔

لیڈی اقتدار کے چہرے پر ہلکی سی ستائش ابھری۔

"اس کے زندہ ہوتے ہوئے بھی ہیرے حاصل کرنا ناممکن ہے۔ یہاں تک ٹھیک تھا، مگر وہ ہمیں بلیک میل کرتا ہے۔ ناجائز مطالبات آگے رکھتا ہے۔" ٹھہر ٹھہر کر کہتے سرد نگاہ درانی پر ڈالی۔

”یاد رکھو درانی۔ وہ بے وفا ہو گیا ہے۔“ سرمئی آنکھوں میں بے دردی تھی۔ ”بے وفائی کرنے والوں کی سزا صرف ایک ہے، موت۔“

غراہٹ جیسی آواز نے کمرے کی فضا میں سنسنی خیز لہر دوڑا دی۔

”صرف اور صرف موت!“ الفاظ چبا چبا کر دہرائے گئے، گویا کمرے میں موجود ہر فرد کی یاددہانی کروانا مقصود ہو۔

درانی کی الجھن کچھ حد تک کم ہوئی۔

”کیا ایسا ممکن نہیں کہ ہم اس کا کوئی راز کھوج نکالیں؟ اور اسے ہی بلیک میل کریں؟“ درانی نے نئی ترغیب پیش کی۔

”نہیں۔ کوئی فائدہ نہیں ہو گا، درانی۔ وہ جو ہمارے بارے میں جانتا ہے اگر اس نے جذباتی عوام میں پھیلا دیا تو ہمارا پورا کا پورا کاروبار ڈھے جائے گا۔ لاعلمی ہمارا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔“

درانی نے آگے سے کچھ نہ کہا۔ اسے اپنے ہر سوال کا جواب مل چکا تھا۔

”لیکن وہ ہیرے لیڈی۔ ہم انہیں کیسے بازیاب کروائیں گے؟“ اس بار بولنے والا شمس تھا۔

لیڈی اقتدار کے چہرے پر گہری مسکراہٹ در آئی۔ معاً نیلوفر بھی مسکرا دی۔

”اس کے لیے تو ہمارے پاس۔۔۔ وہ ہے۔“

مسکراتی نیلوفر اور مسکراتی لیڈی اقتدار کی معنی خیز نگاہوں کا تبادلہ ہوا۔ اس کمرے میں صرف وہ دونوں تھے جو جانتے تھے کہ یہ ”وہ“ کون ہے۔



اللہ اکبر اللہ اکبر

کھڑکیوں کے ذریعے اذان کی آواز داخل ہوئی اور اس کے کے کانوں کی زینت بنی۔ بستر پر دراز سی لیٹی مہر کی نیند میں خلل پیدا ہوئی۔ آنکھوں میں غنودگی بھری تھی۔ اس نے کروٹ بدلی اور آنکھیں موند لیں۔ وہ دوبارہ سونے لگی۔

اللہ اکبر اللہ اکبر

یکبارگی آنکھ کھلی۔ وہ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی۔ چہرے پہ تھکان اور آنکھوں میں غنودگی ہنوز برقرار تھی۔ دل پھر غفلت کی نیند سو جانے کے لیے مچل رہا تھا۔

اشھد ان لا الہ الا اللہ اشھد ان لا الہ الا اللہ

آنکھیں بند کیے وہ ایک دفعہ پھر سے نیند کے آغوش میں جانے ہی والی تھی کہ معذن کی آواز نے اسے بیدار کیا۔ دماغ بیدار ہونے لگا۔ وہ جان گئی تھی کہ فجر کا وقت تھا۔ مگر جی کی صدائیں اس قدر شدید تھیں کہ اس نے سو جانے کا ارادہ کیا۔

”جو غیب پر ایمان لاتے اور آداب کے ساتھ نماز پڑھتے اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا فرمایا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔“

یکبارگی اسے وہ آیت یاد آئی۔ وہ نیند کے آغوش سے ایک مرتبہ پھر باہر آئی۔ پلکیں جھپکاتے اس نے کمبل جسم سے جدا کیا۔ نرم و ملائم بستر اسے سونے کی دعوت دے رہا تھا۔ آنکھیں بند ہو جانے پر بضد تھیں۔ مگر وہ سب نظر انداز کیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اذان کی آواز بدستور گونج رہی تھی۔

اس نے اپنے پیر چپلوں میں گھسیٹرے اور سیدھا غسل خانے میں بند ہوئی۔ نیند کے مارے اس کا سر چکرا رہا تھا۔ مگر اب وہ غفلت کی نیند نہیں سو سکتی تھی۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کا نفس جاگ چکا تھا۔ اس نے غسل خانے کی بتیاں جلائیں۔ تیز روشنیوں نے آنکھیں چھندیائیں۔ اس نے بلا تاخیر وضوء بنانا شروع کیا۔

ٹھنڈا پانی اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ نیند کم تر کم ہوتی گئی۔ سر پر چھائی دھند صاف ہوئی۔

وہ ایک طویل عرصے بعد نماز پڑھ رہی تھی۔

ایک طویل عرصے بعد اپنے رب کی طرف لوٹی تھی۔

ایک طویل عرصے بعد وہ غفلت کی نیند سے جاگی تھی۔

نماز کے دوران دل بھر آیا۔ آنکھ سے آنسو بھی پھوٹ پڑے۔

عرصۂ دراز غفلت میں کاٹنے کے باوجود اس کا رب اس پر اس قدر مہربان تھا کہ اسے اپنے سامنے حاضر کر رہا تھا۔ اسے دعاؤں میں گڑگڑانے کی توفیق دے رہا تھا۔

وہ اللہ ہے، ہمارا پروردگار۔ رحمٰن ورحیم۔ اس کی طرف بس ایک قدم بڑھانے کی دیر ہوتی ہے۔ صرف ایک کوشش کرنی ہوتی ہے۔ اور وہ ہماری ہر کوتاہی کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

وہ دعاؤں میں گھنٹوں گڑگڑائی۔ یہاں تک کہ سورج کی کرنوں نے کمرے میں دلفریب روشنیاں بکھیر دیں۔ بہت عرصے بعد مہر کو اپنا آپ مکمل لگا۔ باطن کے زخم بھرنے لگے تھے۔ تلخیاں، رنجشیں اور پریشانیاں چھوٹی معلوم ہو رہی تھیں۔

یہ عام فجر نہ تھی۔ یہ مہر کی زندگی کی فجر تھی۔ جو تاریکیاں دہائیوں سے اس کی زندگی پر قابض تھیں ان کو سفید روشنیوں نے چیرا تھا۔

زندگی بے معنی و بے مقصد معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ ہوتی بھی کیسے۔ وہ اس حقیقت کو تسلیم کر چکی تھی کہ اس کا رب اللہ ہے۔ اور جن کا رب اللہ ہوتا ہے ان کی زندگیاں بے معنی ہو ہی نہیں سکتیں۔

☆☆☆

آج کل مہر بنتِ عبد اللہ اپنے آفس کا چکر تسلسل سے لگایا کرتی تھی۔ کام میں اب بھی خاص دلچسپی تو نہ تھی، مگر وقت کٹ جایا کرتا تھا سو وہ چلی جاتی تھی۔ وہ سکرین کو بے مقصد گھور رہی تھی۔ دفعتاً دروازے پر دستک ہوئی۔ عبد اللہ سلطان چوکھٹ پر کھڑے تھے۔

”میں اندر آجاؤں۔“ وہ گرمجوش انداز میں بولے۔

مدھم مسکراہٹ نے مہر کے لبوں کا احاطہ کیا۔

”ضرور۔“ وہ حتی الوسع نرم ہوئی۔

وہ گردن اوپر نیچے ہلا کر اس کے عین سامنے براجمان ہو گئے۔ بہت کم ہوتا تھا مہر ان کے لیے مسکراتی تھی۔

”تم بہتر لگ رہی ہو۔ مجھے دیکھ کر اچھا لگا۔“ وہ جواباً مسکرائے۔

مہر کی مسکراہٹ دھیمی پڑی۔ آنکھیں پر سوچ ہوئیں۔

”میں پہلے کیسی تھی؟“ ان کی آنکھوں میں دیکھے بنا سوال پوچھا۔

”کھوئی ہوئی۔ ہر چیز سے لاتعلق۔ مجھے رپورٹ ملی ہے، پچھلے کچھ دنوں سے تم نے کسی کو نہیں ڈانٹا۔“ وہ شریر لہجے میں بولے۔ مہر دل کھول کر ہنس دی۔

عبداللہ سلطان نے تھم کر اسے ہنستے ہوئے دیکھا۔ یہ نظارا بھی عام نہ تھا۔

”ان سے چغلیاں کروالیں۔ کام ٹھیک سے نہیں کریں گے تو ڈانٹ تو پڑے گی۔ آج تک کسی کی بلا وجہ خبر نہیں لی۔“ اس نے ہنسی قابو کرنے کے بعد وضاحت پیش کی۔

اس کے چہرے پر اطمینان دیکھ کر ان کے دل میں خوشی کی لہریں ابھریں۔ وہ منظر دیکھنے کے لیے جیسے باپ کی آنکھیں ترس گئی تھیں۔ وہ جتنے برے صحیح، باپ ضرور تھے۔ بیٹی کی محبت ان پر فرض تھی۔

”کیا ہے نا، ڈیڈ۔“ مہر نے واپسی انہیں دیکھا۔

”میں اب طلاق کے غم سے نکلنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ ہم اپنے غموں سے تب تک نہیں نکل سکتے، جب تک ہم نکلنا نہ چاہیں۔ میں نے اس رشتے کو اپنا زندگی کا مقصد بنالیا تھا۔ اب اندازہ ہو رہا ہے کہ

زندگی محبت کے مکمل ہو جانے کا نام نہیں۔ یہ رشتے، یہ محبتیں یا ناطے تعلق اس کا حصہ ضرور ہیں، مگر وہ پوری زندگی نہیں۔"

عبداللہ سلطان کی آنکھیں چمکیں۔

"کس چیز نے روکا تمہیں مہر؟ کیوں اس کے لیے اتنے سال ضائع کیے اس کے ساتھ؟" انہوں نے لب بھینچ کر خفگی سے کہا

سیاہ آنکھیں مغموم ہوئیں۔

"امید۔ امید کہ وہ بدل جائے گا۔ بعض اوقات یہ امیدیں ہمارا سب سے بڑا دشمن بن جاتی ہیں۔" وہ زخمی سا مسکرائی۔

دل ہلکا پھلکا ہونے لگا تھا۔ باپ بیٹی یوں دل کی باتیں کم ہی کیا کرتے تھے۔ عبداللہ سلطان کھڑے ہو گئے۔

"کہاں جا رہے ہیں؟" اس نے پیچھے سے پکارا۔

"احمد یوسف سے ملنے۔ اس نے نئی فرم کھولی ہے۔ مبارکباد دینا تو بنتی ہے۔" ہاتھ جیبوں میں ڈالے۔

اس نام نے دنیا کو رنگوں سے بھر دیا۔ دل کی دھڑکنیں بار بط ہوئیں۔ لب مسکرانے کے لیے بضد تھے۔ مگر وہ مسکرا کر کوئی نیا عقدہ کھولنا نہیں چاہتی تھی۔

"میں بھی چلوں؟" آواز کپکپائی۔ وہ جیسے سمجھ نہ سکی کہ وہ سب چھوڑ چھاڑ کر جانا کیوں چاہتی تھی؟ اس کو تو کبھی یوں ملنے ملانے کا دل نہیں کرتا تھا۔

عبداللہ سلطان کو حیرت کا جھٹکا لگا۔

"تم کب سے ان کاروباری معاملات میں اتنی دلچسپی لینے لگی؟" وہ تفتیشی نگاہ لیے بولے۔

مہر نے ذرا سی شرم کے مارے گردن جھکائی اور پرس کندھے پر ٹانگا۔

"بس آج سے۔ اب چلیں۔" بالوں پر ہاتھ چلاتے ہوئے وہ ان کے شانہ بشانہ چلنے لگی۔

وہ دونوں آفس کی راہداری میں چل رہے تھے۔ مدھم بھنبھناہٹ کانوں سے ٹکرائی۔

"دیکھیں کام کا وقت ہے، اور ان کی باتیں نہیں ختم ہو رہیں۔" مہر نے آفس کا جائزہ لیتے تبصرہ کیا۔

عبداللہ سلطان کے چہرے پر شریر مسکراہٹ بکھری۔

"تو تم اتنا بھی نہیں بدلی۔" طنز کسا گیا۔ مہر نے مسکرا کر گردن جھٹک دی۔

"ویسے، آپ کو احمد یوسف اتنا کیوں پسند ہے؟" اس نے لاتعلق سا انداز اختیار کیا۔ دل کی باتوں کے آشکار ہونے کا وقت جو نہیں ہوا تھا۔

"مجھے لوگ نہیں، ان کے کام پسند آتے ہیں، مہر۔ بزنس کی دنیا میں انسان سے زیادہ اس کی کارکردگی اہم ہے۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولے۔

”ایسی کیا کارکردگی ہے اس کی جو آپ اتنا متاثر ہورہے ہیں؟“ ”دل نے رفتار پکڑلی۔وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اس اجنبی کے بارے میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہی تھی جس سے بس تین بار ہی ٹوٹی پھوٹی ملاقاتیں ہوئیں۔

”تم جانتی نہیں، یہ جو فرم وغیرہ ہیں اب تک پرانے سسٹم پر چل رہی ہیں۔ بھئی زمانے کے ساتھ سسٹم اپ ٹوڈیٹ رکھنا چاہیے۔احمد یوسف جدید ٹیکنولاجی کا استعمال کرتا ہے۔“ وہ مصروف سے انداز میں بولے۔

بے خبر اس بات کے کہ مہر کے چہرے پر تبسم بکھر چکی تھی۔وہ باہر آئی تو آج ہوائیں اور بھی زورو شور سے اپنے وجود پر محسوس ہو رہی تھیں۔اسے پرندوں کا شور سہانا لگا۔اسے ہرے بھرے درخت دلفریب معلوم ہوئے۔ساری دنیا خوبصورت ہونے لگی تھی۔

نہ جانے کیوں؟

☆☆☆

احمد کا آفس چھوٹے رقبے پر بنا تھا، البتہ تھا بہت خوبصورت۔مہر نے ہاتھ میں گلدستہ تھاما ہوا تھا۔ عبداللہ سلطان مودب مسکراہٹ لیے اس سے گفتگو کررہے تھے۔

”تمہارا کام ہمیشہ ہی مجھے متاثر کرتا ہے احمد۔“ انہوں نے آفس کی تیاریوں کی طرف اشارہ کیا۔

دیوار کے ساتھ ڈیسک لگائی گئی تھی، جہاں ایمپلائیز اپنی ذاتی کمپیوٹر سکرینز پر کام کررہے تھے۔ کافی بینز کی مہک نے فضا میں تازگی بکھیری ہوئی تھی۔اس نے گردن جھکائے سینے پر ہاتھ رکھا اور داد وصول کی۔

اس کا یہ انداز ہر بار کی طرح مہر کو پگھلانے میں کامیاب ہوا۔ سادگی اس مرد پر تمام تھی۔

وہ دونوں گفتگو کرتے ہوئے کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پر مہر کچھ نہیں سن رہی تھی۔ بس اسے بولتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ پُر تکلف مگر مبہم مسکراہٹ ہمہ وقت احمد کے لبوں پر چھائی رہتی۔ آنکھوں میں عاجزی وانکساری کی انتہا تھی۔ کہیں سے نہ لگتا تھا کہ وہ شخص بلندیوں کو چھو رہا ہے۔

وہ احمد کے ذاتی آفس میں تھے۔ احمد پاور چیئر پر بیٹھا۔ مہر نے پھولوں کا گلدستہ اس کی ڈیسک پر دھر دیا۔ ٹھیک اسی لمحے احمد کی نظر اس پر پڑی تھی۔ وہ ترنت نظریں پھیر لینا چاہتا تھا۔ مگر دل میں کوئی چنگاری ابھری۔ لمحے بھر کے دل نے اچھل کود کی۔ وہ اسے دیکھے گیا۔ ہاں وہ خوبصورت تھی۔ بہت خوبصورت۔ پر اس کی سیاہ آنکھیں سب سے زیادہ پر کشش تھیں۔ وہ نہایت گہری معلوم ہوتی تھیں، کسی بھول بھلیا جیسی، جسے دیکھتے ہی دیکھنے والا کھو جائے۔

اس نے دل پر قابو پا کر نظریں پھیر لیں۔ انجان اس بات سے کہ مہر اس کی نظروں کی چوک سے نہ صرف واقف تھی بلکہ انہیں دل کی گہرائیوں میں قید کر چکی تھی۔ فضا پہلے ہی خوشگوار تھی، اب اور خوشگوار ہو گئی تھی۔

”میں تو مہر سے کہتا ہوں کہ اسے بھی کاروبار میں دلچسپی لینی چاہیے۔ مگر یہ سنتی ہی نہیں۔“

مہر نے چونک کر اپنے ڈیڈ کو دیکھا۔ کیا ضرورت تھی اس کے سامنے یہ سب کہنے کی؟

”عبداللہ صاحب۔ ہر انسان کی اپنی صلاحیتیں، اپنی خوبیاں ہوتی ہیں۔ ہر کام ہر کسے کے بس میں نہیں ہوتا۔“

اس کا کہنا تھا، اور مہر کی خود ساختگی فنا ہوئی۔ وہ بے اختیار مسکرائی۔ اس مرد کے معمولے فقرے فضا مہکا دیتے تھے۔

”اور ویسے بھی۔“ اس نے مہر کو تائیدی انداز میں دیکھا۔

اس کی آنکھوں کی حرکت بارہا اس کی نبض کے ساتھ کھلواڑ کرتی تھیں۔

”مجھے محترمہ مضبوط معلوم ہوتی ہیں۔“ وقفہ لیا۔

یکبارگی مہر کو وہ موسلا دھار بارش یاد آئی۔

”خود کو مضبوط کرلیں۔ جلد حالات آپ کی مضبوطی آزمائیں گے۔“ مسکراہٹ دھیمی پڑی۔

”ہے نا؟“ آنکھوں میں تنبیہ تھی۔

مہر نے گردن اوپر نیچے ہلائی۔

”اس بات پر مجھے کوئی شک نہیں۔“ عبداللہ سلطان بولے۔ ”مہر مضبوط ہے۔ تلخ اور اذیت ناک وقت کے بعد بھی اس نے خود کو کھڑا کیا۔“

مہر دوسری طرف الجھ گئی۔ وہ دانستہ طور پر اپنی باتیں یاد کروا رہا تھا۔ کیا تھا ایسا جو وہ مشکوک مگر پرکشش مرد جانتا تھا جو اس سے چھپی ہوئی تھی۔

”لیکن بس۔ سوچتا ہوں۔ ایک نہ ایک دن میں نے چلے ہی جانا ہے۔“

مہر نے خفگی سے ڈیڈ کو دیکھا۔

”وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر لگتا ہے آپ کی بات سے مہر خفا ہو گئیں۔“ احمد نے مہر کی طرف آنکھ سے اشارہ کیا۔

عبداللہ سلطان نے قہقہہ بلند کیا۔ مہر نے گردن کا رُخ پھیرا۔ تاثرات سخت ہو چکے تھے۔

”ہماری اولادیں جذباتی ہوتی ہیں۔ اب یہ تو حقیقت ہے۔ ہم سب نے ایک نہ ایک دن چلے ہی جانا ہے۔“

مہر کے نتھنے پھولے۔ مگر بولی کچھ نہیں۔

کچھ دیر دونوں معمول کی گفتگو ہوئی تھی۔ پھر وہ چلے گئے۔

اس نے دروازہ بند ہوتے دیکھا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔ دل میں تازگی گھلی ہوئی تھی۔ ذہن میں بار بار اس عورت کا چہرہ ابھر رہا تھا۔ اور وہ بے اختیار مسکرا دیتا۔ وہ کچھ بولی نہیں تھی۔ خاموش رہی۔ پھر کیوں وہ بھلی معلوم ہو رہی تھی؟

احمد نے سر جھٹکتے اس سے منسلک ہر خیال کو جھٹکنا چاہا۔ وہ جانتا نہ تھا کہ اس ایک خیال پر وہ قادر نہیں۔

☆☆☆

آسمان پر چاند کا نام و نشان نہ تھا۔ رات میں غیر معمولی تاریکی تھی۔ ہوا کی سرسراہٹ، پتوں کی جھلملاہٹ کا امتزاج فضا میں ہیبت ناک گیت پیدا کرتا۔ ایسی دہشت رقم تھی جو حلق کی گہرائیوں میں کانٹے چبھوتی۔

فضا میں پنپتی ہولنا کی سے بے خبر، عبد اللہ سلطان گاڑی کی پچھلی نشست میں براجمان، گردن جھکائے موبائل استعمال کر رہے تھے۔ یکبارگی موبائل بج اٹھا۔ سکرین پر اجاگر نام پڑھ کر لبوں پر کمینی مسکراہٹ بکھری۔ موبائل کانوں سے لگایا۔

"اس ماہ کی رقم لینے آجاؤں؟" وہ مزے لینے والے انداز میں بولے۔

وہ شام کے خوش باش، شوخ و چنچل عبد اللہ سے قدرے مختلف تھے۔ فطرت میں گھلی سفاکی چہرے پر ابھری۔

"عبد اللہ۔ کم سے کم ہماری سالوں کی پارٹنر شپ کا احترام کر لو۔ ہماری امانت ہمیں لوٹا دو۔"

درانی کی خشک مگر پر سکون آواگونجی۔ وہ ہنس کر لوٹ پوٹ ہوئے۔

"یہ سب بہت ہی اِم پریکٹیکل اور فضول باتیں ہوتی ہیں درانی۔ خاص کر میرے جیسے کاروباری آدمی کے لیے۔" وہ تمسخر سے بولے۔

"تم بھی جانتے ہو اور میں بھی، کہ ہمارا ساتھ صرف مطلب کا تھا۔ میں تمہارے کام آتا تھا اور تم لوگ میرے۔ اس لیے یہ پارٹنر شپ والا ڈراما بند کرو اور چپ چاپ میرا پیٹ بھرتے رہو۔ تم لوگوں کی بہتری اسی میں ہے، درانی۔"

درنانی نے سرد سانس خارج کی۔

"جیسی تمہاری مرضی۔ شمس تمہارا انتظار کر رہا ہے۔" آواز میں ناگواری تھی۔

اپنے سکون آراستہ آفس میں بیٹھا درانی کافی برہم نظر آرہا تھا۔ اس نے غصے سے کال کاٹی۔ فون ڈیسک پر اچھالا۔ مقابل کرسی پر شمس براجمان تھا۔ ٹھہری ہوئی نگاہیں شمس کی طرف مرتکب کیں۔ قلبی اضطراب چہرے پر مدعو ہوا۔

سرد فضا میں بھیانک خاموشی کا راج رہا۔ شاید جس شخص نے حکم صادر کرنا تھا، وہ کترا رہا تھا۔ کوئی شے اسے اب بھی روک رہی تھی۔

"آج کی رات۔" بالآخر وہ بول اٹھا۔

شمس کے کان کھڑے ہوئے۔ لحظے بھر کو کمرے کی ہر شے برف ہوئی۔

"آج کی رات اس کی آخری رات ہونی چاہیے۔"

شمس نے سر اثبات میں ہلایا اور پہلی فرصت میں چلا گیا، اپنے باس کے حکم کو بجالانے۔

☆☆☆

نیلی ویگن ویران سوسائیٹی میں داخل ہوئی جہاں ہر طرف کچے پکے مکانات تھے۔ اس نے ویگن ایسے ہی ایک گھر کے سامنے پارک کی۔

گھر کے اندر اپنی دہشت باور کرواتے ہوئے گپ اندھیرے کا راج تھا۔ چھت سے ایک تار لٹک رہی تھی جس پر ایک سوئچ لگا ہوا تھا۔ سوئچ دبنے پر دیوار پر لگا بلب روشن ہوا۔

زیرِ تعمیر گھر زرد روشنیوں کے باعث واضح ہوا۔ اس نے جیب سے پستول نکالی اور اینٹوں کی دیوار کے پیچھے چھپ گیا۔ وہ سانس تک محتاط ہو کر لے رہا تھا۔

کئی گھڑیاں اس سنسانی کے زیر ہوئیں۔ شمس کا جسم پسینے میں بھیگ چکا تھا، شرٹ تک جسم سے چپک چکی تھی۔ دفعتاً اسے پہیوں کے رگڑنے کی آواز آئی۔ وہ چوکنا ہو گیا۔ عبداللہ سلطان گاڑی سے اترے۔ چہرے پر تفاخر بھری مسکان تھی۔

وہ موت کے پہرے سے بے خبر تھے۔ موت بھی خاموشی سے انہیں اپنی جانب قدم بڑھاتے دیکھ رہی تھی۔ اور موت ایسی ہی ہوتی ہے، وہ اپنے شکار کی بے خبری سے لطف اٹھاتی ہے۔

وہ زرد بتی کے نیچے کھڑے ہو کر شمس کا انتظار کرنے لگی۔ انہیں خاموشی سے اکتاہٹ محسوس ہوئی، تو زیر لب کوئی پرانا گیت گنگنایا۔ ٹھنڈی ہوا ان کی پشت سے ٹکرائی۔ ان کے بال لہرائے۔ ہر طرف سکون ہی سکون تھا۔ کہاں جانتے تھے کہ یہ سکون دھوکے کے سوا کچھ نہ تھا۔

یکبارگی انہیں کچھ احساس ہوا۔ جیسے کوئی برفیلی شے ان کی گردن کی پشت سے ٹکرائی ہو۔ ایک لمحے کے اندر سارا سکون غارت ہوا۔ ریڑھ کی ہڈی سنسنا اٹھی۔ سانسیں جو لمحے پہلے باربط تھیں، اکھڑنے لگیں۔ عبداللہ سلطان کی ساری کائنات زلزلے کے زیر ہوئی۔

”ہاتھ اوپر۔“

شمس کی بھاری آواز نے ان کی روح پر خنجر چلائے۔

”پیچھے مڑنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔ زیادہ ہوشیاری کی تو میں گولی چلا دوں گا۔“

شمس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ تر پیشانی پر لاتعداد سلوٹیں تھیں۔ ماتھے کی لکیروں کے درمیان پسینے کی بوندیں جمع تھیں۔

اور یہ وہ وقت تھا جب عبد اللہ سلطان کو یقین ہوا کہ انہیں جال میں پھنسا لیا گیا ہے۔ آنکھیں خوف سے پھٹیں۔ دل کی دھڑکنیں اتنی تیز ہوئیں کہ سماعت سے ٹکرائیں۔

"میں نے کہا ہاتھ اوپر۔"

عبد اللہ سلطان نے کرنٹ کھانے والے انداز میں ہاتھ اوپر کیے۔

دل ہی دل میں انہوں نے دعا کی کہ کاش انہیں کوئی بچانے آجائے۔ وہ بھول گئے تھے کہ، جب موت شکار منتخب کر لے، تو دعائیں بھی اسے شکار کرنے سے روک نہیں سکتی۔

"میری جان چھوڑ دو۔" اپنے اعصاب قابو کیے۔ انہیں جینا تھا۔ اور جینے کی تگ و دو میں غلطاں انسان سے زیادہ بے بس کوئی نہیں ہوتا۔

"تم نے ہمارے ساتھ بہت گیمز کھیل لیں، عبد اللہ۔" وہ پھولتے ہوئے تنفس کے ساتھ کہہ رہا تھا۔

"اس لیے اب ہم تمہارے ساتھ یہ آخری گیم کھیلیں گے۔ اور اس گیم کے اختتام میں تمہارا کھیل ختم۔" وہ چبا چبا کر بولا۔

پسوتل کی نال اور مضبوطی سے ان کی کھوپڑی پر کسی۔

"میں تمہیں بتا سکتا ہوں وہ ہیرے کدھر ہیں۔" عبد اللہ سلطان کو فرار حاصل کرنے کا صرف یہی راستہ نظر آیا۔

ان کے ذہن کے پردے پر صرف ایک ہی انسان کا خاکہ تھا۔ مہر کا خاکہ۔ اتنے سالوں بعد ان کے تعلقات ٹھیک ہوئے تھے۔ وہ کچھ ہی دنوں کے لیے صحیح، مگر جینا چاہتے تھے۔

مگر موت ہے اٹل، اور موت ہے یقینی۔ جس وقت حکم ہوتا ہے وہ نازل ہو جاتی ہے۔ انسان کا چاہنا یا نہ چاہنا اس لمحے بے معنی ہو جاتا ہے۔

"میں سن رہا ہوں۔" شمس کی چہرے پہ حیوانیت بھری مسکراہٹ تھی۔

"میرے آفس کے شیلوز میں ہیں۔ انہیں صرف اور صرف میں ہی کھول سکتا ہوں۔ اب بندوق نیچے کرو اور مجھے جانے دو۔" عبداللہ سلطان نے ہمت مجتمع کی۔

انہیں امید کی کرنیں نظر آئیں۔ شمس کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ عبداللہ سلطان پستول کا اپنی کھوپڑی سے منقطع ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ مگر۔۔ مگر وہ نیچے نہ ہوئی ایک دفعہ پھر سیان کے سر پر سیاہ بادل چھانے لگے۔ امید کی کرنیں دم توڑنے لگیں۔ تیر نشانے پر نہیں لگا تھا۔

"آخری خواہش؟" شمس غرایا۔

کوئی مسکرا رہا تھا، اور ایک کے لیے سانسیں لینا دشوار ٹھہرا تھا۔

"تم سب کو ضرورت ہے میری۔ میرے بغیر تمہارے کاروبار تباہ ہو جائیں گے۔ تم مجھے یوں ختم نہیں کر سکتے۔" ایک آخری کوشش کی۔

"عبداللہ اب ہم تمہاری ان چالوں میں نہیں پھنسنے والے۔ تم بولو گے وہ تمہارے شیلوز میں ہیں اور ہم یقین کر لیں گے۔ اتنا بیوقوف سمجھا ہے ہمیں۔" شمس زور سے ہنسنے لگا۔

عبد اللہ سلطان کی آنکھیں بے یقینی کے باعث پھیلیں۔ وہ جان گئے تھے کہ اب فرار نا ممکن تھی۔ شمس کی درندگی بھری ہنسی ان کے کانوں میں چبھ رہی تھی۔

"تم مرتے مرتے اپنی بیٹی کو قربان کر گئے ہو۔ ہمارے کاروبار میں تمہارا کردار اب تمہاری پیاری سی نازک بیٹی ادا کرے گی۔" شمس ٹھہر کر مزے لینے والے انداز میں بولا۔

"مہرو!" وہ بے ساختہ بولے۔ ان کے سر پہ جیسے ہتھوڑے برسا دیے گئے تھے۔ عبد اللہ سلطان اپنی تمام تکلیفیں بھلا گئے۔ سر پر اب صرف فکر سوار تھی، اپنی مہرو کی۔ اپنی اکلوتی بیٹی کی۔ یہ سیاہی کی فوجیں تھیں۔ وہ ان کا مقابلہ کیسے کرتی؟

وہ خود کو ملامت کرتے ضرور، پر موت کی گھڑی میں ملامتوں کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔

"مہر کو کچھ نہیں کرنا، پلیز۔" وہ بارعب، ذہین بزنس مین تو مر چکا تھا۔ وہ باپ کی طرح ظالم سے فریاد کر رہے تھے۔

"یعنی تمہاری کوئی بھی آخری خواہش نہیں ہے۔" شمس ٹرگر دبانے کے لیے تیار تھا۔

اور شمس کی اس درندگی کے درمیاں۔۔۔،

عبد اللہ سلطان کے سر پر ابلتے ہوئے خوف و خدشات کے بیچ۔۔۔،

جہاں مہر کی بربادی کے بیج بو دیے گئے تھے۔۔۔،

رات کی تاریکی میں۔۔۔،

عمارت پر چھائی ٹھنڈی ہوا کے آغوش میں۔۔۔،

جہاں خواب ٹوٹنے والے تھے،

زوردار آواز گونجی!

جو کہ کانوں میں چبھتی تھی،

جو کہ دل کو جھنجوڑ کر رکھ دیتی تھی۔

روح۔۔۔جو جسم میں کبھی قید ہوا کرتی تھی،

بالآخر وہ جسم کے اس پنجرے سے آزاد ہو گئی تھی۔

☆☆☆

لاؤنج کے صوفے پر براجمان مہر قرآن کی تلاوت کر رہی تھی۔ ٹھیک اسی وقت انٹر کام بجا۔ آس پاس کوئی ملازمہ نہ تھی، یعنی یہ کال اسے ہی اٹھانی تھی۔ اس نے تھکی ہوئی سانس خارج کی۔ قرآن سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور انٹر کام تک گئی۔

"جی۔" وہ عام سے انداز میں بولی تھی۔

"میم، آپ سے مناج ملنے آئی ہیں۔" مہر کے چہرے پہ شدید ناگواری ابھری۔

تو وہ ڈھیٹ لڑکی یہاں تک پہنچ گئی تھی۔

"ٹھیک ہے، آنے دیں۔" مہر کی آواز نیم غصیلی تھی۔ وہ بھی جاننا چاہتا تھی کہ مناج آخر بات کیا کرنا چاہتی تھی۔

وہ قصر کے ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔ اس نے ملازمہ کو بتا دیا کہ مہمان عورت کو ڈرائنگ روم میں بھیج دیا جائے۔

کوئی اور ہوتا تو سجے سنورے عالی شان محل نما قصر کا آنکھ بھر کر جائزہ ضرور لیتا۔ لیکن وہ مناج تھی، دنیا کی رونقیں اس کی آنکھوں کو خیرہ نہیں کرتی تھیں۔

مہر نے تپتی ہوئی نظر سے اس کا استقبال کیا۔ ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کا کہا۔ مناج بھی چپ چاپ بیٹھ گئی۔

”آپ تو کافی ڈھیٹ نکلیں۔“ مناج جیسے ہی صوفے پہ آرام دہ سی ہوئی اس نے چوٹ کرنا شروع کی۔

”میں نے کہا تھا مجھے آپ سے نہیں ملنا لیکن پھر بھی آپ آ ہی گئیں؟“ وہ تنفر سے بولی۔ ذہن میں بار بار مناج کے زہر آلود الفاظ گونج رہے تھے۔

”میں جذباتی نہیں ہوں۔ مجھے جو کام کرنا ہوتا ہے وہ میں کر کے ہی دم لیتی ہوں۔“

اس کی آواز سن کر مہر ٹھٹک گئی۔ وہ بے جان سی تھی۔ تھکی ہوئی۔ الفاظ نہایت کھوکھلے تھے۔ اس کے کندھے بھی جھکے ہوئے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ اس عورت میں جینے کی آرزو تھی ہی نہیں۔

اس نے مصمم ارادہ باندھا تھا کہ وہ مناج کو اچھی خاصی سنائے گی۔ مگر اس کے مرجھائے ہوئے باطن کو دیکھ کر وہ چاہ کر بھی سخت نہ ہو سکی۔

”خیر۔“ مہر نے سر جھٹکا۔ ”اب آ ہی گئی ہیں۔ تو بات بھی کر لیں۔“

”میں جو کہوں، پلیز اسے تحمل سے سننا۔ کھلے دماغ سے سب سمجھنے کی کوشش کرنا۔“

مہر نے شانے اچکا دیے۔

”آپ سید ھامدعے پر آسکتی ہیں۔“ وہ لاپرواہ سے انداز میں بولی تھی۔ وہ اس ملاقات کو جلد از جلد نبٹانا چاہتی تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ مناج ٹھہری۔ ”میں تمہیں آؤٹ آف کورٹ سیٹلمنٹ کرنے کی دعوت دینے آئی ہوں۔ تم اپنے وکیل کی موجودگی میں ہمارے ساتھ ٹیبل پر بیٹھ جاؤ۔ ہم مل کر درمیانی راہ نکالنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔“

مہر کا چہرہ بے تاثر رہا۔

”کورٹ کے اس جھنجھٹ میں سب سے زیادہ نقصان تمہاری بیٹی کو پہنچے گا۔ میں نے کئی کسٹڈی کیسز لڑے ہیں، آخر میں بچے رلتے ہیں اور والدین لڑ مڑ کر آدھے ہوئے ہوتے ہیں۔ کیا تمہارے لیے عنایا کا ذہنی سکون اہم ہے یا اپنی انا اور ضد؟“ مناج نے اپنی بات مکمل کی۔

مہر نے مناج پر استہزائیہ نگاہ ڈالی۔

”حسام کا کیا؟ کیا اس کو سزا نہیں ملنی چاہیے؟ آپ مجھے سمجھ کیوں نہیں رہیں۔ اس نے میری زندگی تباہ کی ہے۔ میں اسے اپنی بیٹی کیوں دیتی پھروں؟“ وہ اطمینان سے بولی۔

”میں بطور ایک عورت تمہیں سمجھ سکتی ہوں۔ اور میں خوش ہوں کہ تم نے ایک ایسے رشتے کو چھوڑا جس میں تمہارا ساتھی تمہارے اوپر ڈرگز کو ترجیح دیتا تھا۔ ہر عورت کو ایسے رشتے کو چھوڑ دینے کا حق حاصل ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے ایک عورت کو ایسے رشتے میں پستے دیکھا ہے۔“

کیا مہر کو وہم ہوا تھا یا واقعتاً مناج کی آواز لرکھڑائی تھی؟

”مگر بدقسمتی سے اس عورت کے پاس اس رشتے کو چھوڑنے کا آپشن ہی موجود نہ تھا۔ مگر میری اس گفتگو کا مدعہ تم نہیں ہو۔ عنایا ہے۔ اس کا باپ زندہ ہے۔ اور وہ یہ بات جانتی ہے۔ دنیا میں ایسا کوئی جادو ہے نہ دوائی جو بیٹی کے دل سے باپ کی محبت مٹا دے۔ کیا یہ عنایا کے ساتھ ناانصافی نہیں کہ باپ کی یاد اور باپ کی محبت کے ہوتے ہوئے وہ اس کی شفقت سے محروم ہو؟“

مہر کے تاثرات اب کی بار نرم پڑے۔ اسے درِفشاں سے ملاقات یاد آئی۔ سچ تو یہ تھا کہ تب سے لے کر اب تک وہ اس بارے میں خود کشمکش کا شکار تھی، مگر کوئی حتمی فیصلہ لینے سے قاصر تھی۔

”مگر۔“ مہر جیسے مزید کچھ دلیل کھوجنے لگی۔ مناج نے اس کے بولنے کا انتظار کیا مگر وہ کچھ نہ بولی۔

”تمہارے پاس کہنے کو کچھ نہیں بچا ہے۔“

”تم جو فیصلہ آج لو گی وہ تمہارا مستقبل طے کرے گا۔ ہم مل کر حل نکالیں گے۔ تم بس یہ سوچو کہ عنایا کتنی خوش ہوگی۔ وہ جب بڑی ہوگی تو تمہارے اس فیصلے پر فخر محسوس کرے گی۔ تم اس کی نظر میں مثالی ماں بننے کا موقع گنوا سکتی ہو۔ سوچ لو، مہر۔ اچھی طرح سوچ لو۔“ اس نے ٹیک لگائی۔ جان گئی تھی کہ تیر نشانے پر لگا ہے۔

مہر گردن جھکائے خاموشی سے غور کرتی گئی۔

”ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔“ بالآخر وہ بول اٹھی۔

مناج نے ایک فاتحانہ سی سانس خارج کی۔

”ہم آؤٹ آف کورٹ سیٹلمنٹ کرلیں گے۔“ اسے کوئی دلیل ڈھونڈنے پر بھی نہ ملی سو ہار تسلیم کرلی۔

مناج کے دل سے بوجھ سرکا۔ آدھا کام تمام ہوا۔ اس کیس سے دستبرداری قریب تر تھی۔

”جب بھی آپ تیار ہوں، اپنے وکیل کے ساتھ میرے آفس آجائیں۔ ہم باہمی رضامندی سے معاملات طے کریں گے اور کورٹ سے کیس اٹھالیں گے۔“ مناج یہ کہتے ہوئے کھڑی ہوئی۔

مہر اسے رُخصت کرنے کے لیے کھڑی ہوئی۔ وہ عورت ملاقات سے قبل جتنی بری لگی تھی، اب اتنی ناگوار معلوم نہ ہو رہی تھی۔ اس کی شخصیت میں کچھ فرسودہ تھا۔ جو دل کو دکھی کردیتا۔

ٹھیک اسی گھڑی ہانپتی ہوئی ملازمہ لاؤنج میں داخل ہوئی۔ مہر تشویش میں مبتلا ہوئی، البتہ اس نے چہرے کو حتی الوسع پرسکون رکھا۔

”میم باہر پولیس آئی ہے۔“ مہر نے ایک جھٹکا سا لیا۔

مناج پوری کی پوری پیچھے مڑی اور تیز قدم بڑھاتے ہوئے کمرے سے باہر نکلی۔

مہر اور ملازمہ کمرے میں اکیلے تھے۔ سیاہ آنکھوں میں سوالیہ تاثر ابھرا۔

”کیا آپ کو بتایا کہ وہ کیوں آئی ہے؟“

چہرے پر سرد مہری دیکھ کر کہیں سے نہ لگتا تھا کہ اندر سے اس کی روح کس قدر بے چین تھی۔

''نہیں میم۔'' مہر کے ماتھے پہ شکنیں ابھریں۔

وہ کشادہ لان میں پہنچی۔ مناج پولیس افسر سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کے چہرے کی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ مہر کی تشویش میں اضافہ ہوا۔ اس نے خود ساختہ طور پر اپنے قدموں کی رفتار سست کی۔ وہ کسی انہونی کو بھانپ سکتی تھی۔ انہونیاں خود کو آشکار کرنے سے پہلے علامتیں ضرور چھوڑتی ہیں۔

پولیس افسر نے رُخ اس کی طرف موڑا۔ مہر نے گہری سانسیں خارج کر کے اعصاب قابو کیے۔

''مس مہر۔ ہم نے آپ کو ایک خبر سنانی ہے۔'' آواز میں فسوں قائم تھا۔

''جی۔ میں سن رہی ہوں۔'' اس نے طوفان کو دبایا۔ چہرہ پر سکون ظاہر کیا۔

ہوا ساکن ہوئی۔ دل مٹھی میں جکڑا۔ آنکھیں پلک جھپکنا بھول گئیں۔

''ہمیں آپ کے والد عبداللہ سلطان کی ڈیڈ باڈی ملی ہے۔ شناخت اور تفتیش کے سلسلے میں آپ کو ساتھ چلنا ہو گا۔''

سر پر پوری قوت سے ہتھوڑا برسا۔ وہ سانس لینا بھول گئی۔ اسے لگا جیسے ساری دنیا فنا ہو گئی تھی اور بس وہ رہ گئی تھی۔ تنہا، اکیلے، بے سہارا۔ نہ کوئی ساتھی، نہ کوئی مددگار۔ آنکھوں کے سامنے دھند چھا رہی تھی۔ اس نے شدید جذباتی کیفیت کا مقابلہ کیا۔ چہرے پر سکون برقرار رکھا۔

''کے۔۔کیسے؟'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔

آنکھوں میں ڈھیر سارا کرب نمایاں۔ وہ نم ہوئیں۔ دل دو حصوں میں کٹ گیا۔

”عبد اللہ سلطان کا قتل ہوا ہے۔“ مہر کو اپنا آپ کسی سمندر کی گہرائی میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ جہاں سانس لینے کو ہوا نہیں، اور آنکھوں کے سامنے تھا گہرا اندھیرا۔

مناج بے تاثر چہرے سے سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ مگر دل مچل رہا تھا۔ مہر اس کی دوست تھی نہ کوئی رشتہ دار۔ بس ایک تعلق تھا ان میں۔ ان دونوں کی تکالیف یکساں تھیں۔

”میں بھی آ رہی ہوں ساتھ۔“

جو سالوں پہلے اپنے باپ کو کھو چکی تھی، اس عورت کی ہمت بننے چل پڑی جس نے چند لمحے پہلے اپنے باپ کو کھویا تھا۔ مشکلوں میں انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔

☆☆☆

(”ابو جا رہے ہیں!“)

مہر اور مناج سرد خانے کی پتلی سی راہداری عبور کر رہے تھے۔ مہر کے بال ماتھے پہ بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے کی رنگت اڑ چکی تھی۔۔ آنکھوں کی چمک ماند تھی۔ وہ رو نہیں رہی تھی۔

فی الوقت وہ رو نہیں رہی تھی۔

(”ابو نہ جائیں۔“)

وہ بے جان سی چال چل رہی تھی۔ ہوش و حواس زائل ہو چکے تھے۔ وہ اس قدر غیر حاضر تھی کہ اسے پیروں تلے زمین تک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

(”ابو نہ جائیں۔“)

وہ ایک دروازے کے پاس رک گئی۔ یہ وہی دروازہ تھا جس کے پار المناک منظر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے دروازے کے ناب کو تھاما۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اسے گھما ہی نہیں سکتی۔ کچھ لمحے اس کا جسم بالکل ساکن ہو گیا۔

(''ابو آپ نہیں جاسکتے۔'')

سرد خانے کی راہداری میں چبھتی ہوئی خاموشی تھی۔ مناج کمرے کے باہر بے چین سی کھڑی تھی۔ اس کے ذہن میں ماضی کی کربناک یادیں سرگرداں تھیں۔

دفعتاً مہر کمرے سے باہر آئی۔ اس کا حال بے حال تھا۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر اونچی اونچی سانسیں لے رہی تھی۔

(''ابو آپ نہیں جاسکتے۔'')

''ڈے۔۔ڈ'' اس کی آواز لڑکھڑائی۔ مناج نے مہر کو کندھے سے تھام لیا۔ مگر وہ کچھ بولی نہیں۔ وہ تو خود جانتی نہیں تھی کہ ایسے وقتوں میں آخر بولا کیا جاتا ہے۔ کسی نے اسے کبھی بتایا جو نہ تھا۔

''ڈیڈ۔۔۔ نہیں رہے۔'' مہر کا دل شاخ سے گرتے پتے کی مانند پھڑپھڑایا۔

رنج نے دل میں پنجے گاڑے۔

کمرے کے اندر اس نے اپنے ڈیڈ کا بے جان وجود دیکھا تھا۔ وہ جو کسی زمانے میں اس کی نظروں کے سامنے ہوا کرتے تھے۔ ہنس ہنس کے باتیں کیا کرتے تھے۔ پیار سے اسے مہرو مہرو پکارا کرتے تھے۔

بس اب ان کے جسم میں جان نہ تھی۔

مہر نے اس کمرے میں موت کا نظارہ کیا تھا۔

اور موت دلوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔

☆☆☆

رات کا آخری پہر چل رہا تھا۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب اندھیرے اپنی انتہاؤں کو چھوتے ہیں۔

اس کے اندر بھی کوئی احساس تھا، جو اپنی انتہاؤں کو چھو رہا تھا۔ جیسے کوئی دریا ہو جس میں ہیجان برپا ہو، جو حدوں سے تجاوز کرنے کے لیے بے تاب ہو۔

احمد کی آنکھیں شعلہ باز تھیں۔ چہرہ ہر احساس سے عاری۔ وہ بستر کے کنارے پر بیٹھا، مسلسل پاؤں زمین پر تھپتھپا رہا تھا۔ دماغ میں ایک ساتھ کئی سوچیں منتشر تھیں۔

اس نے پیروں کی حرکت روک لی۔ آنکھیں بند کیں۔ بصیرت اندھیر ہوئی۔ دل کو چیرتی ہوئی خاموشی کا راج قائم ہوا۔ انتقام کی راہوں میں انتھک مسافتوں کے بعد وہ ان خاموش اندھیروں کو اپنا یارِ راہ بنا چکا تھا۔

"مجھے اس قتل کا پچھلے ڈھائی سال سے انتظار تھا۔" آنکھیں بند کیے وہ زیر لب بڑبڑایا۔

اب کی بار آنکھیں کھولیں، تو بھوری آنکھوں کی تپش فنا ہو چکی تھی۔ وہاں سرد مہری لوٹ آئی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ سٹڈی ٹیبل سے موبائل اٹھایا اور کھڑکی کے ساتھ کھڑا ہوا۔ موبائل میں اپنے دوست کا نمبر ملایا جو جرمنی میں رہتا تھا۔ کچھ دیر رنگ ہوئی، پھر کال اٹھا لی گئی۔

"کون؟" وہ جو بھی تھا، اپنی نیند سے جنگ لڑ رہا تھا۔

احمد کے چہرے پہ ناگواری ابھری۔

"میں ہوں، احمد۔ جاگ جاؤ۔" وہ لاتعلق سے انداز میں بولا۔

نظریں سبزہ زار پر مرتکب تھیں۔ پتوں کے جھرمٹ ہوا میں رقص کر رہے تھے۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟ اتنی رات کو کون کال کرتا ہے۔ وہاں تو وقت بھی تین گھنٹے آگے ہے۔" وہ خفگی کے عالم میں احمد پر برس پڑا۔

ناگواری شدید ہوئی۔ اس نے نظر اٹھا کر بنا چاند کے آسمان کو دیکھا۔

"بک بک بند کرو علی۔ اور جاگ جاؤ۔ میری بات تمہاری نیند سے کئی گنا زیادہ ضروری ہے۔" چہرے کے تاثرات کرخت ہوئے۔ پیشانی بل آلود ہوئی۔

"ٹھیک ہے۔ جاگ گیا۔ اب بولو۔" علی جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔

"عبداللہ سلطان کا قتل ہو گیا ہے۔" احمد نے چھوٹتے ہی کہا۔

علی کو شک ہوا کہ احمد کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے۔

"کون۔ عبداللہ سم تھنگ (something)" وہ بری طرح الجھ گیا۔

"اور مجھے یقین ہے ان کا قتل ان ہی لوگوں نے کروایا ہے۔" علی کے جواب کو نظر انداز کیے وہ سرسری سا بولا اور چپ سادھ لی، آنکھوں میں جواب طلب تاثر سجایا۔

علی کا دماغ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔ یکدم سرے سے سر املتا چلا گیا۔ اور اسے سب سمجھ آ گیا۔ نیند تو صحیح معنوں میں اب خراب ہوئی تھی۔ آج کی رات کیا اس پر مستقبل کی نہ جانے کتنی راتوں کی نیند حرام ہو چکی تھی۔ معاملہ ہی کچھ ایسا تھا۔

"تم وہ سب کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے، احمد۔" اس نے بے چینی کے عالم میں احمد کو خبردار کیا۔

احمد پر کوئی اثر نہ ہوا۔

"اگر سوچ رہا ہوں تو، کیا اس دفعہ تم میری مدد کرو گے؟ کیا عبدالحمید کی واپسی ممکن ہے؟" احمد اب تک حتمی جواب کا منتظر تھا۔

"احمد، خود کو باز رکھو۔ نہ بھولنا ڈھائی سال پہلے کیا ہوا تھا۔ ڈھائی سال پہلے ہم سب نے کس کو کھویا تھا۔" علی نے سختی سے کہہ کر احمد کو قائل کرنا چاہا۔

مگر اس کے چہرے سے لگتا نہیں تھا کہ وہ قائل ہونے والی چیز تھا۔ وہ جس کام کا پختہ ارادہ کر لیتا اسے کر کے ہی دم لیتا۔

"ڈھائی سال سے خود کو باز رکھا ہوا ہے۔ اب اور نہیں۔ تم صرف میری بات کا جواب دو۔ مدد کرو گے یا نہیں؟" احمد کا اطمینان مقابل کا سکون غارت کر رہا تھا۔

"مجھے فکر ہے تمہاری۔ جن شیطانوں کے خلاف تم کھڑے ہو وہ بہت خطرناک ہیں۔ ان کی طاقت کا کوئی ثانی نہیں۔ ان کی ذہانت کا کوئی مول نہیں۔" وہ ٹھنڈا پڑنے لگا۔

"یعنی تم میری مدد نہیں کرنے والے ہو۔ ہے نا؟" جذباتی کلمات نے اس پر کوئی اثرِ خاص نہ کیا۔

”ہاں۔ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ یہ موت کا کنواں ہے۔ میں تمہیں چھلانگ لگانے نہیں دے سکتا۔“ علی نے صاف صاف انکار کر دیا۔

احمد نے نا محسوس سے انداز میں پاؤں پٹخا۔

”اگر تمہیں لگتا ہے تمہارے انکار سے میں باز آجاؤں گی تو یہ خوش فہمی کے سوا کچھ نہیں۔ راستے مجھے میرا اللہ فراہم کرے گا۔“ تلخی سے کہتے ہوئے اس نے کال کاٹ دی اور موبائل سائڈ ٹیبل پہ رکھ دیا۔

علی بارہا کال کرنے لگا۔ اس نے موبائل سائیلنٹ پر کر دیا۔ وہ جان چھڑانے کے لیے موبائل بند بھی کر سکتا تھا۔ مگر وہ چاہتا تھا کہ علی بار بار اسے کال کر کے تڑپتا رہے۔

خاموشی کا راج بحال ہوا۔

ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اس کے ہجرے کا مہمان بنا۔ اس نے سنسناتے ہوئے برفیلے جھونکے کو روح کی گہرائیوں میں جذب کیا۔

”میں نے کہا تھا میں واپس آؤں گا۔“ وہ زیر لب بڑبڑایا۔

اب کی بار اس نے آنکھیں کھولیں تو ان میں تپش لوٹ آئی۔

اس تپش کے ساتھ ساتھ ان میں گہرا کرب تھا اور رنج بھی۔

شکایت تھی اور کسی محرومی کا احساس بھی۔

☆☆☆

عبداللہ سلطان کا جنازہ ظہر کے بعد ادا کیا گیا۔ گھر کے سبزہ زار میں مرد حضرات موجود تھے۔ لاؤنج کے سربراہی صوفے پر مہر براجمان تھی۔ وہ بے مقصد چھت کو گھور رہی تھی۔ دوپٹہ پھانسی کے پھندے کی طرح گردن میں کسا ہوا تھا۔

درِفشاں تعزیت کی نیت سے آئی تھی، اور اب جانے لگی تھی۔ اس کی نظر درخت کے سائے میں چہل قدمی کرتی مناج پر پڑی، جو فون پر کسی سے بات چیت کر رہی تھی۔ وہ ٹھٹک گئی۔ آنکھوں میں تشویش ابھری۔ مناج کال کاٹ کر جانے لگی۔ درِفشاں سب چھوڑ چھاڑ کر اس کی طرف لپکی۔

''ہیلو!'' درے فشاں کا تنفس پھولا ہوا تھا۔

مناج نے چونک کر اس اجنبی کو اوپر سے نیچے دیکھا۔ آنکھوں پر ٹکایا ہوا موٹا چشمہ۔ سفید شرٹ اور جینز کی سکرٹ، اور لبوں پر پھیلی دراز مسکراہٹ۔ بظاہر اس نے چہرہ عام رکھا، مگر اندر کئی سوالوں نے زور لیا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' درے نرمی سے بولی۔

مناج کے انداز میں واضح جھجک تھی۔ وہ مشکوک نظروں سے درِفشاں کو گھور رہی تھی۔

''مناج۔'' مناج سرد لہجے میں بولی۔

درے کے گرمجوش انداز اسے کھل رہے تھے۔ اس کے نزدیک دنیا مفاد پرستوں سے بھری ہوئی تھی۔ میٹھے لہجے منافقانہ معلوم ہوتے تھے۔

''مناج، تم ٹھیک ہوناں؟'' آواز میں اپنائیت تھی۔

مناج نے ایک بار پھر اس اجنبی کا بغور جائزہ لیا۔ اس کی آنکھیں واقعتاً بناوٹ اور مصنوعی پن سے پاک تھیں یا یہ سب دھوکہ تھا؟

"ہاں میں ٹھیک ہوں۔" وہ تذبذب کا شکار ہونے لگی۔

درے نے گردن اثبات میں ہلائی۔

"پکا؟"

اگر کوئی اور ہوتا تو مناج کچھ کڑوا کسیلا کہہ کر اسے بھگا چکی ہوتی۔ مگر درفشاں کا انداز اتنا خالص اور معتبر تھا کہ وہ چاہ کر بھی کچھ تلخ نہ کہہ سکی۔

"جی میں بالکل ٹھیک ہوں۔" چہرے پہ تھکا ہوا سا تاثر لیے وہ بولی۔

درِفشاں نے رازدارانہ سے انداز میں سر کو جنبش دی۔

"چلو تم کہتی ہو تو میں مان لیتی ہوں۔ البتہ میں تمہیں بتانا چاہوں گی کہ میں ایک ماہرِ نفسیات ہوں۔ اگر تمہیں کبھی بھی لگے کہ تم ٹھیک نہیں ہو تو میں حاضر ہوں۔" درے نے سنجیدگی سے کہا۔

مناج کو کچھ عجیب لگنے لگا تھا۔ اس کے لیے صرف خالہ پریشان ہوتی تھیں۔ کسی اور کی پریشانی اسے کھٹک رہی تھی۔

"آپ کو مجھ میں اتنی دلچسپی کیوں ہے؟ میری مدد کیوں کرنا چاہتی ہیں آپ۔" مناج کا لہجہ طنزیہ تھا۔

درے آسودگی سے مسکراتے ہوئے گردن نفی میں ہلا گئی۔

"نہیں مناج۔ میرے چاہنے سے بھلا کیا ہو گا؟ میں تمہاری مدد تب تک نہیں کر سکوں گی جب تک تمہیں یہ احساس نہ ہو کہ تمہیں مدد کی ضرورت ہے۔"

مناج درِفشاں کو دیکھتی رہ گئی۔ یہ عورت واقعی اتنی اچھی تھی یا محض ڈھونگ رچا رہی تھی؟ ڈھونگ رچا کر بھلا کیا حاصل ہونا تھا؟ اس کے پاس دینے کو کون سے خزانے موجود تھے۔

درے نے اپنے پرس سے کارڈ نکالا اور مناج کے حوالے کیا۔ مناج کے ذہن میں درِفشاں کے لیے جتنے اچھے خیالات ابھرے تھے سب جھاگ ہوئے۔

"تم نے سوچا بھی کیسے کوئی تمہارے لیے مخلص ہو گا، مناج۔ اس دنیا میں سب اپنی دکانیں چمکانے میں لگے ہوئے ہیں۔" مناج نے بس سوچا۔ بولی کچھ نہیں۔ تحقیر آمیز نگاہ درے پر ڈالی۔

درے نے سر نفی میں ہلایا اور اس کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھا۔

"نہیں مناج، تم غلط سمجھ رہی ہو!"

مناج چونک گئی۔ وہ دماغ پڑھنا بھی جانتی تھی؟

"یہ کارڈ میں نے تمہیں اس لیے دیا ہے کیونکہ اس میں میرا نمبر ہے۔ میں آٹھ بجے کے بعد اپنے گھر میں ہوتی ہوں۔ تم مجھے میرے گھر میں بھی مل سکتی ہو۔ بس شرط یہ ہے کہ تمہارے اندر خود کو بدلنے کا عزم ہو۔" مناج اب تک دم بخود تھی۔

درے نے دو قدم اگے بڑھائے۔ اس نے نرمی سے بات شروع کی:

"تم دنیا سے متنفر لگتی ہو۔ ایک زمانے میں، میں بھی تھی۔ ایک وقت تھا جب میں ذہنی طور پر بیمار تھی۔ اور ان دنوں مجھے دلاسہ دینے کے لیے کوئی نہیں تھا۔ میں نے خود کو ہیل کیا، تاکہ میں دوسروں کو ہیل کر سکوں۔ میں تمہیں سمجھ سکتی ہوں۔" اس نے کندھے سے ہاتھ اٹھایا اور دو قدم پیچھے بڑھ گئی۔

"اپنا خیال رکھنا۔ میں تمہاری کال کا انتظار کروں گی۔" وہ رُخصت ہو گئی۔

مناج مسحور ہو چکی تھی۔ درِ فشاں نے اپنی شخصیت کا اثر اس کے ذہن میں مرتسم کیا۔ کیا اسے درے کے روپ میں ایک مخلص دوست ملنے لگا تھا؟

مناج کے دماغ میں ایک بار پھر طرح طرح کے خیالات ابھرنے لگے۔ اس کا سر پھٹنے لگا۔ وہ سبزہ زار کو پار کر کے گاڑی میں سوار ہوئی۔ سر میں شدید درد ہونے لگا تھا۔ اسے تکلیف کی طلب ہوئی۔ اپنے خیالات سے فرار حاصل کرنے کا اسے بس یہی ایک راستہ نظر آتا تھا۔

☆☆☆

قصر کی مجبوری تھی۔ رات کی آمد پر اسے چمکنا تھا، دمکنا تھا۔ مگر اس ظاہری رونق کے باوجود ہر سو ہر دم اداسی کا بسیرا تھا۔ گو کہ قصر کی دیواریں بھی اپنے مالک کے جانے پر غم منا رہی تھیں۔

وہ کرسی سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ رُخ کھڑکی کی جانب تھا۔ گردن اٹھائے تاریک آسمان کے نظارے تک رہی تھی۔ آنکھوں میں خالی پن سمایا ہوا تھا۔ مگر وہ رو نہیں رہی تھی۔ وہ گزرے وقتوں میں رو رو کر عاجز آچکی تھی۔

اسے ڈیڈ شدت سے یاد آرہے تھے۔ آخر تب ہی انہیں جانا تھا جب دونوں کے درمیان تلخیاں پستی کی اور پرواز کر رہی تھیں۔ قصر کی ویرانی اسے کاٹ کھانے کو دوڑ رہی تھی۔

وہ سوچوں میں گم تھی جب کمرے میں ملازمہ داخل ہوئی۔

''میم۔ عبداللہ سر کے دوست آئے ہیں۔''

مہر کے جسم نے کوئی حرکت نہ کی۔ بس خالی پن کے ساتھ آسمان کو تکتی گئی۔

''انہیں ڈرائنگ روم میں بیٹھا دو۔'' آواز بے تاثر تھی۔

ملازمہ نے سر کو خم دیا۔

''نیلوفر چلی گئیں؟'' مہر نے بدستور کہا۔

''جی میم، وہ چلی گئیں۔'' مہر نے سر کو ذرا سی جنبش دی۔

ملازمہ کمرے سے جا چکی تھی۔ وہ گہری سانسیں لیتے کھڑی ہوئی۔ بھورا نیٹ کا دوپٹہ سر پر لپیٹا اور ڈرائنگ روم کی طرف چلی گئی۔

وہ بیٹھے بٹھائے پوری ایمپائر کی مالک بن گئی تھی۔ مگر کیا اس کے کندھوں میں اتنا دم تھا کہ وہ اتنا بھاری بوجھ اٹھا سکے؟ ڈرائنگ روم کا سفر کرتے ہوئے وہ یہی سوچ رہی تھی۔

ڈرائنگ روم کے کونے میں ایک شخص اس سے پشت کیے کھڑا تھا۔ اس نے بھورا کوٹ زیب تن کیا تھا۔ اسے تعجب ہوا کہ انتقال والے گھر میں اتنا چمکیلا کوٹ پہن کر کون آتا ہے؟

''السلام علیکم!'' وہ اس شخص سے محفوظ فاصلے پر کھڑی ہو گئی۔

وہ مڑا۔ نقش سخت اور کرخت تھے۔ وہ بمشکل تیس سے پینتیس برس کا لگتا تھا۔ پھر وہ عبداللہ سلطان کا دوست کیسے ہوا؟ سیاہ آنکھوں میں تشویش ابھری۔

وہ مہر کو ایسے گھور رہا تھا جیسے اس کا ایکس رے لینا چاہ رہا ہو۔ اس سب میں مہر کو پہلی بار خطرے کا اندیشہ ہوا۔ اس نے گھبراہٹ کو بمشکل دبایا اور چہرے کے تاثرات پر سکون رکھنے کی کوشش کی۔ مگر وہ شخص اس کی گھبراہٹ کو بھانپ چکا تھا۔ بدھے سے چہرے پر کمینی مسکراہٹ کا گزر ہوا۔ مہر کے قدم بے ساختہ پیچھے ہوئے۔

عین اسی سمے ملازمہ داخلی دروازے پر کھڑی ہو گئی۔

”میم کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟“

اس کی موجودگی مہر کو کسی معجزے جیسی معلوم ہوئی۔ اس کی جان میں جان آنے لگی۔ وہ آدمی بری طرح ٹھٹکا۔ چہرے پر ناگواری گزری۔

”تم ملازمہ کو بھیجو۔ ہم سکون سے بات کرتے ہیں۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”میں اسے کہیں نہیں بھیج رہی۔ آپ کو جو بھی کہنا ہے اس کے سامنے کہنا ہو گا۔“ مہر کا لہجہ سرد تھا۔

ڈرائینگ روم وسیع تھا، اور ان کے آوازیں قدرے دھیمی۔ سو آواز ملازمہ تک نہیں پہنچی۔

اس شخص کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری۔ اس نے مہر پہ جتاتی نگاہ ڈالی جیسے کہنا چاہ رہا ہو کہ ”دیکھتے ہیں کیسے نہیں بھیجتی تم اسے۔“

وہ غیر آرامدہ ہوئی۔ وہ ایک قدم پیچھے گیا اور دو قدم دائیں طرف بڑھائے۔ اب اس کے کسرتی بازوؤں کے علاوہ اس ملازمہ کو کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ مہر نے حواس چوکنا کیے اس کی مشکوک سرگرمیوں کا جائزہ لیا۔

اس شخص نے اپنے کوٹ کا پٹ اوپر اٹھایا۔ اور پھر مہر کو وہ نظر آئی۔۔۔ کالی چمکدار سی پستول۔ جو آس پاس کی روشنی کی وجہ سے چمک رہی تھی۔ مہر کی سانسیں تھمنے لگیں۔ دل کی دھڑکنوں نے اپنی رفتار پکڑلی۔ آنکھوں میں خوف ابھرا۔

مرد کے چہرے پر فتح کا تاثر آن ٹپکا۔

"میرا نام شمس ہے۔ اور میں بالکل سکون سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ اور تم ابھی اسی وقت اپنی چپکو ملازمہ سے جان چھڑاؤ گی۔" شمس چبا چبا کر سرگوشیانہ انداز میں بولا۔

مہر ساکن ہوگئی۔ قدم ہل سکے نہ لبوں سے آواز نکل سکی۔ دل کی دھڑکن کان کے پردے پھاڑتی محسوس ہوئی۔ آنکھوں کی پتلیاں کپکپائیں۔ اس نے گہری سانسیں لیں، اور اعصاب پر قابو پانا چاہا۔ دماغ کے گھوڑے بھگائے۔ کیا اس شخص سے جان چھڑانے کا کوئی آسان طریقہ تھا؟

"میرے پاس وقت نہیں ہے۔ اگر تم کچھ نہ بولی تو ایک لمحہ ضائع کیے بغیر فائر کروں گا۔" مہر کی خاموشی اس سے برداشت نہ ہوئی۔

مشکل وقتوں میں انسان کی ذہانت اس کا بچاؤ کر سکتی ہے۔ مہر نے اپنے ذہن پر پورا زور ڈالا۔ بے ربط دھڑکنوں کو قابو کرنے کی کوشش کی۔

”صرف دس تک گنوں گا۔ اس کے بعد انجام جو بھی ہو، زمہ دار تم ہو گی۔“ شمس کا پارا ہائی ہو رہا تھا۔

تو مہر کے پاس صرف دس سیکند تھے۔ اسے جو بھی کرنا تھا ان ہی دس سیکنڈز میں کرنا تھا۔ مگر وہ کیا کر سکتی تھی؟

”ایک!“

وہ پورے ڈرائنگ روم کا سرسری سا جائزہ لینے لگی۔ اس کی نظر شمس پر ٹکی۔

”دو!“

وہ مہر سے دو سے تین قدم کے فاصلے پہ تھا۔ پستول اس کی پینٹ میں کسی ہوئی تھی۔ شمس نے اپنے ہاتھ ڈھیلے چھوڑے ہوئے تھے۔ ان باریکوں کو دماغ میں محفوظ کیا۔

”تین!“

شمس کی پستول لوڈ تھی یا نہیں وہ نہیں جانتی تھی۔ مگر وہ مہر کو فوراً نہیں اڑا سکتا تھا۔

”چار!“

اسے کم سے کم مہر کے سر پہ پستول تاننے میں ہی تین سیکنڈز لگ جانے تھے۔ اتنے وقت میں ملازمہ فرار ہو جاتی۔ گولی کی آواز سے باقی ملازمین چوکنا ہو جاتے۔

”پانچ!“

مہر کو احساس ہونے لگا کہ شمس اسے پستول سے مارنے کی غلطی کبھی نہیں کرے گا۔ بالآخر دھڑکنیں باربط ہوئیں۔

"چھے!"

باہر گارڈز تھے۔ گھر میں ڈھیر سارے ملازمین۔ وہ بری طرح پھنس سکتا تھا۔ وہ مہر کو مارنے کی غلطی اسی صورت میں کرتا اگر وہ بیوقوف ہو۔ مہر کو وہ شخص بے وقوف کہیں سے نہ لگا۔

"سات!"

سر پہ چھائے بادل چھٹنے لگے تھے۔ اس کے چہرے کی گھبراہٹ زائل ہوئی۔ اب اس کے چہرے پہ اطمینان تھا۔ وہ جانتی تھی کہ کم سے کم اس کی جان کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔

"آٹھ!"

آپشن اے: وہ ملازمہ کو جانے کا بولے گی۔ شمس کو صوفے پر بیٹھنے کا کہے گی۔ شمس کے مڑتے ہی وہ میز پہ پڑا پانی کا جگ اس کے سر پر دے مارے گی۔ وہ تکلیف سے بلبلائے گا۔ وہ اس کی پستول چھین لے گی اور پھر اسے پولیس کے حوالے کروا دے گی۔ ضرورت پڑی تو اسے شوٹ بھی کرے گی۔

"نو!"

آپشن بی: وہ ملازمہ کو یہاں سے جانے کا کہے گی۔ چپ چاپ سکون سے شمس کی بات سن لے گی۔ کیونکہ وہ جان گئی تھی کہ شمس کا اسے نقصان پہنچانا کچھ ناممکن سا تھا۔

"دس!"

"صائمہ۔ دروازہ بند کر کے چلی جاؤ۔" وہ مختصر سا پیچھے مڑ کر ملازمہ سے مخاطب ہو کر پر اعتماد سے انداز میں بولی۔

"آپ چائے پینا پسند کریں گے ویسے؟"

دس سیکنڈ میں ہی اس کا ہر انداز بدل گیا تھا۔

شمس نے بھی یہ تبدیلی نوٹس کر لی تھی۔ اسے رہ رہ کر غصہ آیا۔ وہ تو اس عورت کو دبانے آیا تھا، مگر اپنی کوششوں میں ناکام ٹھہرا تھا۔

"نہیں۔ کیا ہم بیٹھ کر بات کر لیں؟" شمس کچھ متذبذب سا ہو کر بولا۔ مہر کے اس ٹھنڈے ردِ عمل نے چودہ طبق روشن کیے۔

"ترکش کہوہ؟" مہر مدھم سا مسکرائی۔ یہ مسکراہٹ جلانے والی تھی۔

شمس واقعتاً جلا۔ اس کا دل کیا کہ وہ مہر کا حشر نشر بگاڑ دے۔

"میں یہاں کوئی کھیل رچانے نہیں آیا۔ سمجھی تم۔" وہ دبی دبی آواز میں دھاڑا۔

مہر نے گردن ترچھی کیے سرد سانس خارج کی۔

"صائمہ تم جا سکتی ہو۔ ہمارے مہمان کو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ اور ہاں، دروازہ بند کر دینا۔" اس نے اونچی آواز میں حکم صادر کیا۔

شمس حیرانی سے اسے دیکھے گیا۔

وہ مہر تھی، وہ زندگی کی پستیوں کا مزا چکھ چکی تھی۔

وہ اتنی آسانی سے ٹوٹنے والوں میں سے نہ تھی۔

☆☆☆

باب پنجم: ''اے چاند یہاں نہ نکلا کر''

اے چاند یہاں نہ نکلا کر

بے نام سے سپنے دیکھا کر

یہاں الٹی گنگا بہتی ہے

اس دیس میں اندھے حاکم ہیں

نہ ڈرتے ہیں نہ نادم ہیں

نہ لوگوں کے وہ خادم ہیں

ہے یہاں پر کاروبار بہت

اس دیس میں گردے بکتے ہیں

کچھ لوگ ہیں عالی شان بہت

اور کچھ کا مقصد روٹی ہے

وہ کہتے ہیں سب اچھا ہے

مغرب کا راج ہی سچا ہے

یہ دیس ہے اندھے لوگوں کا

اے چاند یہاں نہ نکلا کر

(حبیب جالب)

☆☆☆

”صائمہ تم جاسکتی ہو۔ ہمارے مہمان کو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ اور ہاں دروازہ بند کر دینا۔“

شمس کی انا پر چوٹ لگی۔ اس نے تہیہ کیا کہ وہ اس عورت کی اکڑ نکال کر ہی دم لے گا۔ وہ صوفے پر ایسے ٹھاٹھ باٹھ سے بیٹھا جیسے یہ گھر اسی کی ملکیت ہو۔ مہر اس کے مقابل بیٹھی۔ چہرے پر اطمینان برقرار رکھا۔

آپشن اے میں واضح خطرہ تھا۔ ذرا سی نوک جھوک اور لینے کے دینے پڑ جاتے۔ سو اس نے خاموشی سے معاملات طے کرنی کی سعی کی۔ اتنا تو وہ جان گئی تھی یہ آدمی محض مہرا تھا، اس کے پیچھے بڑی طاقتیں چھپی تھیں۔

”جو میں تمہیں بتانے لگا ہوں اسے سننے کے لیے ہمت درکار ہے۔“ اس نے صوفے پر ٹیک لگائی۔ ٹانگ پر ٹانگ جمائی۔

مہر کو اس آدمی سے گھن آئی۔

”شاید تم چلاؤ۔ رو۔ گڑگڑاؤ۔ میرے قدموں میں گر کر منتیں کرو۔“ آنکھیں بند کیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے اس نے ان سارے مناظر کو تصور کیا۔ انا کو تسکین پہنچی۔

مہر کی جتاتی ہوئی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ چہرے پر تناؤ حال ہوا۔

”چلو شاباش۔ اب یہ جگ ہے نا۔“ شمس نے جگ کی طرف اشارہ کیا۔

”اس میں سے پانی کا ایک گلاس نکالو۔ اور اسے پی لو۔“ شمس نے بھنویں اکھٹا کیے حکم صادر کیا۔

مہر نے اسے اچھنبے سے دیکھا۔ نفرت اپنی انتہاء کو پہنچی۔ اچھا ہی ہوتا وہ جگ اس کے سر پر مار دیتی۔

”شاباش!“ اس کا اعتماد ہوا ہوتے دیکھ کر وہ محظوظ ہو رہا تھا۔

مہر نے ہاری ہوئی سانس خارج کرتے ہوئے گلاس میں پانی انڈیلا۔ پانی گرنے کی آواز نے کمرے میں گھلی دہشت میں اضافہ کیا۔

”اہاں!“ شمس نے ہاتھ بڑھا کے مہر کے ہاتھ سے گلاس چھینا۔

پانی کے کچھ قطرے گلاس کی سرحد کو عبور کرتے مہر کے کُرتے میں جذب ہوئے۔

”یہ والا گلاس میرے لیے۔ تم اپنے لیے دوسرا گلاس نکالو گی۔“

مہر نے غصے کے زہریلے گھونٹ اندر اتارے۔ اس نے پانی کو دوسرا گلاس بھرا اور غٹاغٹ پیا۔

”معلوم ہے ایک جانور کو بھر کر پانی کب پلایا جاتا ہے؟“

شمس نے جگ اپنے ہاتھوں میں اٹھایا۔ وہ جگ کو بغور دیکھنے لگا۔ وہ آدمی اب اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

کاٹ دار خاموشی کمرے غالب آئی۔ شمس کے تمسخرانہ قہقہے نے خاموشی کو توڑا۔

"ایک جانور کو بھر کر پانی اسے قربان کرنے سے پہلے پلایا جاتا ہے۔ اور مہر بنت عبداللہ سلطان، تم اس وقت قربان ہونے والی ہو۔"

جہاں مہر کے رونگٹے کھڑے ہوئے وہاں شمس نے جگ زمین پر پٹخ دیا۔ زوردار آواز کے ساتھ فرش پر کرچیاں پھیلیں۔ مہر اچنبھے سے اسے دیکھتی گئی۔ سیاہ آنکھوں میں سہم تھی۔ اور وہ اسے سہمانا ہی تو چاہتا تھا۔

"تمہارے نخرے۔ تمہارا یہ ایٹیٹیوڈ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا۔" اپنے ہاتھوں کو مٹھی میں بھینچتے ہوئے وہ بے بسی بھرا غصہ لیے بولا تھا۔

مہر کے دل پر ضرب لگی۔ اعتماد کے بادل چھٹنے لگے۔ حلق میں رکاوٹ محسوس ہوئی۔ اس مرد کی طاقت نے اسے خوفزدہ کیا۔

"اگر تم اتنی پیاری سی نازک سی نہ ہوتی تو اب تک تو میں تمہارا وہ حشر کر چکا ہوتا۔ اتنا برا حال کرتا کہ تمہاری بیٹی بھی تمہاری شناخت نہ کر پاتی۔"

پھولے ہوئے نتھنے، طیش سے پھٹتی آنکھیں، گردن اور ماتھے پر ابھرتی رگوں نے اس شخص کو مزید خوفناک بنایا۔ مہر کا دل بے قابو ہوا۔

"تم چپ چاپ میری بات سنو گی۔ اور اب اگر تم نے کوئی ہوشیاری کی تو تمہیں نوچ کھاؤں گا۔" انگلی اٹھا کر متنبہ کیا۔

مہر کا اعتماد پاش پاش ہو چکا تھا۔ اسے اپنا آپ زمین کے اندر دھنسا ہوا محسوس ہوا۔ خوف وہراس کے سیاہ ابر سر کے اوپر لوٹ آئے تھے۔

شمس ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے مہر کو سرد گھوری سے نوازتے ہوئے بات شروع کی۔

"تمہیں اندازہ ہو ہی گیا ہو گا کہ مجھے کسی نے بھیجا ہے۔ اور اگر تم بے وقوفوں کی سردار ہو تو میں تمہیں خود بتا دیتا ہوں۔ مجھے میرے مالکوں نے بھیجا ہے۔" مالکوں کا لفظ کہتے ہی شمس کی مسکراہٹ معنی خیز ہوئی۔

مہر کے وجود پر کانٹے سے چبھے۔

"میرے مالک، بہت طاقت ور ہیں۔ تم آئے دن ملک میں بمب دھماکے، ٹارگٹ کلنگ کے واقعات دیکھتی ہو گی۔ کتنوں کے زمہ دار میرے مالک ہیں۔ بس کوئی جانتا نہیں۔"

مہر کی پسلیوں میں ٹھنڈ اتری۔ وہ آخر کہاں پھنس گئی تھی؟

"میں تمہاری معلومات میں ایک اور اضافہ کرنا چاہوں گا۔ تمہارے باپ کو ہم نے مروایا ہے۔"

مہر کو جیسی کسی نے الیکٹرک چیئر میں بٹھایا۔ اس کا بدن تھرتھرایا۔ سیاہ آنکھوں میں بے یقینی اتری۔

"بلکہ، تمہارے باپ کو موت کے گھاٹ میں نے اپنے ہاتھوں سے اتارا تھا۔" وہ زور سے ہنس دیا۔

وہ جملہ کسی سور کی طرح کان میں پھونکا گیا۔ آنکھیں بے اختیار نم ہوئی۔ وہ اپنے باپ کے قاتل سے بات کر رہی تھی۔ مگر زندگی نے اس قدر بے بس و لاچار کر دیا تھا کہ وہ کچھ کر بھی نہ سکتی تھی۔ اسے خود پر غصہ آیا۔ خود سے زیادہ اس آدمی پر غصہ آیا۔

''یہ قانون ہمارا ہے۔ تم چلا چلا کر بھی سارے زمانے کو یہ بتا دو کہ تمہارے فرشتہ صفت (انداز میں طنز تھا) باپ کو ہم نے مارا ہے تب بھی ہمارا بال باکا نہیں ہو سکتا۔'' اس نے ہنسی قابو کی۔

مہر کا دل ڈوبا۔ کندھوں پر دنیا جہاں کا بوجھ محسوس ہوا۔ حالات اس کی سوچ سے زیادہ سنگین تھے۔

''میں تمہارے پاس بطور خبر رساں آیا ہوں، آگے بھی آتا رہوں گا۔ اب جو میں بتانے جا رہا ہوں اسے غور سے سنو۔'' شمس نے توقف لیا۔

مہر نے ہر خیال کو اپنے دماغ سے جھٹکا اور اپنے کان کھڑے کر لیے۔ دل پسلیوں سے ٹکرا رہا تھا۔

''تمہارے باپ نے میرے مالکوں سے ایک بہت بڑا قرضہ لیا تھا۔ لیکن وہ یہ قرضہ واپس نہ کر سکا، اس لیے اس نے ہمارے ہیرے چرائے۔ ہم مجبور ہو گئے تھے۔ وہ ہیرے ملینز آف ڈالرز کے ہیں۔ وہ یہاں رکا نہیں، بلکہ ہمیں بلیک میل کر کے اوپر سے مزید رقم بٹور کر اپنا کاروبار چمکانے لگا۔ پھر ایک دن ہماری برداشت ختم ہو گئی۔''

مہر نے سب غور سے سنا۔ پیشانی تنگ ہوئی۔ اس کہانی میں کوئی جھول تھا۔ جیسے کچھ چھپایا جا رہا ہو۔ شمس نے کوٹ کی جیب سے کاغذات نکال کر میز پر اچھالے۔

''یہ وہ قرضہ ہے جو تمہارے باپ نے ہم سے لیا تھا۔۔۔''

اپنی کہانی کو کچھ لمحے روک کر ہم دو دن پہلے کی اس تاریک رات میں چلتے ہیں جہاں عبد اللہ سلطان کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔



”یعنی تمہاری کوئی بھی آخری خواہش نہیں ہے۔“شمس ٹرگر دبانے کے لیے تیار تھا۔

لیکن اس نے ابھی ٹرگر دبایا نہیں تھا، ایک اہم کام ابھی باقی تھا۔

”خدارا مجھے چھوڑ دو۔ مجھے چھوڑ دو۔“

”تمہارے اور میرے جیسے بے ایمان لوگ خدا کا نام لیتے اچھے نہیں لگتے۔“

”شمس رحم کرو مجھ پر۔ تم لوگ جو کہو گے میں کروں گی۔ بس میری بیٹی کا پیچھا چھوڑ دو۔“

عبداللہ سلطان رو رہے تھے۔ غیر متوقع طور پر شمس نے پستول کی نال نیچے کی۔ موت کا پہرا اتنی آسانی سے چھٹ سکتا تھا؟ انہیں یقین نہ آیا۔

”ٹھیک ہے۔ یہ کچھ پیپرز ہیں ان پر دستخط کرو۔ اور پھر ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔“شمس نے جیب سے پیپرز نکالے اور زمین پر پھینک دیے۔ معاً قلم زمین پر اچھالا۔

”یہ کس چیز کے پیپرز ہیں؟“عبداللہ سلطان پیچھے مڑ کر اسے دیکھنے لگے۔

”چپ چاپ سائن کر لو۔ اور پھر میں تمہیں یہاں سے جانے دوں گا۔ ہمارے راستے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا۔“شمس نرمی سے بولا۔

عبداللہ سلطان کے دماغ میں طرح طرح کے سوالات ابھرے۔ صورتحال ان کے حامی ہوتی تو وہ کبھی بنا پڑھے کسی کاغذ پر دستخط نہ کرتے۔ مگر افسوس ہی اس بات کا تھا کہ صورتحال ان کے حامی نہیں تھی۔

”اگر تم نے دستخط کروانے کے بعد مجھے مار دیا۔“ عبداللہ سلطان نے تشویش ظاہر کی تھی۔ شمس کے چہرے پہ سختی در آئی۔

”تم اس وقت سوال جواب کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ چپ چاپ دستخط کر دو عبداللہ۔“ شمس کا انداز سخت ہو گیا تھا۔

عبداللہ سلطان زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھے۔ انہوں نے فٹافٹ ان کاغذات پر دستخط کیے۔ دل ہی دل میں وہ جانتے تھے کہ اس سب کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ بس زندگی کے لیے ایک معمولی کوشش کرنا چاہتے تھے۔

اگر انہیں اندازہ ہوتا کہ یہ کاغذات نہیں، مہر کی بربادی کا پروانہ تھا جس پر انہوں نے بے ہنگم دستخط کر دیا تھا، تو وہ خود اپنے آپ کو گولی سے اڑا دیتے۔ مگر زندگی سے بڑا سازشی کوئی نہیں ہوتا۔ وہ ضروری باتوں کو ہی پردے میں رکھتی ہے۔

دستخط کر دیے گئے تھے۔ سانسیں تیز ہو رہی تھیں۔ دل برق رفتاری سے دھڑک رہا تھا۔ انہوں نے عدم یقینی سے شمس کو دیکھا۔ مستقبل سے ناآشنائی سے بڑی کوئی ناآشنائی نہیں ہوتی۔

”کام ہو گیا، مجھے جانے دو۔“ آواز لرکھڑائی۔

”ٹھیک ہے۔ تم جا سکتے ہو۔“ شمس بولا۔

شمس نے اپنی پستول ہوا میں اٹھائی۔ آنکھوں کو خوف جھلکانے کی مہلت نہ ملی۔ گولی پستول سے نکل کر سیدھا کھوپڑی میں داخل ہوئی۔ خون کا فوارہ پھوٹا۔ وہ زمین پر ڈھے گئے۔

اونچی آن بان والا، وسیع سلطنت کا مالک، بزنس مین فرش پر اوندھا پڑا تھا۔ ارد گرد خون کا تالاب بن چکا تھا۔

''کہا تھا، میں تمہیں جانے دوں گا۔'' وہ مسکرا کر عبد اللہ سلطان کے بے جان جسم سے کلام کر رہا تھا۔ اس نے کاغذات اکھٹا کیے اور جیب میں بھر دیے۔ گھر کے دروازے پر وہ لمحے کے لیے رکا۔ مڑ کر اس خون آلود منظر کو دیکھا۔

آنکھیں بند کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی۔

''جہنم میں ملتے ہیں، عبد اللہ۔''



''ان کاغذات کو دیکھ لو۔ ان میں قرضے کا سارا ریکارڈ ہے۔''

وہ کاغذات پلٹنے لگی۔ قرضہ ''سنابل'' ہسپتال کی طرف سے دیا گیا تھا۔ مہر مشکوک ہوئی۔ نظر ان نمبرز پہ پڑیں۔ اس نے جیسے دو سو چالیس والٹ کا جھٹکا کھایا تھا۔ آنکھیں بے یقینی کے عالم میں پھٹیں۔ انگلیاں لرزیں۔ کاغذات ہاتھ سے چھوٹ کر فرش بوس ہوئے۔

''نہیں!'' تنفس تیز ہوا۔

وہ اپنے ڈیڈ کی کمپنی جیسی سو کمپنیز بنا کر انہیں بیچ بھی دیتی تب بھی وہ یہ رقم نہیں چکا سکتی۔ مہر بنتِ عبد اللہ سلطان راتوں رات دیوالیہ کمپنی کی مالک بن گئی تھی۔ وہ شیطان کے پیروکاروں کی مقروض تھی۔

''یہ میں کیسے کر سکتی ہوں؟'' وہ حواس باختہ سے عالم میں بولی۔

”یہ تو تمہاری سوچنے والی چیز ہے۔ میرا کام خبر پہنچانا ہے، حل تجویز کرنا نہیں۔“

”میں کیسے؟“ چہرہ رند چکا تھا۔ اس عالی شان قصر کی بنیادیں اس قدر کھوکھلی نہیں ہو سکتی تھیں!

”میں تمہاری فکر گھٹانا چاہتا ہوں۔“ شمس جتانے والے انداز میں بولا۔

”تم وہ چار ہیرے ہمیں ڈھونڈ کر دے دو۔ ہم اسی وقت یہ قرضہ معاف کر دیں گے۔ ہمارے راستے جدا جدا ہو جائیں گے۔“ شمس نے کسی بزنس مین کی طرح ڈیل سامنے رکھی۔

مہر کو لگا جیسے اس کے قدم چیپ زدہ مائع میں پھنس چکے ہیں۔

دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ عرصے بعد جس بااعتماد اور مضبوط لڑکی نے جنم لیا تھا وہ پھر مر گئی تھی۔ وہ ہارنا نہ چاہتی تھی، پر بری طرح ہار گئی تھی۔ زندگی نے مہر بنتِ عبداللہ سلطان کو ٹرکوں کے نیچے روندھ دیا تھا۔

☆☆☆

وقت کی سب سے بڑی خصوصیت پتا ہے کیا ہے؟ کہ یہ گزر جاتا ہے۔ انسان اس گزرتے وقت کے ساتھ سنبھلنے لگتا ہے۔ وقت کی درسگاہ بہترین درسگاہ ہوتی ہے۔ زندگی کے وہ اسباق جن تک انسانوں کی پہنچ نہیں ہوتی وہ سکھا دیتی ہے۔

ہمارے کہانی کے کرداروں کے لیے وقت کچھ دن آگے بڑھا۔

مناج کی گاڑی قمقموں کی روشنی تلے کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں درِفشاں کا کارڈ تھا۔ وہ مغرب سے اس کارڈ کو گھور رہی تھی، مگر اپنا دماغ نہیں بنا پا رہی تھی۔

''کیا تمہیں اس کے پاس جانا چاہیے مناج؟ کیا تم ٹھیک ہو سکتی ہو؟'' دل سے ایک آواز ابھری۔

''تم کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتی مناج۔ تمہیں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ تم جب تک مردہ ہو کوئی انسانی ذات تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گی مناج۔ تم کسی کے اوپر بھی بھروسہ نہیں کر سکتی ہو۔ کیا پتا وہ سائیکولاجسٹ بھی تمہیں استعمال کرے؟'' دل کی نئی آواز نے سابقہ آواز کی نفی کی۔

اندر کہیں چبھن ہوئی۔ یہ احساس کہ وہ مردہ ہے اسے تکلیف بخشتا تھا۔ مگر وہ اس تکلیف کے ساتھ جینا چاہتی تھی۔ اسے لگتا تھا جیسے یہ تکلیف اس کی بڑی تکلیفوں سے بچاتی تھی۔

''بس ایک آخری کوشش کر کے دیکھ لو۔ کیا پتا تم ٹھیک ہو جاؤ؟ کیا پتا وہ حیوان نما انسانوں کے بھیڑ میں ایک انسان ہو؟''

وہ دو حصوں میں بٹ چکی تھی۔ اندر کہیں وہ بہتر ہونا چاہتی تھی۔ مگر اقرار کرنے کی ہمت نہ تھی۔

اس نے گہری سانس خارج کی۔ تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے درے کو کال ملائی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اب دماغ کی صدا اسے یہ کرنے سے روک لے۔

''یقیناً یہ کال مناج نے کی ہے۔ ہے نا؟'' فون کے دوسری طرف درے چہکی۔

مناج اس کی شخصیت سے مسحور ہوئے بنا رہ نہ سکی۔

''آپ سے میں نے فون پر کبھی بات نہیں کی۔ پھر آپ کو کیسے پتا چلا؟'' انداز حتی الوسع عام رکھنا چاہا مگر وہ چاہ کر بھی بے یقینی نہ چھپا سکی۔

”ارے۔ میں کوئی جادوگرنی نہیں۔ پچھلے دنوں تمہارے علاوہ کسی کو اپنا نمبر نہیں دیا، اس لیے اندازہ لگانا آسان تھا۔“ انداز دوستانہ تھا۔

مناج بے اختیار مسکرائی، مسکراہٹ بے جان تھی۔ انسانوں سے بات کرتے ہوئے وہ کبھی پرسکون نہیں ہوتی تھی، مگر درِفشاں کی بات ہی کچھ اور تھی۔

”جی، میں آپ سے ملنا چاہ رہی تھی۔ کیا آپ مجھے اپنی لوکیشن بھیج دیں گی؟“ مناج کا دل ڈگمگایا۔

”بالکل دے دوں گی۔ مگر صرف تب ہی جب میرے اس سوال کا جواب ہاں میں ہو گا۔ تو مناج ،کیا تم بہتری کی جانب قدم بڑھانا چاہتی ہو؟“

گاڑی میں کچھ دیر کے لیے خاموشی پھیل گئی۔ مناج بھی گہری سوچ میں پڑ گئی۔

”جی۔۔۔“ مناج کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ بالآخر دل کی خواہش زبان پر آ گئی تھی۔

”ٹھیک ہے۔ میں لوکیشن دے رہی ہوں۔ مجھے انتظار رہے گا۔“ درے نے کال کاٹ کر مناج کو لوکیشن بھیج دی۔

آدھے گھنٹے بعد مناج درِفشاں کے گھر کے دروازے پر کھڑی تھی۔ انگلیوں کے درمیان سگریٹ تھی جس کا کونا دہک رہا تھا۔ اس نے بیل بجاتے سگریٹ لبوں سے لگائی۔

درِفشاں برتن دھو رہی تھی۔ احمد ایل شیپ ٹیبل کے ساتھ بیٹھا، موبائل استعمال کر رہا تھا۔

”احمد میری دوست آئی ہو گی۔ دروازہ کھول دو، میں بس آخر کے برتن دھو کر آئی۔“ درے کا ہاتھ تیزی سے کام کرنے لگا۔

احمد ٹھنڈی آہیں بھرتا اپنی کرسی سے اٹھا۔

گھر کے دروازے پر مدہوش سے عالم میں سگریٹ کے کش بھرتی عورت کو دیکھ کر اس کی پیشانی تنک گئی۔ اتنا کافی نہ تھا، اتنی گرمی میں بھی اس نے پشمینہ شال کندھے پر گرائی ہوئی تھی۔ مناج نے اس کے چہرے کی ناگواری کو بھانپ لیا۔

"یہ درفشاں کا گھر ہے؟" مناج کے مشینی انداز میں مصنوعی نروٹھے پن کا ملاپ تھا۔ احمد نے گردن ہاں میں ہلائی۔ مناج ایسے حق سے اندر داخل ہوئی جیسے یہ گھر اسی کا تھا۔

ٹھیک اسی وقت درفشاں دروازے پر آئی۔ اس کی آستینیں مڑی ہوئی تھیں اور ہاتھ گیلے تھے۔

"مناج اندر آجاؤ۔ میرے ساتھ اوپر چلو۔" درے مڑ گئی۔

مناج نے ایک سرد نگاہ احمد پر ڈالی جس کے چہرے کے تاثرات اب بھی تنے ہوئے تھے۔ اس نے سگریٹ کا گہرا کش بھرا اور ڈھیر سارا دھواں احمد کے چہرے پر خارج کیا۔ احمد کھانستا اور کراہتا رہ گیا۔ جب تک احمد نے اپنی کھانسی قابو کی تب تک تو مناج منظرِ عام سے غائب ہو چکی تھی۔

"نہ جانے آپا کے کیسے کیسے دوست آرہے ہیں۔ اف۔" وہ دل ہی دل میں درفشاں کو ملامت کرنے لگا۔

اوپر والی منزل میں ڈرائینگ روم میں درِفشاں نے مناج کو بٹھایا۔

”مجھے خوشی ہوئی کہ تم آئی۔ البتہ ایک بات میں واضح کروں گی کہ تبدیلی تم سے آئی گی۔ انسان میں کوئی تبدیلی تب تک پیدا نہیں ہوسکتی جب تک وہ خود کوشش نہ کرے۔ میرا کام ہدایات فراہم کرنا ہے۔ تمہیں راہ دکھانا ہے۔ اس راہ کا تعاقب تمہیں خود کرنا ہے۔“ وہ مودب انداز میں بولی۔

مناج غور سے اسے سن رہی تھی۔ البتہ کافی گھبرائی ہوئی تھی۔

”اب تمہیں اعتراف کرنا ہوگا۔ خود سے ایمانداری کا مظاہرا کرو اور بتاؤ مجھے تمہارے ساتھ کیا مسئلہ درپیش ہے۔“

مناج کے دل پر گرہیں لگیں۔

”اعتراف کی گھڑی سے زیادہ، اعتراف سے پہلے کی گھڑی کٹھن ہوتی ہے۔ تم گہری سانس خارج کرو، وقت لینا ہے تو لو پھر ایک ہی سانس میں اعتراف کرو۔“ منتظر نگاہیں مناج پر مرتکب کیں۔

مناج کا دل حلق میں آ گیا۔ اسے اپنی صورتحال بتانے کو درست الفاظ بھی نہیں مل رہے تھے۔ گھبراہٹ کے مارے پیشانی پر پسینے کی بوندیں جھلکیں۔

”میں۔۔۔ میں ایک عجیب سی چیز میں مبتلا ہوں درفشاں۔ مجھے نہیں پتا میں آپ کو کیسے بتاؤں۔“ وہ بنا نظریں ملائے بولی۔

”تم اس چیز کی پرواہ نہ کرو کہ میں کیا سوچوں گی۔ ایک جھٹکے میں سب کہہ ڈالو۔“

چبھتی ہوئی خاموشی حائل رہی۔ مناج کو لگا جیسے اس کے حلق میں ریت کے ذرات پھنس گئے ہوں۔ اس نے آنکھیں میچ لیں۔ درے کی ہدایت پر عمل کرتے، ایک سانس اندر کھینچی پھر باہر نکالی۔

’’میں اپنے آپ کو تکلیف دیتی ہوں۔‘‘ اس نے تیزی سے اپنا گہرا راز اگلا۔ دل برق رفتاری سے دھڑکا۔ سانسیں تیز ہوئیں۔

’’مجھے تکلیف کی طلب ہوتی ہے۔ کبھی سگریٹ سے، کبھی ریزر سے، کبھی خود کے اوپر تھپڑ برسا کر میں خود کو اذیت پہنچاتی ہوں۔‘‘ سانسیں بدستور پھولی ہوئی تھیں۔

مناج نے ڈھیروں ہمت جمع کی اور آنکھیں کھولیں۔ لمحے بھر کے لیے وہ دنگ رہ گئی۔ درے کا چہرہ عامیانہ جو تھا۔ ایسا کیسا ممکن تھا کہ کوئی اتنی غلیظ بات جان کر اس کے بارے میں منفی رائے قائم نہ کرے؟

’’تمہیں اسی بات کا ڈر تھا کہ میں تمہیں جج کروں گی؟‘‘ درے مسکرائی۔

وہ ماہرِ نفسیات اسے کوئی فرشتہ لگی۔ وہ اس کے سحر میں پھر کھو گئی۔

’’میں نے تمہارے بارے میں کچھ نہیں سوچا۔ کیا ہم کینسر کے مریض کو جج کرتے ہیں؟ کیا دل کے مریض کو جج کرتے ہیں؟ کسی کو بخار ہو جائے تو اسے جج کرتے ہیں؟ پھر میں تمہیں کیوں جج کروں گی؟ یقین کرو، میرے پاس ایسے کیسز آئے دن آتے ہیں۔ یہ تمہاری سوچ سے زیادہ عام ہے۔‘‘

مناج کے دل سے پھندا سا اترنے لگا۔

’’کیا واقعی؟‘‘ مناج نے اچنبھے سے پوچھا۔ درفشاں نے سر اثبات میں ہلایا۔

’’ہر انسان جس کی ذہنی صحت بگڑی ہوتی ہے وہ یہی گمان کرتا ہے کہ وہ اکیلا ہے۔ مگر یہ سچ نہیں۔ تم دنیا کی پہلی انسان نہیں جو اس سب سے گزر رہی ہے۔ تم سے پہلے بھی بہت آئے اور بہتر بھی ہوئے۔ تم بھی ہو جاؤ گی۔‘‘ اس نے مناج کو یقین دلایا۔

مناج کے دل کو قرار پہنچا۔ چند ہی منٹ میں اسے بہت سے سوالات کے جواب مل گئے تھے۔

"یہ بہت سی وجوحات کی بنا پر ہوتا ہے۔ کچھ لوگ اڈوینچر کے طور پر خود کو تکلیف دیتے ہیں۔ انسانی دماغ نہایت پیچیدہ ہے، وہ نہ جانے کون سے کاموں کا عادی ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگ توجہ کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ کچھ خیالات سے آزادی حاصل کرنے کے لیے۔ بعض نے زندگی میں اتنا ابیوز جھیلا ہوتا ہے کہ وہ خود کو تکلیف کا حقدار سمجھتے ہیں۔ اسے ہم سیلف ہارم بھی کہتے ہیں۔ خودکشی بھی سیلف ہارم کی ایک قسم ہے۔"

مناج گہرے خیال میں کھو گئی تھی۔ وہ سچ میں خود کو تنہا سمجھتی تھی۔ اور یہاں درے نے اس کے مرض کی دس مثالیں پیش کر دیں۔

"اب تم مجھے اپنی کہانی سناؤ۔ جہاں سے چاہتی ہو وہاں سے بتاؤ۔ میرے بارے میں نہ سوچو۔ میرا کام ہے سننا، میں بے جھجک سنوں گی۔" درِفشاں اپنائیت سے لبریز انداز میں بولی تھی۔

مناج پوری طرح آرامدہ ہو چکی تھی۔ ساری جھجک دم توڑ گئی۔ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے مناج نے اپنی کہانی بتانا شروع کی۔

"درفشاں، مجھے جب سے ہوش آیا تب سے میں نے اپنی امی اور اپنے ابو کو جھگڑتے دیکھا۔ مجھے دونوں بہت پیارے تھے۔ ان کی لڑائیوں میرا دل توڑ دیتی تھیں۔" مناج کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ بکھری۔

"اور پھر جب بڑی ہوئی تو پتا چلا۔" مناج کی مسکراہٹ سمٹی۔ اس نے تھوک نگلا۔

"کہ ابو کو جوئے اور شراب کی لت تھی۔ وہ گھر کا سارا پیسہ جوئے میں وار دیا کرتے تھے۔ شراب نے ان کی صحت کھالی تھی۔ اور وہ لت کے ہاتھوں مجبور تھے۔"

☆☆☆

"ابو کیا آپ کو اپنی بیٹی سے پیار ہے؟" سات سالہ مناج اپنے عزیز والد سے شدید خائف تھی۔

طارق جھکے ہوئے تھے۔ باپ کے منہ سے سڑانڈ اٹھ رہی تھی۔ اس نے بمشکل اسے برداشت کیا۔

"میری ملکہ کو گمان بھی کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اس سے پیار نہیں کر سکتا؟" انداز میں مصنوعی خفگی تھی۔

"ابو پھر آپ شراب کیوں نہیں چھوڑتے۔ امی سارا دن روتی رہتی ہیں۔ مجھے بہت برا لگتا ہے۔ آپ شراب چھوڑ دیں تو ہماری زندگی ٹھیک ہو جائے گی۔" وہ سختی سے بولی۔

طارق کے چہرے پہ رنج بھرا تاثر ابھرا۔ جس آدمی کو کسی بھی چیز کی لت ہو، وہ اس وقت کو ضرور کوستا ہے جب وہ پہلی مرتبہ اس لت کے قریب بھٹکا تھا۔ طارق جب بھی اپنی بیٹی کی ملتجی آنکھوں کو دیکھتے، خود کو دل سے ملامت کرتے۔

مگر کیا آج تک ملامتوں سے کسی کی لت ٹوٹی ہے؟

"اگر میں وعدہ کروں کہ اب شراب نہیں پیوں گا تو میری مناج مجھ سے ناراض نہیں رہے گی؟" طارق نے آنکھ کے کونے پر چھلکتا آنسو پونچھا۔

"ہاں، ہم سب خوش ہو جائیں گے۔" وہ خیال ہی اس بچی کے دل میں مسرتیں گھول گیا تھا۔

”میں وعدہ کرتا ہوں، اب شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔“

وہ ایک چست میں ان کے گلے سے لگی۔ بغیر پرواہ کیے کہ ان کے منہ سے کیسا تعفن اٹھ رہا تھا۔ وہ اس کے باپ ٹھہرے تھے۔ ان کے کھوکھلے وعدے ہی مناج کو امیدوں کے قلعے میں کھڑا کر دیتے تھے۔

☆☆☆

”یہ روز کا معمول تھا۔ نئے وعدے۔ نئی امیدیں۔ اور پھر نئے سرے سے مایوسی محسوس کرنا۔ میں ناراض ہوتی تھی۔ اور ہر بار ان کے وعدوں پر یقین کر لیتی تھی۔ باپ تھے میرے۔ مجھے بہت عزیز تھے۔ اب بھی عزیز ہیں۔ آئندہ بھی عزیز رہیں گے۔“

وہ بولتی گئی۔ چہرے پر رتی برابر کرب نہ تھا۔ مگر باطن میں طوفان برپا تھا۔ اس طوفان کے آثار چہرے پر جھلکنے سے کس طرح روکے ہوئے تھی، صرف وہی جانتی تھی۔

☆☆☆

وہ پلنگ پر باپ کے ہاتھ پر سر رکھ کر لیٹی ہوئی تھی۔ وہاں سکون رقم تھا۔ ان کے ساتھ چند لمحے ہی نصیب ہوتے تھے، وہ انہیں ضائع نہیں کرتی تھی۔ طارق کا چہرہ سوکھ چکا تھا۔ آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے تھے۔ چہرے کی کھال لٹکنے لگی تھی۔

”ابو میری ایک دست ہے فاطمہ۔ وہ کہتی ہے کہ میرا نام لڑکوں کا ہوتا ہے۔ آپ میرا نام کیوں نہیں بدل دیتے۔“ اس نے باپ کو مڑ کر دیکھا۔

طارق کے سینے میں تکلیف بھری ٹیسیں ابھریں۔ کمال کا ضبط تھا ان کا۔ تکلیف کی جھلک تک اپنی بیٹی پر نہ پڑنے دی۔ اس کے معصومانہ سوال پر ہنستے چلے گئے۔

”وہ اس لیے کہتی ہے کیونکہ اسے تمہارے نام کا مطلب نہیں پتا، مناج۔“ آواز میں واضح لرکھڑاہٹ تھی۔

”اچھا۔ اور میرے نام کا کیا مطلب ہے؟“ مناج کا انداز تعجب آمیز تھا۔

”مناج کا مطلب ہوتا ہے ایک باوقار مہارانی۔ ایسی مہارانی جس کا نفس مضبوط ہوتا ہے اور روح دلیر۔ میری بیٹی بھی مضبوط نفس کی باوقار مہارانی ہے۔“

ٹھیک اسی وقت مناج کی والدہ فرزانہ اندر آئیں۔ چہرے پر تلخی تھی۔

”ہاں وہ مہارانی ہے۔ مگر وہ تمہارے جیسے باپ کی مستحق نہیں تھی۔“

جو لڑکی لمحے پہلے تک پھول کی طرح کھلی ہوئی تھی، یکدم بجھ گئی۔

”نہ جانے کون سا گناہ کیا ہے میں نے جس کی سزا میری بیٹی کو مل رہی ہے۔“

ہاتھوں میں کپڑوں کا پلندا اٹھائے وہ غسل خانے کی طرف جا رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر اپنے شوہر کے لیے گہری نفرت تھی۔ یکبارگی طارق ان کے سامنے کھڑے ہوئے۔ وہ رک گئیں۔

”میں کوشش کر رہا ہوں، فرزانہ۔ ایک دن سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ طارق پھیکا سا مسکرائے۔

فرزانہ کے کندھے شل ہوئے۔ آنکھوں میں کرب کے ساتھ طیش سما گیا۔ وہ استہزائیہ ہنسی ہنس دیں۔

”کچھ ٹھیک نہیں ہوتا۔“ وہ اونچی آواز میں بولیں۔

”تم کبھی ٹھیک نہیں ہو گے اور ہم تمہارے ساتھ اپنی زندگی ضائع کر دیں گے۔ جن لڑکیوں کے بھائی بے غیرت ہوتے ہیں، وہ تم جیسے نشئیوں کے ہاتھوں پستی ہیں، طارق۔ مجھے اپنے بھائیوں سے رتی برابر امید ہوتی تو میں کب کا اپنی بیٹی کو تمہارے پاس سے لے گئی ہوتی۔“ تھکان، شکوہ، اذیت، رنج، الم اور سوگ۔ کیا کچھ تھا اس عورت کی آواز میں۔

طارق کی روح کانپ گئی۔ آنسوؤں کا پھندا حلق میں پھنسا۔

”اب تم ایسا بھی مت کہو، فرزانہ۔“ دل کی سوزش انتہاء کو پہنچی۔

”تم۔۔۔ تم“ فرزانہ کی سانسیں غصے کے مارے پھولنے لگیں۔ ”تم مر کیوں نہیں جاتے، طارق۔“ وہ کپکپانے لگیں۔ آنکھ سے ایک آنسو نکلا۔

شاید قبولیت کی گھڑی تھی۔

یا شاید قسمت کو یہی منظور تھا۔

طارق کو لگا جیسے ان کے سینے میں نوکیلے شے داخل ہوئی تھی۔ آنکھوں کے سامنے جھماکے پر جھماکہ ہوا۔ وہ توازن کھو بیٹھے اور زمین پر ڈھے گئے۔ جسم تڑپ رہا تھا۔ چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ مناج بھاگتے ہوئے اپنے ابو کی جانب بڑھی۔ فرزانہ کے ہاتھ سے کپڑوں کی ٹولی چھوٹ گئی۔ قدم بے ساختہ پیچھے بڑھے۔ ہاتھ گالوں کو پہنچے۔ آنکھوں میں شاک تھا۔

”ابو، آنکھیں کھولیں۔“ مناج دھاڑے مار کر رو رہی تھی۔



”شراب نے ان کا سارا جسم نوچ کھایا تھا۔ جگر کام نہیں کر رہا تھا۔ گردے ناکارہ ہو گئے تھے۔ پھر دل نے بھی دھڑکنا چھوڑ دیا۔ میں رو رو کر ہلکان تھی۔ مگر امی، انہوں نے ایک آنسو نہیں بہایا۔ لیکن اس میں ان کا کیا قصور درِ فشاں؟ جس آدمی نے زندگی بھر ان کی ناقدری کی، ان کے اوپر چند گھڑی کی لذتوں کو فوقیت دیں، وہ ایسے انسان کے اپنی زندگی سے رُخصت ہو جانے پر افسوس کیوں کرتیں؟“



”ابو چلے گئے!“

سکرین پر ایک سیدھی لکیر کھینچ چکی تھی۔

باریک آواز وائٹلز سے رواں تھی۔

نرس نے طارق کے چہرے کے اوپر کپڑا ڈال دیا۔ مایوسی، رنجشی اور المنا کی کا راج قائم تھا۔

وہ بلک رہی تھی۔ رو رہی تھی۔ سسک رہی تھی۔ دل پھٹ رہا تھا۔ خاردار کوڑے اس کی روح پر برس رہے تھے۔

”ابو چلے گئے امی!“ وہ زیر لب بولی۔

زہر پینا اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے زیادہ آسان ہوتا۔

فرزانہ دروازے کی چوکھٹ پر کسی بت کی طرح کھڑی تھیں۔ آنکھیں ہر احساس سے عاری تھیں۔

"ابو چلے گئے۔"

وہ درد کی شدت کو جھیل نہ سکی اور فرش پر گھٹنوں کے بل ڈھے گئی۔

☆☆☆

"پتا ہے درفشاں، امی کو اگر اندازہ ہوتا کہ ابو کی موت کے بعد ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے تو شاید وہ کبھی بھی وہ دعا نہ کرتی۔ ابو کی موت کے بعد ہی تو میری اور امی کی زندگی صحیح معنوں تباہ ہو گئی۔ کیونکہ ہمیں۔" مناج ٹھہری۔

پہلی بار تھا اس کی آنکھوں میں اس قدر واضح احساس ابھرا تھا۔ وہ احساس خوف کا تھا۔

"ہمیں پرویز اور اس کی بہن، لویزا مل گئے تھے۔"

☆☆☆

دس سالہ مناج اپنی والدہ کے ساتھ اپنے نانا کے گھر رہ رہی تھی۔ لاؤنج میں سارا ٹبر جمع تھا۔ پھوپھیاں، دادی، دادا، چاچیاں اور چچا بھی۔

وہ فرش پر بیٹھی تھی۔ سر شیشے کی گول میز پر رکھا تھا۔ چہرے پر ویرانی تھی۔ فرزانہ اپنی ماں کے ساتھ صوفے پر زندہ لاش کی طرح براجمان تھیں۔ ان کے والد سربراہی صوفے پر بیٹھے تھے۔ بڑے بھائی اونچی آوازوں میں مدعا بیان کر رہے تھے۔

"ابا، کب تک اسے گھر بیٹھاؤ گے۔ جوان بیوہ ہے۔ لوگ طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں۔" بڑے بھائی نے کہا۔

”سچ بولو ناں، تمہاری گھر والی سے میری بچی اور نواسی برداشت نہیں ہو رہی۔“ فرزانہ کی والدہ کو اپنی سب سے بڑی اولاد زہر لگی۔

”اماں بس ہی کرو تم۔“ فرزانہ کا بھائی بد لحاظ سے انداز میں بولا۔ ”اتنا اچھا رشتہ ملا ہے مجھے، فرزانہ کے لیے۔ اب دیر کیوں کریں۔“

”میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔۔۔“ فرزانہ کی والدہ نے اپنے بیٹے کی طرف انگلی اٹھائی، مگر ان کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔

”تم چپ کرو!“ فرزانہ کے والد دھاڑے تھے۔ ”اور تم تفصیل بتاؤ۔“

ایک جھٹکے میں ان کی آواز کو دبا دیا گیا۔

گھروں کے مرد اپنی عورتوں کی آوازیں دباتے ہیں تو وہ زمانے کے ہاتھوں پس جاتی ہیں۔

”اس کا نام پرویز ہے۔ بہت امیر اور بہت طاقتور انسان ہے۔ اسے بس کوئی جوان سی عورت سے شادی کرنی ہے۔ وہ عمر میں بڑا ہے مگر فرزانہ کی بچی پالنے کے لیے تیار ہے۔ اس کی بہن کے اس شہر میں بڑے بڑے ہسپتال ہیں۔ اب ایسے رشتے کو میں کیسے منع کر سکتا ہوں؟“ فرزانہ کے بھائی بولے تھے۔

”ٹھیک ہے، تم بلوا لو انہیں۔ ہم جلد ہی فرزانہ کا نکاح کروا دیں گے۔“

فرزانہ زندہ لاش کی طرح سب سنتی گئیں۔ وہ کچھ نہ بولیں۔

بولتی بھی کیوں؟ وہ جانتی تھیں ان کی آواز بھی ان کی والدہ کی آواز کی طرح دبا دی جانی تھی۔

یہ ہوتا ہے جب عورتوں پر بے جا ظلم کیا جاتا ہے۔ ان کی آوازیں چھینی جاتی ہیں۔

وہ ڈھے جاتی ہیں۔

وہ جیتے جی مر جاتی ہیں۔

وہ دنیا کے سامنے رسوا ہو جاتی ہیں۔



''امی اور پرویز کی شادی ہو گئی۔ ہم دونوں اس بڑے سے گھر میں چلے گئے۔ وہ گھر تھا تو بہت بڑا۔ مگر اس گھر میں دہشت سوار تھی۔ اس گھر میں میرے ساتھ وہ سب ہوا جس کے بارے میں، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔'' مناج کچھ دیر کے لیے ٹھہری۔

درے بھی پوری توجہ کے ساتھ اسے سن رہی تھی۔

''کیا میں باقی کہانی کسی اور وقت سنا دوں؟'' مناج کا انداز التجائیہ تھا۔ توانائی جیسے نچڑ گئی تھی۔

دوسری طرف درے فشاں کی روح کانپ اٹھی تھی۔ بہت کم ہوتا تھا جب کسی کی کہانی درے کو اتنا متاثر کرتی تھی۔ مناج کے ماضی میں کیا تاریکی کے علاوہ بھی کچھ تھا؟ درے کو تعجب ہونے لگا۔

''جیسا تم چاہو۔ ہم یہاں پر روک سکتے ہیں۔''

درے نے خود کو نارمل ظاہر کیا۔ مناج کا دل ہلکا پھلکا ہونے لگا۔ اسے معلوم نہ تھی کہ کہانی کا ایک حصہ بتانے پر ہی وہ کتنی تازہ دم ہو جائے گی۔

دوسروں کو سننا ایک آرٹ ہے۔ اور درِ فشاں سے بہتر یہ آرٹ شاید ہی کوئی جانتا ہو۔

”تمہارے ابو نے کہا تھا کہ تم باوقار مہارانی ہو۔ میں ان کی بات سے سو فیصد متفق ہوں۔ تم مہارانی ہی تو ہو۔ خوبصورت مہارانی۔“

وہ اور باوقار ماہرانی؟ کبھی نہیں۔ مناج نے سوچا۔

”مگر میں متفق نہیں۔ میرا کوئی نفس نہیں۔ میری عزتِ نفس نہیں۔ مجھے تضحیک کا احساس نہیں ہوتا۔ کوئی برا بھلا کہے تو میں جواب تک نہیں دیتی۔ مجھ میں ایسا کچھ نہیں کہ مجھے باوقار کہا جائے۔“

صوفے پہ کھسکتے ہوئے درے مناج کے قریب پہنچی۔ مناج کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھا۔

”مناج ہمارا ماضی جیسا بھی ہو، وہ ہمارا ہوتا ہے۔ سب سے پہلے اس بات کو قبول کرنا ہوگا کہ جو بھی ہوا وہ ٹل چکا ہے۔ تم وہاں سے نکل چکی ہو۔ تم اب تک ان ہی یادوں میں جی رہی ہو۔ ایک بات بتاؤں ویسے، میں نے تم سے زیادہ بہادر اور مضبوط لڑکی آج تک نہیں دیکھی۔“

مناج الجھی۔

”کیسے؟“

”تمہاری کہانی نے میری روح کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ کوئی اور یہ سب بتاتا تو رو رو کر ہلکان ہو جاتا۔ مگر تم نے ضبط بحال رکھا۔ کتنے لوگ پہلے ہی مرحلوں میں اپنی نسیں کاٹ دیتے ہیں۔ مگر تم، تم ڈٹی رہی۔ تم نے سب سروائیو کیا۔ مناج، تم سروائیور ہو۔“ درے نے اس کے اندر آگ بھڑکانا چاہی۔

”بس تمہارا وقار کہیں کھو گیا ہے۔ اسے بازیاب کروانا ہوگا۔“

”اور وہ کیسے ہوگا؟“ مناج نے پوچھا۔ درفشاں مسکرادی۔ یقیناً آگ بھڑک چکی تھی۔

”کیا تم سچ میں کوشش کرو گی؟“

مناج نے سر اثبات میں ہلایا۔

”تمہیں تمہارا کھویا ہوا وقار صرف ایک صورت میں ملے گا۔ جب تم خود کی نظر میں معتبر بنو گی۔ جانتی ہو خود کی نظر میں معتبر کیسے بنا جاتا ہے؟ اپنا خیال رکھ کر۔ اپنی ذات کے لیے بہترین عمل کرنے سے۔ تمہیں خوشیوں کے پیچھے نہیں بھاگنا ہے۔ خوشی تو ہمیں ڈر گز بھی دیتی ہیں۔ ہمیں اطمینان کی کھوج کرنی ہے۔ خوشیاں عارضی ہوتی ہیں، اور اطمینان دائمی۔“

مناج کے اندر امید کی کرنوں نے جنم لیا۔ اسے زندگی میں پہلی دفعہ یقین ہوا کہ وہ بھی بہتر ہو سکتی ہے۔

”اب ایک دفعہ مسکراؤ؟ شاباش۔“

پرسوز ملاقات کا اختتام مسکراہٹوں کے تبادلے پر ہوا۔

”آج سے تمہارا سفر شروع ہوا مناج۔ تمہیں خود کو تلاش کرنا ہے۔ تمہیں خود کو فتح کرنا ہے۔ تم جب تیار ہو میرے پاس آجانا۔“ الوداعی کلمات کہہ کر اسے رُخصت کر دیا۔

احمد اب تک ایل شیپ ٹیبل کے ساتھ بیٹھا موبائل میں لگا ہوا تھا۔

”اچھی بھلی آئی تھی وہ۔“ اس نے درے کو مخاطب کیا۔ ”اور تم نے تو اس کا پورا موڈ ہی بگاڑ دیا۔“ احمد مصروف سے انداز میں بولا۔

درے اداس سا مسکرا دی۔

"مناج ہر جذبے سے عاری تھی، احمد۔ اور جذبات سے عاری ہونا انسان کے لیے اچھا نہیں ہوتا۔ جذبات انسان کے دشمن نہیں ہوتے۔ مناج کو ابھی علم نہیں۔" درفشاں کے اندر کی بڑی بہن جاگ چکی تھی۔

احمد کے چہرے پر شرارتی مسکراہٹ بکھری۔

"چچ چچ! تمہیں یہ سب جاننے کے لیے سالوں سائیکولاجی پڑھی، اور مجھے دیکھو، میں یہ سب پہلے سے ہی جانتا ہوں، آپا۔" اس سے پہلے درِفشاں ایک آدھ چپت لگاتی وہ سیڑھیاں پھلانگتا ہوا کمرے میں بھاگ گیا۔

درِّفشاں وہیں دم سادھے کھڑی رہی۔ آج کسا جانے والا طنز اس کے لیے بہت ذاتی تھا۔ اس کے مکروہ بھائی نے اس کی ڈگری کو نااہل قرار دیا تھا۔ کیا سارے بھائی ایسے ہی ہوتے ہیں؟

نامحسوس انداز میں پیر پٹختے ہوئے وہ اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔

☆☆☆

دو ہفتے بیت گئے تھے۔۔۔

دو ہفتے لگ گئے مہر کو ہمت کے بلبلے میں قدم رکھنے کے لیے۔ دو ہفتے لگے اسے اپنے ٹوٹے ہوئے حصوں کو اکھٹا کرنے میں۔ دو ہفتے لگے اسے سر پر منڈلاتی آفت کو قبول کرنے میں۔ دو ہفتے جو بظاہر چھوٹی مدت سہی، مگر مہر کے لیے صدیوں کے برابر تھی۔

ملامتوں کی گھڑیاں ٹل چکی تھیں۔

مقابلے کا وقت آن پڑا تھا۔

(شمس سے ملاقات ختم کر کے وہ اپنے کمرے میں آئی تو اسے اپنی دنیا اجڑی ہوئی لگی۔ کوئی نہ جانتا تھا کہ بظاہر عظیم سلطنت کی مالکن، در حقیقت دیوالیہ ہو چکی تھی۔ اسے اپنا آپ پہاڑوں کے نیچے محسوس ہوا۔ وہ خاکستر ہو چکی تھی۔)

آفس کی راہداری میں ٹہلتے ہوئے اس نے کئی استقبالیہ چہرے دیکھے۔ کچھ کے چہروں پر پُر امید مسکراہٹ تھی۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ اب ان کی نئی باس تھی۔ ایک دفعہ پھر خوف ستانے لگا۔ کیا وہ اپنی قرض میں ڈوبی کمپنی کو کبھی بچا پائے گی؟

اپنے آفس تک کا سفر طے کرنا محال تھا۔

(وہ بستر کے سرہانے سر ٹکا کر روتی گئی۔ وہ رات سوگ کی رات تھی۔ بکھرتی زندگی کے ماتم کی رات تھی۔ اس دل ہی دل میں اپنے ڈیڈ کو کوسا۔ پھر خود کو اپنی کمزوری پر کوسا۔ نظر سٹڈی ٹیبل پر موجود سیاہ سرورق والی کتاب پر گئی۔

"میرے اللہ، مجھے بچا لے۔" وہ سسک اٹھی)

زندگی سخت ہو جائے تو اچھوں اچھوں کے ہوش اڑا دیتی ہے۔ اس کی ہوائیاں بھی اڑی ہوئی تھیں۔

آفس میں اس کے سامنے عمر رسیدہ مینجر بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے پر گرمجوش مسکراہٹ تھی۔ اس کی پیشانی تنگ تھی اور دل بے چین۔

آج مشکل فیصلے لینے تھے۔ وہ ان مشکل فیصلوں کے لیے خود کو ہفتوں سے تیار کر رہی تھی۔

(اندھیری رات میں صرف اس کا مصحف ہی تھا جو اسے امید کی نادیدہ کرنیں دکھا رہا تھا۔ مہر نے سب جھڑک کر اپنی اسٹڈی ٹیبل کا رخ کیا اور اپنا مصحف وہیں سے کھولا جہاں سے آخری مرتبہ چھوڑا تھا۔)

"ڈیڈ نے ہماری کمپنی کو ایک بہت بڑے قرضے میں چھوڑ دیا ہے، زاہد۔"

انہیں اپنی سماعت پر شک ہوا۔ بھلا نئی باس آتے ساتھ ہی اتنا بڑا بم کیوں پھوڑے گی؟

"یہ کیا بات کر رہی ہیں آپ؟" وہ کرنٹ کھانے والے انداز میں بولے۔

مہر نے سر اوپر نیچے ہلایا۔ زاہد کا سارا سکون غارت ہوا۔ مہر کا چہرہ پُر اطمینان تھا۔ اس نے کاغذات کا پلندہ زاہد کی طرف بڑھایا۔ وہ انہیں پلٹتے گئے۔ ان پر لرزاں طاری ہوئی۔

"ناممکن! یہ بہت بڑی رقم ہے۔" وہ خواب سی کیفیت میں بولے۔

مہر کے چہرے پر برفیلہ تاثر استدعا تھا۔

وہ ان سب کی سربراہ تھی۔ اندر سے ٹوٹ رہی تھی، مگر اسے کچھ ظاہر کرنے کی اجازت نہ تھی۔

("اور ہم ضرور تمہیں خوف و خطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے۔"

لاجواب، مسحور۔ وہ رو پڑی۔ یہ کتاب آخر کیا تھی؟ اس کا اللہ، اس کا پروردگار آخر میں ہمیشہ اس کی دل جوئی کر ہی دیتا تھا۔)

”یہ وقت پینک (panic) ہونے کا نہیں ہے۔“ وہ پر سکون انداز میں بولی۔

”یہ حل تلاش کرنے کا وقت ہے۔ اس کمپنی کو اس کرائسز سے نکالنے کا وقت ہے۔ جو ہوا سو ہوا، اب آگے بڑھنے کا وقت ہے۔“ مایوسی کے کڑوے گھونٹ حلق میں اتارے۔

کچھ دیر کمرے میں خاموشی پھیلی رہی۔ زاہد اپنی باس کا تحمل مزاج دیکھ کر متاثر ہوئے تھے۔

”ہمیں کمپنی سے ایمپلائی فارغ کرنا پڑیں گے۔ بڑے پیمانے میں ڈاؤن اسکیلنگ کرنی پڑے گی، تاکہ پروفٹ بڑھایا جاسکے۔“

مہر نے گردن نفی میں ہلائی۔

”میں اتنے سارے لوگوں کی بددعا نہیں لے سکتی۔ اس کمپنی سے نہ جانے کتنے خاندانوں کا رزق جڑا ہوا ہے۔“ مہر کا انداز سرد تھا۔

”مگر یہ ہماری ضرورت ہے۔“

(”ان حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے، تو کہیں کہ ”ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔“

مہر کا ضبط پھر سے ٹوٹا اور وہ رونے لگی۔ اس کا رب اس پہ حد سے زیادہ مہربان تھا۔ آج اسے صحیح معنی میں سمجھ آیا تھا کہ اس کا رب رحمٰن ورحیم کیوں کہلاتا ہے۔

”میں آپ ہی کی ہوں اللہ۔“ وہ آنسوؤں کا پھندا حلق میں نگلتے بولی تھی۔ ”اور میں آپ ہی کی طرف پلٹ کر جانے والی ہوں۔“

کچھ تھا جو اس میں بدلنے لگا تھا۔)

"کمپنی کے اکاؤنٹس میں جو رقم ہے۔ اس سے ہم قرضے کا کچھ حصہ اتار سکتے ہیں۔" اس نے لبوں پر انگلی رکھتے، پر سوچ آواز میں کہا۔

"اس میں ہمارا نیٹ پرافٹ بھی ہے میم۔ ہمیں ایک مخصوص رقم پراڈکشن میں دینی ہوگی۔" زاہد کو مہر کی تجویز اتنی پائدار نہ لگی۔

"ہم اس میں سے مخصوص رقم پروڈکشن کے لیے چھوڑ کر باقی کی رقم نکال لیں گے۔ ساتھ ساتھ پراڈکٹس ڈاؤن اسکیل کریں گے۔ پیسہ جہاں بچ رہا ہوگا اسے بچانے کی کوشش کی جائے گی۔"

مہر اپنا فیصلہ حتمی سے انداز میں سنانے لگی۔

(وہ اللہ کی تھی، یہ اقرار صرف زبان کا نہیں تھا، بلکہ اس نے دل سے اقرار کیا تھا۔ وہ دل سے سب کچھ تسلیم کرنے لگی تھی۔

"انہیں خوش خبری دے دو ان پر ان کے رب کی طرف سے بڑی عنایت ہوگی، اس کی رحمت ان پر سایہ کرے گی اور ایسے ہی لوگ راہِ راست پر ہیں۔"

مہر مسکراتے مسکراتے رونے لگی۔ اس نے صحیح معنوں میں آج اپنے رب کو پہچانا تھا۔)

"ہم کمپنی کے شیئرز بیچیں گے۔ ابھی میرے پاس سو فیصد شیئرز موجود ہیں۔ شیئرز کی قیمت سے کمپنی کو بچایا جا سکتا ہے۔" مہر قلم ہاتھ میں گھماتے بول رہی تھی۔

"اس میں رسک ہے۔ اگر ہم کامیاب نہ ہوئے تو سب کچھ ہمارے گلے پڑے گا۔ شیئر ہولڈرز طوفان برپا کر سکتے ہیں۔" زاہد کو یہ راستہ بھی زیادہ اچھا نہ لگا۔

"رسک ہر طرف ہے زاہد۔ ہم صرف کوشش ہی کر سکتے ہیں۔" مہر نے زور سے ٹیبل پر ہاتھ رکھا۔

زاہد جان گئے تھے۔ مہر کا فیصلہ حتمی تھا۔

(اب وہ رو نہیں رہی تھی۔ اب وہ کسی کو نہیں کوس رہی تھی۔ وہ پر سکون تھی، مطمئن تھی۔ زندگی کی خوبصورتی، زندگی کی تلخیوں کے ساتھ سمجھوتا کرنے میں ہوتی ہے۔ یہ سب اللہ کی اجازت سے ہو رہا تھا۔ اسے بغیر شکوہ کیے اس سب کو قبول کرنا تھا۔)

"جہاں تک ایمپلائیز کو فائر کرنے والی بات ہے۔ وہ بھی ہمیں کرنا ہو گا۔ وہ بھی ضروری ہے۔ اب کام پر لگ جائیں، زاہد۔" اٹل انداز میں کہتے ہوئے اس نے ہاتھ ہوا میں بلند کیا۔

زاہد سرعت سے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆☆☆

اگلے کچھ دن مہر نے طے شدہ معاملات نبٹانے میں لگائے۔ اس نے ہیروں کی تلاش شروع کی۔ گھر کا چپا چپا چھان مارا مگر وہ مل کر دم ہی نہ لیتے۔ بوجھ بڑھنے لگا تھا۔ مایوسی لوٹنے لگی۔

ان سب مسئلوں کے درمیان اس نے ایک مسئلہ سلجھانے کی سعی کی۔ وہ مسئلہ عنایا کا تھا۔ زندگی جھمیلوں سے بھری پڑی تھی۔ وہ کورٹ کا جھنجھٹ کسی صورت برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

اس نے آفس میں ہی مناج کو کال ملائی۔

رسمی علیک سلیک کے بعد مہر نے بات کا آغاز کیا۔

"میں میٹنگ کرنا چاہتی ہوں۔ وہ بھی آج۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔ کتنے بجے؟" انداز ہمیشہ کی طرح مشینی۔

"آج آٹھ بجے۔ کیسا رہے گا؟" معاً کچھ فائلز جانچ رہی تھی، سو آواز قدرے مصروف تھی۔

"ہو جائے گا۔ اپنے وکیل کو ساتھ ضرور لانا۔"

"مجھے آپ سے کچھ اور بھی پوچھنا تھا، مناج۔" مہر نے فائلز بند کیں۔ کرسی سے ٹیک لگائی۔

"ہاں پوچھو۔"

"کوئی بلیک میل ہو رہا ہو۔ تو اسے کون سے قانونی اقدامات اٹھانے چاہییں؟" اس نے حتی الوسع انداز عامیانہ رکھا۔

"بلیک میلر پر کیس کیا جا سکتا ہے۔ عموماً بلیک میلنگ کے تمام کیسز جلد ثابت ہو جاتے ہیں۔ مگر لوگ کتراتے بہت ہیں کیونکہ اکثر بلیک میلر اپنے ٹارگٹ کو دھمکیاں ہی ایسی دے رہا ہوتا ہے۔"

مہر نے سر اثبات میں ہلایا۔

''فرض کریں کہ بلیک میلر اپنے ٹارگٹ کو قرضہ دے چکا ہے۔اس کے علاوہ بلیک میلر ایک منجھا ہوا مجرم ہے۔تو اگر اس کا جُرم ثابت ہو جائے تو قرضہ معاف کیا جا سکتا ہے؟''مہر کی آنکھوں میں امید جاگی تھی۔

''ہاں۔اگر جُرم ثابت کیا جائے تو معاف ہو سکتا ہے۔مگر یہ اس بات پر انحصار کرتا ہے کہ بلیک میلنگ کی فطرت کیا ہے اور جُرم کس نوعیت کا ہے۔اور کچھ؟''

مہر کے لیے فیصلہ کرنا آسان ہو گیا تھا۔

''آپ کا بہت شکریہ۔آٹھ بجے ملتے ہیں۔''مختصر سا کہہ کر اس نے کال کاٹ دی۔

کام سے فارغ ہو کر وہ ڈی ایس پی سے ملنے چلی گئی۔ڈی ایس پی کے عبداللہ سلطان سے دوستانہ مراسم رہے تھے۔اس لیے وہ پر امید تھی۔

اس نے ڈی ایس پی کو شروع سے لے کر آخر تک سارا ماجرہ سنایا اور ثبوت کے طور پر کاغذات تھما دیے۔

''تو آپ یہ کہہ رہی ہیں کہ آپ کو بلیک میل کیا جا رہا ہے؟''ڈی ایس پی اسماعیل تعجب سے بولا۔

''بالکل۔''مہر ٹھنڈے ٹھار لہجے میں بولی۔

''سنابل ہسپتال نے ڈیڈ کو قرضہ دیا تھا اور اب یہ لوگ میرے ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ان کا ایک بندہ آیا تھا میرے پاس۔اس نے خود اعتراف کیا کہ وہ لوگ پیشہ ورانہ مجرم ہیں۔''

کاغذات کو بغور تکتے اس نے قہقہہ لگایا۔

”میڈم، کیا بات کر رہی ہیں۔ سنابل ہسپتال جس بندے کے نام ہے وہ جرمنی میں رہتا ہے۔ وہ بھلا جرمنی سے آپ کو دھمکیاں کیوں بھجوائے گا۔ مجھے لگ رہا ہے کہ آپ بس قرضے سے جان چھڑانے کے لیے یہ سب کر رہی ہیں۔“

مہر کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔

”نہیں۔ یہ لوگ اندر خانے کچھ غلط کر رہے ہیں۔ آپ investigation تو کریں۔“

مہر کو اندازہ ہونے لگا تھا کہ ڈی ایس پی اس معاملے کو سنجیدگی سے لینے نہیں والا۔ اس کا دل جلنے لگا۔

”ہم ایف آئی آر کاٹ دیں گے۔ اور تھوڑی بہت چھان بین بھی کر لیں گے، صرف اس لیے کیونکہ ہمارے عبداللہ صاحب سے بہت اچھے تعلقات رہے ہیں۔ مگر ہم کوئی گارنٹی نہیں دیں گے۔“ اسماعیل نے لاپرواہ انداز میں کہا۔

مہر نے ڈی ایس پی پر کھا جانے والی نظر ڈالی۔ اپنا غصہ ضبط کرنا اس کے لیے مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے یہاں آکر بہت بڑی غلطی کر دی تھی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تم سب بکے ہوئے ہو۔“ وہ چبا چبا کر بولی۔

ڈی ایس پی نے بھنویں اٹھائیں۔ کچھ کہنے کو لب کھولے تھے کہ مہر نے ہاتھ ہوا میں بلند کیے اسے خاموش کروایا۔

”مجھے کچھ نہیں سننا، تم سب بکے ہوئے ہو۔“

پاؤں پٹختے وہ وہاں سے چلی گئی۔ اب اسے مناج کے پاس پہنچنا تھا۔

اس کے جاتے ہی ڈی ایس پی نے کسی کو کال ملائی۔ کچھ ہی دیر میں کال اٹھالی گئی۔

"جی درانی صاحب، کیا حال ہے؟" وہ اونچی آواز میں بولا۔

"تم بتاؤ، کیوں کال کی؟" درانی کی خشک آواز میں تلخی سی تھی۔ اسماعیل مرعوب سا ہو گیا۔

"آپ لوگوں کے خفیہ ہسپتال کی کمپلین کی ہے عبداللہ سلطان کی بیٹی، مہر نے۔" اسماعیل نے عام سے انداز میں بتایا۔

"اور تم نے کاٹی؟"

"ہم آپ کے وفادار ہیں سر۔ آپ کا کھاتے ہیں، ہم بھلا کیوں کاٹیں گے کوئی ایف آئی آر۔ بس ہم آپ کو اطلاع دے رہے تھے۔" اسماعیل نے مسکا لگانے والا انداز اختیار کیا۔

"ٹھیک ہے۔" بس اتنا سا کہہ کر درانی نے کال کاٹ دی۔

وہ اپنے آفس میں بیٹھا ہوا تھا۔ آنکھیں غصیلی ہونے لگیں۔ اسے مہر کے اوپر رہ رہ کے غصہ آرہا تھا۔

اگلے ہی لمحے، چہرے پہ ناگوار سا تاثر لیے وہ لیڈی اقتدار کو کال ملا رہا تھا۔ کچھ دیر رنگ کے بعد کال اٹھالی گئی تھی۔

"لیڈی اقتدار یہ لڑکی پولیس اسٹیشن پہنچ گئی۔ ابھی ابھی میرے پاس ڈی ایس پی کی کال آئی تھی۔ ہمیں اسے اتنی کھلی چھوٹ نہیں دینی چاہیے۔" درانی نے چبا چبا کے احوال بتایا۔

"بس؟ ابھی اس کی لگام کھینچ دیتی ہوں۔" بے رحم انداز میں یقین دلایا گیا۔

☆☆☆

بیٹی سے بچھڑے باپ کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ وہ مناج کے آفس میں وقت سے کافی پہلے آگیا۔ وہ دونوں میز کے ایک طرف کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ دیوار گیر ٹی وی پر خبرنامہ چل رہا تھا۔

"سعودی شیخ عبدالرحمٰن اپنی بیٹی کے ساتھ پاکستان تشریف لائے ہیں۔۔" نیوز اینکر نے خبرنامہ پڑھا۔

"سعودی شیخ پاکستان میں؟" حسام نے تبصرہ کیا۔

مناج گردن جھکائے میز پر پڑے کاغذات کو پڑھ رہ تھی۔

"ہاں۔ میں نے پرسوں خبر سنی تھی کہ شیخ کی بیٹی کے دل میں سراخ ہے۔" اس نے کاغذات اکٹھا کرتے مصروف سے انداز میں کہا۔

"ان دونوں خبر کا آپس میں کیا تعلق؟ پاکستان میں اتنی اچھی طبی سہولتیں تو موجود نہیں ہیں؟" حسام حیران ہوا۔ نظریں ٹی وی پر مرکوز تھیں۔

مناج نے سرسری نظر حسام پر ڈالتے، کاغذات فائل میں بھرے۔

"اس کی بیٹی کا دل نکالا جائے گا۔" تھکی ہوئی سانس خارج کی۔ "اس کی جگہ کسی دوسرے کی بیٹی کا دل ڈالا جائے گا۔ پاکستان میں اعضاء کا غیر قانونی کاروبار بہت عام ہے۔"

وہ عام سے انداز میں بولی مگر حسام کے احساسات ہر گز عام نہ تھے۔ اس نے بے اختیار جھر جھری لی۔

”یہ اس قدر عام ہے؟“ حسام کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

”ہاں۔“

حسام کا دل ڈوبنے لگا۔ کیسی ظالم دنیا تھی۔ کسی کی بیٹی کی زندگی بچانے کے لیے کسی دوسرے کی بیٹی کی زندگی چھینی جا رہی تھی۔

”کیا اس سب کو روکا نہیں جا سکتا؟ کیا ان درندوں سے نجات پانے کا کوئی راستہ نہیں؟“ وہ کوفت کے عالم میں بولا۔

اس لمحے مناج نے ایک جھٹکا لیا۔ اس کا کام کرتا ہاتھ تھمنے لگا۔

”نہیں۔ جو طاقتیں قانون چلاتی ہیں۔ وہ خود اس سب میں ملوث ہیں۔“ اس نے کندھے اچکا دیے۔ البتہ کچھ تھا جو اس کے اندر بدلا تھا۔

حسام نے گردن جھٹکی۔ کچھ کہنے کو لب کھولے۔ پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ یکدم وہ سب بھلا گیا۔ دل میں لڈو پھوٹنے لگے۔ یاس سے بھرپور تکلیف و تڑپ کی راتیں بالآخر اختتام پذیر ہونے والی تھیں۔

☆☆☆

مناج کے آفس کی یخ بستہ فضا شدید تناؤ سے دوچار تھی۔ مناج اور حسام میز کے ایک طرف بیٹھے تھے۔ ولید او مہر دوسری۔ ولید سومرو کا موڈ بری طرح بگڑا ہوا تھا۔ پیشانی بل آلود تھی۔ وہ وقتاً فوقتاً مناج پر کھا جانے والی نظر ڈالتے۔

"مہر، مجھے تو آپ کی سمجھ نہیں آتی۔ آپ آؤٹ آف کورٹ سیٹلمنٹ کے لیے راضی کیسے ہو گئیں؟ مجھ سے مشورہ تک کرنا گوارہ نہ کیا۔"

حسام دلچسپی سے وہ منظر دیکھ رہا تھا۔ مناج بمشکل اپنی مسکراہٹ چھپا رہی تھی۔

"آپ فکر کیوں کرتی ہیں؟ یہ کیس ہمارا تھا، ہے اور رہے گا۔" ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مہر کو گھسیٹ کر مناج کے آفس سے باہر لے جاتے۔

مناج لبوں پر ہاتھ رکھے، ہلکا سا ہنس دی۔

"ولید۔" وہ جیسے ولید کے بھاشن کو کسی خاطر میں نہ لائی۔

"میں نے آپ کو شروع دن سے بتایا تھا کہ عنایا کی بہتری میری اولین ترجیح ہے۔ آپ مجھے قائل نہیں کر سکتے سو بلاوجہ اپنا وقت برباد نہ کریں۔" مہر نے تحمل سے بتایا۔ چہرے کے زاویے سخت تھے۔

ولید نے ہاری ہوئی سانس خارج کی۔ مناج کی مسکراہٹ لبریز آنکھوں پر نظر پڑی۔ وہ عورت انہیں کسی ڈائن جیسی معلوم ہوئی۔

"اگر آپ کے بے وجہ اعتراضات ختم ہو گئے ہوں تو کیا ہم میٹنگ شروع کریں؟"

مناج نے جلانے والی مسکراہٹ ولید کی طرف اچھالی۔ ولید نے اسے انتقاماً کھا جانے والی گھوری سے نوازا۔

"حسام، آپ بات شروع کریں۔" مناج بولی۔

حسام نے سر کو جنبش دی۔ حلق پر پھندا سا لگا۔ ایک وقت تھا وہ اس عورت سے بلا جھجک، کوئی بھی بات کبھی بھی کر سکتا تھا۔ وقت نے ایسا پلٹا کھایا تھا کہ وہ اسے دیکھ تک نہیں پا رہا تھا۔

"میں سوچ رہا تھا کہ ہم عنایا کی باریاں رکھ سکتے ہیں۔ کچھ دن وہ میرے پاس رہے گی، اور کچھ دن تمہارے۔ کیا خیال ہے؟" دل میں کسک پیدا ہوئی۔

مہر نے حسام کو گھورتے ہوئے گردن ترچھی کی۔ اس کے چہرے سے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کیا سوچ رہی تھی۔

"تم اتنا کیوں پھیلنے لگے ہو، حسام۔ کچھ دن؟" وہ اچنبھے سے بولی۔

حسام کے اوپر مایوسی کے کالے بادل چھانے لگے۔ یہ کیسا موڑ تھا؟ اگر مہر کو یہی سب کرنا تھا تو میٹنگ کے لیے راضی ہو کر اس کی امیدیں آسمانوں تک کیوں پہنچائیں۔

"میں عنایا کو تمہارے پاس ایک دن سے زیادہ رکھنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔" وہ اٹل سے انداز میں بولی۔ دونوں ہاتھ میز پر دھرے۔

ولید سومرو کے تاثرات بدل گئے۔ چہرے پر کھسیانی مسکراہٹ بکھری۔ یہ نیا موڑ انہیں بھایا تھا۔

"میں بھی دیکھتا ہوں کیسے ہوتی ہے یہ سیٹلمنٹ۔" ولید نے سوچا۔ انہیں جیت کی خوشبو آنے لگی۔

"بالکل۔ صرف ایک دن ہی۔" وہ مزے لینے والے انداز میں بولے۔ مہر سمیت مناج اور حسام کو ان کی مداخلت شدید ناگوار معلوم ہوئی۔

"مہر ایک دن میں کیا ہو جائے گا؟ کم سے کم دو دن کر لو۔ پلیز مہر۔" حسام شکست خوردہ ہوا۔

مناج نے بے دلی سے فائل پلٹی۔ اسے کچھ لمحے کے لیے یقین ہو گیا تھا کہ بات بننے نہیں والی۔ مہر نے اسے مایوس کیا تھا۔

"ایک دن، ورنہ ایک بھی نہیں۔ دن کا اپنی مرضی سے انتخاب کر سکتے ہو۔ اگر تمہیں منظور نہیں تو مجھے یہ میٹنگ اسی وقت ختم کرنی پڑے گی۔ میری زندگی میں زیادہ ضروری کام ہیں۔" مہر کا انداز تلخ تھا۔

حسام کی گردن جھکتی چلی گئی۔

"ٹھیک ہے۔ ہم کورٹ میں ہی عنایا کا کسٹڈی کیس لڑیں گے۔ ہمارے پاس کوئی اور راستہ نہیں چھوڑا گیا۔" مناج بھی تلخ ہو کر بولی۔

مہر نے شانے اچکائے اور اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ وہ جانے کے لیے تیار تھی۔

ولید سومرو بھی چہرے پہ فاتحانہ مسکراہٹ لیے کھڑے ہو گئے۔

"مجھے۔۔۔ منظور ہے۔" حسام نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"نہیں حسام۔ ہم کورٹ میں اس سے بہتر نتیجہ حاصل کر سکتے ہیں۔" مناج نے فوراً کہا۔

ولید سومرو کی امید ایک دفعہ پھر دم توڑنے لگی۔ وہ ہڑبڑا کر کبھی مناج کو دیکھتے، کبھی حسام کو، اور کبھی مہر کو۔ مہر ہاتھ باندھے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

"نہیں مناج۔ میں شاید اس سے بہتر کا مستحق نہیں۔ تم بس ایک دن کے لیے عنایا کو دے سکتی ہو؟ مجھے منظور ہے۔" آنکھیں نم ہونے لگیں۔ گزرے وقتوں میں جس عورت کی آنکھوں کی نمی کا سبب بنا تھا آج وہی عورت اس کی آنکھیں نم کر رہی تھی۔

مہر واپس سے اپنی جگہ پر بیٹھی۔ اس شخص کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنے دل کو کریدا۔ اسے ڈھونڈنے پر بھی اس کے لیے کوئی احساس نہ ملا۔ وہ آدمی جو کسی زمانے میں اس کی کل متاع تھا، محض ایک عام انسان بن کر رہ گیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ کس دن؟"

"اتوار کا دن۔ میں ہفتے کی رات عنایا کو لے جاؤں گا اور پیر کی صبح اسے سکول چھوڑ دوں گا اور پھر تم اسے واپس لے لینا۔ یہ تو ٹھیک ہے نا؟" حسام نے محتاط انداز میں مہر سے پوچھا۔

"میرے لیے یہ قابلِ قبول ہے۔ مگر یاد رہے۔ عنایا کی پروٹوکول کی گاڑی ہر وقت تمہارے اپارٹمنٹ کے باہر رہے گی۔ اور اگر تم کہیں جاؤ گے تو وہ ساتھ جائے گی۔ یہ ایسی شرط ہے جس پر میں نے کوئی سمجھوتا نہیں کرنا۔" اس نے ماتھے پر بکھرتی لٹوں کو کانوں کے پیچھے کسا۔ آواز میں بے اعتنائی تھی۔

"مجھے سب منظور ہے۔" وہ ہار مان چکا تھا۔ زندگی کی سختیوں کے درمیان بیٹی کا ایک دن کا ساتھ بھی کسی رعایت سے کم نہ تھا۔

مناج نے کچھ کاغذات کے پرنٹس نکالے۔ ان سب نے باری باری دستخط کیے اور پھر مہر ولید سومرو کے ساتھ رُخصت ہو گئی۔

"میں آپ کا زندگی بھر مشکور رہوں گا، مس مناج۔" اس نے ادب سے کہا۔

’’مجھے ہمیشہ اس بات کا خود سے شکوہ رہے گا کہ میں اس سے بہتر ڈیل نہیں دلوا سکی۔‘‘ مناج پھیکا سا مسکرائی۔

حسام کے چہرے پر سوگواریت گھلی۔

’’میں اسی کا مستحق تھا، مناج۔ مجھے اس سے بہتر نہیں ملنا چاہیے۔‘‘ آنکھوں میں کرب اترا۔

مناج نے گردن نفی میں ہلائی۔

’’غلط۔ آپ کی بیٹی آپ کے ساتھ ایک ایک لمحہ ڈیزرو کرتی ہے، حسام۔‘‘ وہ کہہ کر دوبارہ سے کاغذات سمیٹنے میں لگ گئی۔

حسام چونکا تھا۔ مناج آج سے پہلے اتنی جذباتی باتیں نہیں کرتی تھی۔ اس کے اندر ہلکی سی تبدیلی رونما تھی۔ چہرے کی کھال نکھری ہوئی تھی۔ اس نے بہتر کپڑے زیب تن کیے ہوئے تھے۔ بس ایک چیز تھی جو پہلے جیسی تھی۔ پشمینہ شال۔ وہ آج تک اس کے کندھے پر گری ہوئی تھی۔

حسام سوچنے لگا، نہ جانے اس پشمینہ شال کی کیا کہانی ہو گی؟

☆☆☆

مہر بنتِ عبداللہ سلطان سڑک پر گاڑی بھگا رہی تھی، وہ آنے والی گھٹنا سے بے خبر۔ کندھوں سے ایک بوجھ تو کم از کم گر ہی گیا تھا۔ اسے عنایا سے ملنے کی جلدی تھی اس لیے شورٹ کٹ لیا تھا۔ نہیں جانتی تھی کہ یہ شورٹ کٹ اس کے اوپر کیسا طوفان برسانے والا تھا۔

یہ ویران سا علاقہ تھا۔ آس پاس آبادی ذرا کم تھی۔ قمقمے نہ ہونے کے برابر تھے۔ یکبارگی مہر کے کانوں سے زوردار آواز ٹکرائی۔ وہ دم بخود رہ گئی۔ گاڑی گلی میں پھسلنے لگی۔ اس کا سر سٹیرنگ وھیل سے ٹکراتے ہوئے بچا۔ دل بے قابو ہو گیا۔ ہاتھ نم ہوئے۔ اس نے بمشکل اعصاب قابو کرتے ہوئے بریک دبایا۔ اگر نہ دباتی تو کسی خالی مکان میں گاڑی گرا دیتی۔

اس نے سائیڈ ویو مرر دیکھا۔ اس کے پیچھے تیزی سے بھاگتی ہوئی نیلی ویگن آ رہی تھی۔ سر پر خطرے کی گھنٹی بجی۔ وہ گاڑی سے اتری اور گلی میں بھاگنے لگی۔ جسم پسینے میں نہا چکا تھا۔ بال چہرے سے چپک گئے تھے۔

نیلی ویگن مہر کی گاڑی کے پیچھے رکی۔ اندر سے شمس نمودار ہوا۔ اس کے چہرے پر حیوانگی طاری تھی۔ وہ مہر کی طرف بھاگا۔

وہ پوری رفتار سے سڑک پر بھاگ رہی تھی۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ہمت نہ کی تھی۔ سینے میں درد ہونے لگا۔ یکبارگی اس کے بازو کو کسی کھردرے ہاتھ نے تھاما۔ ڈھیر سارا خون دماغ میں جا لگا۔ اس نے بازو آزاد کرنے کی کوشش کی مگر گرفت اس کی سوچ سے زیادہ مضبوط تھی۔ شمس نے مہر کو دیوار سے لگایا۔ اسی مرحلے میں مہر کا پاؤں مڑ گیا۔ اس نے تکلیفدہ کراہ جاری کی۔

اس کی آنکھوں کے سامنے شمس کا خوفناک چہرہ تھا۔ دل بند ہونے کو تھا۔ وہ بتیسی کی نمائش کیے مہر کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ وہ کسی جنگلی بھیڑیے جیسا معلوم ہوا جو مہر کو پلک جھپکنے کی دیر میں چیر پھاڑ دینا چاہتا ہو۔

"کتنے سکون سے سمجھانے کی کوشش کی تھی میں نے تمہیں۔" شمس غرایا۔

مہر نے خوف کے مارے آنکھیں میچ لیں۔

”مگر نہیں۔ میڈم کو تو مار کھانے کا شوق ہے۔ کیوں گئی پولیس سٹیشن۔“

مہر نے اپنے آزاد بازو کا استعمال کرتے اس کے سینے پر ہاتھ رکھا۔ شمس اس کے بالوں کو ایک جھٹکے میں دبوچا۔ اس کی چیخیں جاری ہوئی۔ وہ تڑپ اٹھی۔ شمس نے جارحیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا سر دیوار پر مارنا شروع کیا۔ پاؤں کی سڑک سے رگڑ ہوئی۔ وہ خون آلودہ ہوا۔ مہر کے سر پر جیسے کیلیں ٹھوکی جا رہی تھیں۔ گرمہ گرم خون اس کی پیشانی سے ابل ابل کر نکلا۔ شمس رکا نہیں، اس کا سر پے در پے مارتا گیا۔

اور جہاں مہر کو لگا کہ زندگی کی مسافتیں ختم ہو جائیں گی۔

جہاں اسے گمان ہوا کہ یہ تکلیف اب موت کی آمد پر ختم ہو گی۔

جہاں اس نے مایوسی کو گلے سے لگاتے فرار کے راستے بند ہونے پر یقین کیا۔

وہاں پر وہ نمودار ہوا تھا۔

اس نے شمس کے اوپر پیچھے سے وار کیا۔

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی کسی کو مارنے کی۔“ وہ چلایا تھا۔

افراتفری کا عالم تھا۔ مہر سمجھ نہ سکی کہ ہو کیا رہا تھا۔ دوسری جانب شمس کراہے جا رہا تھا۔ جیسی ہی مہر کے بازوؤں پر سے گرفت ڈھیلی ہوئی وہ لنگڑاتے ہوئے اپنی گاڑی کے پیچھے پنجوں کے بل بیٹھ گئی۔ وہ شدید خوفزدہ تھی۔ جسم بری طرح لرز رہا تھا۔ اب تک اس مددگار انسان کو دیکھنے کی زحمت نہ کی۔

اس شخص نے شمس پر لاتوں اور مکوں کی برسات شروع کی۔ دو مکے پیٹ میں، ایک چھ چپیڑ منہ پر مارا۔ شمس تکلیف سے چیخیں جاری کرتا۔ پھر اس کی نظر اس کے چہرے پر پڑی۔ وہ خوف سے کپکپا اٹھا۔ بغیر دفاع کیے، بغیر جوابی حملے کیے وہ اپنی نیلی ویگن میں سوار ہوا۔ گاڑی موڑی اور فرار اختیار کی۔

وہ آدمی گہری سانسیں لے رہا تھا۔ پیشانی نم ہو چکی تھی۔ ہاتھ زخمی تھے۔ وہ مہر کی طرف بڑھا۔

مہر سسکیاں لے رہی تھی۔ بے خبر اس بات کے، کہ وہ اس کے ساتھ کھڑا تھا۔

"آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟" مہر کو یہ آواز جانی پہچانی معلوم ہوئی۔

پھر اس نے زور کا جھٹکا کھایا۔ یہ آواز وہ کیسے نہیں پہچان سکتی تھی؟ یہ تو احمد تھا۔ یکبارگی ساری کپکپاہٹ دم توڑ گئی۔ وہ ساکن پڑ گئی۔ اس کی مدھم، نرم و ملائم آواز نے مہر کو برف کیا تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تشویش تھی۔ فکرمندی تھی۔ نم پیشانی بل آلود تھی۔ وہ شخص ایک مرتبہ پھر سے زندگی میں تحفظ کا احساس بن کر آیا تھا۔

"احمد؟" مہر کی آواز میں لرزش تھی۔

احمد کے دل میں وہ چنگاری پھر ابھری۔ اس زخمی، روتی ہوئی لڑکی کو دیکھ کر دل نے آہیں بھریں۔ وہ سمجھ نہ سکا کہ یہ کیا ہو رہا تھا۔

"میرا گھر قریب ہے۔ میں جاگنگ کر رہا تھا۔ چیخیں سنائی دیں تو میں یہاں آ گیا۔ آپ میرے گھر چلیں۔ میری بہن بھی وہاں ہو گی۔ مرہم پٹی کروا کر میں آپ کو چھوڑ آؤں گا۔" اس نے گردن جھکائے پیش کش کی۔

مہر کی سانسوں کو ترتیب ملی۔ اسے یقین آگیا تھا کہ وہ بھیانک منظر تحلیل ہو چکا تھا۔ اب وہ شخص تھا اس کے ساتھ۔ وہ مہربان مرد۔ جس کے آتے ہی تاریک راتیں بھی روشنیوں سے بھر جاتی تھیں۔

مہر نے اپنا سر ہاں میں ہلایا۔

”گاڑی کے ٹائر پر گولی ماری تھی۔“ مہر کی آواز کمزور تھی۔ پاؤں میں درد بھری ٹیس ابھری۔

”گاڑی میں اضافی ٹائر موجود ہے؟“ وہ اسے دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر جھلکتی اذیت دیکھ کر دل کڑھنے جو لگتا تھا۔

مہر نے سر اثبات میں ہلایا۔ اگلے لمحے احمد نے ڈگی کھولی۔ نیا ٹائر نکالا اور کار جیک کی مدد سے لگا بھی لیا۔ اس کی پینٹ دھول سے اٹ گئی تھی۔ چہرے پر بھی گرد چپک گئی تھی۔

وہ مہر کی طرف بڑھا۔

”آئیں۔“ احمد نے اپنا ہاتھ مہر کی طرف بڑھایا۔

مہر نے اس کی بھوری آنکھوں میں دیکھا، جو قمقموں کی ہلکی روشنی میں نمایاں تھیں۔ کوئی ذخیرہِ آب تھا جو کھل گیا تھا، اور وہ اس میں پوری کی پوری ڈوبتی چلی گئی۔ وہ بھی سانسیں تھام کر اسے دیکھے گیا۔ روح پر ایسا احساس غالب آیا جو آج سے پہلے احمد یوسف نے کبھی محسوس نہیں کیا۔ بھوری آنکھوں نے اس چہرے سے نظر اٹھانے کی کتنی ہی کوششیں کیں۔ پر وہ ناکام ٹھہری تھیں۔ وہ چہرہ دماغ میں بری طرح نقش ہوا تھا۔

مہر کی نظر اس کے ہاتھ تک گئی۔ اس نے اسے مضبوطی سے تھام لیا۔ وہ کھڑی ہو گئی۔ لنگڑا کر احمد کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی۔ اس سارے سلسلے میں احمد اسے دیکھتا گیا۔ زندگی بدلی ہوئی معلوم ہوئی۔ کوئی دل کی بھولی بسری آس تھی جو سطح پر ابھرنے لگی۔ گھر کے پورے راستے احمد اسی ایک نکتے پر غور کرتا رہا۔



درے گھر کے دروازے پر اپنے بھائی کے ساتھ زخمی مہر کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی تھی۔ مگر اس نے اپنے سوالات کو تھام کر رکھا۔ وہ جانتی تھی مہر کو اس وقت مدد کی ضرورت تھی۔

درِ فشاں کو دیکھ کر مہر پہلے سے زیادہ پر سکون ہو گئی۔ وہ دونوں انسان اسے اپنے معلوم ہوتے تھے۔ وہ خوبصورت گھر بھی اپنا اپنا سا لگا۔

گھر کے لاؤنج میں مہر صوفے پر بیٹھی تھی۔ درے مہر کے پاؤں کی پٹی کر رہی تھی۔ احمد ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

”میں جاگنگ کر رہا تھا، تب میں نے چیخیں سنیں۔ کوئی ان پر حملہ کر رہا تھا۔“

احمد بہن کی متجسس فطرت سے واقف تھا۔ سو خود ہی سب بتا دیا۔ درے پٹی کر کے فارغ ہو گئی۔

”آپ دونوں کا بہت شکریہ۔ اگر اس وقت آپ نہ آتے تو نہ جانے میرے ساتھ کیا ہو جاتا۔“ وہ منظر ایک دفعہ پھر یاد آیا۔

اس نے پھر سے خود کو ہارا ہوا محسوس کیا۔ ہمت کا بلبلہ پھٹ چکا تھا۔ اس کے دشمن واقعتاً بہت طاقتور تھے۔ ان سے مقابلہ کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ ان سب کے سامنے وہ کسی چیونٹی کی طرح تھی، جسے کسی بھی وقت کچلا جا سکتا تھا۔

''ارے!'' درے کھڑی ہوئی۔ ''احمد نے جو بھی کیا، کوئی دوسرا انسان بھی وہی کرتا۔ اب تم بے فکر ہو جاؤ۔ ہم ہیں نا تمہارے ساتھ۔'' اس نے مہر کا دل ہلکا کرنا چاہا۔

''میں دار چینی اور الائچی والی چائے بنا کر لاتی ہوں۔ رات میں قیمے کے کباب بنائے تھے وہ بھی لائی۔'' درے مصروف سے انداز میں بولی۔ کچن میں جانے سے پہلے احمد کو آنکھ سے اشارہ کر کے کہا: ''دھیان رکھنا''۔ احمد نے اپنے سر کو خم دیا۔

درِ فشاں کے جاتے ہی وہ اس کے سامنے کرسی رکھ کر بیٹھ گیا۔

''اب آپ بہتر ہیں؟'' وہ نہایت دھیمی آواز میں بات کر رہا تھا گویا دانستہ طور پر آواز درے تک پہنچانا نہ چاہتا ہو۔

مہر نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''آپ اس خطرے کے لیے مجھے وارن کر رہے تھے؟'' وہ یکدم بولی۔

احمد نے سانس خارج کی اور گردن اوپر نیچے ہلائی۔

''آپ مجھے سب کچھ بتا سکتی ہیں۔ شاید میں کسی کام آجاؤں۔'' وہ مڑ کر دیکھتا، کہ کہیں درِ فشاں لوٹ نہ جائے۔

"میں نے پولیس کو بتایا تو انہوں نے میرا یہ حال کیا ہے۔ اگر آپ کو بھی بتا دیا تو میرا کیا ہو گا؟" مہر کی آواز لرز رہی تھی۔

"پولیس بکی ہوئی ہوتی ہے۔ ان کے پاس جانا ہی نہیں چاہیے۔ اگر آپ کو بہتر لگے تو مجھے سب بتا دیں۔" اس کے انداز میں کچھ مضطرب تھا۔

"مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔" مہر کے دل پر رسی بندھنے لگی۔ وہ عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گئی۔

مہر کا دل بھرنے لگا۔ آنکھوں سے آنسو روانہ ہوئے۔ وہ انہیں پونچھتی، نئے آنسو ان کی جگہ آجاتے۔ اس کی سوجھی ہوئی آنکھیں دیکھ کر احمد کے دل کو کچھ ہوا۔ اس نے لمحے بھر کو آنکھیں میچ لیں۔

"میرا سب چھن چکا ہے، احمد۔ سالوں بعد میری زندگی ٹریک پر آرہی تھی۔ پھر یہ لوگ میری زندگی میں آگئے۔" اس کی توانائی ختم ہونے لگی۔

احمد کے دل پر ضرب آکر لگی۔ کیوں اس کی آواز میں پنپتی تھکان اسے بھی تھکا رہی تھی؟

"آپ مجھ پر بھروسہ کریں۔" اس نے نرمی سے کہا۔

مہر نے پلکیں جھپکائیں۔ وہ اسے منتظر نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ کچھ تھا اس کے اندر کہ وہ مطمئن ہونے لگی۔ اس نے اسے سب کچھ بتانے کا فیصلہ کیا۔ تقریباً تین منٹ کے اندر اس نے سارا معاملہ احمد کے گوش گزار کیا۔ وہ بہت غور سے اسے سن رہا تھا۔ ہر تفصیل ذہن میں محفوظ کی۔

”سب سے پہلے تو پر سکون ہو جائیں۔ کسی بھی قسم کے دباؤ میں صرف ہمارا دماغ ہمیں راستہ دکھا سکتا ہے۔ ہمارا ذہن بہت طاقتور ہوتا ہے، مہر۔ اس کی قابلیت پر بھروسہ کرنے کی دیر ہوتی ہے۔“ آخر وہ نرمی سے مسکرایا۔

کوئی گرد سی تھی جو جھڑنے لگی۔ رکاوٹیں تھیں جو ہٹنے لگیں۔

”مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ میرا بال بال جکڑا ہوا ہے۔“ مہر کی آواز میں بے بسی تھی۔

”ہر مصیبت کا حل موجود ہوتا ہے۔ آپ اپنے دماغ سے مدد طلب کریں۔ کچھ دیر کے لیے بھول جائیں کہ حالات کتنے سنگین ہیں۔ وہ ہیرے کہاں ہو سکتے ہیں؟ آپ کے ڈیڈ کا کوئی خفیہ لاکر؟ کوئی خفیہ کمرہ؟ کوئی ہوٹل؟ سوچیں۔ غور کریں۔“ وہ انگلیاں آپس میں مسلتے ہوئے بولا۔

اس نے احمد کے مشورے پر عمل کیا۔ دماغ سے مدد کی اپیل کی۔ چہرے پر الجھن ابھری۔ یکبارگی الجھن فنا ہوئی۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ احمد کی بھوری آنکھیں چمکیں۔

”ایک ہوٹل ہے۔“ مہر کی آواز میں امید تھی۔ ”سرینا ہوٹل۔ میرے ڈیڈ وہاں جاتے تھے۔ میرے پاس key card موجود ہو گا۔ شاید وہ ہیرے وہاں ہوں۔“ اس کی ہمت لوٹ آئی۔

وہ بے اختیار مسکرا دیا۔ تھکاوٹ سرکنے لگی۔

”ٹھیک ہے۔ ہم کل صبح ہی وہاں چلیں گے۔“ احمد نے سرسری سا کہا۔ مہر چونکی۔ کیا اس نے ”ہم“ کہا تھا یا اس کے کان بج رہے تھے؟

”ہم؟“ مہر بے اختیار بولی۔

"میں صرف آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ کو کوئی اعتراض ہے؟" احمد کے انداز میں مصنوعی سی خفگی تھی۔

مہر کی آنکھوں میں کچھ مشکوک سا ابھرا۔ ہاں اس شخص سے بھلائی کا اندیشہ ہوتا تھا۔ مگر اس کی ذات کے بارے میں بہت کچھ پسِ پردہ تھا۔

"مجھے تو اعتراض نہیں۔۔۔" وہ آگے "مگر" کہنے لگی تھی لیکن احمد نے اسے وقت سے پہلے ٹوک دیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں کل صبح آجاؤں گا۔"

وہ پہلے سے زیادہ شک میں مبتلا ہوئی۔ اس کا پہلے خبر دار کرنا۔ پھر مدد کے لیے بے تاب ہونا۔ آخر کیوں اس معاملے میں اسے اتنی دلچسپی تھی؟ احمد یوسف کا کردار سوالیہ نشان بنتا جا رہا تھا۔

دفعتاً درِفشاں لوازمات سے سجی ٹرے لے کر آئی۔ مہر کو کباب کھلائے۔ جبراً چائے پینے پر مجبور کیا۔ اچھی طرح خاطر تواضع کر کے اسے احمد کے ساتھ روانہ کر دیا۔

گاڑی اسلام آباد کی سڑکوں پہ رواں تھی۔

"آپ کو یہ، ہیرے والی کہانی جو سنائی گئی ہے۔ آپ کو اس پر یقین ہے؟" احمد نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے سر سری سا کہا۔ ریئر ویو مرر سے اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیا۔

"مجھے شک ہے کہ وہ لوگ بہت کچھ چھپا رہے ہیں، اور غلط بیانی بھی کر رہے ہیں۔" مہر جواباً بولی۔

"بالکل۔ ایسا ہی ہے۔" وہ پر اعتماد سا ہو کر بولا تھا۔

مہر نے آنکھیں چھوٹی کیں۔ وہ آخر اتنے یقین سے ایسا کیسے کہہ سکتا تھا؟

"پولیس نے قتل کی تفتیش کی تھی، آپ اس تفتیش کا احوال بتانا چاہیں گی؟" احمد نے محتاط انداز میں پوچھا۔

مہر نے لب بھینچے۔ اس کے لیے اتنا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ احمد کا اس کے دشمنوں سے پہلے ہی واسطہ پڑ چکا ہے۔ مگر پھر بھی، اس کی دلچسپی کھل رہی تھی۔ فی الوقت اس نے شک وشبہ کا اظہار نہ کیا۔

"ڈیڈ نے ڈرائیور کو بیچ راہ میں اتارا تھا۔ ڈرائیور کے بیان کے مطابق وہ ایسا پہلے بھی کر چکے ہیں۔ پھر وہ اس سوسائیٹی میں گئے جہاں۔" مہر نے ضبط کے گھونٹ اندر اتارے۔ اپنے آپ کو رونے سے اس نے ایک بار پھر روکا۔ "انہیں مار دیا گیا۔"

"دلچسپ۔" احمد نے زیر لب تبصرہ کیا۔ "سوچنے والی بات یہ ہے کہ، عمارت ہی کیوں؟ وہاں بلوانا کیوں ضروری تھا؟ ٹارگٹ کلنگ کی جاسکتی تھی۔ زہر دیا جاسکتا تھا۔ ہزار طریقے تھے۔ پھر یہ طریقہ کار کیوں اپنایا؟"

مہر الجھ گئی۔

"میں سمجھی نہیں۔" اپنی الجھن کا اظہار کیا۔ احمد کے چہرے پہ شاطر مسکراہٹ بکھری۔

"امکان یہ ہے کہ یہ ہیرے والی کہانی جھوٹ ہو۔ میں عبداللہ سلطان کو جانتا ہوں۔ وہ ایک شاطر بزنس مین ہیں، وہ کبھی بھی یوں قرضہ نہیں لے سکتے۔ جو آپ کو کہانی سنائی گئی ہے وہ کمزور ہے۔ وہ سینس نہیں بنا رہی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ عبداللہ سلطان نے وہ ہیرے چرائے تھے، مگر قرضے سے بچنے کے لیے

نہیں، کوئی اور وجہ ہو گی۔ یہ قرضہ بعد میں پلانٹ کیا گیا ہو گا، تاکہ آپ کو پھنسایا جائے۔ آپ کے حریف کو کم سے کم کہانی تو تگڑی گڑنی چاہیے تھی۔" احمد زیر لب ہنس دیا۔

مہر نے محسوس کیا کہ "آپ کے حریف" کہتے وقت اس کی آواز میں نفرت ابھر کر معدوم ہوئی۔

"کیا اصل کہانی جاننا ضروری ہے۔" مہر نے پوچھا۔

وہ احمد کی ذہانت سے متاثر ضرور ہوئی تھی۔ ہاں وہ سائے کے پیچھے چھپا ہوا تھا، مگر کم سے کم وہ مخلص تھا۔

"کچھ حد تک۔ میرا ماننا ہے کہ وہ آپ کو صرف ہیروں کے لیے پریشان نہیں کر رہے۔ یقیناً انہوں نے کوئی اور کام بھی نکلوانا ہے آپ سے۔"

مہر نے سوچتے سمجھتے سر اثبات میں ہلایا۔

"البتہ، یہ سارے صرف اندازے ہیں۔ میری ایک دوست کہا کرتی تھی کہ تفتیش کرتے وقت ایسے بیشتر اندازے لگائے جاتے ہیں۔ اور پھر اپنے اندازوں کو ثابت کرنے کے لیے ثبوت تلاش کرتے ہیں۔ میں بھی یہاں اندازے لگا کر ہماری تفتیش کا سانچا تیار کر رہا ہوں۔" چہرے پہ مسکراہٹ سجائے، آنکھوں میں ذہانت کا عکس لیے، وہ لاپرواہ سے انداز میں بولا۔

جہاں احمد کا کودنا اسے ٹھٹک رہا تھا، وہاں یہ بات تسلی بخش بھی تھی کہ اب وہ اکیلی نہ تھی۔ اسے ہمت مل رہی تھی۔

سفر خاموشی سے کٹا۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں قصر پہنچ گئے۔ احمد معاً گاڑی سے اترا۔

''ٹھیک ہے۔ ہم کل ملتے ہیں۔'' احمد مدھم سا مسکرایا۔

مہر پھیکا سا مسکرائی۔ اس کے لیے احمد کا کردار ہر گزرتے لمحے کے ساتھ مشکوک تر بن چکا تھا۔

''میں ڈرائیور کو بھیجتی ہوں، وہ آپ کو ڈراپ کر دے گا۔'' مہر تکلفانہ انداز میں بولی۔

''نہیں، میں یہاں سے ٹیکسی لے کر چلا جاؤں گا۔'' احمد نے اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالے۔

''اب رہنے دیں۔ کہاں اتنی رات کو خوار ہوں گے۔ اب اتنا تو میں آپ کے لیے کر سکتی ہوں۔ آپ یہیں انتظار کریں میں ابھی ڈرائیور کو بھیجتی ہوں۔'' مہر نے نرمی سے باز پرس کیا۔

احمد نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ مہر مڑ گئی اور قصر کے اندر گم ہو گئی۔ شاندار سا چمکتا دمکتا قصر اس مرد کے چہرے پر روشنیاں بکھیر رہا تھا۔

اس کے چہرے کے تاثرات سخت پڑے۔

اس کی آنکھوں میں سے انگارے برسنے لگے۔

''آپ کا ہر مجرم میرا مجرم ہوا۔ جن ہاتھوں نے آپ کو تکلیف پہنچائی ہے انہیں نہ توڑا تو میرا نام احمد یوسف نہیں۔''

بالآخر، وہ اسے مل گئی تھی۔

آخری کنجی، وہ آخری پزل پیس۔

وہ جس کا عرصے سے متلاشی تھا۔

مگر اس نے تو اب تک یہ تلاش شروع نہ کی تھی۔۔۔؟

پھر وہ بیٹھے بٹھائے اسے کیسے مل گئی؟

کیا خدا نے احمد کو چن لیا تھا، کہ وہ اب یہ کام سرانجام دے؟

وہ کام جو کہ احمد پچھلے تین سالوں سے کرنا چاہ رہا تھا!

☆☆☆

وہ تقریباً تیرہ سال کی تھی۔ حواس زائل ہو چکے تھے۔ ہاتھ کسی اور کے ہاتھ میں تھا۔ گھبراہٹ کے مارے آنکھیں پھٹنے کو تھیں۔

وہ ہسپتال کی راہداری میں چل رہی تھی۔ چمکتی دمتکی راہداری، ہر طرف نرس اور ڈاکٹرز۔ انہیں دیکھتے ہی آنکھیں وحشت زدہ ہو جاتیں۔ کچھ بھیانک تھا جو اس چمک دمک کے پس پشت دکھائی دے رہا تھا۔ اسے ایک کمرے میں چھوڑا گیا۔

دروازہ پیچھے سے بند ہوا تو جیسے اس کا دل بھی بند ہو گیا ہو۔ وہ چونک گئی۔ اس کے سامنے ایک لیڈی ڈاکٹر کھڑی تھی جس کے ہاتھ میں موٹا انجیکشن تھا۔ وہ اسے مسکرا کر دیکھنے لگی۔ مسکراہٹ بہت نرم صحبت تھی، لیکن پھر بھی اس پر ہیبت طاری ہو گئی۔ جسم پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔

"ڈرو مت۔ کچھ نہیں ہو گا۔" لیڈی ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔

جوں ہی مناج کی آنکھ کھلی، اس نے اپنے آپ کو اپنے کمرے میں پایا۔ اس کی پیشانی تر تھی۔ وہ پسینے میں ڈوب چکی تھی۔ تنفس پھول چکا تھا۔ وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھے لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی۔ اس

نے لیمپ جلایا۔ سائڈ ٹیبل پہ پڑے جگ کو لبوں سے لگائے وہ تیزی سے پانی اپنے اندر اتارنے لگی۔ اس کی سانسوں کو ربط ملنے میں کچھ دیر لگی تھی۔

”کیا اس سب کو روکا نہیں جا سکتا؟ کیا ان درندوں سے نجات پانے کا کوئی راستہ نہیں؟“

حسام کا وہ قول اس کے دماغ میں گونجا۔ اور جہاں رات کے اندھیرے میں زیادہ تر آبادی نیند میں کھوئی ہوئی تھی، ایک جذبہ مناج کے دل میں بیدار ہوا۔

خواب نے جنم لیا۔ نیا عزم اس کے دل کی زینت بنا۔ اپنے جسم سے چادر کھینچ اتاری۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ دل ٹھاٹھے مار رہا تھا۔ فضا سہانی معلوم ہو رہی تھی۔ سالوں بعد زندگی میں زندگی کا گمان ہوا۔

میز پر نوٹ بوک دھری ہوئی تھی۔ ہاتھ میں قلم تھاما ہوا تھا۔

خالی صفحے کو بہت دیر گھورتی گئی۔ وہ جانتی تھی، اگلہ قدم زندگی کا نقشہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بدل دینے والا تھا۔ واپسی ناممکن تھی۔

آخرکار اس نے لکھنے کا فیصلہ کیا۔۔۔

اس نے قلم نوٹ بوک پر چلایا۔ قلم ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

”پراجیکٹ حرر“ (Project Harar)

”اکیسویں صدی کی غلامی سے جان ہمیں ہے چھڑوانی۔“

☆☆☆

باب ششم: ”قسم ہے فجر کی“

قسم ہے فجر کی

اور دس راتوں کی

اور جفت اور طاق کی

اور رات کی جبکہ وہ رخصت ہو رہی ہو

کیا اِس میں کسی صاحب عقل کے لیے کوئی قسم ہے؟

تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے رب نے کیا برتاؤ کیا

اونچے ستونوں والے عاد ارم کے ساتھ

جن کے مانند کوئی قوم دنیا کے ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی تھی؟

اور ثمود کے ساتھ جنہوں نے وادی میں چٹانیں تراشی تھیں؟

اور میخوں والے فرعون کے ساتھ ؟

یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے دنیا کے ملکوں میں بڑی سرکشی کی تھی

اور ان میں بہت فساد پھیلایا تھا

آخر کار تمہارے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسا دیا

حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب گھات لگائے ہوئے ہے

مگر انسان کا حال یہ ہے کہ اس کا رب جب اُس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اُسے عزت اور نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دار بنا دیا

اور جب وہ اُس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اُس کا رزق اُس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا

ہر گز نہیں، بلکہ تم یتیم سے عزت کا سلوک نہیں کرتے

اور مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں اکساتے

اور میراث کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو

اور مال کی محبت میں بری طرح گرفتار ہو

ہر گز نہیں، جب زمین پے در پے کوٹ کوٹ کر ریگ زار بنا دی جائے گی

اور تمہارا رب جلوہ فرما ہو گا اِس حال میں کہ فرشتے صف در صف کھڑے ہوں گے

اور جہنم اُس روز سامنے لے آئی جائے گی، اُس دن انسان کو سمجھ آئے گی اور اس وقت اُس کے سمجھنے کا کیا حاصل؟

وہ کہے گا کہ کاش میں نے اپنی اِس زندگی کے لیے کچھ پیشگی سامان کیا ہوتا!

پھر اُس دن اللہ جو عذاب دے گا ویسا عذاب دینے والا کوئی نہیں

اور اللہ جیسا باندھے گا ویسا باندھنے والا کوئی نہیں

(دوسری طرف ارشاد ہوگا) اے نفس مطمئن!

چل اپنے رب کی طرف، اِس حال میں کہ تو (اپنے انجام نیک سے) خوش (اور اپنے رب کے نزدیک) پسندیدہ ہے

شامل ہو جا میرے (نیک) بندوں میں

اور داخل ہو جا میری جنت میں

(سورۃ فجر)

☆☆☆

سال موسمِ سرما کی طرف پرواز کر رہا تھا۔ فضا بدل رہی تھی۔ دنیا کے رنگ بدل رہے تھے۔ ہلکی ٹھنڈی ہوائیں اسلام آباد کے مضافات پر ناچ رہی تھیں۔ درختوں کے پتے لہرا رہے تھے۔

وہ قصر کے باہر کھڑا مہر کی راہ تک رہا تھا۔ کہنی کلٹس کی چھت پر ٹکائی ہوئی تھی۔ آنکھوں پر سیاہ چشمے لگائے تھے۔

احمد نے جھنجھلا کر گھڑی پر وقت دیکھا۔ وہ انتظار کر کے بے زار آنے لگا تھا۔ ہوا کے جھونکوں سے خاکی کوٹ کا پٹ لہراتا۔

دفعتاً مہر صدر دروازے پر اجاگر ہوئی۔ انتظار کی گھڑیاں تمام ہوئیں۔

اس نے خاکی رنگ کی فراک پہنی ہوئی تھی۔ سر پر سُرخ بندانا لگا کر شمس کے دیے ہوئے زخم کو چھپانے کی کوشش کی تھی۔ کمر پر سُرخ بیلٹ کسی ہوئی تھی۔ وہ اپنی ہیلز پر چلتے ہوئے اس کے مقابل پہنچی۔

کرم تھا سیاہ چشموں کا کہ مہر اس کی آنکھوں کو دیکھ نہیں سکی تھی۔ وہ مسحور ہو چکی تھیں۔ وہ عورت دن بہ دن اس کے حواسوں پر سوار ہو رہی تھی۔ آخر کیوں؟ یہ سوال اس کے لیے اب تک راز تھا۔ وہ اسے دیکھتا تو بس دنیا سے بیگانہ ہو کر دیکھتے رہنے کا جی چاہتا۔

"چلیں؟" مہر بولی۔ چہرے پر بوجھل پن تھا۔ سیاہ آنکھیں بے قرار۔

احمد چونکا۔ چہرے پر مدھم مسکراہٹ بکھر گئی۔

"گاڑی کی چابی؟"

مہر نے سوالیہ نگاہ اس پر ڈالی۔

"آپ لنگڑا رہی تھیں۔ یقیناپاؤں کا زخم اتنی جلدی بھرا نہیں ہو گا۔ آپ کی آسانی کے لیے چابی مانگی تھی، محترمہ۔" اس نے آپ ہی وضاحت پیش کی۔

مہر نے سر اثبات میں ہلایا اور احمد کو مرسڈیز کی چابی پکڑا دی۔ دونوں مرسڈیز میں سوار ہو گئے۔

سفید مرسڈیز، اسلام آباد کی کشادہ اور صاف ستھری سڑکوں پر رواں تھی۔ اتوار کا دن تھا، اور وقت بھی صبح کا تھا اس لیے سڑکوں پہ رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ ڈرائیونگ پر پورا دھیان دینا چاہتا تھا، مگر بارہا اسے مڑ کر دیکھتا۔ اسے کے چہرے پر غم کی پرچھائی دیکھ کر بھوری آنکھیں مغموم ہو جاتیں۔

"کیا آپ کو یقین ہے وہ ہیرے اُدھر ہی موجود ہوں گے؟" احمد نے خاموشی کو توڑنا چاہا۔

"بس احمد۔ وہ وہیں پر ہونے چاہییں۔" گہری آہیں بھریں۔ آواز میں ناامیدی جھلکی۔

"ویسے ایک بات پوچھوں؟" مہر کچھ دیر بعد بولی۔ احمد نے سرسری انداز میں "ہنہہ" کہا۔

"میں جاننا چاہتی ہوں کہ یہ معاملہ آپ کے لیے اتنی اہمیت کا حامل کیوں ہے؟ آپ کا نیا کام ہے۔ آپ کو آفس میں ہونا چاہیے تھا۔ لیکن آپ یہاں ہیں۔ میرے ساتھ۔" وہ محتاط انداز میں ٹھہر ٹھہر کر بولی۔

"آپ نے صحیح پہچانا۔ آپ کا مسئلہ میرے آفس سے زیادہ ضروری ہے۔ کیا وجہ بتانا ضروری ہے؟" وہ کچھ ثانیے مڑ کر اسے دیکھتے ہوئے لاپرواہی سے بولا۔

"اگر آئندہ بھی آپ میری مدد کرنا چاہتے ہیں، تو میرا باخبر ہونا ضروری ہے۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

احمد مسکرایا۔

''چلیں آپ بتائیں۔ آپ کو کیا لگتا ہے میں آپ کے ساتھ کام کیوں کر رہا ہوں؟ آپ نے اندازے لگائے تو ہوں گے۔'' اس نے کندھے اچکائے۔

مہر کو کوفت محسوس ہوئی۔ یہ آدمی پہیلیاں بجھائے بغیر کوئی بات کرنا نہیں جانتا تھا کیا؟

''میرے مطابق میرے دشمنوں نے آپ کو ماضی میں چوٹیں پہنچائی ہیں۔ آپ ان کو پہلے سے جانتے ہیں۔ اور حساب برابر کرنا چاہتے ہیں۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

وہ جواب طلب نگاہوں سے احمد کو تک رہی تھی۔ اس کے تاثرات تن گئے تھے۔ سٹیرنگ وھیل پر گرفت مضبوط ہوئی۔

''وہ لوگ میرے بھائی کے مجرم ہیں۔ آپ کے باقی اندازے بھی درست ہیں۔ مگر میں اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتا۔ ورنہ ہم باتیں کرتے رہ جائیں گے۔'' اس کے چہرے پر مختصر دورانیے تکلیف ابھری۔

بس ایک لمحے کے لیے ہی تکلیف جھلکی تھی، مگر مہر نے اسے فوری طور پر بھانپ لیا تھا۔ وہ مرد فطرتاً اپنے اصل کو دباتا تھا۔ کتنا کرب ہوگا ان یادوں میں کہ خلافِ فطرت اس کے چہرے پر تکلیف رونما ہوئی؟ مہر کا دل دکھا۔

''ویسے آپ کافی خوش قسمت ہیں۔'' مہر نے ماحول کا تناؤ کم کرنے کے لیے موضوع بدلنا چاہا۔'' آپ کو درفشاں جیسی میچور اور سمجھدار بہن ملی ہے۔'' وہ متاثر کن لہجے میں بولی۔

احمد کے چہرے پر شرارتی مسکراہٹ بکھری

''اور آپ کو وہ اتنی میچور اور سمجھدار کیوں لگتی ہے؟'' وہ طنزاً بولا۔

''وہ جسمانی، ذہنی اور جذباتی طور پر ایک پختہ عورت ہیں۔ ان سے جب بات کی، میں نے بہتر محسوس کیا ہے۔''

''آپ ایک دفعہ اس میچور اور سمجھدار کو شاپنگ کرتے ہوئے دیکھ لیں۔'' اس کی ہنسی چھوٹنے لگی۔ ''آپ کے خیالات کو بدلنے میں دیر نہیں لگے گی۔''

مہر نے بھنویں اٹھائیں۔

''آپ کافی mean (بدتمیز) ثابت ہو رہے ہیں۔'' وہ برا مانتے ہوئے بولے۔

''آپ کہتی ہیں تو مان لیتے ہیں۔'' وہ آدھا لب اٹھاتے لاپرواہی سے بولا۔

''اور ہٹ دھرم بھی۔'' اس نے چوٹ کرنا چاہی۔

وہ کچھ ثانیے گردن جھکائے بے اختیار ہنستا چلا گیا۔ اس کی ہنسی مہر کو کسی سریلے تال سے زیادہ سریلی معلوم ہوئی۔

☆☆☆

احمد نے گاڑی ہوٹل کے سامنے روکی۔ مہر کسی میسج کا ریپلائی دے رہی تھی۔ وہ گاڑی سے اترا۔ لاشعوری طور پر قدم مہر کے دروازے کی جانب بڑھے۔ اس نے دروازہ کھول دیا، اور جہاں تھا وہیں تھم گیا۔ یہ اس نے کس خوشی میں کیا تھا؟

مہر نے حیرت سے اسے دیکھا۔ موبائل پرس میں ٹھوسا اور گاڑی سے اتری۔

”میں دروازہ خود کھول سکتی تھی احمد۔“ وہ ٹھنڈے لہجے میں بولی۔

احمد نے خود کو عام ظاہر کرنے کے لیے گاڑی کی چابی ویلے کو تھمادی۔

”ہاں، کھول تو سکتی تھیں۔“ اس نے مہر سے زیادہ خود کو باور کروایا۔

”مگر میں نے کھول لیا، اس میں کون سی بڑی بات ہے؟“ اس نے خیال جھٹکنا چاہا۔ مگر مہر کا تصور اس کے لیے غیر معمولی بنتا جا رہا تھا، اس بات کو زیادہ دیر جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔

وہ دونوں ہوٹل کے صحن میں ٹہل رہے تھے۔ پتھروں سے بنایا گیا رستہ قدموں تلے تھا۔ ارد گرد ہری بھری گھاس تھی۔ ٹھنڈی ہوا نے موسم کی شادابیت میں چار چاند لگائے تھے۔

”ویسے بھی، بھلائی کرنے والوں کو شکریہ کہا جاتا ہے۔ ان کی بھلائی پر سوال نہیں اٹھایا جاتا۔“ وہ اب تک ذہنی خلفشار میں تھا۔

”میں ایک بزنس مین کی بیٹی ہوں۔ میرے نزدیک اکثر لوگ احسانات مقابل کو خریدنے کے لیے کرتے ہیں۔“ وہ سادگی سے بولی۔

صحن کے بیچ و بیچ ایک بلند و بالا فوارا تھا، جس میں سے پانی کی دھاریں پھوٹ رہی تھیں۔ پانی کی جلترنگ ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

”اگر سامنے والی کی نیت بھلی ہو۔ تب بھی؟“ اس نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کوئی کسی کی نیتوں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔" اس نے مبہم سے انداز میں کندھوں کو جنبش دی۔

"تو اس کا مطلب ہے آپ کو میری نیتوں پر شک ہے؟" چشموں کو پسِ پشت، بھوری آنکھیں چمکیں۔

"نہیں، مگر یقین بھی نہیں ہے۔"

احمد کو خود بھی اندازہ نہ ہوا، اس کے چہرے پر مسکراہٹ تیر چکی تھی۔ دل لطیف تاثر سے دوچار تھا۔

"مجھے آپ اتنی عقلمند نہیں لگتی تھیں۔"

وہ سرینا ہوٹل کے اندر داخل ہو گئے۔ اے سی کی کولنگ جسم سے ٹکرائی۔

"تو اس کا مطلب میں آپ کو بیوقوف لگتی تھی؟" اس نے بھنو اٹھاتے استفسار کیا۔

"نہیں، بس عقلمند نہیں لگی تھیں۔" وہ لب کاٹتے بولا۔

مسکرانے کی باری مہر کی تھی۔ وہ سر جھٹکتے ریسیپشن کی اور چلی گئی۔ وہ شخص اس کے دل میں عجیب سا اثر رکھتا تھا۔ اس کی ذات سوالیہ نشان ہونے کے باوجود دلکش تھی۔

عبداللہ سلطان کا کمرہ تیسری منزل پر واقع تھا۔ وہ وقت ضائع کیے بنا وہاں چلے گئے۔

ہوٹل کا کمرہ کافی خوبصورت تھا۔ کھردری دیواروں پر آف وائیٹ پینٹ تھا۔ چھت پر لکڑی کے نقش والی فالس سیلنگ چسپاں تھی۔

"چلیں۔ شروع کرتے ہیں۔" وہ پرجوش تھا۔ اپنا کوٹ اتارا اور کرسی پر دھر دیا۔ مہر نے اسے تھم کر دیکھا تھا۔ سفید شرٹ، خاکی پینٹ میں بھی وہ نہایت پرکشش لگ رہا تھا۔

وہ چھان بھین شروع کرتے، اس سے پہلے مہر کا موبائل بج اٹھا۔ احمد کی آنکھوں میں شک ابھرا۔ اس نے کمر پر دونوں ہاتھ جمائے۔

"فون اسپیکر پہ رکھیں۔ انہیں بتائیے گا نہیں کہ ہم یہاں کیا کرنے آئے ہیں۔"

مہر نے سوالیہ نگاہ احمد پر ڈالی۔ بھلا انہیں کیسے پتا لگنا تھا وہ لوگ یہاں آئے ہیں؟ اس نے سر جھٹک کر کال اٹھائی۔ فون سپیکر پر رکھا۔

"کیسی ہو مہر؟" شمس کی خشک آواز نے اس کا سارا موڈ خراب کیا۔

"کل تو تم بچ گئی، مگر یاد رکھنا ہمیشہ نہیں بچو گی، اس لیے احتیاط کرنا۔" بات کا آغاز اس نے دھمکی سے کیا۔

رات کا خوفناک منظر دماغ میں گزرا۔ آنکھوں میں سائے لہرائے۔ اس نے آنکھیں کچھ دیر بند کیے گہری سانس باہر نکالی۔

احمد سب غور سے سن رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ اگر کچھ اور نہیں کہنا تو میں فون رکھ رہی ہوں۔ مجھے بہت کام کرنے ہیں۔" مہر کا انداز تلخ تھا۔

"تم سرینا ہوٹل میں ہو؟"

مہر کے اوپر جیسے ٹرین آکر گزری۔ اس نے حیرت سے احمد کو دیکھا جس نے بھنویں اچکا دیں۔

''وہاں کیا کام تمہیں؟'' شمس کا لہجہ شکی تھا۔

مہر کے چہرے کے تاثرات تن گئے۔ احمد اس کے برعکس کافی پرسکون تھا۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بات جاری رکھنے کا کہا۔ اس نے نظریں پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

''میں بس ایک بریک لینا چاہ رہی تھی۔ کیا یہ بھی نہیں کر سکتی؟'' وہ اکتانے لگی۔

''ٹھیک ہے۔ اور ہاں، اپنے ڈیڈ کے آفس کے لاکرز دیکھ لینا۔ ان میں شاید تمہیں ہیرے مل جائیں۔''

مہر کے چہرے پر لاعلمی پھیلی۔

''کون سے لاکرز؟''

''یہ تو تمہیں ہی پتا ہو گا۔ دماغ پر زور ڈالو۔ کوئی لاکرز ہوں گے ضرور۔''

لمحے بھر میں مہر کو کچھ یاد آیا۔

''میں دیکھ لوں گی۔ اب کال رکھ دوں میں؟'' وہ شدید کوفت زدہ تھی۔

''اپنی ادائیں کسی اور کو دکھانا۔ رات والا واقعہ دوبارہ نہ دہرایا جائے کہیں۔'' برہمی سے کہتے ہوئے شمس نے کال کاٹ دی۔

کچھ سوچتے ہوئے احمد بیڈ پر بیٹھ گیا اور اپنی ٹھوڑی کھجائی۔ مہر مضطرب سے عالم میں ادھر ادھر ٹہلنے لگی۔ وہ لوگ اس کے قدم قدم کی خبر رکھے ہوئے تھے۔ پریشانی کے عالم میں وہ اپنی کنپٹی سہلانے لگی۔

"آپ کو کیسے پتا چلا کہ وہ ہمارا تعاقب کر رہے ہیں؟" مہر کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔

احمد کا ٹھوڑی کھجاتا ہاتھ تھم گیا۔ اس نے ایک نظر مضطرب سی مہر کو دیکھا۔ پھر کھڑا ہو گیا اور دراز تک پہنچا۔ دراز کے اندر سے قلم نکالا۔ قلم کا ڈھکن والا حصہ اپنی بیچ کی انگلی اور انگوٹھی کے درمیان تھاما۔ وہ پین کو دراز کے اوپر گول دائرے کی صورت گھمانے لگا۔

مہر کو اس کا ڈرامائی انداز دیکھ کر گہری کوفت محسوس ہوئی۔

"آپ جانتی ہیں میں یہ چشمے کیوں پہنتا ہوں؟"

شروع ہو گئیں اس آدمی کی پہیلیاں۔ مہر بے زار آنے لگی۔

"دھوپ سے بچنے کے لیے؟" مہر متذبذب سی ہو کر بولی۔

احمد مسکراتے ہوئے گردن نفی میں ہلا گیا۔

"یہ چشمے مجھے بغیر کسی مداخلت کے ہر طرف دیکھنے کی آزادی دیتے ہیں۔"

مہر نے آنکھیں چھوٹی کیں اور ناک سکیڑی۔

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں، احمد۔" مہر سپاٹ لہجے میں بولی۔

احمد کا ٹیبل کی سطح پہ قلم گھماتا ہاتھ تھم گیا۔اس نے گرفت ڈھیلی کی۔ قلم لڑھکتا پھڑکتا میز کی سرحد عبور کرتے ہوئے زمین بوس ہوا۔

"راستے میں مجھے کم سے کم تین گاڑیاں ایسی نظر آئیں تھیں جو کہ بے مقصد کھڑی تھیں۔سب سے پہلے، ہم ایک کچے علاقے سے گزرے تھے،وہاں پر نئی نویلی سویک کھڑی تھی۔ آپ کے گھر کے راستہ پر ایک کالی آلٹس بھی نظر آئی تھی جس کے شیشے کھلے ہوئے تھے۔سرینا ہوٹل سے پہلے میں نے ایک گریفائیٹ رنگ کی سٹی دیکھی تھی۔اس کا انجن کھلا ہوا تھا، مگر وہ بے مقصد کھڑی ہوئی تھی۔یہ سارے اشارے اسی طرف نشاندہی کر رہے تھے کہ آپ کا تعاقب کیا جارہا تھا،مہر۔"احمد نے ٹھہر ٹھہر کر بتایا۔

مہر کا بڑھتا تجسس تھمنے لگا۔یہ آدمی ساری باتیں پہلے بھی بتا سکتا تھا۔

"یہ سب اتفاق بھی ہو سکتا تھا۔"مہر نے اپنی ایک تھیوری پیش کی۔احمد نے سر نفی میں ہلایا۔

"نہیں۔آپ اپنے دشمنوں کی طاقت کو جانتی ہیں۔پولیس میں کمپلین کرنے کے کچھ وقت بعد ہی آپ پہ حملہ کروادیا گیا۔ان کی طاقت کے بارے میں جانتے ہوئے بھی اگر اس سب کو اتفاق سمجھا جائے تو یہ سراسر بے وقوفی ہے۔میرا مشورہ ہو گا کہ اپنے دشمنوں کو پہنچان لیں۔انہیں عزیز دوستوں سے زیادہ اچھی طرح سے واقف ہو جائیں۔انہیں کورس کی کتاب کی طرح رٹ لیں۔پھر یقین جانیں یہ کھیل آپ کو محظوظ کرے گا۔"اس کی آواز پرجوش تھی۔

وہ آدمی اس کی سوچ سے بالاتر کوئی اور ہی مخلوق تھا۔ہاں وہ ذہین تھا۔مگر ان سارے معاملات میں محظوظ ہونے والا کچھ نہ تھا۔

"یہ آفس کے لاکرز۔" فاتحانہ مسکراہٹ کو سمیٹتے، چہرے پہ سنجیدگی لیے بولا۔ "آپ کو ان کے بارے میں کافی دیر سے یاد آیا۔ مگر آپ کے دشمن کتنے یقین سے پوچھ رہے تھے۔ اس بات پر غور کرنا پسند کریں گی؟"

مہر کے لب کھلے۔

"اپنے دماغ کو حاضر رکھیں، مہر۔ باریکیوں پر غور کریں۔ یہی باریکیاں ہمیں ہمارے دشمن سے قریب تر کریں گی۔" اس نے سمجھانے والا انداز اختیار کیا۔ "اب آپ بتائیں، اس بات سے کیا واضح ہوتا ہے؟" ہاتھ باندھے، گویا مہر کا امتحان لینا چاہتا ہو۔

مہر نے سر اثبات میں ہلایا اور دماغ پر زور ڈالا۔

"اس کا مطلب ہے۔ میرا دشمن میرے ڈیڈ کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اس لیے انہیں لاکرز کے بارے میں علم تھا۔ ہے نا؟"

"بالکل۔ آپ کا دشمن کوئی قریبی ہے۔" احمد ٹھہرا۔ "اب یہ آپ کو طے کرنا ہے کہ یہ قریبی شخص کون ہے۔ کوئی پرانا دوست شاید؟" احمد نے منتظر نگاہیں مہر پر منجمد کیں۔

"نہیں۔" مہر نے سوچتے ہوئے سر نفی میں ہلایا۔ "ڈیڈ ایک بزنس مین تھے۔ وہ دوستیاں کم ہی کرتے تھے۔ جو ہوتی تھیں وہ مفاد پرستی کی بنیاد پر۔ اتنے سارے مفاد پرست دوستوں میں کسی کو تلاش کرنا مشکل ہو گا۔ باقی گھر میں صرف نیلوفر ہوتی تھیں۔" مہر کو جس طرح سے یاد آتا گیا وہ بولتی گئی۔

احمد کی چہرے پہ مدھم سی مسکراہٹ بکھری، اگلے ہی لمحے اس نے اپنی مسکراہٹ دبائی اور چہرے کو سنجیدہ کیا۔

''نیلوفر؟ کون ہے یہ؟'' مصنوعی لاعلمی کے سنگ بولا۔

''ڈیڈ کی بیوی تھیں۔ لیکن ہمیں ان پر شک کرنے کی ضرورت نہیں۔'' وہ پورے وثوق سے بولی۔

''مگر کیوں؟ ہم کیوں ان پر شک نہ کریں؟'' احمد مطمئن نہ تھا۔

مہر کو لگا جیسے اس نے نیلوفر کا ذکر چھیڑ کر غلطی کر دی ہے۔

''کیونکہ نیلوفر ایک اچھی لڑکی ہے۔ میں انہیں اچھے سے جانتی ہوں۔ آپ بے فکر رہیں۔'' مہر تحمل سے اس کو قائل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

وہ خود سے منسلک لوگوں کے لیے کوئی بری بات برداشت نہیں کرتی تھی۔

''لڑکی؟'' احمد نے اچنبھے سے پوچھا۔

مہر کے تاثرات تن گئے۔ یہ آخر اتنی بال کی کھال کیوں نکال رہا تھا۔

''ہاں وہ صرف بتیس سال کی ہیں۔'' اسے احمد کھلنے لگا۔

''اور نیلوفر نے آپ کے ڈیڈ سے شادی کیوں کی؟ یہ بتایئے ذرا۔''

مہر نے لب کھولے پھر بند کیے۔ آنکھوں میں احمد کے لیے ناگواری تھی۔

''شاید پیسوں کے لیے۔ لیکن یہ کوئی معیوب بات نہیں، ڈیڈ کی ساری بیویوں نے ان سے پیسوں کے لیے شادی کی تھی۔ لیکن احمد، نیلوفر دل کی اچھی ہیں۔ آپ یہ نہ بھولیں کے ہمارے دشمن ڈیڈ کے

قاتل بھی ہیں۔ نیلوفر کے نام ڈیڈ کی کوئی جائداد نہیں تھی۔ انہیں اس قتل سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔" اس نے بڑھ چڑھ کر وضاحتیں دیں۔

احمد نے گردن ترچھی کیے سر اثبات میں ہلایا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ فی الحال ہم ہیرے ڈھونڈتے ہیں۔" احمد نے بات کو ٹال دیا۔

مہر بھی سمجھ گئی تھی کہ وہ ٹیڑھا مرد تھا۔ با آسانی قائل نہیں ہونے والا تھا۔

مہر اور احمد نے ہیروں کی تلاش شروع کی۔ انہوں نے درازیں کھنگالی۔ الماریاں خالی کر دیں۔ چھپا چھپا چھان مارا، حتیٰ کہ بستر تک الٹ دیا۔ مگر ہیرے مل کر دم نہ لیے۔

مہر تھک ہار کر کرسی پر بیٹھی۔ چہرہ رندھ چکا تھا۔ وہ امیدوں کا پہاڑ لے کر آئی تھی۔ پہاڑ ٹوٹ چکے تھے۔ وہ ان کے ملبے تلے چکنا چور ہو گئی تھی۔ اس نے ہاری ہوئی سانس خارج کی۔

احمد کی روح بے چین ہوئی۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ جلد ہی رو جائے گی۔ وہ ٹوٹ رہی تھی، اسے لگا کہ وہ بھی ٹوٹ کر بکھر جائے گا۔ وہ چہرے پر نرمی لیے اس کی طرف بڑھا۔ مہر نے سر ہاتھوں میں گرایا ہوا تھا۔

"آپ اتنا مایوس کیوں ہو رہی ہیں؟ آپ کے ڈیڈ کے لاکرز ابھی باقی ہیں۔" احمد نے تسلی بخش انداز اختیار کیا۔ آج اس کے لفظوں نے اسے تسلی نہ دی۔ جان، امان اور مستقبل کا خوف سر پر حاوی رہا۔

احمد اداس سا مسکرایا اور اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھا۔

"نہ جانے کتنے لاکرز کتنے کمروں کی تلاشی لینی ہو گی، احمد۔ کیا میری زندگی ایسے ہی ضائع ہو جائے گی؟" اس نے آنکھیں کھولیں۔ دمکتی ہوئی سیاہ آنکھوں میں رنجوری سی رنجوری تھی۔

احمد پر وہی کیفیت ایک مرتبہ پھر طاری ہوئی۔ اس کا دکھی ہونا دکھی کرتا تھا۔ مگر جو وہ محسوس کر رہا تھا وہ ہمدردی سے بڑھ کر تھا۔ اس نے چپ سادھ لی۔

"میری بیٹی ہے، احمد۔ میرا اپنا مستقبل گھاٹے میں ہے۔ میں اس کا مستقبل کیسے سنواروں گی؟ ایک ہفتے پہلے تک میں اس زعم میں تھی کہ میرے پاس دولت ہے۔ آسائشیں ہیں۔ کچھ ماہ پہلے تک میری زندگی کا سب سابڑا غم طلاق کا غم تھا۔ اب دیکھیں، وہ غم چلا تو گیا۔ مگر ایک نئے غم نے جگہ بنالی۔" اس نے اپنی پیشانی کو چھوا اور احمد کو تکتی گئی۔

اگر وہ سیاہ چشموں کے پار آنکھوں کو دیکھ لیتی تو شاید بولنا بھول جاتی۔ وہاں گہرا غم تھا۔ وہ پوری محویت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"کیا اپنے ڈیڈ کے گناہوں کا خمیازہ میں اپنی موت تک بھگتنے والی ہوں؟ یہ تو ناانصافی ہوئی نا، احمد۔" وہ بے کسی سے بولی۔

دل کو قابو کرنا مشکل تھا۔ مگر وہ اسے ٹوٹتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اسے دلاسے دینے آتے تھے، مگر آج اسے خود دلاسوں کی ضرورت پڑ رہی تھی۔ مہر بنتِ عبداللہ سلطان احمد یوسف کے لیے پہیلی بن کر رہ گئی تھی۔

"کسی کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہو رہی۔" اس نے جذبات دبائے اور بات کا آغاز کیا۔ "سب مسئلے ختم ہو جاتے ہیں۔ بلکہ، مسئلے ختم ہونے کے لیے ہی ہماری زندگی میں بھیجے جاتے ہیں۔ اس سب کے

پیچھے خدا کی حکمت ہوتی ہے، مہر۔ ہمارا دماغ خدا کی حکمت عملی تک پہنچ نہیں سکتا۔ اسی لیے، جو ہے اس کا مقابلہ کریں نہ کے اس طرح سے مایوس ہو کر بیٹھ جائیں۔ جس خدا نے آپ کو اس مصیبت میں ڈالا ہے، وہی آپ کو نکال بھی لے گا۔ اور ویسے بھی، ہم نے (ہم پر زور دیا) بہت سارے لاکرز کی چھان بین کرنی ہے۔" آخر میں اس کے چہرے پہ گرم جوش مسکراہٹ بکھری۔

وہ بھی جواباً مسکرانا چاہتی تھی مگر۔ مگر مسکرانا اس لمحے حرام ٹھہرا۔

وہ کھڑی ہوئی اور دروازے کی طرف جانے لگی۔

"کہاں جا رہی ہیں؟" احمد نے پیچھے سے اسے پکارا۔

"روف ٹاپ۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔" وہ اٹک اٹک کر بولی۔

احمد نے سرعت سے سر اثبات میں ہلاتے، اسے جانے دیا۔

تنہائی میں وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ سر ہاتھوں میں گرایا۔ آنکھیں بند کرتا، تو بس ایک ہی چہرہ ابھرتا۔ سیاہ آنکھیں اس کا دل موہ لیتیں۔ پھر ان آنکھوں میں تیرتے نیر دیکھ کر اس کا مسخ ہو جانے کا جی چاہتا۔ وہ پہلی عورت تھی جس نے احمد کے شعور لاشعور پر قبضہ کیا تھا۔ وہ پہلی عورت تھی جس نے اسے تنہائی کا احساس دلایا تھا۔

"نہیں احمد۔ تم کچھ محسوس نہیں کر سکتے۔ تم انتقام کی راہ پر چل رہے ہو۔ تم جل رہے ہو۔ تمہارے ساتھ جو ہو گا، وہ جل جائے گا۔ کسی اور کا جلنا تم سہہ بھی لو مگر اس کا جلنا تم جھیل نہیں سکتے۔" اس کے دل سے آواز نکلی۔

اس نے خیالات کو جھٹک دیا۔ چھت میں جانے کا ارادہ کیا۔ لفٹ مصروف تھی، اس لیے سیڑھیوں کا استعمال کیا۔

احمد نے روف ٹاپ کا دروازہ کھولا۔ میٹھی سی خوبصورت آواز اس کے کانوں میں داخل ہو کر رس گھولنے لگی۔ آواز کی تاثیر ٹھنڈی تھی۔ آواز دل کو اطمینان بخشتی تھی۔

وہ کونے پر کھڑی، گم صم سے عالم میں تلاوت کر رہی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ وہ احمد کے طرز پر تلاوت کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

وَالْفَجْرِ

(قسم ہے فجر کی)

وَلَيَالٍ عَشْرٍ

(اور دس راتوں کی)

وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ

(جفت اور تاق کی)

وَاللَّيْلِ إِذَا يَسْرِ

(و رات کی جبکہ وہ رخصت ہو رہی ہو)

هَلْ فِي ذَٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِي حِجْرٍ

(کیا اِس میں کسی صاحب عقل کے لیے کوئی قسم ہے؟)

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ

(تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے رب نے کیا برتاؤ کیا)

احمد کے چہرے پر مسکراہٹ سجی۔ وہ محویت کے عالم میں اس کی طرف گیا۔ اس کے برابر میں کھڑے ہو کر اس کے چہرے کو تکا۔ وہ پر سکون ہو گئی تھی۔ جس مہر کو وہ دلاسے دے رہا تھا اس سے یکسر مختلف۔ اب اس پر رشک آ رہا تھا۔

إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ

(اونچے ستونوں والے عاد ارم کے ساتھ)

الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ

(جن کے مانند کوئی قوم دنیا کے ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی تھی؟)

وَثَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ

(اور ثمود کے ساتھ جنہوں نے وادی میں چٹانیں تراشی تھیں؟)

مہر کو اس لمحے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ تلاوت کا تسلسل ٹوٹا۔ بدمزہ ہو کر آنکھیں کھولیں۔ وہ بھوری آنکھوں میں ناز، اور چہرے پر مسکراہٹ لیے اسے ہی تک رہا تھا۔ وہ غیر آرامدہ سی ہوئی۔

"سورہ فجر۔ کتنی خوب صورت سورہ ہے ناں؟" احمد کی انداز میں دبا دبا جوش تھا۔

”بہت خوبصورت۔“ مہر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”آپ نے سورہ فجر کا ترجمہ پڑھا ہے؟“ احمد نے مہر سے پوچھا۔

”ہاں میں نے پڑھا ہے۔“ مہر نے جواب دیا۔

”ہر سورہ کا ایک موضوع ہوتا ہے، جس کے ارد گرد وہ گھومتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے سورہ فجر کا موضوع کیا ہے؟“ احمد نے جواب طلب نگاہ مہر پہ مرکوز کی۔

مہر سوچ میں پڑ گئی۔ اس نے سورہ فجر کا ترجمہ پڑھا تھا۔ مگر اس نکتے پر غور نہ کیا۔

”نہیں۔“ اپنا سر نفی میں ہلایا۔ ”مگر کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں؟ میں جاننا چاہتی ہوں۔“ اسے تجسس ہوا۔

احمد نے ریلنگ پہ ہاتھ رکھا۔ پرجوش مسکراہٹ گہری ہوئی۔ وہ مہر کو سب بتانے کے لیے تیار تھا۔

☆☆☆

آسمان پر بادلوں کے جھمگٹے جمع تھے۔ سورج کی مندمل کرنیں ان کے درمیان جگہ بناتے ہوئے عافیتِ زندگی کی بلند و بالا عمارت کے اوپر نچھاور ہو رہی تھیں۔ نیلوفر اپنے کمرے میں کسی عورت کے ساتھ گفتگو کر رہی تھی۔ چہرے پر شائستہ مسکراہٹ تھی۔

”حال ہی میں، میں نے نیا گھر خریدا ہے۔ بہت خوبصورت اور دلشاد ہے۔ وہ گھر میرے لیے جنت کا دوسرا نام ہے۔ میں جب کام سے تھک ہار کر جاتی ہوں، تو خود کو کسی ریاست کی ملکہ سے کم نہیں سمجھتی۔“ وہ فخریہ انداز میں اپنی کامیابیاں گنوا رہی تھی۔

مقابل بیٹھی عورت اس سے کافی متاثر لگتی تھی۔

"نیلوفر، تم عدت نہیں کرو گی۔" عورت نے پوچھا۔

نیلوفر کی مسکراہٹ برقرار رہی۔ اس نے سر دائیں بائیں ہلایا۔

"میں نے اپنے سوشل میڈیاز کچھ عرصے کے لیے بند کر دیے ہیں، یہی بہت ہے۔ میں کون سا دینی ہوں جو عدت جیسی قدیم اور بوسیدہ روایت پر عمل کروں۔ مجھے اس سے زیادہ ضروری کام کرنے ہیں۔ میرا اگلہ خواب ایک محل ہے، وہ بھی دبئی میں۔ میں وقت ضائع نہیں کر سکتی۔" نیلوفر تکبر سے چور لہجے میں بولی۔

اس عورت نے نیلوفر کی بات پر سر اثبات میں ہلایا۔

☆☆☆

ٹھنڈی دلفریب ہوائیں چھت کی اور چل پڑیں۔ مہر کے گھنے بال لہرائے۔ احمد کے بال پیشانی پر بکھر گئے۔ وہ بادلوں سے بھرے سرمئی آسمان تلے بات کا آغاز کر رہا تھا۔

"ہم جب قرآن پڑھتے ہیں تو ہمیں عرب قبائل کی ثقافت اخلاقیت کے پس منظر کے بارے میں پتا چلتا ہے۔ سورہ فجر زمانہ جہالت میں عربی ثقافت کے تاریخ پہلو کو مدعا بناتی ہے۔ ذرا سوچیں، کون سا؟" وہ سادگی سے بولا تھا۔

"کون سا؟"

"دولت اور دنیا کی لازوال محبت۔ اس زمانے میں عرب قبائل بہت زیادہ دولت پرست اور دنیا پرست ہوگئے تھے۔ اور جب کوئی معاشرا دنیا سے اندھی محبت میں مشغول ہو جائے تو وہ اخلاقی حدوں کو عبور کرنے لگ جاتا ہے۔ یہی حال عرب کا بھی تھا۔ وہ یتیموں کو دھکے دیتے۔ غریبوں کا حق مارتے۔ آپ سوچیں، جو انسان دولت کے نشے میں چور ہو جائے وہ کیا کیا نہیں کر سکتا؟" احمد خاموش ہوا۔

مہر نے سمجھتے ہوئے سر اوپر نیچے ہلایا۔

"ایسے لوگوں کے دل سخت ہو جاتے ہیں۔ ہے نا؟" مہر نے احمد کو دیکھتے ہوئے تصدیق چاہی۔

احمد نے مدھم سا مسکرا کر تصدیق کی۔



سڑک پر گاڑیوں کا جم غفیر تھا۔ وہ ٹریفک تھمنے کا انتظار کر رہی تھی۔ ہاتھ میں رومال دبوچا ہوا تھا۔ پسینے کی بوندیں پیشانی پر جھلکتیں، وہ انہیں ترنت پونچھ لیتی۔

ایک سیاہ فام بچہ نیلوفر کی طرف لپکا۔ اس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ چہرے پر دھول مٹی تھی۔ وہ اس قدر کمزور تھا کہ اس کا ڈھانچا ظاہر ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں مدد طلب تاثر تھا۔ عمر آٹھ سال تھی، مگر غذائیت کی قلت کے باعث قد چھوٹا رہ گیا تھا۔

"کچھ دے دیں۔" وہ بھیک مانگنے لگا۔ اس کے ہڈیالے چہرے پر آنسو لڑھکا۔

نیلوفر نے اس پر تحقیر آمیز نگاہ ڈالی۔ وہ دائیں جانب چلی گئی۔ اسے اس بچے سے گھن محسوس ہو رہی تھی۔

شاید بھوک اور پیاس عزتِ نفس مار چکی تھی۔ وہ نیلو فر کی طرف بڑھا۔ اپنا دھانچہ نما ہاتھ اس کے پجامے پر رکھ دیا۔ نیلو فر کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس کی آنکھیں طیش سے پھٹنے لگیں۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔

"تمہاری جرات!" وہ گلہ پھاڑ کر چلائی۔ بچے کو لات کھینچ کر دے مارے۔ وہ سڑک پر گر گیا۔ اگر کوئی گاڑی رفتار سے گزر رہی ہوتی تو یقیناً اس نے ہلاک ہو جانا تھا۔

"کچھ دے دیں، ایک ہفتے سے کچھ نہیں کھایا میں نے باجی۔" سختیوں نے ایک بار پھر تذلیل بھولنے پر مجبور کیا۔

اسے رحم محسوس نہ ہوا۔ بلکہ پارا پہلے سے زیادہ ہائی ہوا۔

"چلو دفع ہو جاؤ۔" وہ چٹکی بجاتے بولی تھی۔ "تم جیسوں کے ہی پیٹ بھرنے کے لیے رہ گئی ہوں میں۔ نکلو یہاں سے۔" اس نے اونچی آواز میں ڈپٹ لگائی۔

وہ بچہ آنسو پونچھتے رُخصت ہو گیا۔ ٹریفک تھمنے لگی۔ وہ سڑک پار کر کے فلاحی تنظیم کی ایک منزلہ عمارت میں داخل ہوئی۔ شمس اس کی راہ تک رہا تھا۔

وہ بھول گئی تھی کہ کسی زمانے میں وہ بھی اس بچے کی جگہ پر تھی۔ طاقت اور دولت کے نشے میں دھت ہو کر وہ سب کچھ بھلا چکی تھی۔



"دولت اور دنیا سے محبت انسان کو اس قدر اندھا کر دیتی ہے کہ وہ نیکی بھی کرتا ہے تو دکھاوے کے لیے۔ میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔ ابو جہل سے پوچھا گیا کہ کیا محمد ﷺ جھوٹ بولتے ہیں؟ تو ذرا سوچیں، کہ اس نے کیا جواب دیا ہو گا؟" احمد نے مہر سے پوچھا۔

"ابو جہل ہمارے نبی ﷺ کا سب کا بڑا دشمن تھا، یقیناً اس نے ہاں میں ہی جواب دیا ہو گا۔ ہے نا؟"

مسکراتے ہوئے احمد سر نفی میں ہلانے لگا۔ مہر متحیر ہوئی۔

"نہیں۔ ابو جہل لاکھ برا انسان ضرور، لیکن وہ غیرت مند تھا۔ اس نے جھوٹ نہ بولا۔ اس کا جواب بھی بالکل یاد رکھنے والا ہے۔ اس نے کہا کہ دیکھو، ہمارا بنو ہاشم سے مقابلہ چل رہا تھا۔ انہوں نے کھانا کھلایا ہم نے ان سے بڑھ کر کھانا کھلایا، انہوں نے مہمان نوازی کی ہم نے ان سے بڑھ کر مہمان نوازی کی۔ اب تک، ہم ان سے کندھے سے کندھا ملا کر آ رہے تھے۔ اب اگر ہم نے ان کی نبوت تسلیم کر لی تو اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ ہم ان کے قیامت تک غلام ہو گئے۔ اور یہ مجھے تسلیم نہیں۔

ایسے ہو گئے تو عرب۔ اپنی شان بڑھانے کے لیے، اپنی انا کی تسکین کے لیے نیکی کرتے تھے۔ رضائے الٰہی کا گمان ہی نہ تھا۔"

☆☆☆

وہ شمس کے ساتھ ہم قدم ہو کر چل رہی تھی۔ سینہ پھلایا ہوا تھا۔ چہرے پر شانِ استغناء تھی۔

"نیلوفر میں نے جب انہیں بتایا کہ آپ اتنی بڑی رقم عطیہ کرنے والی ہیں تو یہ لوگ تو خوشی سے پاگل ہی ہو گئے۔" شمس نے نیلوفر کے کان میں سرگوشی کی۔

نیلوفر زیرِلب ہنس دی۔

”ہونا بھی چاہیے۔“ اس نے شان سے کندھے اچکائے۔ ”اچھی اچھی تصاویر کھینچنا۔ عدت ختم ہو جائے تو سوشل میڈیا پر دھوم مچے گی۔“

”ویسے اس سب کی ضرورت کیا ہے۔ مطلب اتنے پیسے ضائع کرنے کا کیا فائدہ؟“ شمس نے پوچھا۔

نیلوفر نے دل ہی دل میں اس کی عقل پر لعنتیں بھیجیں۔

”تم نہیں سمجھو گے۔ یہ انویسمنٹ ہے۔ اپنے آپ پر۔ مستقبل میں اگر کوئی سکینڈل وغیرہ آ بھی جائے تو مجھے زیادہ نقصان نہیں پہنچے گا۔ جہاں ایک بندہ میرے اوپر کیچڑ اچھالے گا وہاں نو لوگ میری حمایت کریں گے۔ میں سب کی نظروں میں ایک فرشتہ ہوں اس لیے میرے اصل پر کسی کو شک نہیں ہو گا۔ برائی کا بہترین پردہ اچھائی کرتی ہے۔ یہ بات لیڈی اقتدار نے اب سمجھی ہے۔ تم بھی سمجھ جاؤ۔“

کندھے شان سے اٹھے، گویا اسے اپنے کارناموں پر فخر ہو۔

”مگر آپ کہتی تھی کہ آپ اپنی برائی کو تسلیم کر چکی ہیں۔ پھر یہ منافقت کس لیے؟“

نیلوفر کے چہرے پہ حقارت بھری مسکراہٹ بکھری۔

”بھلا منافقت سے بدترین، کوئی برائی ہو سکتی ہے؟ میرا درجہ تو ابلیس سے بھی نیچ ہوا، شمس۔ سمجھے؟“

شمس نے مسکرا کر اس کی تائید کی۔

"بس جلدی کریں۔ ہمیں ہسپتال لوٹنا ہے۔ آج آپ سب لوگوں کو ایک بہت بری خبر سنانی ہے۔ آج عافیت زندگی میں سنسنی پھیل جانے والی ہے۔"

☆☆☆

"تو احمد ان سب کا آخر انجام کیا ہو گا۔" مہر نے سوال کیا۔

وہ جواب جانتی تھی۔ مگر احمد سے وضاحتیں سننے کا اپنا ہی لطف تھا۔

"اللہ نے سورہ فجر میں ہی ان کا انجام بتایا ہے۔" احمد نے دو آیات پڑھیں:

"وَجِايْٓءَ يَوْمَئِذٍۢ بِجَهَنَّمَ ۚ يَوْمَئِذٍۢ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى

يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِىْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِىْ

اور جہنم اُس روز سامنے لے آئی جائے گی، اُس دن انسان کو سمجھ آئے گی اور اس وقت اُس کے سمجھنے کا کیا حاصل؟

وہ کہے گا کہ کاش میں نے اپنی اِس زندگی کے لیے کچھ پیشگی سامان کیا ہوتا!"

یعنی کہ جو معاشرے فاسق ہو جایا کرتے ہیں، ان کا زوال یقینی ہوتا ہے، مہر۔ اور اس وقت بھی یہی ہوا۔ اللہ نے مسلمانوں کو مکہ سے ہجرت کرنے کا حکم دیا۔ جنگِ بدر میں ابو جہل سمیت بڑے بڑے دشمنانِ اسلام کو مار دیا گیا۔ فتحِ مکہ میں پورا کا پورا مکہ مسلمانوں کے پاس آ گیا۔ سورہ فجر میں اور بھی مثالیں ہیں۔ جیسے فرعون کی۔ جو کے ایک سرکش بادشاہ تھا، خدا نے ہمیں اس سورہ میں یاد دلایا کہ اتنی سرکشی کے بعد بھی اس کا کیا انجام ہوا۔ اس کے علاوہ اس میں ثمود کی قوم کی مثال ہے، عاد کی قوم کی مثال ہے۔ یہ

ساری سرکش قومیں تھیں۔ جو کہ اپنے پیغمبر کو جھٹلا چکی تھیں، اللہ کے پیغام کو جھٹلا چکی تھیں۔ اور پھر خدا نے ان کے اوپر عذاب نازل کیا۔ یہ انجام ہوتا ہے سرکش لوگوں کا مہر۔ بربادی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔"

☆☆☆

وہ دونوں عافیتِ زندگی لوٹ چکے تھے۔ فی الوقت ہسپتال کی راہداری میں چل رہے تھے۔

"سب پہنچ گئے ہیں اور ہمارے منتظر ہیں۔ آج سب کا چین اور سکون تباہ ہونے والا ہے۔" شمس نے متنبہ کیا۔

نیلوفر کے ماتھے پہ بل نمودار ہوئے۔

"ایسی کون سی خبر ہے شمس؟ مطلب اتنا بھی کیا برا ہو سکتا ہے؟" نیلوفر کا تجسس انتہاء کو پہنچا۔

"نیچے چلیں، سب بتاتا ہوں۔"

نیلوفر کا دل تیزی سے دھڑکا۔

کچھ دیر کی چہل قدمی کے بعد ایک گول زینہ نمودار ہوا۔ وہ گول زینہ عبور کرتے نچلی منزل میں پہنچے۔ وہاں ڈھیروں کمرے تھے۔ وہ سٹور روم میں داخل ہوئے۔ نیلوفر نے بتیاں جلائیں اور دروازہ پیچھے سے بند کیا۔

کمرے کے اندر دائیں اور بائیں طرف طبی امداد شیلفز میں سجی ہوئی تھیں۔ ہر سو ہر دم دواؤں کی کڑوی مہک پھیلی تھی۔ وہ ان کے درمیان چلتے ہوئے آخری دیوار تک پہنچے، جہاں لیڈی اقتدار کا

دروازے جتنے پورٹریٹ نصب تھا۔ نیلوفر نے اسے کسی دروازے کی طرح کھسکایا۔ کی پیڈ نمودار ہوا، جس پر انگیریزی نمبر شمار جڑے ہوئے تھے۔

کیز دبانے پر، لفٹ مخصوص آواز کے ساتھ اوپر آئی۔ وہ سوار ہو گئے، اور نکل پڑے، عافیتِ زندگی کی خفیہ بیسمنٹ کی طرف۔

☆☆☆

"تو احمد اس تاریک زمانے سے آزادی کیسے حاصل کی جائے گی؟" مہر کچھ ڈسٹرب نظر آرہی تھی۔

"اس کا جواب خدا نے اگلی سورۃ، سورہ بلد میں دیا ہے۔ اس میں خدا فرماتا ہے کہ دو نمایاں راستے ہیں، مگر معاشرہ عقبہ کے راستے پر نہیں گیا۔ کیا آپ جانتی ہیں عقبہ کیا ہے؟" احمد نے پوچھا۔ مہر نے سر نفی میں ہلایا۔

"عقبہ کا مطلب ہے دشوار گزار گھاٹی۔ اور آپ کو پتا ہے کہ یہ دشوار گزار گھاٹی کیا ہے؟" مہر نے ایک بار پھر گردن نفی میں ہلائی۔

یوں پہیلیاں بجھا بجھا کر مدعا بیان کرنے کا انداز اب کی بار مہر کو برا نہ لگا۔

"اللہ تعالیٰ آگے کی آیت میں عقبہ کو واضح کرتا ہے۔ عقبہ کا راستہ وہ ہے جس میں ہم، ایمان لانے والوں کے ساتھ مل جائیں۔ ان لوگوں کے ساتھ مل جائیں، جنہوں نے رحم اور صبر کی تلقین کی۔ اور پھر غلاموں کو آزاد کریں، غریبوں اور مسکینوں کو کھانا کھلائیں۔ اور یوں ہی ہم معاشرے کی پستی کو ختم کر سکتے ہیں۔"

"یعنی اتحاد حل ہے۔ اتحاد اور معاشرے میں بسی برائی سے جنگ کا عزم۔ بس؟" مہر نے تصدیق چاہی۔

"بالکل، ایک معاشرے میں، کسی بھی قسم کی برائی کو ختم کرنے کے لیے اتحاد کا ہونا ضروری ہے۔ اکیلا انسان کبھی کوئی تبدیلی نہیں لا سکتا۔" مہر کو بھی بات سمجھ آ گئی تھی۔



سب نے اپنی کرسیاں پکڑی ہوئی تھیں۔ نظریں شمس کی طرف مرکوز تھیں۔ دل تھمے ہوئے تھے۔ ساکن فضا میں انتشار چھپ کر بیٹھا تھا۔

"اب بتاؤ شمس، ایسا کیا ہوا ہے جو تم نے اتنی ایمرجنسی میں یہ میٹنگ بلوائی۔" لیڈی اقتدار کا انداز ہمیشہ کی طرح مغرور تھا۔

شمس نے سرسری نگاہ ہر چہرے پر ڈالی۔ ایک گہری سانس باہر نکالی۔

"احمد!" وہ بس اتنا ہی بولا۔ سب کے چہروں کا جائزہ لینے لگا۔

ہوائیاں اڑ گئیں۔ چہروں کی رنگت زرد ہوئی گویا خون نچڑ گیا ہو۔ انتشار پھیلتا چلا گیا اور سب کو اپنی لپیٹ میں لیا۔ ہر چہرے پر ہیبت سوار تھی۔

"احمد یوسف؟" نیلوفر کی آواز میں بے چینی تھی۔ وہ انگلیاں آپس میں چٹخا رہی تھی۔

درانی نے سینے پر ہاتھ رکھ کر شکست خوردہ سے انداز میں سانسیں لیں۔

اور ان سب کے درمیان، پرسکون صرف ملکہ ہی تھی۔ ماتھے پر تشویش کے بل کے سوا کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

"تفصیل سے بتاؤ۔ احمد کا کیا ہوا؟ اور تم سب ٹھنڈے ہو جاؤ۔" لیڈی اقتدار نے بلند آواز میں کہا۔

"کل رات جب مہر کی خبر لے رہا تھا تو وہ پتا نہیں کہاں سے ٹپک گیا۔" وہ نفرت سے بولا۔ "اس نے مہر کو بچا لیا۔ رات بہت تھی، مجھے معلوم نہیں اس نے مجھے دیکھا تھا یا نہیں۔"

لیڈی اقتدار نے سوچتے سمجھتے سر اوپر نیچے ہلایا۔ درانی کا چہرہ جھک چکا تھا۔

"اُف! شاید شور شرابے کی وجہ سے وہ اُدھر پہنچا ہو۔ شاید یہ ڈرنے کی بات ہی نہ ہو۔" نیلوفر اضطرابی کیفیت میں بولی۔ ہاتھ پاؤں پھولنے کو تھے۔

"نیلوفر ٹھیک کہہ رہی ہے۔ شاید یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں۔ تم اس وقت تھے بھی اس کے علاقے میں۔ ممکن ہے وہ چیخ و پکار سن کر آ گیا ہو۔ تم ویسے بھی ان معاملات میں بے قابو ہو جاتے ہو۔ تمہیں مہر پہ ہلکا ہاتھ رکھنا چاہیے تھا۔" لیڈی اقتدار برہم ہوئیں۔

شمس شرمسار ہوا۔

"اگر بات اتنی معمولی ہوتی تو میں آپ لوگوں کا وقت برباد نہیں کرتا۔ آج مہر سرینا ہوٹل گئی تھی۔ میں نے بندے اس کے گھر کے راستوں پر کھڑے کروائے تھے۔ رپورٹ کے مطابق اس کے ساتھ کوئی تھا۔ کوئی مرد۔ مجھے شک ہے وہ کہیں احمد تو نہیں۔" شمس نے اطلاعات میں اضافہ کیا۔

درانی نے اپنا سر اٹھایا۔ اس نے کچھ بولنے کے لیے اپنے لب کھولے مگر پھر اپنے لب بند کیے۔

''ہنہہ۔ تم نے اس سے پوچھا کہ وہ وہاں کیوں گئی تھی؟''لیڈی اقتدار کے چہرے پہ تشویش بڑھتی جارہی تھی۔

''کہہ رہی تھی بریک لینے گئی ہے۔'' شمس نے کچھ دیر بعد جواب دیا۔

''محترمہ کے والد کے انتقال کو مہینے ہی ہوئے ہوں گے اور وہ گل چھرے اڑانے ہوٹل پہنچ گئی۔'' نیلوفر کا لہجہ کڑوا تھا۔

''مجھے نہیں لگتا احمد یوں کسی کے ساتھ ہوٹل جائے گا۔'' درانی اچانک سے بولا۔ سب کی نظریں اس پر پڑیں۔

لیڈی اقتدار کھڑی ہوگئی۔ اس کی ٹیم گر رہی تھی، اسے ان سب کو کھڑا کرنا تھا۔

''بس اب بہت کر لی ملامت۔'' سینہ تان کر سب کو مخاطب کیا۔ ''شمس تم پتا کرواؤ کہ وہ مرد کون ہے۔ ہم بغیر تصدیق کوئی بڑا قدم نہیں اٹھا سکتے۔ اگر وہ احمد ہوا، ہم اس کا مقابلہ کریں گے۔ ہم نے پہلے بھی کیا تھا۔ ہم ایک ٹیم ہیں۔

گزرے وقتوں میں کتنی مصیبتیں ہمارے سر پر نازل ہوئیں۔ ہم نے مل کر ان سب کا مقابلہ کیا۔ خود کو پہلے سے زیادہ مضبوط کر لو۔ اور جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ چلو اٹھو۔''

وہ جوش دلانے والے انداز میں بولی۔ ملکہ کی آنکھیں پر عزم تھیں۔

نیلوفر، شمس اور درانی ایک ایک کر کے کمرے سے رخصت ہو لیے۔ پیچھے بس وہی رہ گئی۔ شان سے اکڑی گردن۔ تکبر سے پھولتا سینہ۔

لیکن پھر۔۔۔کچھ غیر متوقع ہوا۔ ملکہ کے کندھے شل ہو گئے۔ آنکھیں بے چینی کے مارے چھوٹی ہوئیں۔ چہرے کا ہر زاویہ مرجھا گیا۔

"احمد کے معاملے میں، میں ہمیشہ سے بے بس رہی ہوں۔" آنکھیں میچ لیں۔

"تم لیڈی اقتدار ہو۔ ان کی سربراہ۔ تم ہار نہیں مان سکتی۔" اس نے اپنی یاددہانی کروائی۔



وہ دونوں ہوٹل کے باہر کھڑے تھے۔ مگر ذہن اب تک چھت کے منظر میں تھا۔ بڑھتے دن کے ساتھ ٹھنڈ میں کمی آئی تھی۔

ویلے کو چابی دی جاچکی تھی۔ اب صرف اس کا انتظار کرنا تھا۔

"وہ جو درخت نظر آرہا ہے ادھر دیکھیں۔" احمد اچانک بولا۔ درخت کی طرف انگلی اٹھائی۔

شروع ہو گیا پہیلیوں کا ایک نیا سلسلہ۔ مہر نے اندر ہی اندر سوچ کر گہری سانس خارج کی۔

"جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسا کرتی جائیں۔ سوالات کو تالہ لگالیں، میں سب کچھ خود بتادوں گا۔" وہ مدھم سا مسکرا کر سرگوشیانہ انداز میں بولا۔

مہر کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ آنکھوں میں تشویش ابھری۔

"پہلے پورے دل سے مسکرائیں۔"

وہ برے دل سے مسکرائی۔ مسکراہٹ انتہائی مصنوعی تھی۔ اس کے سارے دانت نظر آرہے تھے۔ احمد نے اس کی طرف نظر ڈالی تو وہ کچھ خائف سا ہونے لگا۔

"اف!" احمد کراہ کر رہ گیا۔ "اداکاری تو اچھی کر لیں کم سے کم۔" مہر کو دیکھے بغیر اس نے زیرِ لب تبصرہ کیا۔

ایک تو وہ آدمی سیدھی باتیں نہیں کرتا تھا۔ پھر بہترین کارکردگی کی توقع کرتا تھا۔ اسے تپ چڑھنے لگی۔

"دفع کریں۔ اب میرا ہاتھ پکڑ لیں اور میری بات دھیان سے سنیں۔"

اس نے احمد کا ہاتھ تھام لیا۔ ہاتھ نم ہوئے۔

"اس درخت کو دیکھتی رہیں اور میری بات غور سے سنیں۔"

دل چاہا کہ احمد کو کھری کھری سنا دے۔ بس اب سسپنس ختم بھی کرے۔

"ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہے۔"

مہر کو جیسے جھٹکا لگا۔ خون کی روانی تیز ہوئی۔ وہ بدقت مسکرا پا رہی تھی۔

"سڑک پار نیلی گاڑی ہے۔ ہینڈ بریک کے ساتھ ایک کیمرا دھرا ہوا ہے۔ وہ تصویریں کھینچنے والا ہے۔"

مہر کی روح بے چینی کے مارے مچلی۔ اس کی ترپیشانی سے ٹھنڈی ہوائیں ٹکرائیں۔

"وہ شیشہ اوپر کر رہا ہے۔ بہترین پوز کریں۔ اچھی طرح مسکرائیں۔" وہ چہرے پر دلکش مسکراہٹ سجائے بولا۔

مہر نے گہری سانسیں خارج کیے خود کو قابو کیا۔ وہ کھل کر مسکرا دی۔ گردن پسینے کی بوندوں کے باعث چمک رہی تھی۔

دفعتاً ویلے گاڑی لے آیا۔ مہر کی سانسیں روانہ ہوئیں۔ وہ پلک جھپکنے کی دیر میں گاڑی میں بیٹھ گئی۔ احمد اس کے برعکس پر سکون تھا۔

وہ ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہوا۔ مہر سینے پر ہاتھ رکھ کر گہری سانسیں لے رہی تھی۔

"اس سب کا مقصد کیا تھا۔ اور پلیز اب پہلیاں بجھانے کا سوچیے گا بھی مت۔" وہ نیم برہمی سے بولی۔

"اتنا تنگ آگئی ہیں مجھ سے؟" وہ سیدھ میں دیکھتے بولا۔

مہر ٹھٹک گئی۔ "میں نے یہ کب کہا؟"

احمد زیر لب ہنس دیا۔

"آپ پھر سے موضوع بدل رہے ہیں۔ کیوں شوق ہے اتنا مشکوک بننے کا؟ زہر لگتے ہیں۔" وہ واپس برہم ہوئی۔

اس کا برہم ہونا اسے بالکل برا نہ لگا۔ وہ چند ثانیے گردن موڑے اس کے سُرخ چہرے کو تکتا گیا۔

"یعنی میں آپ کو مشکوک بھی لگتا ہوں؟" اس نے اب چشمے اتارے اور ڈیش بورڈ پر دھر دیے۔

چہرے کی برہمی زائل ہوئی۔ سُرخی فنا ہوئی۔ اسے معلوم بھی نہ ہوا، وہ دل ہی دل میں بھوری آنکھوں کے دیدار کو مس کر رہی تھی۔ اس کے ابلتے ہوئے سر پر جیسے کسی نے برف کا ٹکڑا رکھ دیا تھا۔

"کیا ہوا؟ اتنی جلدی غصہ ختم بھی ہو گیا، محترمہ؟" اب وہ سیدھ میں دیکھ رہا تھا۔ ہینڈ بریک کھینچتے گاڑی چلانا شروع کی۔

"آپ نے ایک مرتبہ پھر باتیں گول کیں اور مجھے کچھ نہیں بتایا۔" اب وہ برہم نہ ہو سکی، بس خفگی سے بولی۔

احمد نے گہری سانس خارج کی۔

"بس، میں کچھ وقت کے لیے انہیں بھٹکانا چاہ رہا تھا۔ اور کچھ نہیں۔" احمد پر سکون تھا۔

"یہ تو بے وقوفی ہے؟ ان لوگوں کو آپ کی مداخلت کا علم ہو گیا ہے۔" مہر نے اچنبھے سے پوچھا۔

"ہاں۔ وہ تو ہونا ہی تھا۔ میں اس کے لیے تیار تھا۔"

وہ آدمی ٹکڑوں ٹکڑوں میں باتیں کیوں بتاتا تھا؟ کوئی اس قدر ناقابلِ برداشت کیسے ہو سکتا تھا؟

"پھر یہ تصویریں؟ یہ مسکرانا؟ یہ پوز؟ یہ سب کیا تھا۔ آپ ایک دفعہ ٹک کر مجھے سب بتا دیں۔" اس کی برداشت ختم ہو گئی۔

"اچھا اچھا۔ میں سب بتاتا ہوں۔" اس نے موڑ کاٹتے ہوئے کہا۔

"میں بس کچھ وقت مانگ رہا ہوں۔ اگر انہیں پتا چل جائے گا کہ میں حساب برابر کرنے کے لیے آپ سے جڑا ہوا ہوں، تو وہ جواباً کوئی چال چلتے۔ یہ تصویریں کھینچ کر، پوز دے کر میں نے انہیں بھٹکایا ہے۔

تاکہ وہ شک میں پڑ جائیں کہ کیا میں واقعی آپ کے ساتھ خاص مقصد کے تحت ہوں، یا ہمارے درمیان کچھ اور ہے۔" احمد ٹھہر ٹھہر کے اسے سب سمجھانے لگا۔

مہر کو بھی سب سمجھ آگیا تھا۔ آخر کار تجسس کو موت نصیب ہوئی۔

"ٹھیک ہے۔ لیکن میرے پاس تو ہیرے ہیں، وہ لوگ مجھے کچھ نہیں کریں گے۔ آپ کا کیا؟ آپ کیسے بچ جائیں گے؟" مہر نے تشویش ظاہر کی۔

"بس آپ اتنا جان لیں، کہ مجھے کچھ نہیں کیا جائے گا۔ ختم بات۔" احمد اٹل سے انداز میں بولا۔

صاف ظاہر تھا کہ وہ پوچھنے پر بھی اس سے آگے کچھ نہ کہتا۔ وہ آدمی قیامت کے روز تک ایک راز ہی رہ جائے گا۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

"ٹھیک ہو گیا آپ کا موڈ؟' اس نے بھنویں اٹھا کر پوچھا۔

"ہاں۔ ہو گیا۔ آپ بس تھوڑے۔۔۔" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"تھوڑے کیا؟" بھوری آنکھیں شریر ہوئیں۔

"کچھ نہیں۔" اس نے جان بوجھ کر اسے لٹکایا۔

"یہ آپ غلط کر رہی ہیں۔ جملے ادھورے چھوڑے نہیں جاتے۔" وہ تڑپ کر بولا۔

مہر کی شیطانی حس بیدار ہوئی۔

"آپ کو بھی اندازہ ہونا چاہیے میں کس طرح کا عذاب جھیلتی ہوں۔"

احمد نے بدقت مسکراہٹ دبائی۔

☆☆☆

مناج مغرب کے بعد درِفشاں کے کلینک پہنچ گئی تھی۔ وہ متذبذب سے عالم میں سیاہ صوفے پر بیٹھی تھی۔ باقی کہانی کافی اذیت ناک تھی۔ اس لیے وہ پریشان تھی۔ درے نے ہاتھ میں نوٹ بوک اور قلم تھاما ہوا تھا۔

"مناج۔ تمہارے لیے یہ والا ہفتہ کیسا گزرا؟ تم نے اپنے اندر مثبت تبدیلیاں نوٹس کیں؟" درے نے سنجیدگی سے پوچھا۔

مناج نے سست روی سے سر اثبات میں ہلایا۔

"میں نے پورے ہفتے اپنے آپ کو تکلیف نہیں دی۔ طلب ہوتی تھی، کبھی دل چاہتا تھا کہ سگریٹ سے ہاتھ جلاؤں، کبھی چھری سے ٹانگوں پر کٹس لگاؤں۔ مگر میں نے سب کو نظر انداز کیا۔ مگر اب بھی کوئی رکاوٹ ہے، درے۔ مجھے بار بار خیالات ستاتے ہیں، کہ میں مردہ ہی ٹھیک ہوں۔" اس نے مشینی انداز میں سارا احوال درے کے گوش گزار کیا۔

درے نے سمجھتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا۔

"ہمارا گول پروگریس ہونا چاہیے، پرفیکشن نہیں۔ تمہارے اندر جو بھی تبدیلیاں رونما ہوئیں، ان پر داد وصول کرو۔" درے نے خوشمگین مسکراہٹ اچھالی۔

"کیا تم نے سگریٹ کی عادت ترک کی؟" درِفشاں نے مناج کے چہرے کا بغور جائزہ لیا۔

مناج نے سست روی سے گردن نفی میں ہلائی۔

”کیا یہ ضروری ہے؟“سگریٹ چھوڑنے کا خیال ہی اسے پریشان کر گیا تھا۔

”ہاں، اگر تم خود سے محبت کرتی ہو اور تم خود پرست انسان نہیں ہو تو ضرور چھوڑو گی۔ جانتی ہو سگریٹ پھیپھڑوں کے کینسر کا سبب بنتی ہیں۔ ان میں کاربن مونو آکسائیڈ کا مادہ ہوتا ہے۔ یہ زہریلی گیس گاڑیوں سے نکلتی ہے۔ کیا ایسا انسان جو خود سے محبت کرتا ہے کبھی ایسی چیز کو ہاتھ بھی لگائے گا؟“

”وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر اس سب میں خود پسندی کہاں سے آگئی؟“ مناج نے پوچھا۔

”سگریٹ کے دھویں سے تمہارے ارد گرد ہر انسان کو نقصان پہنچے گا۔ تم یہ بات جانتی بھی ہو۔ پھر یہ خود غرضی نہیں ہوئی؟“ درے نے مدعا آگے رکھا۔

”ٹھیک ہے۔ میں پوری کوشش کروں گی۔“خود کی بہتری کے لیے اس نے کڑوا گھونٹ پی ہی لیا۔

”اب ہم آگے بڑھتے ہیں۔ تمہاری ماں کی پرویز سے شادی ہوئی تھی۔ اس کے بعد کیا ہوا؟“

مناج نے یادوں کو ٹٹولا۔ سامنے ماضی کے منظر چل پڑے۔ وہ انہیں دیکھ کر، درے کو سب سناتی گئی۔

☆☆☆

دوپہر کا وقت تھا۔ سورج کی کرنیں اس وسیع و عریض سبزہ زار پر پڑ رہی تھیں۔

پرویز، جو کہ پینتیس سالہ مرد تھا، نے اپنے بال رنگے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں فرزانہ کا ہاتھ تھا۔ ان کی آنکھیں بے جان تھیں اور نظریں نیچی۔ انہوں نے سفید رنگ کا کامدار جوڑا پہنا تھا۔ مناج فرزانہ کے دوپٹے کی اوٹ میں چھپی تھی۔ وہ بہت سہمی ہوئی تھی۔ نئ جگہ سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔

قصر کی عمارت کے داخلی دروازے پر خوبصورت، عمر رسیدہ خاتون کھڑی تھی۔ پرویز فرزانہ کا ہاتھ چھڑواتے اس کی طرف لپکا۔ اس عورت کی سرمئ آنکھوں میں بھائی پر ڈھیروں رشک تھا۔ پرویز کی آنکھوں میں خوشگوار حیرانی تھی۔

عورت کی نظر فرزانہ پر گئ۔ نظروں کی فطرت میں تبدیلی آئی، ان میں حقارت تھی۔ پھر سہمی ہوئی مناج پہ اس کی بے رحم نگاہ ٹھہری۔ لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ بکھری۔

”لویزا آپا، کاش آپ وقت پر آجاتیں۔ اپنے بھائی کے لیے وقت نکالنا سیکھ لیں۔“ پرویز کے انداز میں نروٹھاپن سا تھا۔

لویزا نزاکت سے ہنس دی۔

”میں تو تمہیں سرپرائز دینے کے لیے کہہ رہی تھی کہ انگلینڈ سے آنا مشکل ہے۔ مجھے تو یہی اطلاع ملی تھی کہ دوپہر میں نکاح ہو گا۔ جب پہنچی تو پتا چلا جناب ڈولی لے کر صبح سویرے ہی نکل پڑے۔“ وہ شوخ سے انداز میں بولی۔

لویزا نے اپنا رخ پریشان فرزانہ اور سہمی ہوئی مناج کی طرف موڑا۔

”تم دونوں کو بھی خوش آمدید۔“ گردن مزید اکڑی۔ اب کی بار انداز سخت تھا۔

"صرف میرا بھائی مجھے میرے نام سے مخاطب کر سکتا ہے۔" اس نے رعب سے کہا۔ "تم دونوں مجھے لیڈی اقتدار بلاؤ گے۔ سمجھے؟ لیڈی اقتدار!" فرزانہ نے گردن کو جنبش دی۔

وہ گھر کے اندر جا چکے تھے۔ لیڈی اقتدار ان سب کے آگے چل رہی تھی۔ اس کے انداز حاکموں جیسے تھے۔

"اور پرویز۔" وہ کھانے کی میز پر پہنچ کر بولی۔ "تمہیں تو شادی کا پتا نہیں کون سا جنون چڑھا تھا۔ کھانے پینے تک کا انتظام نہیں کیا۔ میں نے ارجنٹ نوٹس پر ملازماؤں سے سب تیار کروایا ہے۔"

کھانے کی میز پر ڈھیروں لوازمات سجے تھے۔ لیڈی اقتدار نے سربراہی کرسی سنبھالی۔

"پرویز۔ تم نے اسے سب بتا دیا ہے ناں؟" کھانے کے دوران لیڈی اقتدار بولی۔

پرویز نے عجیب سی نگاہ لیڈی اقتدار پر ڈالی جیسے کہنا چاہ رہا ہو کہ اس وقت کیا باتیں لے کے بیٹھ گئیں۔

"نہیں ابھی ضرورت نہیں ہے۔" پرویز نے سرسری انداز اختیار کیا۔

"کیوں ضرورت نہیں ہے۔ اسے پہلے دن سے سب پتا ہونا چاہیے کہ ہم کون ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ آج سے ہی اسے ہمارے رازوں کے ساتھ جینے کی مشق کرنی چاہیے۔ کچھ دنوں بعد اسے سب پتا چل ہی جانا ہے۔" ماحول میں تناؤ پھیل گیا۔

فرزانہ کے ماتھے پہ شکن ابھریں۔ مناج سب سن رہی تھی مگر اسے کچھ بھی ٹھیک سے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ دماغ سن جو تھا۔

"مگر۔۔اچھا پھر آپ خود بتادیں۔" پرویز نے جان چھڑانا چاہی۔

لیڈی اقتدار کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ بکھری۔ فرزانہ کا دل پھڑ پھڑانے لگا۔ وہ سہمی ہوئی فرزانہ کے اوپر اپنی سرد نگاہ گاڑے ہوئے تھی۔

"ہم لوگ عام لوگ نہیں۔ ہمارا ایک بہت بڑا کاروبار ہے۔ انسانوں کا، ان کے اعضاء کا۔"

فرزانہ کا دل بند ہوا۔ ساری آوازیں ڈگمگ ہو گئیں۔ یہ کشادہ قصر، اس کی بلند دیواریں جیسے ان کے قریب آنے لگیں، انہیں دبانے لگیں۔ وہ چیخنے چلانے کی خواہشمند تھیں، مگر آواز حلق میں بند رہ گئی۔

"ڈرو مت۔"

لیڈی اقتدار کی گرجدار آواز نیان کے حواس بحال کیے۔ وہ دہشت سے اس عورت کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کے گمان میں نہ تھا، یہ سجی سنوری عورت جس کے ہر انداز میں نزاکت تھی، وہ ایسے دھندے کی مالکن ہو گی۔

"تمہاری خاموشی تمہاری اور تمہاری بیٹی کی حفاظت کرے گی۔ اس راز کو سینے میں محفوظ کرنے کی مشق آج سے شروع کر دو۔" لیڈی اقتدار کا لہجہ سخت تھا۔ "سمجھی؟" سرمئی آنکھوں نے دھمکایا۔

مارے خوف کے فرزانہ کی گردن ہاں میں ہلی۔ نظر اپنی بیٹی پر پڑی، جو گم صم سے عالم میں چاولوں کے لقمے بھر رہی تھی۔ پھر نظر اٹھا کر چھت کو دیکھا، جس سے فانوس لٹک رہا تھا۔ آنکھوں میں شکایتوں کی لمبی فہرست تھی۔

☆☆☆

”لویزا عرف لیڈی اقتدار ایک خطرناک اور طاقتور عورت ہے۔ خود پسندی، شر پسندی اور خود غرضی کی انتہاء اس پر شروع ہوتی ہے اور اسی پر ختم بھی ہو جاتی ہے۔“ آنکھوں میں دنیا جہاں کی نفرت سما گئی۔

”اس کی زبان پر ہمیشہ اپنی ذات کا چرچہ رہتا تھا۔ وہ سب کو شان سے بتایا کرتی تھی کہ کیسے اس کے والد نے اسے انگلینڈ میں لڑکوں کی طرح پرورش دی۔ جب گردونواح لوگ ان کی پرورش پر سوال اٹھاتے تو وہ شان سے کہا کرتے تھے کہ ”میں مستقبل کے اقتدار کو بڑا کر رہا ہوں۔“ اور شاید اسی لیے وہ اپنے لیے اس قدر اونچے الفاظ استعمال کرتی تھی۔ بڑی عمر میں اس کے لیے لیڈی اقتدار کا لقب استعمال ہونے لگا۔“ اس نے سارا زہر اگلا۔ لب اوپر کی طرف اٹھے۔

”اور اس دن میری ماں کو معلوم ہوا کہ اسے پیشہ ورانہ مجرموں میں بیاہ دیا گیا تھا۔ پرویز ایک سائکوپیتھ تھا۔ وہ امی اور مجھے تشدد کا نشانہ بناتا تھا۔ آج تک میرے جسم پر ایسے نشانات ہیں جو اس کے دیے گئے ہیں۔ وہ کبھی بیلٹوں سے مارتا، کبھی ڈنڈوں سے، کبھی اپنی سگار سے مجھے جلاتا۔ تشدد پسند پرویز اور خونی لیڈی اقتدار کی صحبت میں ہم نے آنے والے سال جیسے تیسے کر کے کاٹے۔ اور پھر میں نے ایک دن امی سے وہ سب کہا جو مجھے کہنا نہیں چاہیے تھا۔“

☆☆☆

تیرہ سالہ مناج نرم و ملائم صوفے پر دراز سی لیٹی ہوئی تھی۔ آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ وہ اونچی چھت کو تک رہی تھی۔ دنیا والوں کے لیے یہ گھر کشادگی کا دوسرا نام تھی، پر وہ اس کی زندگی میں کشیدگی

کے سوا کچھ نہیں لایا تھا۔ دنیا والوں کے لیے یہ زندگی آسائشوں سے بھرپور تھی، مگر اس کے لیے یہ قید سے بدترین تھی۔

یکبارگی فرزانہ وہاں سے گزریں۔ سر پر زخم تھا۔ وہ مناج کو دیکھ کر لمحے بھر کے لیے تھم گئیں۔ پھر اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"کیا ہوا مناج۔ کیا سوچ رہی ہو؟" انہوں نے مناج کا سر اپنی گود میں رکھا۔

"کیا ہم یہاں سے نہیں نکل سکتے، امی؟" مناج نے بے بسی سے کہا۔

فرزانہ لاجواب ہوئیں۔

"کیا ہم ہمیشہ کے لیے قید ہو گئے ہیں؟ کیا ہم یہاں سے بھاگ نہیں سکتے۔" مناج کی آنکھ سے آنسو نکلا۔

اس میں اپنی عمر کی لڑکیوں کی طرح کے شوق و ذوق نہ تھے۔ وہ کسی بدروح کی طرح یہاں سے وہاں بھٹکتی تھی۔

"میں جانا چاہتی ہوں یہاں سے۔ میں نہیں رہ سکتی ادھر۔" اس نے خاموش آنسو بہائے۔

فرزانہ کا دل پسیجا۔ اس کے روکھے سوکھے چہرے کو تکتے ہوئے وہ یہی سوچ رہی تھیں کہ اس معصوم لڑکی کا کیا قصور تھا جو آخر اس قدر عبرتناک زندگی سے نوازا جا رہا تھا۔

"تم نکلنا چاہتی ہو یہاں سے مناج؟ تم فکر نہ کرو۔ میں تمہیں نکال دوں گی یہاں سے۔ بہت جلد۔ تم فکر نہ کرو، بس تھوڑا صبر کرو۔" فرزانہ نے چبا چبا کر کہتے اس کا سر تھپ تھپایا۔ آنکھوں میں جنون اترا۔

اگر مناج کو اندازہ ہوتا کہ فرزانہ کے دماغ میں کون سی جنگ چل رہی رہی تھی، تو وہ کبھی یہ باتیں نہ کرتی۔

ایک رات انہوں نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانا چاہا۔ وہ دوپٹے میں چھری چھپائے پرویز کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ اس کے سرہانے کھڑے ہو کر گھن آلود نظروں سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ وہ دنیا کا سب سے بدنما چہرہ معلوم ہوتا تھا۔ جنونِ انتقام نے زور لیا۔ ہاتھ ہوا میں بلند ہوا اور تیزی سے پرویز کے سینے کی طرف بڑھا۔

پرویز نے ایک جھٹکے میں ان کی کلائی تھام لی۔ چھری کی نوک سینے سے آدھے انچ کی دوری پر تھی۔ فرزانہ سانس لینے کی صلاحیت کھو بیٹھیں۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے چھری کھینچی اور زمین پر پھینکی۔ وہ طیش نظروں سے اٹھا کھڑا ہوا۔

وہ ایک قدم بڑھاتا۔ فرزانہ دو قدم پیچھے بڑھاتیں۔ آنکھوں میں وحشت بھری ہوئی تھی۔ دل بند ہونے کے درپے تھا۔ یکبارگی دیوار سے ان کی پشت ٹکرائی۔ انہوں نے آہ بھری۔ کاش اس کمرے کا رقبہ لامحدود ہوتا۔ وہ انہیں جارحانہ نظروں سے گھورتا گیا۔ فرزانہ جان گئی تھیں ان کے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ شکار ہوتے ہوئے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے قسمت تسلیم کر لی۔

"تمہاری ہمت!"

چند منٹ کمرے میں دل خراش چیخوں کی آواز گونجی۔ گالیاں، لعن طعن، مکے لاتیں، وہ جنگلی درندے کی طرح ان پر برسا۔ لیڈی اقتدار اور مناج کمرے میں بھاگے بھاگے آئے۔ فرزانہ کا جسم فرش پر

بے سدھ پڑا تھا۔ مناج کو کسی اپنے کا شناسا منظر یاد آیا۔ وہ بھی دل پر ہاتھ رکھے ایسے ہی فرش پر لیٹا تھا، پھر اس نے کبھی ان آنکھوں کو کھلتے نہیں دیکھا۔ وہ ماں کے سرہانے بیٹھ کر بین کرنے لگی۔

''یہ کیا پرویز؟ مر تو نہیں گئی یہ؟ اتنا مارنے کی کیا ضرورت تھی۔''لیڈی اقتدار نائٹ گاؤن میں ملبوس تھی۔ انداز میں مصنوعی پریشانی تھی۔

''لویزا آپا وہ میرا قتل کرنے والی تھی!'' پرویز نے چھری کی طرف اشارہ کیا۔

لیڈی اقتدار نے چھری کو دیکھا۔ چہرے کی لکیریں فنا ہوئیں۔ لب اوہ میں ڈھلے۔ مناج کے بین اس کے کانوں میں بری طرح چبھے۔

''اچھا، اسے چپ کرواؤ۔'' وہ لاتعلقی بولی۔ ''اگر مر بھی گئی تو کوئی بات نہیں۔ تمہاری بہن تمہارا بچاؤ کر لے گی۔''

☆☆☆

''امی کی زندگی باقی تھی۔ تھوڑی ہی صحیح، مگر باقی تھی۔ وہ ہسپتال میں ایڈمٹ تھیں۔ جسم پر گہری چوٹیں تھیں، سر پھٹ چکا تھا۔ انہوں نے امی کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھایا اور میرا۔۔'' حلق میں پھندا لگ گیا۔ آنکھ سے ایک آنسو نکلا۔

یہ پہلی بار تھا کہ مناج درے کے سامنے آنسو بہا رہی تھی۔

''انہوں نے میرا اگردہ مجھ سے چھین لیا، درِفشاں!''

☆☆☆

اگلے دن کی بات ہے۔ مناج صوفے پر بیٹھی تھی۔ لیڈی اقتدار اور پرویز اس کے مقابل بیٹھے تھے۔ نہ پرویز کے چہرے سے لگتا تھا وہ ایک عورت کو تقریباً مار کر لوٹا ہے، نہ لیڈی اقتدار کے چہرے سے لگتا تھا کہ وہ ایک درندے نما انسان کی بہن تھی۔

"مجھے اپنی امی سے ملنا ہے۔" وہ ہر خوف کے باوجود بولی۔

ہر ڈر پر ماں کی فکر غالب تھی۔

"ملنا ہے؟ مگر اس وقت تو شاید تمہاری ماں زندہ بھی نہ بچے، چندہ۔" لیڈی اقتدار نے ایسے کہا جیسے یہ اس کے نزدیک معمولی بات ہو۔

مناج کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

"ایسا نہ کہیں، پلیز۔" مناج نے منت سماجت والے انداز میں کہا۔

"تمہاری ماں کی جان صرف ایک ہی صورت میں بچ سکتی ہے، مناج۔" لیڈی اقتدار نے نرمی اختیار کی۔

"وہ کیسے؟" مناج پر امید ہوئی۔

"چھوڑو، تم وہ ہمیں نہیں دے سکو گی۔ شاید، تمہاری ماں سے الوداع کہنے کا وقت ہو ہی گیا ہے۔" لیڈی اقتدار کی آنکھوں پر مصنوعی ہمدردی چھا گئی۔

"آپ پلیز بتائیے۔ اپنی امی کو بچانے کے لیے میں کچھ بھی دے دوں گی۔" مناج جذباتی انداز میں بولی۔

لیڈی اقتدار نے ایک ستائشی نظر پرویز پہ ڈالی۔ پرویز ایسے مسکرایا جیسے اپنی بہن کی کارکردگی پر فخر کر رہا ہو۔

"گردہ دو گی اپنا؟" لیڈی اقتدار نے پوچھا۔

مناج کی آنکھوں میں حیرانگی پھیلی۔ وہ قطعاً اس بات کی توقع نہیں کر رہی تھی۔ مناج خاموش سی ہو کے لیڈی اقتدار کو متعجب نظروں سے دیکھتی گئی۔

"مجھے پتا تھا، تم نہیں دو گی۔ میرے پاس اب تمہاری ماں کو ختم کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں بچا۔" نروٹھے پن کے ساتھ فرش پر بچھے قالین کو گھورا۔

"نہیں ایسے نہ کریں پلیز۔۔۔ میں۔۔۔" مناج رکی۔ آگے کا جملہ کہنے کے لیے ہمت جمع کی۔

"میں دوں گی اپنا گردہ۔ پلیز میری امی کو بچا لیں بس!" چھوٹی مناج روتے ہوئے التجاء کر رہی تھی۔

لیڈی اقتدار نے جتاتی نگاہ پرویز پہ ڈالیں۔ پرویز کا چہرہ خوشی سے پھولے نہیں سمایا۔

"کہا تھا ناں، منا لوں گی اسے۔ او نیگیٹیو بلڈ ہمارے گھر میں ہی دستیاب تھا، اور تم کہاں کہاں خوار ہو رہے تھے۔ اب اسے رات میں لے جانا آپریشن کے لیے اور اسے خوب سمجھا دینا کہ یہ سب اپنی ماں کو ہرگز نہ بتائے۔"

☆☆☆

"اور پھر انھوں نے میرا پیٹ کاٹ کر میرا گردہ نکال لیا۔" مناج اب رونے لگی۔

درے کا کلیجہ چھلنی ہو گیا تھا۔

”مجھے دھمکایا گیا کہ میں یہ سب امی سے راز رکھوں۔ مگر میرے پیٹ پر بڑا سا زخم تھا۔ میں وہ امی سے کیسے چھپاتی؟“

☆☆☆

لیڈی اقتدار ان دنوں انگلینڈ جا چکی تھی۔

تیرہ سالہ مناج اپنے کمرے میں بیٹھی درد سے کراہ رہی تھی۔ پیٹ کے ایک مخصوص حصے میں جلن ہو رہی تھی۔

فرزانہ مناج کے کمرے میں اس کا حال چال دریافت کرنے آئی تھیں۔ وہ دو ہفتے بعد ہی ڈسچارج کر دی گئی تھیں، زخم قدرے بہتر ہو چکے تھے۔

مناج آنکھیں میچے ہوئے تھی۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار دیکھ کر فرزانہ پریشان ہوئیں۔

”مناج! کہاں تکلیف ہو رہی ہے؟“ فرزانہ فکرمندانہ انداز میں بولیں۔

مناج کو فرزانہ کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اسے پرویز کی ساری دھمکیاں یاد آئیں۔ اس نے چہرے کو عام رکھنا چاہا مگر کامیاب نہ ہو سکی۔

”کچھ نہیں امی۔“ مناج نے جبراً مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں جانتی ہوں تم جھوٹ بول رہی ہو۔ کُرتا اوپر کرو اپنا۔“ وہ بھی آخر میں تھیں تو مناج کی ماں۔

مناج نے سر نفی میں ہلایا۔

”امی کیا ضرورت ہے؟“ مناج بوکھلا کر بولی۔

وہ طیش کے عالم میں مناج کی طرف بڑھیں۔ مناج نے پلکیں بند کر لیں۔ فرزانہ نے کرتا اٹھایا۔ پیٹ پر دراز ساز خم تھا، جس پر ٹانکے لگے ہوئے تھے۔

فرزانہ کو لگا جیسے ان کے جسم پر کسی نے بے دردی سے خنجر چلائے ہوں۔ جسم کپکپانے لگا۔ چہرے پر نسیں بھڑک اٹھیں۔ شعلہ برساتی آنکھیں پپوٹوں سے نکلنے کو تھیں۔

”یہ کس نے کیا ہے، مناج؟“ وہ باقاعدگی سے تھر تھرا رہی تھیں۔

مناج کے رونگٹے کھڑے ہوئے۔ اس نے آج سے پہلی امی کو اتنا غصے میں نہیں دیکھا تھا۔

”بتاؤ کس نے کیا ہے یہ۔ ورنہ میں تمہارا حشر نشر بگاڑ دوں گی مناج۔“ مناج کا گریبان پکڑ کر اسے جھنجھوڑا۔

مناج کے آنسو جاری ہوئے۔ اسے زندگی میں پہلی مرتبہ امی سے خوف آیا۔

”بتاتی ہوں بتاتی ہوں۔ وہ آپ کو مار رہے تھے امی۔ آپ کی جان کے بدلے انہوں نے میرا گردہ مانگا میں نے دے دیا۔ پلیز کسی کو پتا نہ لگنے دی جیے گا ورنہ آپ کو ماردیں گے۔“

مناج کی بات ادھوری رہ گئی۔ گردے کے ذکر پر ہی فرزانہ اس کا گریبان چھوڑ کر کسی شیرنی کی طرح کمرے سے نکلی تھیں۔ جسم سلگتے ہوئے کوئلے کی طرح گرم ہو چکا تھا۔ آنکھوں میں اتنی حرارت تھی، کہ پوری کائنات راکھ ہو سکتی تھی۔

پرویز گھر کے کچن میں موجود تھا۔

وہ ان سے پشت کیے کھڑا، پھل کھانے میں مصروف تھا۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے شعلہ باز نگاہوں سے اسے دیکھتی گئیں۔ نتھنیں پھول گئے تھے۔ لبوں سے ہلکی غراہٹیں نکل رہی تھیں۔

انہوں نے ہاتھ کی مٹھی بنائی اور اس کی پشت پر زور سے وار کیا۔ وہ اس پر شکاریوں کی طرح جھپٹیں۔ اسے پے در پے مکے مارے۔ اپنے لمبے نوکیلے ناخن اس کے چہرے میں گاڑے۔

”تیری اتنی جرات تو میری بیٹی کا گردہ نکالے۔ میں اپنی بیٹی پر اتنا ظلم نہیں برداشت کر سکتی ،پرویز۔“

ممتا پھڑ پھڑا اٹھی تھی۔ شعور، لاشعور کام نہیں کر رہا تھا۔ حواس زائل ہو چکے تھے۔ ان پر الگ نوع کی غیر انسانی کیفیت طاری تھی۔ پرویز پہلے بوکھلا گیا۔ جلد اس نے صورتِ حال کو قابو کیا۔

وہ زیادہ طاقت ور تھا۔ فرزانہ کا اس کے سامنے کوئی مقابلہ نہ تھا۔ اس نے طاقتور ہاتھوں کی مدد سے فرزانہ کو دھکا دیا۔ فرزانہ کا سر دیوار سے ٹکرایا۔ وہ بس ایک وار کی مار تھیں۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے گرتی چلی گئیں۔ آنکھوں کے سامنے دھند پھیلنے لگی۔

مناج آنکھوں میں خوف لیے، لاؤنج میں کھڑی سب دیکھ رہی تھی۔ پرویز نے چولہا جلایا۔ آگ کے اوپر لوہے کی چمٹا رکھا۔ چمٹا دہک کر سُرخ ہو گیا۔

اس سے پہلے مناج فرار اختیار کرتی وہ اس کی طرف پھرتی سے لپکا۔ اسے دبوچا۔ ہاتھ کے اوپر لوہے کا سلگتا ہوا حصہ رکھ دیا۔ وہ درد کے مارے چلانے لگی۔ امی کو مدد کے لیے پکارنے لگی۔ آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو روانہ ہوئے۔ مگر اس آدمی کی درندگی پر کوئی فرق نہ پڑا۔

نیم بے ہوش فرزانہ کی سماعت سے بیٹی کی چیخ و پکار ٹکرائی۔ یکبارگی وہ بیدار ہوئیں۔ اب کی بار ان کا غصہ اپنی انتہاء کو پہنچا۔ دماغ میں لاوا ابل رہا تھا۔ وہ کھڑی ہوئیں۔ جسم میں توانائی بھر چکی تھی۔ ان کی ممتا کو چیلنج دیا گیا تھا۔ وہ اتنی اونچی سانسیں لے رہی تھیں کہ انہیں خود سنائی دے رہی تھیں۔ کاؤنٹر سے چھری اٹھائی۔ چہرے پر جنون و جلال تھا۔

وہ اتنی رفتار سے پرویز کی طرف بڑھیں کہ اسے پیچھے دیکھنے کا موقع تک نہ مل سکا۔

پرویز نے ایک جھٹکا لیا۔ اسے اپنے جسم کے اندر کچھ داخل ہوتا محسوس ہوا۔ مناج کی گردن پر اس کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی ہوئی۔ اسے سمجھ نہیں آیا کہ یہ ہوا کیا تھا۔

فرزانہ نے اس کی پشت پر پے در پے وار کیے۔ خون کے چھینٹوں نے اس کے چہرے کو داغدار بنا دیا

۔

پرویز زمین پر گر پڑا۔ وہ خون میں نہا چکا تھا۔ مناج چہرے پہ بے یقینی اور خوف لیے پرویز کے خون میں ڈوبے جسم کو دیکھ رہی تھی۔ پرویز پیٹ کے بل گرا ہوا تھا۔ زندگی نام کی نہ تھی۔ مگر فرزانہ ہوش میں نہ آئیں۔

انہوں نے اس کے سینے پر پے در پے وار کیا۔ وہ اس کے پورے جسم کو چیر چکی تھیں۔ اس کے اعضاء تک اس کے جسم سے باہر نکل گئے تھے، فرزانہ یہاں بھی نہ رکیں۔ انہوں نے اس کے چہرے کو نشانہ بنایا۔ انتقام، نفرت، بے بسی اور نہ جانے کن کن احساسات کے ساتھ وہ اس پر وار کرتی گئیں۔ اس کے اعضاء نکل کر باہر آ چکے تھے۔ کچھ دیر پہلے تک جو انسان چل پھر رہا تھا، گوشت کا ڈھیر بن چکا تھا۔

یکبارگی فرزانہ کے جسم نے جھٹکا کھایا۔ شعور بیدار ہوا۔ وہ دنیا میں لوٹ آئیں۔ انہیں احساس ہوا کہ وہ کیا کر گزری تھیں۔ وہ بے تاثر چہرے سے پرویز کے چیچھڑوں کو دیکھتی گیئں۔ پھر نظر اٹھا کر مناج کو دیکھا۔ وہ پتھر کا مجسمہ بن چکی تھی۔ آنکھوں میں زندگی نام کی نہیں تھی۔

وہ گہری سانس کھینچتے کھڑی ہو گیئں۔ مناج کو ہاتھ سے پکڑ کر کمرے میں لے آئیں۔ اسے نہلایا، خود بھی نہائیں۔ لباس تبدیل کیے۔ ایک خط تحریر کر کے بھورے لفافے میں قید کیا۔ کندھوں پر پشمینہ شال اوڑھی اور مناج کا ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکلیں اور بس میں سوار ہو گیئں۔ مناج کو دنیا جہاں کا ہوش نہ رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے پرویز کی موت کا منظر گھوم رہا تھا۔

بس ایک پوش علاقے میں اتری۔ رات گہری ہونے کے باعث سڑک سنسان تھیں۔ وہ کچھ دیر چلنے کے بعد سڑک کے بیچ و بیچ رکیں۔ مناج کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھیں۔ اسے دیکھتے ہوئے بے اختیار مسکرا دیں۔

”تمہیں پتا ہے نا، تمہاری خالہ کا گھر کہاں ہے، مناج؟“ آنکھیں نم پڑیں۔ وہ اس کے بالوں پہ ہاتھ پھیر رہی تھیں۔ اس نے کوئی ردِ عمل ظاہر نہ کیا۔ آنکھوں میں اب تک صدمہ تھا۔

فرزانہ نے پشمینہ شال کی اوٹ سے خط نکال کر اس کے ہاتھ میں تھمایا۔

”تم یہ خط اپنی خالہ کو دے دینا۔ میں بس ابھی کچھ کام نبٹا کر آتی ہوں۔ ٹھیک؟“ فرزانہ نے مناج کا ماتھا چوما۔ آنکھ سے آنسو نکلا، جو انہوں نے پونچھ دیا۔ مناج کچھ نہ بولی بس اپنا سر اثبات میں ہلایا۔

یخ بستہ ہواؤں نے سڑک پر گزر کر فسوں میں اضافہ کیا۔

وہ یوں ہی گھٹنوں کے بل بیٹھے مناج کو دیکھتی گئیں۔ انہیں جانا تھا۔ مگر اس کے لیے ہمت درکار تھی۔

”مناج۔“ فرزانہ ایک دم سے بولیں۔ ”تمہارے ابو کہا کرتے تھے کہ۔“

فرزانہ کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ انہوں نے اس کے رخسار تھامے۔

”تم ایک باوقار مہارانی ہو۔ ایک مضبوط نفس کی، بہادر اور دلیر ملکہ۔ وہ بالکل سچ کہتے تھے، مناج۔ تم واقعی ایک باوقار مہارانی ہو۔ تم ایک ملکہ ہو، ملکہ۔ اور مرتے دم تک ایک ملکہ رہو گی۔ اپنے ابو کی بات دماغ میں بٹھالو۔“ فرزانہ نے آنکھ کے کونے میں جھلکتا ایک آنسو صاف کیا۔

مناج نے سکتے کے عالم میں ماں کو سنا۔ فرزانہ نے اپنی پشمینہ شال اتاری۔ مناج کے کندھوں کے گرد لپیٹ دی۔

”ٹھنڈ بہت ہو رہی ہے۔ اسے اوڑھ لو۔“ انہوں نے نرمی سے کہا۔

آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ مگر انہیں جانا تھا۔

”اپنا خیال رکھنا۔“ اور وہ چلی گئیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی واپس نہیں آسکیں گی۔

وہ سیدھا رضیہ کے گھر چلی گئی۔ اس کی آمد پر دونوں پریشان تھے مگر مناج پھوٹنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ اس نے بس وہ خط انہیں تھما دیا۔

”پیاری بہن،

مجھ سے شاید میری زندگی کی سب سے بڑی خطا ہو گئی ہے۔

میں نے پرویز کا قتل کر دیا ہے۔ اس کی لاش کے اتنے ٹکڑے کیے ہیں کہ پہچانی بھی نہیں جاسکتی۔ مگر مجھے اس قتل پر کوئی شرم وندامت نہیں۔ اگر سو دفعہ بھی موقع ملے، تو میں یہی کروں گی۔

اس نے مناج کا پیٹ کاٹ کر اس کا گردہ نکال دیا۔ تم گواہ ہو میں نے آج تک ہر ظلم سہا۔ باپ کا ظلم۔ بھائی کا ظلم۔ طارق کا ظلم۔ لویزا کا ظلم۔ اور پھر پرویز کا ظلم۔ میری جیسی عورتوں کے نصیب میں ظلم کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ مگر میں مناج کو اپنے جیسا نصیب نہیں دے سکتی تھی۔ اسے نکلنا تھا یہاں سے۔

میں مناج کو تمہارے پاس چھوڑ رہی ہوں۔ تم اس کا خیال رکھنا۔ اس کا بچپن سے خواب تھا کہ وہ ایک وکیل بنے۔ اور اب میرا بھی ایک خواب ہے۔ وہ ایک دن بہت بڑی وکیل بنے۔ اور ان نام نہاد عدالتوں میں میرے جیسی عورتوں کو انصاف دلوائے۔

میری واپسی ناممکن ہے۔ پرویز کا خاندان بہت خطرناک ہے۔ وہ انتقام لینے کے لیے میری کھوج کرتے اور تمہارے دروازے تک پہنچ جاتے۔ میری اور مناج کی زندگی خطروں سے بھاگتے ہوئے کٹ جاتی۔ ویسے بھی میں نہیں چاہتی وہ مجھے دیکھ کر وہ سب یاد کرے جو کچھ دیر پہلے ہوا۔ میرے نہ لوٹنے میں بھلائی ہے۔

میں اپنے آپ کو اپنی بیٹی کے لیے قربان کرتی ہوں۔"

☆☆☆

"خالو نے فوراً پولیس کو اطلاع دی۔ پرویز کے گھر ریڈ ہوئی، مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ امی نے اپنے جسم پر ایسے گھاؤ لگائے کہ وہ موقع پر ہلاک ہو گئیں۔ مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں درِفشاں۔

بس ایک چھوٹی سی کسک ہے دل میں۔ کہ بس وہ خود کو ختم نہ کرتیں۔ زندگی مشکل ہوتی۔ مگر ہم ساتھ ہوتے، کسی نہ کسی طرح جی لیتے۔ میں نے ان کی کمی ہمیشہ محسوس کی۔ خودکشی حل نہیں تھا۔"

درِ فشاں کا پھوٹ پھوٹ کر رونے کا جی چاہا۔ مگر اس نے چہرے پر ہمدردی سجائے رکھی۔ کچھ دیر کمرے میں خاموشی حائل رہی۔ پھر درِفشاں نے اپنے لب کھولے۔

"تمہیں اپنی امی اور ابو سے کتنی محبت ہے، مناج؟" وہ سوچنے کے بعد بولی۔ اسے مناج کے دماغ کے مطابق درست ڈوریاں ہلانی تھیں۔

مناج کچھ دیر کے لیے خاموش رہی۔ گردن جھکی ہوئی تھی۔

"بے انتہاء۔ بے پناہ۔ دنیا کے سامنے وہ دونوں پرفیکٹ نہیں ہوں گے۔ مگر میرے لیے وہ دنیا کے بہترین والدین تھے۔" وہ جذبات سے لبریز آواز میں بولی۔

درِفشاں مبہم سا مسکرائی۔

"فرض کرو، اگر وہ زندہ ہوتے۔ کیا تمہیں ان سے اتنی محبت ہے ان کا کہا مان سکو؟"

مناج نے نظریں اٹھائیں۔ آنکھیں چمکیں۔

"بلا جھجک۔ بلا تاخیر۔"

درِفشاں کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

"تو پھر تمہیں کیا روک رہا ہے ان کی وہ خواہشات پوری کرنے سے جو انہوں نے اپنی زندگی میں کی تھیں؟"

مناج سوچ میں کھو گئی۔

”تمہارے ابو نے کہا تھا کہ تم باوقار ہو۔ تمہاری امی کے آخری الفاظ بھی یہی تھے۔ اس کا مطلب کیا ہوا؟“ درے نے بھنویں اٹھائیں۔

مناج کے ذہن میں جھماکے ہوئے۔ زندگی کو جیسے نیا معنی مل چکا تھا۔

”مطلب وہ۔۔“ آنکھیں پھیلیں۔

درِ فشاں نے گردن اوپر نیچے ہلائی۔

”بالکل مناج۔ وہ تمہیں ایک باوقار انسان کے طور پر دیکھنا چاہتے تھے۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو کیا تمہارے اس روپ سے خوش ہوتے؟ تم ان سے اتنی محبت کرتی ہو۔ یہ محبت تمہاری رہنما ہے۔ یہ محبت تمہیں راستہ دکھا سکتی ہے۔ تمہیں محبت کا تعاقب کرنا ہے۔ محبت سے زیادہ طاقتور کچھ نہیں ہوتا۔“ درِ فشاں کے چہرے پر آسودہ مسکراہٹ تھی۔

مناج کے دل میں نئی کرنیں جگمگائیں۔ وہ جس تاریک بدبودار گلی پر سالوں سے چل رہی تھی، یکبارگی وہاں روشنی کی سنہری کرنیں نچھاور ہوئیں۔ اس بدبو کے اوپر گلاب کی مہک غالب آرہی تھی۔ گلی کی تنگ دیواریں کشادہ ہو رہی تھیں۔

”میں نے کبھی اس طرح کیوں نہ سوچا؟“ اس نے حیرانی کا اظہار کیا۔

"ہماری زندگی کی بہت سی پیچیدگیاں بس ذہنیت میں ذرا سی تبدیلیوں پر معنی بدل لیتی ہیں، مناج۔ تمہیں نئے زاویے سے اپنے ماضی کو پرکھنا ہو گا۔ اسے کوسنے کے بجائے، اسے گلے سے لگانا ہے۔ سیکھ حاصل کرنی ہے۔ اپنے مقصد سے جڑنا ہے۔"

مناج کا سینہ سالوں بعد جیسے کھل رہا تھا۔ تھکاوٹ، بوجھل پن جو جسم پر سوار رہتی تھی، آخرکار سرک رہی تھی۔

"مناج تم کون ہو؟" درے نے اچانک سوال پوچھا۔

"مطلب؟"

"مناج تم آج اقرار کرو گی خود سے، کہ تم ایک باوقار مہارانی ہو۔ ایک مضبوط نفس کی بہادر لڑکی۔ تیار ہو؟"

مناج مزید الجھی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔

"مگر یہ سچ تو نہیں۔" اس نے تردید کی۔

"کھڑی ہو جاؤ۔" اس نے مناج کی بات کو سرے سے نظر انداز کیا۔

مناج بلاتردد کھڑی ہو گئی۔ درے نے اس کے بازو تھامے۔ پرعزم نگاہ اس کی آنکھوں میں گاڑی۔

"اب جو میں کہہ رہی ہوں وہ دہراؤ۔"

مناج نے سر اثبات میں ہلایا۔

"میں مناج ایک باوقار مہارانی ہوں!" درے نے ہر لفظ پر زور دیا۔

مناج کے حلق میں پھندا سالگ گیا۔ دل کو نادیدہ زنجیروں نے جکڑ لیا تھا۔

"میں مناج۔۔" مناج کی آواز اٹکی۔ "میں مناج ایک باوقار مہارانی۔" مناج کی آنکھ سے آنسو روانہ ہوئے۔

دل میں موجود نادیدہ زنجیروں نے کھلنا شروع کر دیا تھا۔

"اور میں ایک مضبوط نفس کی۔" درِفشاں چبا چبا کر بولی۔

مناج کے آنسو اب اور بھی تیزی سے روانہ ہوئے۔ یہ اقرار اس کے وجود میں ایک قوت بھرنے لگا تھا۔

"اور میں۔" مناج کی آواز کپکپائی۔ مگر اب کہنا آسان تھا۔ "ایک مضبوط نفس کی۔" مناج نے اپنا سر جھکا لیا۔

"بہادر اور دلیر لڑکی ہوں!"

'بہادر۔" مناج نے اب درے کی آنکھوں میں دیکھا۔ '

اسے لگا جیسے وہ آزاد ہو رہی تھی۔ وہ جیسے رہائی پا رہی تھی۔

"اور دلیر لڑکی ہوں!"

غیر مرئی زنجیریں فنا ہوئیں۔

ایک سانس نکلی۔ وہ جسم ڈھیلا چھوڑ کر فرش پر بیٹھ گئی۔ جسم ہلکا پھلکا ہو چکا تھا۔ ہر بوجھ اپنا وجود کھو چکا تھا۔ وہ ہنس پڑی۔ اور پھر ہنستے ہنستے رو پڑی۔

مناج نے مناج کو فتح کر لیا تھا۔



وہ چاروں خفیہ ملاقاتی کمرے میں پھر جمع ہوئے تھے۔

ان کے ہاتھ میں مہر اور احمد کی تصویریں تھیں۔ مسکراتا ہوا احمد اور مسکراتی ہوئی مہر جو کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کھڑے تھے۔ سب کے ماتھوں پہ شکنیں ابھری ہوئی تھیں۔ ان تصاویر نے سب کو ہی اندر تک جلا مارا تھا۔

"کیا ہمیں ڈرنا چاہیے، لیڈی؟" درانی نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

لیڈی اقتدار گہری سوچ میں تھی۔

"میں اتنی جلدی کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی ہوں۔ ہمارے مخالف احمد ہے، احمد!" لیڈی اقتدا نے زور دیا۔

"تعاقب کرواتے ہیں اس کا۔" نیلوفر نے اپنی تجویز پیش کی۔

لیڈی اقتدار نے سر نفی میں ہلایا۔

"نہیں۔ فی الحات تعاقب کرنا حل نہیں۔ فرض کرو، احمد مہر کی زندگی میں ہمیں برباد کرنے کے لیے نہیں آیا۔ اس صورت میں ہم اس کی غیر ضروری توجہ مرتکب کر بیٹھیں گے۔" لیڈی اقدار ہر راستے پر نظر ثانی کر رہی تھی۔

"پھر ہم آخر کریں گے کیا؟" نیلوفر پریشانی کے عالم میں بولی۔

"ہمیں انتظار کرنا ہو گا۔ دونوں کی کالز ٹیپ کرواؤ۔ مہر کا تعاقب کرو۔ وہ دونوں ملیں گے، ہمیں خبر ہو جائے گی۔ میں جلدی میں کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتی۔ فی الحال صرف دو چیزوں کے امکانات ہیں۔"

لیڈی اقتدار کے ذہن میں تصویر واضح ہو چکی تھی، سو وہ قدرے پر سکون تھی۔

"کیسے امکان؟" شمس نے پوچھا۔

"پہلا امکان۔ وہ دونوں اچھے دوست ہیں یا دوست سے بڑھ کر۔ اس صورت میں بھی جلد یا بدیر ہمیں دونوں کو علیحدہ کرنا ہی ہو گا۔" لیڈی اقتدار کے ماتھے کے بل ڈھیلے ہوئے۔

"اور دوسرا امکان؟"

"وہ مہر کے ساتھ صرف اور صرف ہمیں تباہ کرنے کے لیے جڑا ہے۔ اس صورت میں بھی دونوں کو الگ کرنا ہو گا۔"

"اور ہم ایسا کیسے کریں گے لیڈی؟" درانی نے پوچھا۔

"مہر کو جرائم کی دنیا میں اپنا ساتھی بنا کر۔" لیڈی اقتدار کے دماغ میں لائحہ عمل تیار تھا۔

ان تینوں کی نگاہوں کا تبادلہ ہوا۔

"یہ ہمارے منصوبے میں شروع سے شامل تھا۔ اگر وہ دونوں صرف دوست ہیں تو ہم انتظار کر سکتے ہیں۔ اگر احمد جاگ چکا ہے تو ہمیں اپنی رفتار بڑھانی ہو گی۔ مہر کو جلد از جلد پھنسانا ہو گا۔" ہاتھ آپس میں جوڑے۔

"اور ہم احمد کے عزائم کی تصدیق کیسے کریں گے؟" شمس بولا۔ لیڈی اقتدار کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

"ہمیں تصدیق کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" اس بار درانی بولا۔ لیڈی اقتدار نے سر ہاں میں ہلایا۔

"احمد مجھے بہت پسند ہے کیونکہ وہ ایک بہترین حریف ہے۔ اسے جب جنگ کرنی ہوتی ہے تو وہ کھلم کھلا جنگ کرتا ہے، ڈرپوکوں کی طرح پیچھے سے وار نہیں کرتا۔ اسے جب اعلان جنگ کرنا ہو گا تو اس کا اشارہ ہم تک پہنچ جائے گا۔ اس لیے ہمیں صرف اشارے کا انتظار کرنا ہو گا۔"

نیلوفر اور شمس بات کو سمجھ چکے تھے۔

لیڈی اقتدار اب کھڑی ہو گئی۔ چہرے پر اطمینان تھا۔

"درانی تم مہر اور احمد کی کالز ٹیپ کرو۔ شمس تم مہر کے اوپر نظر رکھواؤ گے۔ نیلوفر تم مہر کی زندگی میں پھر داخل ہو اور احمد کے بارے میں پوچھنے کی کوشش کرو۔" لیڈی اقتدار نے ایک سانس میں حکم جاری کیا۔

سب نے ملکہ کی بات کو ذہن نشین کیا۔ لیڈی اقتدار کی گردن مزید تن چکی تھی۔ وہ آنکھوں میں الگ نوع کی جست لیے کمرے سے چلی گئی۔ چال کا رعب برقرار تھا۔

یہ تو طے تھا کہ اندھیرے اور برائی کی یہ ملکہ، اتنی آسانی سے ٹوٹنے والی نہ تھی۔

☆☆☆

”آئندہ کام کی باتیں اسی موبائل پر ہوں گی۔“

رات کا پہر تھا۔ مہر کے کان سے دوسرا موبائل لگا ہوا تھا۔

”مجھے شک ہے۔ بلکہ یقین ہے دوسرے موبائل سے ہماری کالز ٹیپ کی جا رہی ہیں۔“

آفس میں مہر کو ایک پارسل موصول ہوا تھا۔ اس میں یہ موبائل موجود تھا۔ ساتھ ہی احمد نے نوٹ بھیجا تھا کہ وہ رات میں کال کرے۔

”احمد، ہم ڈیڈ کے لاکرز کی تلاشی کب لیں گے؟“ اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ تعاقب کے خیال سے ہی وہ ڈر جاتی۔

”آپ کچھ دیر انتظار کریں۔ میں پہلے تسلی کرنا چاہتا ہوں کہ میرا تعاقب کیا جا رہا ہے یا نہیں۔ میں فی الوقت ان پر اپنے مقاصد کا اعلان نہیں کرنا چاہتا۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”بس آپ نے وہ لاکرز میرے بغیر نہیں کھولنے۔“ زور دے کر کہا۔

مہر نے ٹھنڈی آہ بھری۔ شیشے کی دیوار کے پار سبزہ زار کو دیکھا۔

”ہم اس سب سے نکل تو جائیں گے؟“ آواز مضطرب تھی۔ انداز بوجھل۔

"مہر، مستقبل کا علم صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ہم کوشش کریں گے۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ میرے ساتھ ہیں۔ ہم ہر آفت کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔"

لبوں پر آسودہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ سینے کی تنگی ختم ہونے لگی۔

"آپ نے اگلے کچھ دنوں تک انہیں یہی تاثر دینا ہے کہ آپ ہیرے تلاش کر رہی ہیں۔ عبداللہ سلطان کے دوستوں سے ملیں۔ یہاں وہاں جائیں۔ انہیں بھٹکائے رکھنا ہے۔ بات سمجھ آ رہی ہے؟"

"سمجھ گئی۔" آنکھیں مشکور ہوئیں۔

اس شخص کے ساتھ میں کٹھن وقت بھی آسان معلوم ہو رہا تھا۔

"میں فون رکھتا ہوں۔ اللہ حافظ۔" کال کٹ گئی۔

مہر نے فون کو سینے سے لگایا اور سبزہ زار کو دیکھے گئی۔

"کیوں وہ انسان تمہارے لیے اتنا اہم بنتا جا رہا ہے؟"

اس نے مڑ کر اپنی بیٹی کو دیکھا۔ چہرے پر تلخ مسکراہٹ بکھری۔

"تم طلاق یافتہ، ایک بچی کی ماں ہو، مہر۔ تم اس کے ساتھ کے خواب اپنی آنکھوں میں نہ سجاؤ۔"

اپنے دماغ کو اذیت ناک خیال سونپ کر وہ سونے کے لیے چلی گئی۔



درفشاں ریستوران میں بیٹھی تھی۔ سُرخ شرٹ کے ساتھ جینز کی سکرٹ پہنی تھی۔ بالوں کو جوڑے میں قید کیا ہوا تھا۔ ریستوران کھلے علاقے میں واقع تھا۔ ٹھنڈی ہواؤں کے ساتھ ہری بھری پہاڑیوں کے دلفریب منظر دیکھنے کو مل رہے تھے۔

دفعتاً مناج آئی۔ چال پہلے سے بہتر تھی۔ البتہ چہرہ آج بھی مرجھایا ہوا تھا۔ درِفشاں نے آج کے سیشن کے لیے اسے اس خوبصورت ریستوران میں مدعو کیا تھا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد دونوں نے معمول کی باتیں کیں۔ درے نے پچھلے ہفتے کا حال احوال دریافت کیا، مناج نے ایمانداری سے اسے سب کچھ بتایا۔

"ڈپریشن کی مثال ہے ایک دلدل جیسی۔ تم ایک دلدل میں جتنے ہاتھ پاؤں مارو گی، جتنا انتشار برپا کرو گی، اتنا ہی دلدل کی گہرائیوں میں ڈوبتی جاؤ گی۔ دلدل سے رہائی ایک صورت میں حاصل کی جاتی ہے۔ خود کو آزاد چھوڑ کر۔ وسوسوں کو ذہن سے جھٹک کر۔ ڈپریشن سے نکلنے کے لیے انسان کو منفی سوچوں پر قابو پانا ہوتا ہے۔"

درِفشاں بولتی گئی۔ مناج نے اس کی ساری باتوں کو ذہن نشین کیا۔

(مناج نے اپنی خالہ سے اچھے تعلقات استوار کیے۔ اسے یاد تھا کہ خالہ کیسے اس کی خاطر تواضع کرنے کے لیے آگے پیچھے گھومتی تھیں۔ اس نے ضائع شدہ سالوں کا مداوا کرنا چاہا۔ وہ آئے دن ان کے ساتھ گھومنے جاتی۔ انہیں اپنی زندگی میں شامل کرتی، اور ان کی زندگی میں حصہ لے رہی تھی۔")

"ڈپریشن کی کئی اقسام اور کئی درجات ہیں۔ تم چائلڈ ہڈ ٹراما کا شکار تھی۔ تمہیں اس بچے سے دوبارہ جڑنا ہوگا، جس نے ماضی میں کرب جھیلے ہیں۔ تمہیں اسے دلاسہ دینا ہوگا۔ تمہیں اس بچے کی ہمت بننا

ہو گا۔ تم اسے احساس دلاؤ گی کہ اس دنیا میں جہاں تاریکی ہے وہاں روشنیاں بھی ہیں۔ تب جا کر تم آج والی مناج کو ہیل کر سکو گی۔"

(وہ روز صبح واک پر جاتی تھی۔ اسے قدرت کے ساتھ وقت گزارنا اچھا لگتا تھا۔ اسے اچھا لگتا تھا آسمان کو دیکھنا۔ چڑیا کا چہچہانا بھی اسے اچھا لگتا تھا۔ بارش ہوتی تو وہ اس میں نہایا کرتی۔ اسے اپنی آزادی اچھی لگتی تھی۔ اسے اپنی قید اب یاد نہیں آتی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ بہتری کی طرف جا رہی تھی۔)

"تمہارا دماغ باز نہیں آئے گا۔ وہ آئے دن منفی چیزیں سوچے گا۔ تمہارا گھٹنے ٹیک دینے کا جی چاہے گا۔ مگر تم نے دماغ کا سپہ سالار بننا ہے، نہ کہ اس کی غلامی میں سر بسجود ہونا ہے۔ دماغ کا استعمال کرنا سیکھو، اس سے پہلے وہ تمہیں استعمال کرے۔"

(اکثر اوقات وہ سینے پر بوجھ محسوس کرتی۔ اس کے سامنے ماضی کے منظر دوڑنے لگتے۔ مگر اب وہ در فشاں کی باتوں پر عمل کرتی تھی۔ وہ اپنے خیالات کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیتی تھی۔ بلکہ اب وہ ان کا مقابلہ کرتی تھی۔ اس نے اپنے ماضی کو اپنی طاقت بنا لیا تھا۔)

"اپنے آپ کو ہر وقت مصروف رکھو۔ کوئی مشغلہ تلاش کر لو۔ کوئی سرگرمی تلاش کر لو۔ مگر اپنے آپ کو فارغ نہ رکھو۔ ایک وقت آئے گا جب تمہارے منفی خیالات تمہیں خود ہی تنگ کرنا چھوڑ دیں گے، کیونکہ تمہارے پاس ان کے لیے وقت ہی نہیں بچے گا۔ تم خود کو یاد دلاتی رہو کہ تم آزاد ہو چکی ہو۔"

(اس نے جم بھی جوائن کر لیا تھا۔ وہ اپنے جسم کا خیال رکھتی تھی۔ وہ گھنٹوں کسرت کرتی تھی۔ گھر آ کر وہ اپنا ناشتہ بناتی تھی اور اپنی خالہ کی بھی مدد کرتی تھی۔ صبح سے شام تک وہ لاء پریکٹس کرتی تھی۔ اس سب

کے درمیان مناج کو پراجیکٹ حرر بھی مل چکا تھا۔ حرر نے اس میں ایک نئ روح پھونک دی تھی۔ حرر نے اس کی زندگی کو نیا مقصد بخشا تھا۔)

"اور اس سب میں اپنے رب کو نہ بھولنا۔ یاد رکھو، جو بھی ہوتا ہے اس کی اجازت سے ہوتا ہے۔ وہ قدیر ہے۔ تم نے اپنے رب کو نہیں بھولنا ہے۔ تمہیں بس وہی کرنا ہے جو اسے راضی کرے۔ رب کو جانے بغیر دنیا کی کسی چیز کے پیچھے بھاگنا بے وقوفی ہے۔ تم اس رب کو بھی جانو، اور اپنی دنیا بھی سنوارو۔ وہ اللہ تمہاری اب تک مدد کرتا آرہا ہے، وہ آگے بھی تم پہ بہت مہربان ہوگا۔"

مناج مسکرادی۔ وہ بھی تیار تھی، ایک دفعہ پھر سے اڑان بھرنے کے لیے۔ آسمانوں کی پرواز کرنے کے لیے، بادلوں کی سیر کرنے کے لیے، دنیا کو فتح کرنے کے لیے۔

مناج اب تیار تھی۔

"اور ایک آخری بات۔" دُرِفشاں نے پراسرار وقفہ لیا۔

"اپنا خیال رکھا کرو کیونکہ تم اس قابل ہو کہ تمہارا خیال رکھا جائے۔"

☆☆☆

باب ہفتم: ’’تحریکِ حرر‘‘

میرے اندر کچھ بدل چکا ہے،

کچھ ہے جو پہلے جیسا نہیں رہا،

میں تھک گئی ہوں دوسروں کے بنائے گئے اصولوں پر جیتے جیتے،

اب دوبارہ سوچنے کا وقت گزر گیا ہے،

اب دوبارہ سو جانے کا وقت گزر چکا ہے،

ابھی تو وقت ہوا ہے اپنی جبلت پہ بھروسہ رکھنے کا،

آنکھیں بند کرنے کا، اور اڑ جانے کا!

اب وقت ہے کہ میں کوشش کروں،

کششِ ثقل کو جھٹلانے کی،

میں سوچتی ہوں مجھے کوشش کرنی چاہئے،

کشش ثقل کو جھٹلانے کی،

مجھے الوداع کہہ دو،

میں کشش ثقل کو جھٹلا رہی ہوں!

اور تم مجھے کبھی نیچے نہیں لا سکو گے۔

میں تھک گئی ہوں حدوں کو مانتے مانتے،

کیونکہ کسی نے کہا تھا کہ حدیں ہوتی ہیں،

کچھ چیزیں شاید کبھی نہیں بدلتی،

مگر جب تک میں کوشش نہیں کروں گی میں کیسے جانوں گی؟

بہت عرصے سے میں ڈر رہی تھی،

اس پیار کو کھونے سے جس کو میں کب سے کھو چکی،

اور ایسا پیار ہی کیا،

جو بہت بڑی قیمت چکانے کے بعد ملے۔

اب وقت ہے کہ میں،

کشش ثقل کو جھٹلاؤں!

(وکٹر کی ایلفابا)

☆☆☆

وہ جل رہی تھی۔

وہ اکیلے جلنا نہیں چاہتی تھی۔

وہ ان سب کو اپنے ساتھ جلا کر راکھ کرنا چاہتی تھی۔

جنہوں نے اسے اس آگ میں جھونک دیا۔ کہا جاتا ہے کہ، زخمی زخم دیتا ہے۔ وہ بھی گھائل تھی۔ وہ سب کو گھائل کرنا چاہتی تھی۔

عافیتِ زندگی کے خفیہ تہ خانے میں نیلوفر موجود تھی۔ قدم ان تین دروازوں میں سے درمیان والے دروازے کی طرف اٹھ رہے تھے۔ دراز ہال چمک رہا تھا۔ بس وہ ہی اندھیروں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ دہائیاں ان تاریکیوں میں کاٹ چکی تھی، مگر یہ تاریکیاں اتنی ڈھیٹ ٹھہری تھیں کہ چھٹنے کا نام ہی نہیں لیتیں۔

اس نے سیاہ لیدر جیکٹ اور چست پینٹ پہنی ہوئی تھی۔ ہاتھوں میں فش نیٹ گلوز تھے۔ دروازہ کھولنے سے قبل اس نے جیب سے تہہ شدہ ماسک نکالا اور چہرے پر چڑھا دیا۔ آنکھوں میں ٹھنڈ لیے کمرے میں چلی گئی۔

کمرے میں سُرخ بتیاں جل رہی تھیں۔ دو بھاری بھر کم جسامت والے مرد کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں خاردار کوڑے تھے۔ زمین پر دو جوان لڑکے تھے۔ جسم پر شرٹ نہ تھی۔ ہاتھ اور پیر زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے۔

وہ ماسک کے پیچھے سے مسکرائی۔

وہ عورت جس کی روح گھائل تھی، ان کے گھائل جسموں کو دیکھ کر خوش ہوئی۔

☆☆☆

یہ چھ سال پہلے کا منظر ہے۔۔۔

نیلوفر اپنے کرائے کے اپارٹمنٹ میں سوئی پڑی تھی۔ الماریاں کھلی ہوئی تھیں، کپڑے الماریوں سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ دھول مٹی کی موٹی تہہ فرش پر جمی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہفتوں سے اس کمرے کی صفائی نہ کی گئی ہو۔

بھڑکیلی دھوپ نے اسے بے دار کیا۔ سوجھی ہوئی آنکھیں اس بات کی گواہی دے رہی تھیں کہ وہ رات بھر روئی تھی۔

اس نے سائیڈ ٹیبل پر ہاتھ مار کر اپنا موبائل اٹھایا۔ وقت دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ اسے ہسپتال پہنچنے میں دیر ہو گئی تھی۔ مگر وہ جوں کی توں لیٹی رہی۔ ہسپتال مزید دیر سے جانے کا ارادہ کیا۔

اس نے موبائل پر فیس بک کھولی۔ کسی جنید نامی مرد کی آئی ڈی سکرین پر جگمگا رہی تھی۔ سامنے پوسٹ تھی، جس میں خوبرو سا مرد شیروانی میں ملبوس تھا۔ اس کے کندھے پر سر رکھے اس کی دلہن کھڑی

تھی۔ دل میں درد بھری ٹیسیں ابھریں۔ کیا ضرورت تھی اسے یک طرفہ محبت میں گرفتار ہونے کی؟ اس نے خود کو کوسا۔

زندگی ایک نقطے پر آکر رک کیوں گئی تھی؟ اس کے سارے ساتھی دنیا فتح کرنے میں مصروف تھے۔ بس وہی تھی جو پیچھے رہ گئی۔ غم کے پلندوں کے کندھوں پر لاد کر خود کو دنیا کی ریس میں جیسے تیسے گھسیٹ رہی تھی۔

"جن کے ماں باپ نہیں ہوتے، وہ اسی طرح کی زندگی گزارتے ہیں۔" اس نے پچھلے ہفتے ایک نرس کو کہتا سنا تھا۔

نیلوفر نے تکلیف سے آنکھیں میچ لیں۔ یہ احساس کہ وہ ناکام عورت ہے اسے کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔

"میں تمہارے زوال کی زمہ داری لیتی ہوں، انسپیکٹر عادل۔" اسے بے اختیار وہ جملہ یاد آیا جو اس نے سالوں پہلے کہا تھا۔

"تم اب تک واپس نہیں گئی۔ تم اب تک اسے اس کے زوال تک نہیں پہنچا سکی۔ سب زندگی میں آگے بڑھ چکے ہیں، سوائے تمہارے۔" وہ خود سے کلام کر کے خود کو اپنی نااہلی یاد دلانے لگی۔

ہر طرف سوگ گھلا ہوا تھا۔ فضا میں مغموم خاموشی تھی جو دل میں چبھتی تھی۔

نیلوفر ہمت جمع کرتے اٹھ کھڑی ہوئی۔ خود کو تیار کیا۔ چہرے پر ہلکا سا میک اپ کیا اور رکشے پر سوار ہو کر نکل پڑی ہسپتال کی جانب۔ اس کا آپ حال کی نیلوفر سے یکسر مختلف تھا۔ نہ چہرے پر رعب تھا، نہ چال میں وہ دبدبا۔

رکشہ عافیت زندگی کے باہر رکا۔ نیلوفر نے قیمت کی بھیت بھاؤ کی اور پہلی فرصت میں حاضری دینے ہسپتال کے ناظم کے کمرے میں چلی گئی۔ کرسی پر ایک نوجوان براجمان تھا۔ یہ وہی کرسی تھی جس کو حال کی نیلوفر سنبھالے ہوئے تھی۔

"معذرت مسٹر درانی، میں لیٹ ہو گئی۔" نیلوفر نے روکھے لہجے میں کہا۔

درانی جو کاغذ پر قلم چلارہا تھا، یکدم اسے بغور دیکھنے لگا۔ آنکھوں میں تفتیش تھی۔

"تم رات بھر روئی ہو ناں، نیلوفر؟" درانی نے نرمی سے پوچھا۔

نیلوفر خاموشی سے وہیں کھڑی رہی۔ درانی نے کرسی سے ٹیک لگائی اور سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"بیٹھو نیلوفر۔" درانی نے سنجیدگی سے کہا۔ نیلوفر چپ چاپ بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں ہر تاثر سے پاک تھیں۔

"تمہارے چہرے سے صاف لگتا ہے کہ اب تم پوری طرح ٹوٹ چکی ہو۔" درانی کی آواز مزید دھیمی ہوئی۔ گردن نیلوفر کی طرف جھکائی۔ لبوں پر ہمدرد مسکراہٹ تھی۔

"تمہیں دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ اب تمہاری برداشت جواب دے چکی ہو۔ تم اپنی زندگی کو بدلنا چاہتی ہو۔ ہے نا، نیلوفر؟" آواز میں مصنوعی اداسی تھی۔

نیلوفر کی آنکھیں اداس ہوئی۔ چہرے پر پھیلا سرد وسپاٹ تاثر فنا ہوا۔

"سر پلیز۔ میں آپ کی آفر قبول نہیں کر سکتی۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔" نیلوفر نے ہاتھ اٹھا کر منت کرنے والے انداز میں کہا۔

درانی نے سر نفی میں ہلایا۔

"یہ صرف آفر نہیں ہے، نیلوفر۔ یہ تمہاری ہر مشکل کا حل ہے۔ تمہارے پاس دولت ہو گی۔ تمہارے پاس طاقت ہو گی۔ تم ایک مضبوط عورت بن سکو گی۔ کیا تم ان لوگوں کا حشر نشر بگاڑنا نہیں چاہتی جنہوں نے تمہارے اوپر ظلم ڈھائے؟" درانی ہر ایک الفاظ پر زور دیتے ہوئے سرگوشیانہ انداز میں بولا۔

الفاظ نیلوفر کے کانوں سے گزر کر سیدھا اس کے دل میں داخل ہوئے۔

"میرا دل دو حصوں میں بٹ چکا ہے۔ ایک حصہ چاہتا ہے کہ میں ان سب کو تڑپا تڑپا کے ماروں۔ جس طرح سے انہوں نے میرے اپنوں کو چھینا ٹھیک اسی طرح میں ان کے اپنوں کو چھینوں۔ جس طرح سے انہوں نے میری دولت لوٹی میں ان کی دولت لوٹوں۔ میں ان سب کو برباد کر دینا چاہتی ہوں۔" نیلوفر کا وجود غصے سے ابلنے لگا تھا۔

درانی کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ وہ نیلوفر کے منفی جذبات کو ہوا دینے میں کامیاب ہوا تھا۔

"مگر دوسرا حصہ ڈرتا بھی ہے۔ مجھے خوف محسوس ہوتا ہے۔ اگر اپنے نفس کو بیچ کر میں خوش نہ ہو سکی؟ اگر میں جرائم کی دنیا میں آکر بھی زندگی سے مطمئن نہ ہو سکی؟" اور بھی بہت چیزیں تھیں جو نیلوفر کو روکے ہوئے تھیں، لیکن وہ ان سب کا ذکر درانی کے سامنے کرنا نہیں چاہتی تھی۔

"یقین کرو نیلوفر۔ بس ایک قدم بڑھانے کی دیر ہے۔ اور تمہارے پاس بے تحاشا طاقت ہو گی۔ تم دولت کے پہاڑوں پر راج کرو گی، نیلوفر۔" درانی نیلوفر پر اتنی جلدی ہار ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔

”لیکن آپ مجھے بتاتے بھی نہیں کہ آخر ادھر ہوتا کیا ہے؟ ایسا کیا ہے جس سے مجھے اتنی طاقت اور دولت ملے گی۔“نیلوفر کو تجسس ہوا۔

”اگر میں نے تمہیں بتادیا، تو یہ تمہارے ہاں کہنے کے برابر ہوگا۔ اس کے بعد صرف موت ہی تمہیں اس دنیا سے آزاد کرسکے گی۔“ درانی کا انداز سفاک تھا۔

نیلوفر نے بے اختیار جھرجھری لی۔

”کیا اس کام میں بہت قتل وغارت ہے؟“نیلوفر کی آنکھوں میں تشویش تھی۔ وہ کہیں نہ کہیں یہ قدم بڑھانے کے لیے مان گئی تھی۔ مسٹر درانی نے اپنی گردن اوپر نیچے ہلائی۔

”یہ کام قتل وغارت سے بھی بدتر ہے۔ ہر انسان یہاں غربت میں دھت لاچارگی بھری زندگی گزار رہا ہے۔ اگر ہم ان میں سے چند کی زندگی چھین لیں تو اس میں کیا حرج؟ کھانے کو ان کے پاس کچھ ہوتا نہیں۔ انہیں مار کر ہم تو الٹا ان کی مشکلات آسان کررہے ہیں۔“ درانی مزے لینے والے انداز میں نیلوفر سے کہہ رہا تھا۔

نیلوفر کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ کبھی بھی قاتل نہیں بن سکتی تھی۔

”میں ایک قاتل بن جاؤں گی۔ میں یہ بوجھ نہیں اٹھاسکوں گی۔“نیلوفر آنکھوں میں بے چینی لیے بولی۔ درانی مسکرایا۔

”سب اٹھالیتے ہیں، نیلوفر۔ ہم سب سالوں سے اٹھارہے ہیں۔ جانتی ہو، ہم عام عوام سے زیادہ مضبوط ہیں۔ یہ بوجھ تمہیں ہر مصیبت سے لڑنے کے لیے تیار کرے گا۔ تم ایک چٹان سے زیادہ سخت اور طوفان سے زیادہ خطرناک بن جاؤگی۔ تم ایک قدم تو بڑھاؤ۔ دنیا تمہارے سامنے سجدہ کرنے لگے گی۔“

نیلوفر قائل ہونے لگی۔ یہ دنیا اور کی باتیں اسے اچھی لگتی تھیں۔ اس میں کشش تھی۔ وہ ایک دفعہ اسے آزمانا ضرور چاہتی تھی۔ مگر اندر کہیں خلش رونما تھی۔

"مجھے سوچنے کا موقع دیجیے۔" نیلوفر اٹھ گئی۔

درانی کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ بکھری۔ وہ جانتا تھا اس کا آدھے سے زیادہ کام تو ہو چکا تھا۔

☆☆☆

حال میں واپس آتے ہیں۔۔۔

"ویڈیو بنانا شروع کرو۔" سُرخ بتیوں سے نہائے کمرے میں نیلوفر کی آواز گونجی۔

اس نے فرش بوس ہنٹر اٹھایا۔ آنکھوں میں دہشت سجائے وہ ان کی طرف لپکی۔ نوجوان کانپ اٹھے۔ مگر جسم میں اتنا دم نہ تھا کہ وہ مزاحمت کی کوشش بھی کرتے۔

نیلوفر نے ہنٹر برسانا شروع کیے۔ گھنٹے بھر کمرے میں چیخیں گونجیں۔ وہ مدد کے لیے پکارتے گئے۔ مگر جانتے نہ تھے کہ سارے آوازیں اس کمرے تک محدود تھیں۔ وہ کمرہ عقوبت خانہ تھا۔ موت کے سوا کسی صورت رہائی ناممکن تھی۔

وہ جس طرح سے ہنٹر برساتی، ان کی چیخیں سنتی، انتقام کی آگ پر ٹھنڈے پانی کا چھڑکاؤ ہوتا۔

یکبارگی چیخ و پکار رک گئی۔ خون میں نہائے نوجوانوں کا دم نکل گیا تھا۔ نیلوفر نے آہ خارج کی۔ چہرے سے ماسک اتارا۔

"ویڈیو سمیت لاشیں اس ڈاکٹر کو بھیج دینا۔" وہ چبا چبا کر بولی۔

اس کی پیشانی پسینے سے تر تھی۔ سانسیں پھول رہی تھیں۔ روح آج بھی مضطرب تھی، دل آج بھی غیر مطمئن تھا۔ اس نے ہاری ہوئی سانس خارج کی اور کمرے سے رُخصت ہو گئی۔

☆☆☆

جو آنکھیں خواب دیکھتی ہیں۔ وہی آنکھیں سب سے حسین ہوتی ہیں۔

مناج اپنی آنکھوں میں خواب سجائے سڑک کنارے چل رہی تھی۔ موسم سرد تھا۔ سورج کی کرنیں جاندار نہ تھیں۔

درِفشاں اس کے ہم قدم، آئیس کریم کھا رہی تھی۔

"حرر میرا وہ خواب تھا، جسے میں دیکھ کر بھی جھٹلا رہی تھی۔"

بھوری رنگت والی مناج کچھ بدلی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے کی کھال ترو تازہ تھی۔ اس نے صاف ستھرا بنفشی جوڑا پہنا ہوا تھا۔ پشمینہ شال سے کندھوں کو ڈھکا ہوا تھا۔

"مجھے لگتا ہے جیسے زندگی بدل گئی ہے، درے۔ مجھے سانسیں لینے میں دشواری ہوتی تھی۔ حرر نے اس رکاوٹ کو دور کر دیا۔" چہرے پر پھیکی مسکراہٹ تھی۔

درِفشاں فرصت سے اپنی دوست کو سن رہی تھی۔

"میں نے کہا تھا۔ جب تم کوئی مشغلہ تلاش کرو گی تو غم چھوٹے ہونے لگیں گے۔" سڑک پر گاڑیاں رواں تھیں۔ ٹریفک کا شور ان کے کانوں سے ٹکرایا۔

”غم اپنے آپ میں بری چیز نہیں، مناج۔ انسان کا اپنے غم کے ساتھ برتاؤ غم کو اچھا یا برا بناتا ہے۔
“

مناج نے سر کو جنبش دی۔

وہ دونوں ایک زیرِ تعمیر عمارت کے پاس موجود تھے۔ اندر سے مشینوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مناج نے اس عمارت کو آنکھوں میں الوہی چمک لیے دیکھا۔

”جلد یہاں حرر کا بورڈ ہو گا۔ جلد ہم سب جمع ہوں گے۔ ہم سب ظالم کی فوج کے خلاف لڑیں گے۔“ آواز میں جان بھری ہوئی تھی۔

عمارت کے اندر مزدور کام کر رہے تھے۔ ریسیپشن تعمیر ہو رہا تھا۔ ایک لکڑی کی میز کے اوپر بڑا سا کاغذ پھیلائے حسام کھڑا تھا۔ مناج نے ارد گرد نظر گھمائی۔

”تم نے جس کزن کا بتایا تھا سوشل میڈیا کے لیے، وہ آیا نہیں؟“ مناج نے بھنویں اکھٹا کیے پوچھا۔

”اف خدایا۔ پہلے دن ہی بونگے نے ناک کٹوا دی۔ میں اسے میسج کرتی ہوں۔“ اس نے پرس سے موبائل نکالا۔

”جب تک وہ آئے، میں حسام سے بات کر کے آئی۔“

درِ نے نظر اٹھا کر اس مرد کو دیکھا۔ اس نے پینٹ شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ پیٹ ذرا سا نکلا ہوا تھا۔ آنکھوں پر چشمے تھے۔

''یہ کون ہیں؟'' اس نے آنکھیں چھوٹی کیے پوچھا۔

''معمار ہیں۔ حرر کا انٹیر یئر یہی ڈیزائن کر رہے ہیں۔ کسٹڈی کیس آیا تھا میرے پاس، تب سے اچھی واقفیت ہو گئی تھی۔''

درے نے سر جھٹکتے فون کان سے لگا لیا۔ مناج حسام کی طرف بڑھ گئی۔

''کون سی ضروری بات کرنی تھی، حسام۔'' ہمیشہ کی طرح وہ سید ھا مدعے پر کود گئی تھی۔

حسام نے کاغذ کی طرف اشارہ کیا۔ مناج نے اسے بغور دیکھا۔ اس پر حرر کا نقشہ بنا ہوا تھا۔

''اتنی دیر کیوں لگائی تم نے؟'' پیچھے سے اونچی زنانہ آواز گونجی۔

حسام نے مڑ کر دیکھا۔ مناج اب تک اس کاغذ میں سر کیے ہوئے تھی۔

چشمہ پہنی عورت کسی جوان لڑکے سے کلام ہو رہی تھی۔ ماتھے پر مصروفیت کے بل تھے اور چہرے پر تشویش۔

''انٹرویو والے دن ہی لیٹ ہو گئے؟ ویسے تو آئے دن جاب کی درخواستیں کرتے تھے۔'' وہ اسے لتھاڑ رہی تھی۔ حسام کو اندر ہی اندر ہنسی آئی۔

''جی حسام۔ اس میں کیا دکھانا چاہ رہے ہیں۔'' مناج کی مشینی آواز نے اس کی توجہ مرتکب کی۔

حسام سر جھٹکتے دوبارہ نقشے کی طرف متوجہ ہوا۔

”دراصل میں جانتا ہوں کہ حرر ایک خطرناک کام کرنے لگا ہے۔ ہیومن ٹریفکنگ اور طرح طرح کے جرائم پر پردہ اٹھانا۔ تو میں نے سوچا ہے کہ کیوں نہ حفاظتی اقدامات کے طور پر ایک بنکر بنوایا جائے۔“ حسام نے تجویز پیش کی۔

مناج نے ہاتھ باندھتے سر کو جنبش دی۔

”یہ تمہارے پیر پر کیا ہوا ہے؟“ وہ پھر پیچھے مڑا۔ درِفشاں پنجوں کے بل بیٹھے اس لڑکے کی ایڑی کا معائنہ کر رہی تھی۔

”یہ خیال مجھے پہلی کیوں نہ آیا۔“ مناج کا انداز تائیدی تھی۔

اس نے واپس مڑ کر نہ دیکھا۔ لمحے بھر کو بس ٹھہر کر درِفشاں کو تکتا گیا۔

”تم لڑکوں کا مسئلہ کیا ہے؟ تمہارا ایکسی ڈینٹ ہوا ہے اور تم مجھ سے اتنی ڈانٹ کھانے کے بعد بتا رہے ہو؟“ وہ برہمی سے اسے لتھاڑتے ہوئے کرسی پر بٹھا رہی تھی۔

”بنکر فائر پروف ہو گا۔ اور وینٹی لیشن بھی ہو گی۔“ وہ درِفشاں کی دشا میں دیکھتے خواب سی کیفیت میں کہہ رہا تھا۔

درِفشاں اس لڑکے کو پانی پلا رہی تھی۔ چہرے پر برہمی اور فکر مندی کی لکیریں تھیں۔

”تکلیف بتانے سے ہم کمزور نہیں ہو جاتے ہیں، فارس۔ تمہیں درد ہو رہا تھا، تمہیں بتانا چاہیے تھا۔ میرے ڈانٹنے سے پہلے تمہیں کہہ دینا چاہیے تھا کہ تمہارا ایکسی ڈینٹ ہوا ہے۔“ برہمی فنا ہو گئی۔

”اس کے علاوہ کچھ شیلفز ہوں گے۔ جو کہ چھپے ہوئے ہوں گے۔ وہاں رازداری کا سامان رکھا جا سکتا ہے۔“ وہ اب تک کھویا ہوا تھا۔ اس عورت کی شخصیت میں کوئی اچھوتی چیز تھی۔ وہ چاہ کر بھی اس سے نظریں نہیں پھیر پا رہا تھا۔

”انسان کو اپنے حق کے لیے بولنا آنا چاہیے۔ اپنا مدعا سب سے پہلے رکھنا چاہیے۔ یہ دنیا خاموش انسانوں کے لیے عذاب ہے۔“

اب کہ مناج نے بھی اس کی آواز میں بدلاؤ محسوس کیا۔ وہ پیچھے مڑی۔ اس نے اس مرد کو اپنی دوست کو گھورتے ہوئے پایا۔

”شیلفز میں پانی، اور ٹن فوڈ بھی ہو گا۔ ہنگامی صورتحال میں ایک ہفتے تک بنکر میں باآسانی سروائیو کیا جا سکتا ہے۔“

مناج کے لبوں پر شریر مسکراہٹ تیر گئی۔

”اب تم ایک کام کرو۔ ہسپتال جاؤ پہلے۔ میں نے خون صاف کر دیا ہے۔“ وہ پاؤں پر پٹی کرتے ہوئے بولی۔

”درے آپا اب اس کی کیا ضرورت ہے۔ خون رک تو گیا ہے۔ ویسے بھی کوئی اتنا بڑا حادثہ نہیں تھا جو آپ گھنٹے سے مجھے سنائی جا رہی تھیں۔“ فارس اکتا کر بولا۔

حسام کی آنکھوں میں الوہی چمک اتری۔

درے کمر پر ہاتھ جمائے کھڑی ہوئی۔

"تمہارے پاؤں کی سڑک سے رگڑ ہوئی ہے۔ جاؤ جا کر ٹیٹنس کا انجیکشن لگوا کر آؤ۔" اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

"درے آپا۔۔۔" وہ تڑپ کر احتجاج کرنے لگا۔

درے نے اسے کھا جانے والی گھوری سے نوازا۔

"میں نے کہا جاؤ۔ شاباش۔ چلو۔ پانچ منٹ لگیں گے۔" اب نرمی سے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔

فارس احتجاج روک کر اٹھ کھڑا ہوا اور چلا گیا۔ درِفشاں نے سکون کی سانس خارج کی۔

"وہ درِفشاں ہے۔" مناج کی آواز نے حسام کو چونکایا۔

وہ شرمسار ہوا۔ وہ نہ جانے کتنی دیر سے اس اجنبی کو دیکھ رہا تھا، نہ صرف یہ، اس کی کلائینٹ جانتی تھی۔ اوہ خدایا۔ اس کا اپنا سر دیوار پر مارنے کا جی چاہا۔

"وہ ایسی ہی ہے۔ کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر فکرمند ہو جاتی ہے۔" مناج مسکراہٹ لبریز آواز میں بولی۔

"پتا نہیں اس نے زندگی میں کتنا وقت تکلیف میں کاٹا ہوگا، وہ بھی تنہا۔ کہ اب وہ کسی دوسرے کو پریشان نہیں دیکھ سکتی۔ لوگ کہتے ہیں زخمی زخم دیتا ہے۔ میں درِفشاں کو دیکھ کر کہتی ہوں کہ زخمی مرہم دیتا ہے۔"

مناج نے سانس خارج کی۔ حسام نے مڑ کر اسے دیکھا۔ شرمساری زائل ہو چکی تھی۔

"بہر حال ہم کام کرنے آئے تھے۔ اس پر لوٹ جائیں؟"لبوں پر پیشہ ورانہ مسکراہٹ سجائے گویا ہوئی۔

حسام نے دل کی رفتار کو نظر انداز کیے کاغذ کی طرف رُخ کیا۔ ذہن میں اب تک اس عورت کا سراپا ابھر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر باغیچے کے کسی پھول کا گمان ہوتا تھا۔

"مجھے آپ کی تجویز بھلی معلوم ہوئی۔ آپ اس پر کام شروع کر دیں۔" مناج نے کہا۔

حسام نے سر کو خم دیا۔

"مس مناج، میں آپ سے ایک اور بات بھی کرنا چاہتا ہوں۔" وہ چھوٹتے ہی بولا۔

مناج نے سر کو جنبش دی۔

"کیا میں بھی حرر میں کام کر سکتا ہوں؟"

وہ جواب طلب نگاہوں سے مناج کا جائزہ لینے لگا۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد مناج کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری۔

☆☆☆

یہ چھے سال پہلے کا منظر ہے۔۔۔

نیلوفر کا سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ وہ اپنا سر ہاتھوں میں گرائے، کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔

دماغ میں درانی کے الفاظ گردش کر رہے تھے۔ اسے طرح طرح کے خدشات نے جکڑا ہوا تھا۔

نیلوفر نے سب کچھ جھڑکتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ اندھیرا پھیلا۔ پھر اس اندھیرے میں رنگین مگر کربناک منظر تیر گئے۔

وہ اس منظر میں چودہ سال کی تھی۔ وہ اپنے گھر کے باہر اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ کھڑی تھی۔ شدید غصے کے باعث اس کی رنگت سرخ ہو گئی تھی۔ وہ ہمیشہ سے ہی غصے کی تیز تھی۔ گھر کے دروازے پر دو بڑی عمر کے مرد کھڑے تھے جو اس کا راستہ روکے ہوئے تھے۔ وہ اس کے چچا تھے۔ اس کی آنکھوں میں ایسی کاٹ تھی جسے دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ وہ ان آدمیوں کا قتل بھی کر سکتی تھی۔

"تم لوگوں نے مجھ سے میری چھت چھینی ہے۔ میں تم سب کو بتا رہی ہوں، میں تم لوگوں کو آگ لگا دوں گی، میں تم سب کو برباد کر دوں گی۔" آنکھیں اشکبار تھیں۔ وہ اونچی آواز میں دھاڑی۔

مگر ان بے رحم انسانوں پر ان چیخوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ طاقت کے نشے میں دھت جو تھے۔

"ابو کے انتقال کے بعد تمہارے چچاؤں نے ان کی جائداد پر قبضہ کر لیا۔ تم نے اپنا حق مانگا تو تمہیں امی کے ساتھ گھر سے بے دخل کر دیا۔ تم اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ دربدر بھٹکتی رہی تھی۔ تم نے میڈیا سے، پولیس سے مدد کی بھیک مانگی۔ مگر کسی نے تمہارا ساتھ نہ دیا۔ نیلوفر، تمہارے اوپر ظلم کی شروعات تمہارے گھر سے ہوئی تھی۔"

حال کی نیلوفر خود کلام ہو رہی تھی۔ چہرے پر تکلیف کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔ اب بند آنکھوں کے پیچھے نیا منظر لہرایا۔

چودہ سالہ نیلوفر پولیس اسٹیشن میں کھڑی تھی۔ انسپیکٹر عادل اپنی کرسی پہ لمبی تان کر بیٹھا تھا۔ دفعتاً وردی پوش خاتون نیلوفر کی ماں کا بازو تھام کر اسے باہر لے کر آئیں۔ ان کے چہرے پر لاتعداد نشانات تھے۔ چال بوجھل تھی۔

چودہ سالہ نیلوفر وہ منظر دیکھتے ہی شل رہ گئی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔

"تم دونوں ماں بیٹی کو اپنا سبق سیکھ لینا چاہیے۔" عادل تمسخرانہ انداز میں تبصرہ کرنے لگا۔ "اب کوئی احتجاج کرنے کا سوچنا بھی مت۔ بہت برا حال ہوگا۔"

نیلوفر کی آنکھوں میں سرخی در آئی۔ عادل نے اس لڑکی کو تعجب سے دیکھا۔ لمحے بھر کو اسے وحشت محسوس ہوئی۔ "یہ کیا تم نے میری ماں کے ساتھ؟" وہ حلق کے بل چلائی۔

وہ پھرتی سے عادل کی طرف بڑھی۔ اس کی میز پر دونوں ہاتھ پوری قوت سے دے مارے۔ تمام اشیاء کپکپا اٹھیں۔ کچھ تھا اس لڑکے کی انداز میں جو عادل کو خوف میں مبتلا کر گیا۔

"آج میں مجبور ہوں، مگر وعدہ رہا ہمیشہ مجبور نہیں رہوں گی۔ میں واپس آؤں گی۔ میں تمہیں تمہارے زوال تک پہنچاؤں گی۔" وہ انگلی اٹھا کر اسے متنبہ کرنے لگی۔

"تم تھک ہار کر میڈیا کے پاس گئی۔ ایک معمولی چینل نے تمہاری مدد کرنا چاہی۔ تم نے احتجاج کیا۔ مگر ان ظالموں نے اس دو ٹکے کے انسپیکٹر کی مدد سے تمہاری ماں کو گرفتار کر لیا۔ اسے پیٹا۔ تمہیں انصاف کے نام نہاد نمائندوں سے بھی انصاف نہ مل سکا۔" اس نے اونچی آواز میں کہہ کر اپنی یادداشت تازہ کی۔

اب ایک نیا منظر ابھرا۔

"میری ماں کو بچالیں، پلیز۔ وہ مر رہی ہیں۔" وہ ہسپتال میں موجود تھی۔

وہ ہاتھ جوڑے کھڑی تھی۔ آنکھوں سے مسلسل اشک بہہ رہے تھے۔ ماں کو کھو دینے کے خوف نے اسے اپنی عزتِ نفس کچلنے پر مجبور کیا۔

مگر وہ ڈاکٹر اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ بے دردی سے اس سسکتی ہوئی لڑکی کو دیکھتا گیا۔

"آپ ان کے اخراجات نہیں اٹھا سکتیں۔ آپ انہیں کسی اور ہسپتال لے کر جائیں۔" ظالم ڈاکٹر سرد انداز میں بولا۔

"بہت دیر ہو جائے گی۔ بہت خون بہہ گیا ہے ڈاکٹر، ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔"

اسے تضحیک محسوس ہوئی۔ زندگی کی سختیوں نے اسے فقیر بنا دیا تھا۔

"ہم کچھ نہیں کر سکتے۔" ڈاکٹر بے نیازی سے کہہ کر مڑ گیا۔

"تم لوگ غارت کیوں نہیں ہو جاتے۔"

نیلوفر حلق کے بل چلائی تھی۔ وہ واپس مڑا۔ چہرے پر ناگواری تھی۔

"دیکھو لڑکی، تماشا نہ کرو۔" ڈاکٹر نے نیلوفر کا بازو تھام کر چبا چبا کے کہا۔

"مجھے سمجھ نہیں آتا وہ جو بڑا انصاف پسند بنا پھرتا ہے۔ وہ جو ہم سب کا رب بنا پھرتا ہے، اس کا عذاب تم جیسے درندوں پر کیوں نہیں نازل ہوتا؟ تم لوگ کیوں نہیں جل کر راکھ ہو جاتے؟ آخر ہم ہی کیوں تم جیسوں کی ماریں کھائیں؟" نیلوفر نے اپنا بازو اس ڈاکٹر کی گرفت سے آزاد کیا۔ وہ غصے کے مارے کپکپا رہی تھی۔ دوپٹہ سر سے سرک کر زمین پر گرا۔

”گارڈ، اسے اور اس کی ماں کو نکالو یہاں سے۔ اب تو مر کر بھی اس کی ماں کو داخلہ نہیں دوں گا۔“ ڈاکٹر کی انا پہ چوٹ لگ گئی تھی۔

گارڈز نیلوفر کی طرف بڑھے، وہ نیلوفر کو بازو سے تھام کے لے کر جانے لگے۔

”میں تم لوگوں کے زوال کی ذمہ داری لیتی ہوں۔ آج تم نے میرا خاندان چھینا ہے، میں ایک دن تمہارے خاندان کو تباہ کر دوں گی۔“ گارڈ اسے گھسیٹ کر باہر لے گیا۔

منظر تحلیل ہوا۔۔۔ دل جیسے نچوڑنے لگا تھا۔۔۔ درد بھری لہریں ابھریں۔

اس سے رہا نہ گیا اور وہ رو دی۔ بغیر کسی آواز کے۔

”اور تمہاری ماں اس معاشرتی نظام کے ہاتھوں ماردی گئی۔ وہ ڈاکٹر آج تک ہنسی خوشی رہ رہا ہے۔ اسے بھی قدرت نے کوئی سبق نہ سکھایا۔ کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کے تم بھی اس کے سامنے اس کے اپنوں کو مارو؟ تڑپا تڑپا کر؟ اسے بھی ویسی ہی تکلیف ہونی چاہیے جو اس دن تم نے محسوس کی تھی۔“ نیلوفر کی آنکھیں شعلہ باز ہونے لگیں۔ دل میں بھڑکتی انتقام کی آگ شاہانہ ہو گئی۔

”تم اس معاشرے کے ہاتھوں پستی رہی ہو۔ کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ تم اس خود ترسی کی زندگی سے نکل جاؤ؟ تم صرف اس خدا کے بھروسے کیسے جی سکتی ہو جس نے تمہارا کبھی ساتھ نہ دیا؟ اس نے تمہارا سب کچھ چھین لیا ہے، نیلوفر۔ مگر اب اور نہیں، اب تمہیں بھی اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہو گا۔ تمہیں بھی طاقت حاصل کرنی ہو گی۔ یہ موقع تم ضائع نہیں کر سکتی نیلوفر۔“ نیلوفر کا دماغ بن چکا تھا۔ آنکھوں میں جست و جنون لیے، وہ کھڑی ہوئی۔

سائیڈ ٹیبل سے موبائل اٹھایا اور درانی کو کال ملائی۔

وہ تیار تھی، پہاڑوں سے زیادہ مضبوط بننے کے لیے، طوفان سے زیادہ خطرناک بننے کے لیے۔اس کے لیے نفس کو آف میں جھونک دینا منظور تھا۔

”مسٹر درانی، میں تیار ہوں۔“ وہ شعلہ باز انداز میں بولی۔

”کل صبح جلدی آجانا۔ تمہارے اقتدار کا وقت، ہوا چاہتا ہے۔۔۔“



حال میں واپس آتے ہیں۔۔۔

احمد کے آفس کے پرسکون سے ماحول میں ذرا سا تناؤ حائل تھا۔

وہ آنکھوں میں تفتیشی تاثر سجائے اپنی بہن کو گھور رہا تھا۔ جو مجرموں کی طرح یہاں وہاں دیکھ رہی تھی۔ ہر طرف کافی کی مہک گھلی ہوئی تھی۔

”صاف صاف بتاؤ، کیوں آئی ہو۔“ احمد نے کسی بڑے افسر کی طرح کہا۔

درے آنکھیں ملائے بغیر مسکرائی۔

”بریانی دینے۔“ میز پر پڑے بریانی کے ڈبے کی طرف اشارہ کیا۔

”کیا اتنا بھی نہیں کر سکتی؟“ احمد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور معصومیت سے کہا۔

احمد کی آنکھوں میں عجیب کاٹ تھی۔

”کون سا کام نکلوانا ہے؟ صاف صاف بتاؤ۔ تم بغیر مطلب کے اتنی مہربان کبھی نہیں ہوتی، آپا۔“ وہ اب تک تنکا ہوا تھا۔

دِرفشاں نے ہاری ہوئی سانس خارج کی۔ پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا۔

”ارے ہاں!“ وہ یکدم بولی۔ اس نے پرس کھولا اور چند تصایر نکالیں۔ تصاویر احمد کی میز پر رکھیں۔

احمد نے سرسری نگاہ ان پر ڈالی۔ وہ لڑکیوں کی تصویریں تھیں۔ اس نے بھنویں اکھٹا کیے ترنت نظر اٹھالی۔

”تمہیں بتایا تھا نا، افشہ خالہ سے تمہارے رشتے کی بات کی تھی۔ یہ کل ہی مجھے ملی ہیں۔ میں نے چھان بھین کی ہے، اور سب ویسی ہی ہیں جیسی تمہیں پسند ہیں۔“

اب کی بار احمد غیر آرامدہ ہوا۔ اسے نہ جانے کیوں اس موضوع سے بےزاری محسوس ہوئی۔ پہلے تو کبھی نہ ہوئی تھی؟ نہ جانے کیوں۔

”مجھے ان میں سے کسی میں دلچسپی نہیں۔ تم سب لے جاؤ۔“ وہ صاف گوئی سے کہتے، اپنے لیپ ٹاپ کی طرف نظریں جمائے کچھ ٹائپ کرنے لگا۔

”ارے۔ دیکھ تو لو۔ پوچھ تو لو کہ کرتی کیا ہیں اور کیا نہیں۔ کل تک تو تم شادی کرنا چاہتے تھے۔ اب کیا ہوا ہے؟“ دِرفشاں تشویش میں مبتلا ہوئی۔

”مجھے ان میں سے کسی میں دلچسپی نہیں۔ میں نے کہا نا۔“ وہ دِرفشاں سے بری طرح اکتا چکا تھا۔

درِفشاں نے مایوسی سے تصاویر سمیٹیں۔

”کیوں؟ کسی اور سے تو محبت نہیں کر بیٹھے؟“

ٹائپنگ کرتا ہاتھ اپنی جگہ تھم گئی۔ چہرے کا تناؤ زائل ہوا۔ اس لفظ ”محبت“ پر ایک چہرہ ابھرا۔ سیاہ آنکھوں والا دلکش چہرہ۔ دل نے رفتار پکڑلی۔ جسم کے بال کھڑے ہونے لگے۔ یکبارگی اپنے تنہا ہونے کا احساس ہوا۔ محرومی کے احساس نے اندر ہی اندر جوش لیا۔

”احمد بتاؤ۔ کوئی اور پسند ہے؟“ درِفشاں کی آواز نے اسے چونکایا۔

اور وہ چونک ہی تو گیا تھا۔ وہ کب سے وقت بے وقت یوں کسی اور کے بارے میں سوچنے لگ گیا؟

”بس کر دو آپا۔ نہیں کرنی شادی۔ اب شادی کی بات مت کرنا۔ بس۔“ وہ چڑچڑا کر بولا۔

درِفشاں نے ہاری ہوئی سانس خارج کرتے تصاویر پرس میں ڈالیں۔

”اچھا، میرا ایک کام تو کر دو، کم از کم۔“ وہ پلکیں جھپکاتے معصومیت سے بولی۔

اب آیا ناں اونٹ پہاڑ کے نیچے۔ احمد نے دل ہی دل میں سوچا۔

ہاتھ باندھ کر، لبوں پر مسکراہٹ سجائے درے کو دیکھا۔

”تمہارا بچپنا کب جائے گا؟ اتنا وقت برباد کرنے کے بجائے تم سیدھا کہہ سکتی تھی۔ بس ڈرامے بازی کروالو۔“ وہ برہم تھا۔

درے شرمسار ہوئی۔ اب فطرت کا تو کچھ نہیں کیا جا سکتا ناں۔

”اچھانا۔ اب سنو۔ مجھے دو ہیکرز لا دو۔“ وہ پر امید ہو کر بولی۔

احمد کو حیرت کا جھٹکا لگا۔

”کس خوشی میں؟“

”میری دوست ہے۔ مناج۔ اس نے ایک تنظیم کھولی ہے۔ ”حرر“۔ یہ تنظیم آرگن مافیا کے خلاف کام کرے گی۔ اس لیے کچھ کاروائیوں کے لیے دو ہیکرز درکار ہیں۔“

احمد کی حیرت فنا ہوئی۔ وہ کسی سوچ میں کھو گیا۔

”تمہیں معلوم ہے وہ آخر کرنے کیا والی ہے؟“ اس نے بظاہر لاتعلقی سے پوچھا۔ اندر ہی اندر کھلبلی مچ گئی تھی۔

”زیادہ نہیں۔ مگر کوئی آپریشن وغیرہ کرنا ہے۔“

احمد نے سر کو جنبش دی۔ ٹھوڑی کے اوپر ہاتھ حائل کیا۔

”بتاؤ احمد۔ بندوبست کر دو گے نا؟“

احمد نے سر اثبات میں ہلایا۔ درے نے پر سکون سانس خارج کی۔

”تمہارا بہت بہت شکریہ۔ اف، میں ابھی مناج کو بتا کر آئی۔“ وہ تقریباً چلاتے ہوئے کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔

احمد مسکرا کر اسے دیکھے گیا۔

وہ جو دنیا کے لیے سمجھدار اور پختگی کی اعلیٰ مثال تھی، اپنے بھائی کی نظر میں دنیا کی احمق ترین عورت تھی۔

☆☆☆

نیلی ویگن رات کے اندھیرے میں سنسان علاقے میں چل رہی تھی۔ نیلوفر کھڑکی سے باہر، جھاڑ تنکوں کو تک رہی تھی۔ چہرے پر سفاک تناؤ حائل تھا اور آنکھوں میں چمک۔

"ڈاکٹر کے بیٹے کی لاشیں پہنچ گئیں؟" نیلوفر نے شمس سے پوچھا۔

اس نے ذہن پر ڈاکٹر کے چہرے کو تصور کیا۔ کیا اس کا بھی وہی عالم ہوا تھا جیسا سالوں پہلا اس کا ہوا تھا؟ وہ سوچنے لگی۔

"ہاں۔ اس نے پولیس میں رولے ڈالے۔ مگر آپ جانتی ہیں وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

ریئر ویو مرر سے نیلوفر کے چہرے کو تکتے ہوئے بولا۔ نیلوفر کو خوش دیکھ کر وہ بھی خوش تھا۔

ویگن فیکٹری کے پاس رک گئی، جو وسیع رقبے پر بنی ہوئی تھی۔ فضا میں جنگلی جانوروں کی آوازیں رقصاں تھیں۔

نیلوفر کا دل زور سے دھڑکا۔ انتقام کی حس پھر بیدار ہوئی۔ آگ نے اسے لپیٹ میں لیا۔

"گارڈز کو خرید لیا تھا۔ یہاں کوئی نہیں۔ اب چلیں ہم؟" شمس نے پیچھے مڑ کر پوچھا۔

وہ سر کو جنبش دیتے گاڑی سے اتر گئی۔ ڈگی سے پٹرول کا کین نکالا اور شمس کے ساتھ میدان میں چلنے لگی۔ میدان کے بیچ و بیچ فیکٹری کی بلند و بالا عمارت کھڑی تھی۔

”ویسے نیلوفر، آپ نے بتایا نہیں کہ آپ اس فیکٹری میں آگ کیوں لگانا چاہتی ہیں؟“شمس کو تجسس ہوا۔

”یہ میرے باپ کی فیکٹری ہے۔ جس پر میرے چچاؤں نے ناجائز قبضہ کیا۔ میں ان کے خزانوں پر آگ لگانے آئی ہوں۔“ چہرے پر ایسی مسکراہٹ تھی جو دیکھنے والے کے دل میں دہشت پھونک دے۔

”آج نیلوفر کا انتقام مکمل ہو جائے گا۔“ وہ خود میں بولی۔ ”عادل ہسپتال میں سڑ رہا ہے۔ میرے چچا آج کے بعد سے سڑکوں کی خاک چھانیں گے۔ اور وہ ڈاکٹر، وہ تو بس پاگلوں کی طرح دربدر کی ٹھوکریں کھائے گا۔ نیلوفر کی طاقت لازوال ہے، شمس۔“ وہ کہہ کر زور سے ہنس دی۔

نیلوفر نے پیٹرول کا کین شمس کے حوالے کیا۔ اس نے فیکٹری کے گرد پیٹرول کا مائع چھڑک دا۔ جیب سے لائیٹر نکال کر نیلوفر کو تھمایا۔

نیلوفر نے لائٹر نظروں کے قریب کیے شعلہ بھڑکایا۔ لبوں پر سفاک مسکراہٹ رقص کر گئی۔ اس کی آنکھوں میں نارنجی شعلہ انعکاس ہوا۔

ہر طرف ہو کا عالم پھیل گیا۔ ہواؤں نے گزرنا ترک کر دیا۔

”آج چودہ سالہ نیلوفر کا انتقام پورا ہوا۔“ آواز میں دبا دبا جوش تھا۔

اس نے لائٹر فیکٹری کی جانب اچھالا۔ سطح پر بھڑکتے شعلے کی پیٹرول کے چند قطروں سے ٹکرار ہوئی۔ چنگاری ابھری۔ پھر چنگاریاں ابھریں۔ اور پھر چنگاریوں نے ایک ہونے کا فیصلہ کیا۔ وہ ایک دوسرے کے گلے سے لگتے آگ کی صورت اختیار کر گئیں۔ میدان میں زرد روشنیاں پھیل گئیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے زمین پر سورج کا ظہور ہو چکا تھا۔

نیلوفر نے اپنے ہاتھ پھیلائے اور آسمان کو تکا۔ آنکھیں بند کیں، اور دیوانہ وار ہنسی۔ اس کے قہقہوں نے عرش تک سفر طے کیا۔

"آج میں سکون کی نیند سو سکوں گی۔ میرا انتقام ختم ہوا!"

وہ ہنستی چلی گئی۔



یہ چھے سال پہلے کا منظر ہے۔۔۔

عافیتِ زندگی کی بیسمنٹ میں نیلوفر ایک نرس کے ساتھ آئی تھی۔ نرس نے بائیں طرف کے دروازے کی طرف اشارہ کیا اور مڑنے لگی۔

"ایک سیکنڈ۔ آپ مجھے بتا نہیں سکتی وہاں کیا ہو رہا ہے؟" اے سی کی باعث فضا یخ بستہ تھی، مگر پھر بھی وہ پسینے میں بھیگ چکی تھی۔

دوزخ قریب جو تھی۔ دوزخ کی تپش اس تک پہنچ چکی تھی۔

"یہ ممکن نہیں۔" نرس نے گردن نفی میں ہلائی۔ "ہم وفادار ہیں۔ آپ کو خود یہ راز جاننا ہو گا۔ ہمیں آپس میں بھی اس راز کے بارے میں بات کرنے کی اجازت نہیں۔" وہ مڑ گئی۔

اس سے پہلے نیلوفر مزید باز پُرس کرتی وہ لفٹ میں سوار ہو گئی۔

نیلوفر نے وحشت سے اس دروازے کو دیکھا۔ حلق بری طرح خشک تھا۔ ایک ایک قدم بڑھانا وبالِ جان تھا۔ دل سے آواز نکلی، کہ اسے بھاگ جانا چاہیے۔ لیکن پھر دماغ نے دل کی ہر پکار کی نفی کی۔ وہ کیوں بھاگے؟ وہ کیوں انتقام کی راہ کو نہ چنے؟

وہ چلتی گئی۔ کسی ٹرانس میں۔ ذہن پر دباؤ بڑھتا جارہا تھا۔

دروازہ اس کے ماتھے کو چھو رہا تھا۔ وہ بت بنی کھڑی تھی۔ اس نے سرد ناب پر ہاتھ جمایا۔ ریڑھ کی ہڈی میں ٹھنڈ پہنچی۔ ایک جھٹکے میں دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہو گئی۔

وہ خون آلود منظر دیکھ کر نیلوفر کے اوسان خطاء ہوئے۔ سانسیں گہری ہوئیں۔ وہ پوری قوت سے چلانا چاہتی تھی، مگر وہ آواز کھو بیٹھی۔ وہ بھاگ جانا چاہتی تھی، مگر پاؤں حرکت کرنا بھول چکے تھے۔

وہاں سٹریچر تھا۔ جس پر ایک آدمی کی لاش تھی۔ جسم کٹا ہوا تھا۔ درانی اس کے سینے کے اندر ہاتھ ڈال کر دل نکال رہا تھا۔ نیلوفر کو متلی آنے لگی۔

"تو تم آگئی، نیلوفر۔" بھاری زنانہ آواز نے اسے بیدار کیا۔

اس نے خوف سے کپکپاتے ہوئے گردن موڑی۔ لیڈی اقتدار ہاتھ باندھے کھڑی، اس کا معائنہ کر رہی تھی۔

"درانی نے تمہارے بہت گن گائے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا یہاں کیا ہوتا ہے؟" وہ سفاک سا مسکرائی۔

نیلوفر نے گردن نفی میں ہلائی۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے۔

لیڈی اقتدار اس کے عین سامنے پہنچی۔

”نہ۔۔۔نہ۔۔۔ نیلوفر۔ پیچھے ہٹ جانے کی سوچ بھی تم پر حیران ہوئی۔“ وہ پر سکون سے انداز میں بولی۔

آنسو فرش پر ٹپ ٹپ برس رہے تھے۔

”اس دنیا سے نجات حاصل کرنے کا صرف ایک رستہ ہے۔“لیڈی اقتدار نیلوفر کے کان کی طرف جھکی۔

”موت!“

نیلوفر کی روح کانپ اٹھی۔ اور اس لمحے نیلوفر کو اندازہ ہوا کہ اس نے کتنی بڑی غلطی کر دی تھی۔

☆☆☆

نیلوفر کے قصر کے چاروں اور خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ سبزہ زار پار کرتے ہوئے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا بدن سے ٹکرایا۔ اس کی ہڈیوں میں ٹھنڈ اتری اور کپکپی چڑھی۔

لاؤنج میں اس نے لاپرواہی سے بیگ اچھال دیا اور تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتے اپنے کمرے میں بند ہوئی۔ دروازے سے ٹیک لگائے وہ آنکھیں بند کیے کھڑی ہو گئی۔ آنکھیں کھولیں تو ان میں ڈھیروں پانی بھرا ہوا تھا۔

”تم مطمئن کیوں نہیں ہوتی، نیلوفر؟“ وہ بے یقینی کے عالم میں خود کلامی کرنے لگی۔

”چھے سال پہلے تم جرائم کی دنیا کی قیدی بنی۔ چھے سال نیلوفر۔۔۔“ وہ اونچی آواز میں خود کو یاد دلانے لگی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے روانہ ہوئے۔

”تم اس دنیا کی عادی کیوں نہیں ہو جاتی؟ نہ بھولو کہ واپسی ناممکن ہے۔ تمھیں اس دنیا کی سیاہی میں خوشی تلاش کرنی تھی۔“

اس کی آنکھوں کے سامنے چھ سالوں کا وقت گزرا۔ اس نے سیاہی کا عادی بن جانے کے لیے پے در پے جرائم کیے۔ اس زعم میں کہ ایک دن وہ ان تاریکیوں میں اطمینان حاصل کر لے گی۔ مگر چھ سال بعد بھی وہ اس مقام پر کھڑی تھی جہاں چھ سال پہلے تھی۔

وہ دیوار پر لگے فریم کے سامنے کھڑی تھی۔ فریم میں نیلوفر کی ماں نور بیگم کی تصویر تھی۔ ان کے نقش ہو بہو نیلوفر جیسے تھے۔ وہی ستواں ناک، بھرے بھرائے لب اور تراشیدہ پرکشش نقوش۔ یکبارگی ذہن میں ایک بھولی بسری یاد نے زور لیا۔ وہ اس یاد میں پوری طرح کھو گئی۔

تیرہ سالہ نیلوفر اپنے گھر میں موجود۔ گھر جس پر لٹیروں نے قبضہ کر لیا تھا۔ بستر پر نور بیگم لیٹی تھیں۔ ماتھے پر ایک زخم تھا۔ وہ روئی کی مدد سے ان کے زخم پر مرہم لگا رہی تھی۔ یکبارگی نور بیگم سسکیں۔ نیلوفر کو دل دکھنے لگتا۔ چہرے پر جہاں غم تھا وہاں آنکھیں انتہاء کی غصیلی۔

”نیلوفر۔ تم تو ابھی سے ہی کافی اچھی ڈاکٹر بننے لگی ہو۔“ وہ ماں تھی۔ نیلوفر کے چہرے پر کرب نہ دیکھ سکیں اور اس کا دل ہلکا کرنے کے لیے بول اٹھیں۔

”آپ دیکھیے گا بس۔ میں بہت بڑی ڈاکٹر بنوں گی۔“ ذہن کے پردے پر ایک خوشگوار تصویر ابھری۔ ڈاکٹرز کوٹ پہنی ہوئی نیلوفر، جو نرس کو حکم دے رہی تھی۔ وہ بے اختیار مسکرا دی۔

”اور تم ٹھیک اسی طرح میری مرہم پٹی کروں گی۔“ اس مسکراہٹ نے جیسے سارے زخموں کو بھر دیا تھا۔ اب کسی مرہم کی ضرورت نہ تھی۔

نیلوفر خائف ہو گئی۔

”اللہ نہ کرے اس وقت بھی ہم ان جاہلوں کے ساتھ ہوں۔ بس میں اپنے پیروں پر کھڑی ہو جاؤں پھر آپ کو یہاں سے لے جاؤں گی۔“ وہ جلد بھڑک جاتی تھی۔

”اور پھر؟“

”پھر ان جنگلی جانوروں پر کیس کر کے اپنا گھر واپس لوں گی۔“

نور بیگم مدھم سا ہنس دیں۔

”اور پھر؟“ وہ نیلوفر کے انداز سے محظوظ ہو رہی تھیں۔

”پھر میں ایک اچھی ڈاکٹر بنوں گی، جو ہماری جیسی عورتوں کا خیال رکھتی ہے۔ میں ہمارے معاشرے کی عورتوں کا کندھا بنوں گی، جو نہ جانے کیسے کیسے جبر برداشت کر رہی ہیں۔“

نور بیگم پورے دل سے مسکرا دی۔ انہیں نیلوفر پہ فخر محسوس ہوا۔

”تم میرا نام روشن کرو گی نیلوفر، مجھے یقین ہے۔“ وہ نرمی سے بولیں۔ نیلوفر کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ نیلوفر روئی کا گولا کوڑے دن میں اچھال کر بستر پر لیٹ گئی اور ان سے چمٹ گئی۔

”تم مستقبل میں میرے لیے باعثِ فخر بنو گی۔ مجھے رب پر یقین ہے۔“ مشفق انداز میں بیٹی کا ماتھا چھوما۔

"مجھے بھی یقین ہے۔" ماں کے آغوش میں صرف سکون محسوس ہوتا تھا۔ تلخیاں کچھ لمحے کے لیے زندگی کے در نہیں کھٹکھٹاتیں۔

وہ رو رہی تھی۔ اس کا رونا بنتا تھا۔ خواب ٹوٹ جائیں تو آنکھوں کی سمت آنسوؤں کی صورت بہتے ہیں۔ وہ ڈاکٹر بن گئی تھی، وہ نرسز پر حکم صادر بھی کرتی تھی۔ مگر اچھی، بس وہ یہی نہ بن سکی۔ چھ سال پہلے جس دلدل میں قدم رکھ چکی تھی، آج تک اس کے داغ وجود سے مٹا نہیں سکی تھی۔ نہ جانے کتنے سالوں کا خمیازہ بھگتنا باقی تھا؟

پوری دنیا کے لیے جو مغرور، بگڑی ہوئی اور خود پسند تھی، در حقیقت اس قدر گھناؤنے عذاب کو جھیل رہی تھی۔

کوئی نیلوفر کے اصل سے واقف نہ تھا!

☆☆☆

مہر آفس کی ریسپشن پر کھڑی کسی مرد ایمپلائی سے کلام ہو رہی تھی۔ عین اسی وقت اس کا موبائل تھرتھرایا۔ وہ چوکنا ہو گئی۔ رنگ ٹون احمد کی طرف سے بھیجے جانے والے فون کی تھی۔ اس نے آئیں بائیں باتیں کیں اور ایمپلائی سے جان چھڑائی اور موبائل نکالا۔ وہاں احمد کا میسج تھا۔

"آپ کے آفس میں انتظار کر رہا ہوں۔"

مہر کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔ یہ کیسے ممکن تھا؟

وہ کمرے میں آئی تو حیران رہ گئی۔ وہ ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اس نے سفید کی شرٹ پہنی تھی، آنکھوں پر چشمہ تھا، سر پر پی کیپ اور چہرے پر سفید ماسک۔ اس کے چہرے کا دیدار بھی نہ ہوا تھا، کہ مہر کے چہرے کا تناؤ ڈھیلا پڑ گیا۔

"حیران ہو گئیں؟" اس نے چشمہ اتار کر میز پر رکھا۔

"آپ ایک غیر متوقع انسان ہیں۔ ایسی ہی امید تھی مجھے۔" وہ آواز کی خوشگواری چھپا نہ سکی۔

احمد نے پی کیپ اور ماسک اتارا۔ لبوں پر مبہم مسکراہٹ تھی۔

"پوچھیں گی نہیں یہاں کیسے آ گیا؟"

وہ ٹکٹکی باند کر اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

اور وہ اس کی سمت دیکھ رہا تھا۔

مہر کو دن بھر کی تھکان اترتے ہوئے محسوس ہوئی۔ وہ دیکھتا تھا، تو دل خواہش کرتا تھا کہ وہ تا عمر دیکھتا رہے۔

"اگر آپ پہیلیاں بجھائے بغیر مجھے بتانا چاہیں گے۔ تو ضرور۔"

احمد زیر لب ہنسا۔

"چلیں، صرف آپ کے لیے ایسے ہی بتا دیتا ہوں۔ گارڈز نے بغیر چوں چرا اں اندر آنے دیا۔ آپ کے ایمپلائی ماشاء اللہ سے اس قدر سن دماغ ہیں کسی نے ایک اجنبی کو آپ کے آفس میں گھستے نہیں دیکھا۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر بتایا۔

"بس اب۔ لاکرز کی تلاشی لیں؟" احمد مدعے پر آیا۔ "آپ نے کھولے تو نہیں؟"

"تجسس بہت تھا۔ مگر کھولے نہیں۔ اب بس ہیرے یہاں پر مل جائے۔" اس نے ہاری ہوئی سانس خارج کی۔

"ہیرے یہاں پر نہیں ملنے والے۔" احمد سپاٹ لہجے میں بولا۔

"مطلب؟" چہرہ بجھ گیا۔

"میں عبداللہ سلطان کو جانتا ہوں۔ وہ ہوشیار بزنس مین تھے۔ اگر میں اتنی آسانی سے آفس میں داخل ہو سکتا ہوں تو کوئی اور بھی ہو سکتا ہے۔ ہیرے کسی محفوظ مقام پر ہونے چاہییں۔"

مہر کا چہرہ مایوسی کے رنگوں میں ڈھلنے لگا۔ اب کہ لاکرز کی تلاشی لینے کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔

"اگر وہ ہیرے مجھے نہیں ملے تو میں برباد ہو جاؤں گی، احمد۔" وہ پیشانی کو چھوتے ہوئے بولی۔

احمد کا چہرہ نرم پڑا۔ وہ دھیمے قدم بڑھاتے اس کے عین سامنے پہنچا۔ اس عورت کے چہرے پر مایوسی اس قدر ناگوار کیوں لگتی تھی؟

"مہر، آپ اتنا جلدی مایوس کیوں ہو جاتی ہیں؟ ہر چیز اپنے وقت پر ٹھیک ہو جائے گی۔" وہ تسلی بخش انداز میں بولا۔

مہر نے سر نفی میں ہلایا۔

"کیا کر لوں گی میں اگر کچھ بھی حل نہ ہوا؟ میرے سر پر اتنا بڑا قرضہ ہے۔ کمپنی دیوالیہ ہو گئی ہے۔ ہیرے ملنے کا نام نہیں لے رہے۔ میں نے اتنے دنوں سے اپنی بیٹی سے ڈھنگ سے باتیں نہیں

کیں۔ زندگی الٹ پلٹ ہوگئی ہے، میں کیسے مایوس نہ ہوں؟" وہ بے بسی سے کہتے بے اختیار دو قدم پیچھے بڑھی۔

احمد کے چہرے پر کرب اترا۔ مگر اس نے ترنت کرب چھپایا۔

"میں اچھی باس نہیں بن سکی۔ میں اچھی ماں بھی نہیں بن پا رہی۔ میں ہر طرف سے گھاٹے میں ہوں۔" سیاہ آنکھوں کو نیر نے چمکا دیا۔

احمد نے اپنے دماغ پر زور دیا۔ کوئی اور اس قدر مایوسی بھری باتیں کرتا، تو شاید اسے اتنا فرق نہیں پڑتا۔ وہ اب تک اپنی کیفیت کو سمجھنے سے قاصر تھا، مگر اب اسے سمجھنے میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھا۔ جو تھا، سو تھا۔ وہ ٹوٹ رہی تھی۔ وہ ہی اسے جوڑے گا۔

"آپ کیا چاہتی ہیں، مہر؟" احمد نے اچانک سوال کیا۔

وہ جو احمد کے لبوں سے کچھ تسلی بخش سننے کی متوقع تھی، ذرا سا چونک گئی۔

"میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ وہ ہیرے مجھے مل جائیں۔ ان ہیروں کو واپس کر کے میں وہ قرضہ معاف کروالوں۔"

احمد نے سوچتے سمجھتے سر اوپر نیچے ہلایا۔

"آپ کو واقعی لگتا ہے کہ ہیرے مل جانے کے بعد وہ آپ کو چھوڑ دیں گے؟ نہیں مہر۔ وہ جرائم کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی باتیں جھوٹ اور وعدے اور دعوے کھوکھلے ہوتے ہیں۔" وہ ہاتھوں کو باندھ کر ایسے بولا جیسے کچھ باور کروا رہا ہو۔

یہ احمد تسلی دینے کے بجائے مایوس کیوں کر رہا تھا؟

"احمد آپ نے تو مجھے پریشان کر دیا ہے۔ میں کیا کرلوں گی اگر انہوں نے ہیرے لینے کے بعد بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا؟" پریشانی انتہاء کو پہنچی۔ دل زور سے دھڑکا۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ سر جھکائے میز کو تکنے لگی۔

احمد نے سرد سانس خارج کی۔

"مہر میں لگی لپٹی سنانے کا عادی نہیں۔ میں بس آپ کو حقیقت دکھا رہا ہوں۔ آپ کا مقصد ہیرے ڈھونڈنا نہیں، بلکہ اپنے دشمنوں کو تباہ و برباد کرنا ہونا چاہیے۔" وہ اس کی طرف بڑھا۔ میز کے اوپر ہاتھ رکھے اور کمر جھکائی۔

مہر نے الجھ کر نظر اٹھائی۔

"مگر میں یہ سب کیسے کروں گی؟"

"میں نہیں۔ ہم یہ سب کیسے کریں گے!" وہ مسکرایا۔

وہ اکیلی نہیں تھی۔ کوئی اور ہوتا تو اسے اتنا آسرا نہ ہوتا، مگر وہ احمد تھا۔ اس کی موجودگی میں ہر مصیبت زندگی سے بے دخل ہو جاتی تھی۔

"آپ نے اپنے دماغ کو حاضر رکھنا ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی، معمولی سے معمولی تفصیل پر غور و فکر کریں۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا اور اب دہرا رہوں ہوں، یہ تفصیلات ہمیں ہمارے دشمن سے قریب لے

جائیں گی۔ آپ مجھے صرف اتنا بتائیں۔ کیا آپ اپنے ڈیڈ کے قاتلوں سے بدلہ لینا نہیں چاہتیں؟" وہ سیدھا ہوا۔

مہر کے دل میں آگ سی بھڑکی۔ اس نے سست روی سے گردن ہاں میں ہلائی۔ احمد ناز سے مسکرایا۔

"پھر خود کو مضبوط کرلیں۔ بہادری اور شجاعت کی مثال قائم کریں۔ ہم مل کر اپنے دشمنوں کا مقابلہ کریں گے۔"

ہمیشہ نرم اور میٹھے الفاظ تسلی بخش ثابت نہیں ہوتے، کبھی کبھار حقیقت کا آئینہ دکھا کر اپنا کا دل بہلایا جا سکتا ہے۔

"چلیں پھر، لاکرز کھولتے ہیں۔" احمد بولا۔

وہ دونوں لاکرز کی طرف بڑھے۔ حسبِ توقع اندر ہیرے نہ تھے۔ مگر کچھ کاغذات ضرور تھے جو احمد نے اٹھالیے۔ مہر واپسی اپنی کرسی پر بیٹھی۔ احمد اس کے مقابل بیٹھا۔ وہ کاغذات کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ یقیناً اسے کچھ دلچسپ مل چکا تھا۔

"سب سے پہلے آپ یہ بتائیں۔" احمد نے ڈاکومنٹس ٹیبل پر رکھے اور مہر کی آنکھوں میں دیکھا۔ "آپ کو اپنے ڈیڈ کے کسی فارم ہاؤس کے بارے میں معلوم ہے؟" مہر کی آنکھوں کا جائزہ لیا۔

مہر کچھ سوچتے ہوئے سر نفی میں ہلانے لگی۔

"میرے علم میں تو نہیں ہے۔"

احمد نے اپنے ہاتھوں کو اسٹریچ کیا۔ چہرے پہ مسکراہٹ بکھری۔

"یہ آپ کے ڈیڈ کے دو فارم ہاؤس کے کاغذات ہیں۔"

مہر نے آنکھیں میں استعجاب لیے انہیں پڑھا۔ جہاں ایک دروازہ بند ہوتا تھا وہاں کئی دروازے ایک ساتھ کھل جایا کرتے تھے۔ اسے بے اختیار احمد کی بات یاد آئی۔ مشکلات کے حل ان کے ساتھ اترا کرتے ہیں۔

"عبداللہ سلطان نے ان فارم ہاؤس کو آپ تک سے چھپایا۔ یقینا یہاں کچھ ہوتا ہے۔ شاید ہیرے یہیں پر ہوں۔" احمد نے آخر میں شانے اچکائیں۔

مایوسی کے کہر چھٹنے لگے۔ کچھ دیر پہلے وہ یہی سوچ رہی تھی کہ اب ان ہیروں کو کہاں ڈھونڈے گی۔ بیٹھے بٹھائے اسے دو جگہیں مل گئیں۔

"ہاں! یہاں ہیروں کی موجودگی کا بڑا امکان ہے۔" وہ پر امید ہوئی۔

"نہیں۔ زیادہ بڑا نہیں۔ مگر امکان ضرور ہے۔" لاپرواہ سے انداز میں احمد نے مہر کی تھیوری رد کی۔

"دو امکانات ہیں۔ یا تو یہاں ہیرے ہیں، یا کچھ گڑبڑ ہو گی یہاں۔ جیسے آپ نے بتایا تھا کہ آپ کے ڈیڈ اور آپ کے دشمن پارٹنرز تھے۔ تو ممکن ہے یہاں کچھ ہوتا ہو۔ شاید ہمیں کچھ مزید مل جائے۔ کیا کہتی ہیں؟"

مہر کے اوپر کالی گھٹا چھانے لگی۔ اس نے سانس ہوا کے سپرد کیے احمد کا جائزہ لیے جو اسے منتظر نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ویسے بھی ہماری ترجیح دشمنوں کو تباہ کرنا ہے۔“ اس نے احمد سے زیادہ خود کو یاد دلایا۔

اسے مہر پہ فخر ہو رہا تھا، ٹھیک اسی طرح جیسے ایک استاد کو اپنے اسٹوڈنٹ کی کارکردگی پر ہوتا ہے۔

”آپ ایک اچھی سٹوڈنٹ ثابت ہو رہی ہیں۔“ اس نے موڈ بہتر کرنے کے لیے کہا۔

”اور آپ ایک بہترین استاد۔“

خوشنما مسکراہٹوں کے تبادلے ہوئے۔



ہیروں کا یہ بھیانک کھیل کہاں سے شروع ہوا تھا؟

رازوں پر سے پردہ اٹھانے ہم چار سال پہلے کے وقتوں میں چلتے ہیں۔

ملاقاتی کمرے میں چاروں جمع تھے۔ یخ بستہ فضا میں خوشگوار پر اسراریت رقم تھی۔ لیڈی اقتدار کی گود میں ڈبا تھا۔ ڈبے کے اوپر سبز ویلویٹ کا کپڑا چڑھایا ہوا تھا۔

ان سب کی آنکھوں میں ڈھیروں اشتیاق تھا۔

”آج میں نے تم سب کو ایک انعام دینے کے لیے بلایا ہے۔“

ڈبا کھل چکا تھا۔ اندر سے ڈھیروں روشنیوں نینکل کر ان کی آنکھوں چندھیا دیا۔ چار نایاب پتھر مصنوعی روشنیاں انعکاس کر رہے تھے۔ وہ اس قدر دلکش تھے کہ دیکھنے والے کو لمحے بھر میں اپنے سحر میں جکڑ لیں۔ دل مچلنے لگے تھے، آنکھوں میں حوس جگمگائی۔

"یہ ہمارے جرمن کلائینٹ نے ہمیں دیا ہے۔ اس کی بیٹی کا ہارٹ ٹرانس پلانٹ کامیاب ہوا ہے اس لیے۔"

یکبارگی ڈبا بند ہوا۔ سب نے ایک ایک کر کے جھٹکا کھایا۔ وہ ہیرے بصیرت میں نہ تھے مگر دماغ میں ان کے نقش سب نے محفوظ کر لیے تھے۔

"میں چاہتی تو ان ہیروں کو خود تک محدود رکھتی۔ لیکن میں نے ایسا نہ کیا۔ میں تم چاروں کو بتانا چاہتی تھی کہ تم اقتدار کا بھروسہ جیتنے میں کامیاب ہو چکے ہو۔" وقفہ لے کر باری باری سب کو دیکھا۔

"بابا کہتے تھے، جو بے وفا ہوتا ہے اسے مار دینا چاہیے، اور جو وفادار ثابت ہو جائے اسے سینے سے لگا کر رکھنا چاہیے۔ میرے لیے تم سب ان ہیروں سے زیادہ اہم ہو۔ تم لوگ میری خدمت میں زندگی وقف کرو، زندگی جنت نہ بن جائے تو میرا نام بدل دینا۔" اس نے شان سے اپنے گن گائے۔

سب کے چہروں پر پرجوش مسکراہٹ تھی۔ دل للچا رہے تھے۔ دولت کے سنہری خواب آنکھوں میں جھلکے۔

لیڈی اقتدار نے اٹھ کر ہیرے کا ڈبا ایک لاکر میں بند کر دیا اور واپس اپنی جگہ پر بیٹھی۔ تکبر آمیز مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو زینت بخشی تھی۔

"ان کی قیمت کتنی ہو گی، لیڈی؟" نیلوفر کے منہ میں پانی بھر آیا۔

”تیس ملین ڈالرز کے آس پاس۔“

حیران کن نظروں کے تبادلے ہوئے۔

”ہم ان ہیروں کو بیچ کر، رقم آپس میں بانٹ لیں گے۔“

خوشیاں انتہاء کو پہنچیں۔

”یہ ہیرے ہماری دولت کے خزانوں میں خوش گوار اضافہ ثابت ہوں گے۔“ ان کی خوشیاں دیکھ کر، ان کی آنکھوں میں اپنے لیے شان دیکھ کر ملکہ کو تسکین ملی۔

کہا جاتا ہے، لالچ بری بلا ہے۔ اور ان چاروں کے درمیان کوئی تھا جس کے دل میں لالچ کا چشمہ پھوٹ چکا تھا۔ جانتے ہو کون تھا وہ؟

☆☆☆

اگلے دن:

عبد اللہ سلطان اپنے آفس میں کام کر رہے تھے۔ ماتھے پر مصروفیت کے بل تھے۔ دفعتاً موبائل بج اٹھا۔ نامعلوم نمبر سے کال موصول ہو رہی تھے۔ ماتھے کی سلوٹوں میں اضافہ ہوا۔ آنکھوں میں شکی تاثر سجائے فون کانوں سے لگایا۔

”تمہاری بیوی جس ہسپتال میں کام کرتی ہے، اس کی ایک بیسمنٹ ہے۔ وہاں چار ہیرے چھپے ہوئے ہیں۔“ بغیر کسی تمہید کے اطلاع دی گئی تھی۔ آواز پر ڈھیروں فلٹرز لگے ہوئے تھے اس لیے غیر انسانی معلوم ہوتی تھی۔

عبداللہ سلطان نے کچھ دیر اطلاع کو ہضم کرنے میں لگائے۔

”بکواس بند کرو۔ میں ایسے آدمی کی بات پر اعتبار کیوں کروں جو شناخت چھپا کر بات کرتا ہے؟“ وہ برہمی سے بولے۔

”سوچ لو۔ میں تو تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہا تھا۔ ان ہیروں کی قیمت تیس ملین ڈالرز کے آس پاس ہے۔“

عبداللہ سلطان کرنٹ کھانے والے انداز میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ آنکھوں میں روشنیاں سما گئیں، دل اس رقم پر لمحے بھر کے لیے زور و شور سے دھڑکا۔ ایک کاروباری آدمی کے لیے پیسوں سے بڑھ کر کچھ ہو سکتا تھا کیا؟

”اور تم مجھے یہ سب کیوں بتا رہے ہو؟“

لالچ کو دبانے کی بھرپور کوشش کی۔

”ہم مل کر کام کر سکتے ہیں۔ دو ہیرے تمہارے۔ دو میرے۔ کیا کہتے ہو؟“

ان کے ماتھے پر تیوری چڑھی۔

”بھلا تم میری مدد کیسے کرو گے؟“ مگر وہ اب تک شک میں مبتلا تھے۔

”ٹھیک دو دن بعد ہسپتال کی انتظامیہ لاہور جا رہی ہے۔ تم اگر مانتے ہو تو میں بیسمنٹ کا رستہ اور لاکر کی چابیاں فراہم کروں گا۔“

عبداللہ سلطان ٹھنڈے پڑے۔ کئی لمحے وہ گہری سوچ میں ڈوبی رہے۔ پھر دماغ میں ایک منصوبے نے جنم لیا۔ لب متبسم ہوئے۔

"میں ایک ہوشیار بزنس مین ہوں۔ تم جیسے دھوکے بازوں کی باتوں میں نہیں آتا۔ آئندہ رابطہ کرنے کا سوچنا بھی مت۔" کال کاٹ دی۔

آنکھیں شر سے چمک رہی تھیں۔ مسکراہٹ گہری ہو رہی تھی۔

یہ تو طے تھا، یا تو ساری ہیرے ان کی ملکیت میں ہوں گے، یا ایک بھی نہیں۔

☆☆☆

نیلوفر ہسپتال کی انتظامیہ سمیت لاہور روانہ ہو چکی تھی۔ عبداللہ سلطان نے انہی دنوں ہسپتال جانے کا ارادہ کیا۔ وہ ہر ڈاکٹر، نرس کے چہروں اور حلیوں پر غور کر رہے تھے۔ جوں ہی ایک چہرے نے اپنی طرف توجہ مرتکب کی، وہ تھم گئے۔

اس کی تیاریوں کا اوپر سے نیچے جائزہ لیا۔ میک اپ سے لدا ہوا چہرہ، برانڈڈ ہیلز، اور کہنی سے لٹکتا ہوا لاکھوں کی قیمت کا پرس۔ کانوں سے آئی فون چسپاں تھا۔ ایک معمولی نرس سیدھے راستوں سے اتنی مہنگی اشیاء خرید نہیں سکتی تھی۔

وہ سست روی سے قدم بڑھاتے نرس کے برابر میں پہنچے۔ ہاتھ جیبوں میں قید کیے۔ آنکھیں بلا تاثر تھیں۔ نرس کسی کی موجودگی سے باخبر ہوئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور کال منقطع کی۔ بڑھی عمر کے گنجے مرد کو دیکھ کر وہ غیر آرامدہ ہو گئی تھی۔

''ایکسکیوز می؟'' نرس نے آنکھیں پھاڑ کے عبداللہ سلطان کو دیکھا۔

''میں نیلوفر کا شوہر ہوں۔'' انہوں نے گردن اٹھا کر تعارف کروایا۔

نرس کے تاثرات پر ذرہ برابر فرق نہیں پڑا۔ وہ جوں کی توں انہیں گھورتی گئی۔

''اچھا، مبارک ہو۔ کوئی کام نہیں تو جاؤں؟'' وہ بدلحاظی سے بولی۔

عبداللہ سلطان پر سکون رہے۔ سرد گھوری سے نرس کو نوازا۔ لب وا کیے، سانس باہر نکالی۔ ہاتھ جیب سے آزاد کیے، کوٹ کا پٹ کھولا۔ اندر والی جیبوں میں نوٹوں کی گڈی نظر آرہی تھی۔

نرس کبھی عبداللہ کو دیکھتی، کبھی ان بھری بھرائی جیبوں کو۔ چہرے پر خوشگوار حیرانی پھیلی۔

''میرا نام روشنی ہے۔ میں آپ کی کیسے مدد کر سکتی ہوں؟'' ایک لمحے میں اس کے ناز نخرے وفات پا گئے۔

''میری گاڑی میں ملو۔ نوٹوں سے بھرا سوٹ کیس تمہارا منتظر ہے۔'' وہ رعب سے بولے اور ہسپتال سے باہر چلے گئے۔

روشنی ان کا تعاقب کرنے لگی۔ دونوں گاڑی کی پچھلی نشست پر براجمان ہوئے۔ وہ بے تاب نظروں کے سنگ ان کے بات کرنے کا انتظار کر رہی تھی۔

''کیا کرنا ہو گا مجھے؟'' وہ لاپرواہی سے بولی۔ اتنی مہنگی گاڑی میں پہلی مرتبہ بیٹھی تو اچھی طرح آس پاس کا جائزہ لے رہی تھی۔

"غداری کرنی ہو گی۔ مگر اس غداری کی پوری رقم ادا کروں گا۔" وہ ٹیک لگائے، آرامدہ ہو کر بولے۔

"قبول ہے۔ بتاؤ۔ کیسے کرنی ہے غداری؟" ایک لمحے میں وفاداریوں نے پلٹا کھایا۔

"مجھے جاننا ہے کہ اس ہسپتال میں کون سا سیاہ دھندا چل رہا ہے؟"

"شاید یہاں پر کوئی غلط کام نہ ہوتا ہو؟"

عبداللہ سلطان روشنی کے ہوشیار بننے کی کوششوں پر ہنس پڑے۔

"میں تمہارے مالکوں کے لیے منی لانڈرنگ کرتا ہوں، روشنی۔ ان کا کالا پیسہ دوسرے ممالک بھیج کر چھپا کر رکھتا ہوں۔ مجھ سے کچھ چھپا ہوا نہیں ہے۔"

روشنی نے لاپرواہی سے شانے اچکائے، ایسے جیسے اس چوٹ پر اسے خاص فرق نہ پڑا ہو۔

"ہم اعضاء بیچتے ہیں۔ دنیا بھر سے ہمارے پاس کلائنٹس آتے ہیں۔" بے نیازی سے راز اگلا گیا۔

"تم لوگوں کے پاس یہ اعضاء کہاں سے آتے ہیں؟" عبداللہ کو تجسس نے گھیرا۔

"ہمارے بڑے بڑے گودام ہوتے ہیں، انسانوں کے۔ بعض غرباء اپنی مرضی سے چند پیسوں کے لیے اپنے اعضاء بیچتے ہیں۔"

"اس ہسپتال کی کوئی خفیہ بیسمنٹ بھی ہے؟"

روشنی مسلسل سوالوں سے بیزار آنے لگی۔ یہ کام تو اس کی سوچ سے زیادہ بورنگ تھا۔ تھکی ہوئی سانس خارج کیے جواب دیا۔

''ہاں ہے تو۔'' اس نے آنکھیں گھمائیں۔

''کیا ہوتا ہے وہاں۔'' عبداللہ سلطان کے سوالات رک ہی نہیں رہے تھے۔

''کبھی کبھار ہسپتال کی نرس اور ڈاکٹرز کو بیسمنٹ کے ہال میں مطلوب کیا جاتا ہے۔ وہاں تین کمرے ہیں۔ آپریشن وارڈ، قیدیوں کا کمرہ اور نیلوفر، شمس، مسٹر درانی اور لیڈی اقتدار کے لیے مختص ایک ملاقاتی کمرہ۔'' اس نے جمائی لی۔

عبداللہ سلطان کسی مراقبے میں چلے گئے۔

''ایک آخری فیور چاہیے۔'' دماغ کچھ بن چکا تھا۔ ''مجھے بیسمنٹ میں جانا ہے۔''

''کیوں نہیں۔ مگر اور پیسوں لوں گی۔'' اس کی دلچسپی لوٹ آئی تھی۔

''منظور ہے۔ مجھے وہاں لے کر کیسے جاؤ گی؟''

''نیلوفر میم کے کمرے سے چابیاں چرائیں گے۔ تم اس کی فکر نہیں کرو۔ میں تمہیں وہاں پہنچا دوں گی۔'' وہ پورے اعتماد سے بولی۔

عبداللہ سلطان نے نظریں پھیر لیں۔

''اپنا نمبر دیتی جاؤ۔ آنے سے پہلے کال کروں گا۔'' انہوں نے جیب سے موبائل نکالا۔

روشی نے نمبر بتایا۔ عبد اللہ سلطان نے نمبر محفوظ کر کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ روشنی جان گئی تھی کہ ملاقات ختم ہو چکی ہے۔

☆☆☆

نشہ پیسے کا ہو یا کسی نشہ آور شے کا، بربادی ساتھ لاتا ہے۔

پیسے کے نشے میں دھت عبد اللہ سلطان اس رات ہسپتال چلے تو گئے، مگر کہاں جانتے تھے کہ آنے والوں وقتوں میں ان کا یہ قدم ان کی بیٹی کو ایک کھائی میں دھکا دے گا۔ لالچ صرف بینائی نہیں چھینتی، بلکہ انسان کو عقل و شعور سے غافل بھی کرتی ہے۔

وہ نیلوفر کے کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔ روشنی کے صفائی والی سے اچھے تعلقات تھے، سو کمرے کی چابیاں لینا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ وہ کمپیوٹر کھولے ہوئے تھی، فی الوقت کیمرا ز بند کرنا چاہ رہی تھی۔ عبد اللہ سلطان نیلوفر کے کمرے کی تلاشی لے رہی تھی۔ ان کی نظر ڈیسک کے نیچے ایک خانے پر پڑی۔

وہ جھک گئے۔ کندھے پر بستہ لٹکایا ہوا تھا۔ اس کو کھنگالتے، بابی پن اور چھری نکالی۔ بابی پن سوراخ میں گھسائی، پھر اس سوراخ میں چھری گاڑتے ہوئے پوری قوت سے گھما دی۔ کلک کی آواز کے ساتھ تالہ ٹوٹ گیا۔ شیلف کا دروازہ وا ہوا۔

اندر کاغذات، معمولی سی رقم اور چابی کا گچھا تھا۔ لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تیری۔ وہ چابی مٹھی میں دبوچ کر کھڑے ہو گئے۔

”کیمرا ڈفیوز ہو گئے؟“ وہ پینٹ سے دھول جھاڑتے کھڑے ہو گئے۔

''بس ایک سیکنڈ۔'' روشنی نے کیبورڈ پر انگلیاں چلائیں۔

''ہو گیا کام۔'' اس نے اطلاع دی۔ ''یاد سے، واپس آکر سب کچھ ٹھیک کرنا ہو گا۔'' وہ کمرے سے نکلنے سے پہلے یاد دلانا نہ بھولی۔

دونوں محتاط ہو کر چل رہے تھے۔ رات تھی، اس لیے ہسپتال میں رش کم تھا۔ بیسمنٹ تک پہنچنے میں زیادہ دشواریاں پیش نہ آئیں۔ ہاں بس سٹور روم کا دروازہ کھولتے وقت، چابی کے گچھے میں سے درست چابی ڈھونڈنا ذرا وقت طلب کام تھا۔ اور اس دوران پکڑے جانے کا خوف سروں پر سوار رہا۔

لفٹ بیسمنٹ میں اتری۔ عبداللہ سلطان اس انتظام کو دیکھ کر دل ہی دل میں متاثر ہو رہے تھے۔

''مجھے بتاؤ، ملاقاتی کمرہ کون سا ہے؟ میں آگے کا سفر تنہا طے کرنا چاہتا ہوں۔'' بیسمنٹ کے کشادہ ہال کا جائزہ لیتے ہوئے بولے۔ ہر طرف سفیدی تھی، ہر طرف چمک تھی۔ تعجب ہوتا تھا کہ کیسے چمک دمک بھی تاریکیوں کو پناہ دیتی ہے۔

روشنی نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ سر کو خم دے کر وہاں چلے گئے۔ ہر بڑھتا قدم دل کی دھڑکنوں میں مسرتیں گھول رہا تھا۔ لبوں پر مسکراہٹ گہری ہوتی گئی۔ دل تھام کر دروازہ کھولا گیا۔ اندھیرے نے ان کا استقبال کیا۔ ہال کی روشنی نے کمرے کے کچھ حصے کو چمکایا ہوا تھا۔ انہوں نے سوئچ بورڈ تلاش کیا اور پہلی فرصت میں بتیاں جلائیں اور دروازہ پیچھے سے بند کیا۔

تنہائی کے پُر فریب سکون اور خاموشی کی خستہ حال چھاؤں میں انہوں نے کمرے کا سرسری جائزہ لیا۔

دل نے رفتار پکڑی ہوئی تھی۔ ان کی نگاہ سرمئی لاکر پر ٹھہری۔ وہ آہستگی سے اس تک پہنچے۔ جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا۔ کوئی دو منٹ کی جدوجہد کے بعد درست چابی مل گئی۔

لاکر کھلا تھا۔ اندر ہیرا ڈبا دیکھ کر ان کا دل پھولے نہ سمایا۔ وہ اتنا بھرپور طریقے سے مسکرا رہے تھے کہ بتیسی کی نمائش ہو رہی تھی۔ وہ ڈبا ہاتھ میں تھاما تو انگلیاں کپکپانے لگیں۔ ڈبا کھل چکا تھا۔ چار ہیرے آنکھوں کے سامنے تھے۔ ان کی روشنی نے کچھ دیر کے لیے آنکھوں کو اندھا کیا۔ پہلے دبی دبی ہنسی چھوٹی پھر قہقہہ بلند ہوا۔

بے پناہ مال و دولت کی کنجی ان کی آنکھوں کے سامنے تھی!



وہ لاہور سے واپس آئے تو ہیروں کی گمشدگی کے عقدے کھلے۔ ان پر جیسے پتھروں کی برسات ہو گئی ہو۔ ہر طرف افراتفری پھیل گئی۔ عافیتِ زندگی میں لیڈی اقتدار نے دھوم مچا دیا۔ ہر فرد کی تفتیش لی۔ جن پر شک ٹھہرا ان پر ظلم کی انتہائیں پار کر دیں، مگر وہ ہیرے مل کر دم ہی نہ لیتے۔

کچھ دنوں پہلے تک جو دولت کے ڈھیر ہاتھ میں تھے وہ سارے ریت کی طرح مٹھی سے یوں پھسلے کہ ملنے کا نام ہی نہ لیتے۔ دولت کے نشے میں دھت انسان دولت سے ہاتھ دھو بیٹھے تو وہ جنگلی جانوروں جیسا بن جاتا ہے۔ ان چاروں کا حال بھی کچھ ایسا تھا۔

وہ قصر کے لاؤنج میں بیٹھی ناشتہ کر رہی تھی۔ موڈ بگڑا ہوا تھا۔ آنکھیں تھکان زدہ تھیں۔ اسی وقت فون بج اٹھا۔ آج فون کی رنگ انتہائی ناگوار معلوم ہوئی۔ اس نے سکرین پر جگمگاتا نام پڑھا۔ عبداللہ سلطان کالنگ۔ لیڈی اقتدار نے کوفت کے عالم میں کال اٹھائی۔

"کیسی ہو لویزا؟" عبد اللہ سلطان مزے لینے والے انداز میں بولے۔

ٹوسٹ توڑتا ہاتھ تھم گیا۔ یکبارگی اس آدمی سے برائی کا اندیشہ ہوا۔

"کیا ہوا؟" کسی خدشے نے دل میں زور لیا۔

"تمہارے ہیرے میں نے چرائے ہیں۔"

لیڈی اقتدار کرسی سے اٹھی، نگاہیں طیش ہوئیں۔ ضبط بری طرح ٹوٹ چکا تھا۔ وہ لاؤنج میں ادھر ادھر نظریں گھماتے یہی سوچ رہی تھی کہ ہیرے بازیاب کیسے کروائیں جائیں؟

"تم جانتے ہو میں تمہارا حشر نشر بگاڑنے کی طاقت رکھتی ہوں، عبد اللہ۔" وہ ضبط کے کڑوے گھونٹ پیتے ہوئے بولی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا، وہ فون کے پار پہنچ کر عبد اللہ سلطان کو گردن سے دبوچے اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے آوارہ کتوں میں بانٹ دے۔

عبد اللہ سلطان نے قہقہہ بلند کیا۔ آگ بگولہ عورت کے خدشات میں اضافہ ہوا۔ وہ اتنا پر سکون کیونکر تھا؟

"میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گا۔ میں تمہارے راز سے واقف ہوں لویزا۔ تم لوگ اعضاء کا غیر قانونی کاروبار کرتے ہو۔"

وہ ڈھیلی ہو کر کرسی پر بیٹھی۔ لب کھلے کے کھلے رہ گئے۔ سر پر خطرے کی گھنٹی بجی۔

"فرض کرو اگر میں لوگوں میں یہ بات پھیلا دوں؟ مجھے کوئی ثبوت دینے کی بھی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔ مجھے صرف شک ان سب کے دلوں میں ڈالنا ہو گا۔ پھر دیکھتے ہیں تم اس جذباتی عوام سے

کیسے جان چھڑاؤ گی۔ جو لوگ کل تک تمہاری تعظیم میں ہاتھ چوما کرتے تھے وہیں تمہارے ہاتھ کاٹنے کی باتیں کریں گے۔" عبداللہ سلطان معنی خیز انداز میں دھمکی دے رہے تھے۔

لیڈی اقتدار کا حلق کڑوا ہوا۔

"کیا چاہتے ہو؟" وہ زہر نگلتے ہوئے، آنکھیں میچ کر بولی۔

"تم لوگ ہر ماہ مجھے رقم دیا کرو گے۔ بینک کے تھرو نہیں، میں کسی کو شک میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ مجھے پورا پورا کیش دیا جائے گا۔ اور اگر مجھے احساس ہوا کہ میرے قتل کے منصوبے بن رہے ہیں، میں اسی وقت تمہاری بربادی کے بیج بو دوں گا۔"

لیڈی اقتدار کا سر چکرانے لگا۔ اسے بے بسی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے غصے سے مٹھی میز پر دے ماری۔

"تمہیں، ہماری پارٹنر شپ کا خیال نہیں آیا، عبداللہ؟" وہ دھاڑی۔

"پارٹنر شپ والی بکواس اپنے پاس رکھو، لویزا۔ اور ہاں ایک بات بتانا بھول گیا، تمہارے ہسپتال میں ایک نرس کام کرتی ہے روشنی، اس نے ہی مجھے ہسپتال کی بیسمنٹ تک پہنچایا۔ خیر اس کا کام بھی تمام کر دینا، لویزا۔"

عبداللہ سلطان لاتعلق سے انداز میں بولے۔ لیڈی اقتدار کو مزید تپ چڑھی۔

"تمہارا موازنہ تو میں کتے سے بھی نہیں کر سکتی، عبداللہ۔" آواز میں بے پناہ نفرت اور کڑواہٹ تھی۔

”کتے سے تمہارا موازنہ کتے کی شان میں تذلیل کے برابر ہو گا، کم سے کم کتا وفادار تو ہوتا ہے، تم تو ایک گدھ سے بھی بدتر ہو، تم بے وفا ہو عبداللہ، دغاباز ہو۔“ وہ پوری قوت سے چلائی۔

عبداللہ سلطان کو اپنی شان میں کہے جانے والے حسین الفاظ ہرگز برے نہ لگے۔ وہ زور سے ہنس دیے۔

”میں صرف ایک شاطر بزنس مین ہوں لویزا۔ مجھے کوسنے کے بجائے، سیکھو مجھ سے۔ میں اس روشنی کو بتا چکا تھا کہ میں کیا کرتا ہوں۔ اسے مروانا ہی تھا۔“ عبداللہ سلطان نے کال کاٹ دی۔

اور یہاں سے شروع ہوئی تھی، ان ظالم ہیروں کی داستان۔

ہیرے جو محض پتھر تھے۔

فرق یہ تھا کہ وہ چمکتے تھے۔۔۔ اور ذرا خوبصورت تھے۔

ان کی یہی چمک تھی، جس نے انسانوں کی عقل کو مفلوج کر دیا تھا۔

انہیں اپنے اصل سے غافل کر دیا تھا۔

لالچ میں اندھا کر دیا تھا!

☆☆☆

ملاقاتی کمرے میں برائی کی فوجیں جمع تھیں۔

احمد کی واپسی کے بعد سے ملاقاتوں میں اضافہ ہو چکا تھا۔ پریشانیاں عام ہو چکی تھیں، اور زندگی میں بے سکونی لوٹ آئی تھی۔ مجرم جتنا بھی بڑا کیوں نہ ہو، اسے ہمیشہ یہ خوف رہتا ہے کہ وہ پکڑا جائے گا۔ احمد کی واپسی نے ان کے لاشعور میں بھٹکتے ہوئے خوف کو جگا دیا تھا۔ اور ایک خوفزدہ مجرم سے زیادہ بے چاری کوئی شے نہیں اس دنیا میں۔

''مہر نے بتایا ہے کہ لاکرز میں ہیرے نہیں ملے۔'' شمس نے اطلاع دی۔

''مجھے معلوم تھا۔ عبد اللہ نے صرف موت سے جان چھڑانا چاہی تھی۔'' لیڈی اقتدار پر اطمینان تھی۔

''اس خبیث آدمی سے اس سے کم کی توقع کی نہیں جاسکتی۔'' درانی کے چہرے پر شدید ناپسندیدگی تھی۔

نیلوفر نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔

''ان سب باتوں کو چھوڑو۔ فی الوقت، وہ ہیرے ثانوی ہیں۔ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ احمد ہے۔'' لیڈی اقتدار کے پیشانی تنگ ہوئی۔ نظر اٹھا کر درانی کو دیکھا۔

درانی اشارہ سمجھتے بولنے لگا۔

''پچھلے دنوں مہر نے کچھ بھی غیر معمولی نہیں کیا۔ ہمارے بندوں نے نظر رکھی ہوئی تھی۔'' اس نے ہاتھ اٹھا کر بتایا۔

''وہ احمد سے تو نہیں ملی؟'' نیلوفر آنکھیں چھوٹی کیے بولی۔

درانی نے گردن کو جنبش دی۔

”نہیں۔ وہ عبداللہ کے پرانے دوستوں سے ملنے گئی تھی۔ شاید وہ ہیروں کی کھوج لگا رہی ہے۔“ درانی نے یقین دلایا۔

”ان کے مابین بات چیت ہوئی؟“لیڈی اقتدار نے پوچھا۔

درانی نے گردن ہاں میں ہلائی۔

”کالز کے ذریعے۔ مگر کوئی ایسی بات نہیں جس پر ہم پریشان ہوں۔ بس عام باتیں۔ کہاں ہو۔ کدھر ہو۔ کام کیسا ہے۔“

یکدم سکون نیلوفر کے دل پر اترا۔ اب تک سب عام تھا۔

لیڈی اقتدار کی گردن نفی میں ہلی۔

”میرا شک بڑھ گیا ہے۔“ وہ گردن جھکائے کسی نکتے پر غور کر رہی تھی۔

سب کے سب چونکے۔

اب کہ ملکہ نے گردن اٹھائی تو آنکھیں ٹھنڈی پڑ چکی تھیں۔

”تم سب خود سوچو۔ وہ پہلے پینک کر رہی تھی۔ گڑبڑ پر گڑبڑ کیے جا رہی تھی۔ احمد کی واپسی پر اس کی زندگی میں استحکام آ گیا ہے۔ وہ بھولے سے بھی کوئی چوک نہیں کر رہی۔“لیڈی اقتدار نے جیسے انکشاف کرنا چاہا۔

نیلوفر کا سینہ پھر تنگ ہوا۔ درانی کی بھنویں اکٹھا ہوئیں۔ شمس سوچ میں غرق ہوا۔

”یہ سب اس لیے بھی تو ہو سکتا ہے کہ شمس سے مار کھانے کے بعد وہ سنبھل گئی ہو؟“ نیلوفر کی آواز میں گھبراہٹ گھلی۔

لیڈی اقتدار نے اسے دیکھتے ہوئے گردن نفی میں ہلائی۔

”میں احمد کو نہ جانتی ہوتی تو یہ کہتی۔ وہ گرانے سے پہلے فتح کے خواب دکھاتا ہے۔“

نیلوفر نے لبوں کے اوپر ہاتھ حائل کیا۔

”پھر ہمیں کیا کرنا ہو گا لیڈی؟“ شمس بولا۔

”فی الحال، مزید انتظار۔ میں ایک آخری اشارے کا انتظار کر رہی ہوں۔ مگر ہمیں مہر کو پھنسانے کی تیاری کرنی ہو گی۔“

چہرے سے تناؤ چھٹ گیا۔ لبوں پر مسکراہٹ پھیلی۔

”ہمیں مہر اور احمد کو علیحدہ کرنے کا منصوبہ ابھی سے بنانا ہو گا۔“ اس نے گردن اکڑا کر اعلان کیا۔

”اور وہ ہم کیسے کریں گے؟“ درانی نے خلش بیان کی۔

”مجھے مہر کی دکھتی رگ پر وار کرنا ہو گا۔“ لیڈی اقتدار کے دائیں ہاتھ کی مٹھی بنی۔

”ایک کام کرتے ہیں۔ اس کی بیٹی کو اغواء کر لیتے ہیں۔“ شمس نے تجویز پیش کی۔

نیلوفر نے گردن نفی میں ہلائی۔

"نہیں نہیں۔ عنایا کھو گئی تو وہ پاگل ہو جائے گی۔ وہ کسی کام کی نہیں رہے گی۔" نیلوفر نے شمس کی تجویز رد کی۔

لیڈی اقتدار نے اسے گھورا۔ مسکراہٹ گہری ہوئی۔

"نیلوفر۔ تمہارے دماغ میں کچھ پک چکا ہے؟" اس نے ایک مان سے کہا۔

نیلوفر جواباً مسکرائی۔ سرہاں میں ہلایا۔

شمس اور درانی اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"کیا ہے کہ لیڈی، میں مہر کے ساتھ آٹھ ماہ تک رہی ہوں۔ مجھے اندازہ ہے کہ اس کی سب سے بڑی کمزوری کیا ہے۔" آنکھوں میں شیطانی چمک اتری۔

"کس چیز کی بات کر رہی ہو نیلوفر؟"

"یہ نہ پوچھیں کس چیز کی۔ بلکہ یہ پوچھیں کہ، کون ہے وہ؟"

اگلے لمحے اس نے منصوبہ اپنے ساتھیوں کے گوش گزار کیا۔

آنکھیں چمک اٹھیں۔ لب متبسم ہوئے۔

مہر کی زندگی کو مزید دشوار بنانے کی تیاریاں تمام ہوئیں۔



زندگی سے روٹھی ہوئی لڑکی بالآخر اس سفر کی طرف روانہ تھی، جس کے خواب وہ مدت سے دیکھ رہی تھی۔

آج حرر کی افتتاح کا دن تھا۔ گاڑی چلاتی ہوئی مناج کے چہرے پر آسودگی رقم تھی۔ دمکتی ہوئی آنکھوں میں مان تھا۔ دل ٹھاٹھے مارتا ہوا بے صبری کا اظہار کر رہا تھا۔

پہلی منزل اس کے قدموں تلے تھی۔ ابھی کئی منزلیں آنا باقی تھیں۔ مگر وہ ہر منزل کو کھلے دل کے ساتھ عبور کرنے کے لیے تیار تھی۔

گاڑی رک چکی تھی۔ وہ اتر گئی۔ پچھلی نشست سے خالہ اور خالو اترے۔ آنکھوں میں مناج پر مان جگمگا رہا تھا۔

اس نے حرر کی عمارت کی ایک منزلہ عمارت کو نظر بھر کر دیکھا۔ اس پر بڑا سا بینر لگا تھا جس پر لکھا ہوا تھا:

"تحریکِ حرر فاؤنڈیشن

اکیسویں صدی کی غلامی سے جان ہے چھڑوانی۔"

لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

"یہ سب چودہ سالہ مناج کے نام ہے، جس نے امی کے جانے کے بعد زندگی کو اپنا سب سے بڑا دشمن مان لیا تھا۔ مناج یہ تمہارے لیے ہے۔ دیکھو اسے۔ زندگی نے تمہیں کیا دیا ہے۔ وہ دشمن نہیں تھی۔ ہاں وہ سخت تھی۔ مگر وہ سختیاں تمہاری بھلائی کے لیے کی گئی تھیں۔"

وہ عمارت کو تکتے ہوئے دل ہی دل میں بولی۔ ہوا کے باعث اس کا سفید کرتا لہرایا، جس پر موتیوں کا نفیس کام تھا۔ سر پر بھوری پشمینہ شال اوڑھی ہوئی تھی، جو کندھوں اور سینے کو ڈھانپ رہی تھی۔ اس نے اپنی شال پر ہاتھ پھیرا اور آنکھیں بند کیے کھلی ہوا کو اپنے اندر اتارا۔

آج بھی اس شال میں امی کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔

دروازے پر درِفشاں اور حسام سمیت چند لوگ اور موجود تھے جو حرر کے نئے امپلائیز تھے۔

وہ زینہ پھلانگ کر ان سب تک پہنچی۔ مسکراہٹوں نے اس کا استقبال کیا۔ ڈھیروں آنکھوں نے اسے داد بھیجی۔ اور وہ اس سب کو دیکھ کر دل ہی دل میں کہنے لگی:

”اے رب، تیرا شکر ہے۔ میرے لیے یہ اہم نہیں کہ میں اس مہم میں کامیاب ہو جاؤں، مگر یہ اہم ضرور ہے کہ میں اس مقصد کے لیے قدم بڑھاؤں۔ میری مدد کرنا۔“

دروازے پر سُرخ ربن لگی تھی۔ اس نے سُرخ ربن کاٹی اور حرر کے اندر داخل ہوئی۔

عمارت کا کام دیکھ کر ہر آنکھ کھلی کی کھلی رہ گئی۔ خوبصورت طرز پر بنا بھورا سیلنگ، سفید دیواریں، اور مصنوعی روشنیوں کو انعکاس کرتا ہوا فرش۔ مناج خواب سی کیفیت میں ان تیاریوں کو دیکھ رہی تھی۔

”یہ میرا وہ آشیانہ ہے، جس کی کھوج میری روح عرصۂ دراز سے کر رہی تھی۔“ دل سرشار ہو چکا تھا۔ آنکھیں مسرتوں سے لبریز تھیں۔

تمام ایمپلائیز ہجوم کی صورت جمع تھے۔ اور وہ ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”حرر کی بنیاد میں نے رکھی ہے۔ مگر ایک گھر کو کھڑا کرنا ایک انسان کی زمہ داری نہیں۔“ اس کی سرد مشینی آواز گونج رہی تھی۔ اور اسے سب غور سے سن رہے تھے۔ اسے لمحے بھر کے لیے خدا کی قدرت پر یقین نہ آیا۔ کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ایک دن اتنے کان اسے سن رہے ہوں گے۔

”بنیادیں بلاشبہ میں نے رکھی ہیں، مگر اسے گھر ہم بنائیں گے۔ مجھے آپ سب سے کچھ نہیں چاہیے، سوائے ایمانداری، سچائی اور وفاداری کے۔ ایمانداری اپنے آپ سے۔ سچائی مجھ سے۔ اور وفاداری اس مقصد سے۔ یہ مقصد جو بے غرض ہونا مانگتا ہے۔ جو جان کی پرواہ کیے بغیر لڑنا مانگتا ہے۔ اگر کبھی آپ کو لگے کہ یہ مقصد بوجھ بنتا جا رہا ہے، تو واپسی کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ مگر ایک بات جان لیں۔ حرر کا دروازہ ایک بار بند ہو گیا تو اس کا دوبارہ آپ کے لیے کھلنا ناممکن ہے۔“

اس نے توقف لے کر سب پر نگاہ ڈالی۔

”حرر کا معنی ہوتا ہے آزادی۔ حقیقی آزادی۔ ہماری دنیا میں آزادی کے نام نہاد چرچے بہت ہوتے ہیں۔ مگر آج بھی بہت لوگ ہیں جو قید ہیں۔ جو جبر سہہ رہے ہیں۔ جن کے جسموں پر ان کا حق نہیں۔ جن کی آوازیں دبائی جا رہی ہیں۔ حرر ان سب کو حق دلوائے گا۔ کیونکہ اگر ہمارے معاشرے کا ہر فرد آزاد نہیں، تو ہم بھی آزاد نہیں۔ اور حرر میں کام کرنے والے آج سے متحرر ہوئے۔ یعنی آزادی پسند لوگ۔ ہم متحررین ہیں، ہم لڑیں گے، ہم ٹکرائیں گے ہر محاذ سے چاہے جتنا بڑا محاذ کیوں نہ ہو۔“

پرعزم مسکراہٹ تمام متحررین کے لبوں پر پھیلی۔

مناج کو اپنے کندھوں پر بوجھ محسوس ہوا۔

جس طرح سے ہم اپنے قدم زندگی کے میدانوں میں گاڑتے ہیں، اس طرح ہمارے اوپر زمہ داریوں کا بوجھ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ وہ بھی خود کو بوجھل محسوس کر رہی تھی۔

جب ارادے پختہ اور نیت فتح کی ہو تو ہر بوجھ کا مقابلہ کرنے کی ہمت مل جاتی ہے۔



وہ درخت کی چھاؤں تلے کھڑا تھا۔ بارہا اپنی گھڑی دیکھتا، اور پھر ناک سکیڑ کر یہاں وہاں دیکھنے لگتا۔ ماتھے پر تیوری چڑھی ہوئی تھی۔ سیاہ چشموں کی اوٹ میں چھپی بھوری آنکھوں میں بے زاری رقم تھی۔

دور ہی اسے مہر نظر آئی۔ شکر ہے گرمی نہ تھی، ورنہ اس نے تو راکھ کا ڈھیر ہی بن جانا تھا۔

وہ اس کے عین سامنے پہنچی۔ چہرے پر ندامت تھی۔ وہ نظر بھر کر اس کی تیاریوں کا جائزہ لینے لگا۔

اس نے پھولوں کے نقش والا سفید سفراک پہنا ہوا تھا جو ٹخنوں تک آتا تھا۔ سر پر بھوری ہیٹ تھی۔ احمد لمحے بھر کے لیے مبہوت رہ گیا۔ معمولی سے میک اپ نے بھی چہرے کو خوب نکھارا تھا۔

اب وہ چشمہ صرف دنیا سے اپنی آنکھوں کو چھپانے کے لیے نہیں پہنتا تھا، بلکہ وہ انہیں مہر سے چھپانا چاہتا تھا۔ وہ اس کی موجودگی میں رنگ ہی اتنے بدلتی تھیں۔

"آئی ایم سوری۔" وہ گلہ کھڑکھڑاتے بولی۔

"آج کل عنایا کو خود پک اینڈ ڈراپ کر رہی ہوں، خطروں کی وجہ سے۔ اس لیے دیر ہو گئی۔"

احمد نے لب بھینچ کر گردن دائیں بائیں ہلائی۔

''آپ بتا تو سکتی تھیں، محترمہ۔'' وہ نیم خفگی سے بولا۔

''دوسرا موبائل گھر بھول گئی تھی۔'' مہر کی شرمساری برقرار تھی۔

''یعنی نہ صرف لیٹ لطیف ہیں، بلکہ غیر زمہ دار بھی ہیں۔'' وہ ناراضگی بھلائے شریر انداز میں بولا۔

''اب ایسی بات نہیں ہے۔ انسان ہوں، ہوگئی غلطی۔'' وہ ذرا بدک کر بولی۔ ''اور آپ بھی کیا باتیں پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ جانا نہیں ہے؟'' اس سے پہلے وہ مزید تپ چڑھاتا وہ بولی۔

احمد نے زیر لب ہنس کر سر کو خم دے گیا۔ وہ دونوں پتھریلی روش پر چل رہے تھے۔ گھنے درخت ان کو سایہ دے رہے تھے۔ احمد نے سفید شرٹ کے ساتھ نیوی بلیو پجامہ پہنا ہوا تھا۔ ہاتھ جیبوں میں تھے۔ کوئی عام تیاریوں کے باوجود اس قدر پر کشش کیسے لگ سکتا تھا؟ مہر نے دل ہی دل میں سوچا۔

''کیا آپ کو لگتا ہے ہیرے یہاں پر مل جائیں گے؟'' وہ بولی۔

احمد نے گردن نفی میں ہلائی۔ مہر نے بھنویں اکھٹا کیں۔

''میں نے دور سے۔'' تھم کر انگلی اٹھائی۔ تھوڑے فاصلے پر ایک سٹر کچر کھڑا تھا۔ اس کے دروازے پر شیشے کی بوتلیں دور سے نظر آرہی تھیں۔ ''وہ بوتلیں دیکھ لی تھیں۔ بہر حال، یہ فارم ہاؤس کوئی پارٹی پلیس لگتا ہے۔ عبداللہ سلطان جیسا شاطر بزنس مین یہاں ہیرے نہیں چھپائے گا۔''

مہر نے نظریں جھکائیں۔ احمد نے ایک نظر اسے دیکھا۔

''ٹھیک ہے۔ اب آپ پھر شروع ہو جائیں مایوسی کی گردان کرنا۔'' اس نے ناگواری سے کہا۔

مہر نے گردن اٹھائی تو چہرے پر زخمی مسکراہٹ قائم تھی۔

''نہیں پروگرامر صاحب، میں نے شکایتیں کرنا چھوڑ دی ہیں۔'' اس نے ماں کے انداز میں جملہ دہرایا۔ اچھوتی تکلیف کے احساس نے گھیرا۔

اب دونوں سیومنگ پول کے کنارے پر کھڑے تھے۔

''پروگرامر صاحب؟'' وہ بنا آواز کے بڑبڑایا۔ اسے برا کیونکر نہ لگا؟

عمارت کے اندر ایک دلچسپ منظر ان کی راہ تک رہا تھا۔ دونوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اندر کا حال بے حد خراب تھا۔ ہر طرف شراب کی بوتلیں پڑی ہوئی تھیں۔ ٹیبل پر تاش کے پتے بکھرے ہوئے تھے۔ زمین پر جگہ جگہ پلاسٹک کے ساشے رکھے تھے جن میں سفید سا پاؤڈر تھا۔

''الامان الحفیظ۔'' وہ کانوں کو چھوتے بولا۔

مہر کو گھٹن محسوس ہوئی۔ احمد نے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر گہری الجھن کے آثار دیکھ کر اسے شرارت سوجھنے لگی۔

''مجھے تو شک ہونے لگا ہے کہ آپ عبداللہ صاحب کی بیٹی ہیں۔'' وہ مسکراہٹ دبائے بولا۔

مہر نے اسے مڑ کر دیکھا۔

''احمد!'' وہ تڑپ کر بولی۔ ''آپ پھر شروع ہو گئے؟''

وہ کمر پر ہاتھ جمائے آنکھیں میچ کر ہنسنے لگا۔ اور اس کے ہنستے ہی مہر کا غصہ بے اختیار زائل ہوا۔ اگر اپنے تنگ ہو جانے پر اسے احمد کی ہنسی سننے کا موقع ملتا تھا تو اسے اپنا تنگ ہونا منظور تھا۔

"اور آپ اتنی آسانی سے تنگ ہو گئیں۔" ہنسی قابو کی۔

مہر نے خفگی سے سر جھٹک لیا۔

"اوہ میرے خدا۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔" وہ جیسے کوئی انکشاف کر رہا ہو۔

مہر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ دیوار کو گھور رہا تھا۔ مہر کی نظروں نے دیوار کا تعاقب کیا۔

دیوار پر پورٹریٹ لگا ہوا تھا۔ کوٹ پینٹ پہنے عبد اللہ سلطان کا، اور ان کے برابر میں نیلوفر سیاہ ساڑھی میں ملبوس تھی۔ مہر کے چہرے پر شرمندگی ابھری۔

"یہ کون ہے؟" احمد نے مہر کی طرف نظریں گاڑیں۔

مہر نظریں چرانے لگی۔

"نی۔۔ نیلوفر۔" اس نے شرم کے مارے کانوں کے پیچھے بال کسے۔

احمد زور سے ہنسنا شروع ہو گیا۔ مہر کا سُرخ چہرہ جھکتا چلا گیا۔

"آپ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ نیلوفر ایک "اچھی" لڑکی ہے۔" اس نے طنز کسا۔

مہر نے چہرے کے تاثرات بحال کیے۔

"احمد۔ نیلوفر کی تصویر کا ہونا ان کے بارے میں کچھ ثابت نہیں کرتا۔" اس نے دفاع کیا۔

"آپ اپنی تصویر کسی ایسی جگہ پر لگوانے کی اجازت دیں گی؟" احمد نے ہاتھ باندھے پوچھا۔ "یا شاید میرے نزدیک "اچھی لڑکی" کی ڈیفی نیشن کچھ اور ہے۔"

مہر لاجواب ہوئی۔ پھر اکتا کر سر جھٹکا۔ وہ آدمی دل کو لاکھ بھلا معلوم ہوتا تھا، مگر اس کی باتیں صحیح معنوں میں تنگ کر کے رکھ دیتی تھیں۔

"بس کر دیں آپ۔ ایک موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ چھان بھین شروع کریں؟"

احمد نے چہرے کے تاثرات نارمل کیے۔

انہوں نے فارم ہاؤس کی تلاشی شروع کی۔ اندر کی طرف ایک کمرہ بنا ہوا تھا۔ اس کا چھپا چھپا چھان مارا۔ الماریوں کے اندر سے زنانہ اور مردانہ کپڑے برآمد ہوئے۔

"یہ مردوں والے تو عبداللہ سلطان کے لگتے ہیں۔ زنانہ کپڑوں کا آپ بتائیں۔ کیا نیلوفر ایسے کپڑے پہنتی ہے؟"

مہر نے آگے بڑھ کر کپڑوں کا جائزہ لیا۔

"ہاں۔۔۔ہے تو یہ نیلوفر کا سٹائل۔" انداز بجھ گیا تھا۔

"میں اب کچھ نہیں کہہ رہا۔ آپ کو برا لگے گا۔" وہ معصوموں سی شکل بنا کر بولا۔

"پہلے تو جیسے آپ نے بڑا لحاظ کیا ہے۔" وہ کپڑوں کو گھور رہی تھی۔ بہر حال کافی صدمے میں تھی۔

"میں اب کیا کہوں۔ ثبوت آپ کے سامنے ہیں۔"

مہر نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ آنکھوں میں کرب سمایا ہوا تھا۔

”جو لوگ میرے دل میں گھر کریں، میں ان کے لیےposessiveہو جاتی ہوں۔“اس کا دل ٹوٹ رہا تھا۔

اس سارے سلسلے میں احمد پہلی مرتبہ ترحم ہوا۔ اس نے صورتحال کا مہر کے زاویے سے جائزہ لیا۔

”وہ مجھے اچھی لگتی تھیں۔ ان آٹھ ماہ میں انہوں نے میرا بڑھ چڑھ کر خیال رکھا۔ مجھے تسلی دی اس وقت، جب مجھے تسلیوں کو سب سے زیادہ ضرورت تھی۔“ وہ پیچھے بڑھی اور بستر پر بیٹھی۔ کندھے ڈھیلے ہوئے۔

”مہر، کبھی کبھار میٹھے لہجے منافقانہ ثابت ہوتے ہیں۔“

مہر نے اسے سر اٹھا کر دیکھا۔

”میں انسانوں کی اچھائی پر مزید بھروسہ کرنا چاہتی تھی۔ مگر یہ انسان بار بار مجھے بیوقوف بناتے ہیں۔ خدا گواہ ہے، میں نے آج تک نیلوفر کے لیے صرف دعائیں کی ہیں۔“

وہ آہستگی سے قدم بڑھاتے اس کے پاس پہنچا۔

”ضروری نہیں، جن سے ہم وفا نبھائیں وہ بدلے میں وفا نبھائیں۔ انسان دھوکہ وہاں سے کھاتا ہے جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوتا۔“

وہ زخمی سا مسکرائی۔ پھر جیسے سب کچھ جھٹک کر کھڑی ہو گئی۔

”بہرحال۔ آپ زیادہ خوش نہ ہوں۔ نیلوفر ہماری دشمن پھر بھی نہیں۔“ اس کا موڈ بہتر ہونے لگا۔

احمد کے ماتھے پر تیوری چڑھی۔

”وہ کیوں؟“

”کیونکہ نیلوفر عافیت زندگی میں کام کرتی ہیں۔ اور جو قرضہ مجھے بھیجا گیا ہے وہ سنابل کی طرف سے ہے۔ اس کا مالک جرمنی میں رہتا ہے۔“

احمد سوچ میں پڑ گیا۔ وہ عورت خود کو دھوکے میں رکھنے کے لیے اتنا کیوں بضد تھیں؟

”اچھا۔ ٹھیک ہے۔ آپ اگلی ملاقات میں وہ کاغذات ساتھ لائیے گا۔ میں پتا کرواؤں گا کہ ماجرہ کیا ہے۔“

وہ دونوں واپس باہر جانے لگے۔

”دوسرے فارم ہاؤس کب جانا ہے؟“

”کل۔ اور ہاں، ہم دونوں ساتھ جائیں گے۔“ احمد نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

”کیوں؟“

”کیونکہ اب وقت آگیا ہے کہ شیطان کے چیلوں کو یقین ہو جائے، کہ میں ان کی گردنیں دبوچنے آچکا ہوں۔“

☆☆☆

حرر کے اندر خوب افرا تفری تھی۔ دو سے تین کے گروہ میں لوگ فرش پر کاغذات پھیلائے بیٹھے تھے۔ خوش گپیاں کرتے ہوئے کام ہو رہا تھا۔ مناج درے کے ساتھ ان سب کے درمیان چل رہی تھی۔ وہ ان انتظامات سے کافی مطمئن تھی۔

"کام شروع ہو گیا ہے۔" مناج کے ہاتھ میں کافی کا کپ تھا۔ "سوشل میڈیا پر کیمپین کا آغاز ہو چکا ہے۔ ہمارا سب سے پہلا قدم ہے شعور پھیلانا۔ ہماری عوام میں اس چیز کا شعور ہو گا تو دشمنوں کے ہاتھ تنگ ہوں گے۔" مناج نے کافی کا گھونٹ بھرا۔

وہ دونوں چلتے ہوئے شیشے کے دروازے تک پہنچ گئے تھے۔ شیشے کے دروازے کے پار حسام سیڑھیوں پر بیٹھا تھا۔ اس کی گود میں نارنجی رنگ کی بلی تھی۔

"تمہیں پتا ہے مجھے خوشی کس بات کی ہے؟ کہ تم دونوں کے اپنے بہت کام ہیں، اس کے باوجود حرر کو وقت دے رہے ہو۔" اس کی بات کا موضوع حسام بھی تھا۔

"مناج۔ ہم نہ جانے کتنا کچھ اپنے لیے کرتے ہیں۔ اپنے لیے اچھے سے اچھے کپڑے خریدتے۔ کتابیں خریدتے ہیں۔ اچھے سے اچھا کھانا کھاتے ہیں۔ اگر تھوڑا بہت ہم ایک مقصد کو دیں تو اس میں کون سی بڑی بات ہے؟"

مناج پھیکا سا مسکرائی۔

"ویسے۔ حسام کیا کرتے ہیں یہاں۔" درے نے بلے کو گلے سے لگاتے ہوئے مرد کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ ہمارا face of campaign ہے۔" مناج نے کافی کا سپ بھرا۔

”کوئی خاص وجہ؟“ درے نے پوچھا۔

”ہاں۔ دیکھو، مجھے ایک چہرے کی ضرورت تو تھی ہی جو ہماری کیمپین کے بارے میں سوشل میڈیا پر بات کرے۔ مجھے حسام مناسب لگا۔ وہ شکل سے تجربہ کار لگتا ہے۔ اس کی شخصیت میں دھیما پن ہے۔ ہمارے سامعین اس سے فوراً ریلیٹ کر سکیں گے۔“ مناج نے درِفشاں کے چہرے کا بغور جائزہ لیا۔

”ہاں دھیما پن تو ہے۔“ وہ سوچ میں غرق بولی۔ ذو معنی مسکراہٹ نے مناج کے چہرے کا احاطہ کیا۔

”دیکھو۔ کیسے بلی کو قابو کیا ہوا ہے۔ وہ بھی گلی کی بلی۔ میں لاکھ کوششیں کر لوں وہ ڈر کے مارے بھاگ جاتی ہیں۔“ اس نے افسوس سے بتایا۔

”تو کیا ہوا۔ جا کر پوچھ آؤ، کہ آخر کیا راز ہے جو بلی اتنی آسانی سے قابو ہو گئی۔“ مناج نے نیم سے شریر انداز میں کہتے کپ لبوں سے لگایا۔

درِفشاں نے اسے اچنبھے سے دیکھا۔

”تم کیا سمجھ رہی ہو؟“ وہ تنک کر بولی۔

”کچھ بھی تو نہیں۔ بات ہی کرنی ہے۔ کر لو۔“ مناج نے شانے اچکائے۔

”میں کیوں ملنے لگی۔“ درِفشاں نے خائف ہوتے کہا۔

مناج نے بظاہر شانے اچکا دیے۔

”مرضی۔“کافی ختم ہو گئی تھی۔”میں چلتی ہوں، جب سے سگریٹ چھوڑی ہے مجھے کافی کا نشہ لگ گیا۔ میں دوسرا کپ بھر کر آئی۔“ وہ مڑ کر چلی گئی۔

دِرفشاں کچھ دیر اس آدمی کو دیکھتی گئی۔ پھر پیچھے مڑ کر نظر دوڑائی۔ مناج آس پاس نہیں تھی۔ اگلے لمحے وہ دروازہ کھول کر باہر جا چکی تھی۔

”ہیلو!“

آواز نے حسام کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ سورج کی کرنیں اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ بلی اس کی گود میں پر سکون ہو کر سو چکی تھی۔

وہ چونکا تھا اسے دیکھ کر۔ بھلا وہ کیوں اس سے ملنے آئی ہو گی؟

”میں ذاتی طور پر آپ کو داد دینا چاہتی تھی۔ حرر کا تعمیراتی کام بہترین ہے۔ میری دوست خوش تھی، تو میں بھی خوش ہوئی۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

وہ سیڑھیوں پر اس کے برابر میں کچھ فاصلے سے بیٹھ گئی اور اس بلی کو دیکھنے لگی۔ اس کا فر نہایت نرم و ملائم معلوم ہوتا تھا۔ درے کا اس کے اوپر ہاتھ پھیرنے کا جی چاہا۔

”شکریہ۔ حرر میرے دل کے بہت قریب ہے۔ اس لیے میں نے اسے بہت محبت سے بنایا ہے۔“ وہ بلی کے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔

درے کو وہ آدمی خوش نصیب لگا، جو کتنی آسانی سے اس معصوم جانور کو چھو رہا تھا۔

”کوئی خاص وجہ، حرر جوائن کرنے کی؟“ اس نے گفتگو کو طول دینا چاہی۔ معاً للچائی نظروں سے بلی کو دیکھتی گئی۔

”جی درِ فشاں۔“

اس نے ادب سے اس کا نام لیا۔ درِ بے اختیار مسکرائی۔

”میں نے زندگی کے دس سال نشے کے ہاتھوں گنوائے۔ جو انسان زندگی ضائع کرنے کے بعد ہوش میں آتا ہے اسے صحیح معنوں میں زندگی کی قدر ہوتی ہے۔ میں اب مزید زندگی ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے کچھ بڑا، کچھ پر مقصد کرنا تھا۔ اور پھر مجھے حرر مل گیا۔“

درِ فشاں کی نظر بلی سے اٹھی اور اس کے چہرے پر ٹکی۔ اس کی آنکھوں میں سنجیدگی کے ساتھ اداسی گھلی ہوئی تھی جو اس کی شخصیت کو پر فسوں بناتی تھی۔ ہاں، وہ واقعتاً نہایت دھیما تھا۔ اس کی سوچ پختہ تھی۔

”میں منزل سے بھٹک گیا تھا۔ اب منزل کی تلاش کرنا چاہتا ہوں۔“

دونوں کی آنکھیں ملیں۔ اور کئی ثانیے ملی رہیں۔ وہ آنکھیں گویا ایک دوسرے کو دیکھنے کے لیے بنی تھیں۔

”میں یہ سبق عموماً اپنے کلائنٹس کو دینے کی کوشش کرتی ہوں۔“ درِ فشاں جیسے غائبانہ حصار میں تھی۔ ”لیکن آپ نے یہ سبق حالات کی درسگاہ سے سیکھا۔ ماضی کے گلٹ سے نجات پانے کے لیے سب سے پہلے خود کو معاف کرنا پڑتا ہے۔“

نظریں پھر بلی کی طرف مرتکب کیں۔

”میں دیکھ رہا ہوں، آپ اس بلی کو کب سے دیکھ رہی ہیں۔“

درِفشاں کھسیانی ہو کر ہنس پڑی۔

”مجھے شرم آ رہی تھی کہتے ہوئے، مگر کیا میں اسے پکڑ سکتی ہوں؟“ گال سُرخ ہوئے۔

حسام کچھ لمحے مبہوت سا اسے تکتا رہا۔ پھر بے اختیار ہنس دیا۔ ایک مدت بعد دل میں ایک شناسا احساس در آیا تھا۔ وہ اس احساس کو بخوبی جانتا تھا۔

”ضرور۔“ وہ بلی درِفشاں کی جانب بڑھانے لگا۔ درِفشاں کے چہرے پر جوش اترا۔ اسے کھلکھلی آنے لگی۔ حسام کے چہرے سے مسکان جدا نہ ہو سکی۔ اسے معلوم ہوتا کہ اس کا کھلکھلانا اتنا خوشگوار ہو گا تو وہ پہلے ہی اسے بلی دے چکا ہوتا۔

”ایسا کرتے ہیں، اس کا نام رکھتے ہیں۔ آپ نام رکھنا پسند کریں گی؟“

درِفشاں بلی سینے سے لگائے اسے تھپک رہی تھی۔

”ایسا کرتے ہیں۔“ آنکھیں سوچ سے چھوٹی کیں۔ ”لونا نام رکھ لیتے ہیں۔“

”جو آپ کہیں۔“ وہ خلوص سے بولا۔

درِفشاں اسے دیکھتے گئی۔ شیشے کے دروازے سے جھانکتی مناج نے ان دونوں کو قہقہے بلند کرتے، مسکراہٹوں کے تبادلے کرتے دیکھ رہی تھی۔ وہ دونوں ایک مکمل تصویر کی طرح تھے۔ مناج بے اختیار مسکرا دی۔

”حرر میں ایکشن کے ساتھ رومانس بھی ہونے والا ہے۔“ وہ زیر لب بڑبڑائی۔



وہ دونوں ریستوران میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ اس سے قبل دو سرے فارم ہاؤس جا چکے تھے، مگر وہ خالی پڑا ہوا تھا، یہاں تک کہ وہاں فرنیچر بھی موجود نہیں تھا۔ وہ دونوں فارغ ہو کر کھانے کے لیے یہاں آ گئے تھے۔

”آپ ماشاء اللہ مجھے برگر ترین ریستوران لائی ہیں۔“ وہ آس پاس کی تیاریوں کا اجائزہ لینے لگا۔

چھت سے لٹکتے فانوس، مدھم سی روشنیاں، اور کانوں میں رس گھولتے وائلن کے سر۔ وہ واقعتا ایک خوبصورت جگہ تھی۔

مہر نے مسکراتے ہوئے سر جھٹک دیا۔ اسے احمد کی عادت ہونے لگی تھی۔

”ایک کاروباری عورت ایسی ہی جگہ پر کھانا کھائے گی۔“ اس نے پلکیں جھپکاتے شان سے کہا۔

”سب چھوڑیں۔ مجھے سنابل کے ڈاکیومنٹس دکھائیں۔“ احمد مدعے پر آیا۔

مہر نے پرس میں ہاتھ ڈالا اور کاغذات نکال کر احمد کے حوالے کیے۔ احمد نے ان کی تصویر کھینچ کر کسی کو بھیجیں۔ پھر نمبر ملاتے فون کان سے لگایا۔ چہرے پر خفگی پھیل گئی۔

”علی۔ میں نے تمہیں ایک ہسپتال کے ڈاکیومنٹس بھیجیں ہیں۔ بظاہر کسی جرمن آدمی کے ہیں۔ مگر مجھے شک ہے کہ بات میں کچھ جھول ہے۔ تم پتا کرواسکتے ہو؟“ وہ کن اکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے لاتعلق سے انداز میں بولا۔

”ہاں احمد۔“ علی نے وقفہ لیا۔ ”ناراض ہو اب تک ؟“

”میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ شکریہ۔“ ناراضی سے کہتے کال کاٹ دی۔

مہر دم سادھے اسے بغور دیکھ رہی تھی۔ تو وہ آدمی سب کے ساتھ ہی ایسا تھا؟ اسے اندر ہی اندر ہنسی آنے لگی۔

”آپ کے ہر طرف اتنے تعلقات کیسے نکل آتے ہیں؟“ اس نے پانی کا گلاس لبوں سے لگایا۔

احمد نے کرسی سے ٹیک لگائی۔

”کیونکہ میں تعلقات بنانے کی کوشش کرتا ہوں۔ آپ ایک کاروباری عورت ہیں۔ اتنا تو جانتی ہوں گی کہ اس دنیا میں احسانات کی تجارت ہوتی ہے۔“

دفعتاً یونی فارم میں ملبوس ویٹر نے ان کی میز پر کھانا رکھا۔ احمد کی طرف سٹیک رکھا اور مہر کو سوشی دی۔

”اب یہ نہ کہیے گا کہ کھانا بھی برگروں والا ہے۔“ اس نے چاپ سٹک اٹھائے کہا۔

احمد نے شانے اچکا دیے۔

”ہے بھی تو کیا ہوا؟ آپ کے ساتھ برگروں والا کھانا کھانے میں کوئی مسئلہ نہیں۔“ وہ سرسری سے انداز میں بولا۔

مگر مہر نے اس جملے کا مطلب سرسری طور پر بالکل نہ لیا۔ کچھ دیر بنا پلک جھپکائے اسے دیکھتے گئی۔

"ویسے، آپ میں اتنی تبدیلی کیسے آگئی اچانک؟ کچھ دن پہلے تک آفس میں رونا دھونا نہیں ختم ہو رہا تھا۔ ہم ابھی فارم ہاؤس سے لوٹے ہیں، اور خالی فارم ہاؤس کو دیکھ کر آپ نے کچھ خاص رولا نہیں ڈالا۔" اس نے سٹیک کا لقمہ حلق سے اتارنے کے بعد کہا۔

"احمد، آپ نے کہا تھا کہ ہم ساتھ ہیں۔" مہر نے سوشی حلق میں اتاری۔ "آپ کے ساتھ سب آسان لگتا ہے۔" وہ سادگی سے بولی۔

مگر احمد کے لیے وہ کوئی سادہ جملہ نہ تھا۔ وہ بھی لمحے بھر کے لیے تھما تھا۔ پھر گردن جھٹک کر کھانے میں مشغول ہو گیا۔

"اور ویسے بھی۔ میں نے شکایتیں کرنا چھوڑ دی ہیں۔" سوشی کا دوسرا ٹکڑا اٹھاتے ہوئے بولی۔ اور مغموم سا مسکرائی۔

احمد نے غور کیا تھا۔ پچھلی بار کی طرح اس بار بھی یہ جملہ کہتے وقت آنکھوں میں تکلیف ابھری تھی۔ وہ اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا تھا جو اسے درد دے رہا تھا؟ لب کھولتا تھا۔ پھر خاموش ہو جاتا۔ کوئی رکاوٹ تھی جیسی۔ کوئی احساس تھا جو اب تک منظر عام پر نہیں آیا تھا۔

اس عورت کے ساتھ فضا پر سکون ہو جاتی تھی۔ اندر کہیں ساری محرومیاں چلی جاتی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وجود کا کوئی کھویا ہوا حصہ مل چکا ہو۔ وہ بے اختیار خوش ہو جاتا تھا۔

کھانا ختم ہو چکا تھا۔ ٹھیک اسی وقت علی کی کال آئی۔ مہر کولڈ ڈرنک کے سپ بھرتے ہوئے اس کا جائزہ لینے لگی۔

"ہاں بتاؤ۔" وہ واپسی نروٹھے پن سے بولا۔

”احمد۔ ناراضگی تھوک دو۔“ علی تڑپ کر بولا۔ ”تم جانتے ہو میں صرف ڈرا ہوا تھا۔“

”مجھے بتاؤ۔ ہسپتال کا مالک کون ہے۔“ وہ اب تک ناراضگی کے خول کے اندر بند تھا۔

”اچھا تو سنو۔۔۔“

یکبارگی احمد کی آنکھیں پھیلیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھا۔ چہرہ جوش و خروش کے باعث سُرخ ہو گیا۔ اس نے کال کاٹ دی۔ آنکھوں میں فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

”آپ کو یقین نہیں آئے گا مجھے کیا پتا چلا ہے۔“ اس کے اوپر جیسے کوئی ولولہ طاری ہوا۔

مہر تشویش میں مبتلا ہوئی۔ بس اب وہ پہیلیاں بجھائے بغیر بات کر دے۔ وہ مزید سر درد برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

”گیس کریں؟“

مہر کے ماتھے کی تیوری چڑھی۔ سارا موڈ غارت ہوا۔ لب کھولے ہی تھے کہ احمد پیٹ پر ہاتھ رکھے قہقہہ بلند کرتے اسے چپ کرانے لگا۔

”مذاق کر رہا تھا۔ بتا رہا ہوں۔“

کیسا شیطانی دماغ پایا تھا اس مرد نے؟ کیوں اسے تڑپا کر اتنی خوشی ملتی تھی اسے؟

”اچھا تو سنے۔“ ہنسی قابو کی۔ چہرے پر سنجیدگی طاری کی۔

مہر نے کان کھڑے کیے۔

”وہ ہسپتال جس آدمی کے نام ہے۔“ وقفہ لیا۔ مہر کو آج سے پہلے کوئی وقفہ اس قدر ناگوار معلوم نہ ہوا۔

”وہ آدمی دس سال پہلے مر چکا ہے!“

کوئی پہاڑ تھے جو مہر کے اوپر ٹوٹ کر برسے تھے۔ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اسے بے اختیار جھرجھری آئی۔ کل تک جس آدمی کو وہ اپنا دشمن سمجھ رہی تھی وہ تو سالوں پہلے مر چکا تھا۔

اوہ خدایا!

”یہ کیسے ممکن ہے؟“ وہ بے اختیار بولی۔ سانس چڑھ گئی تھی۔

”مہر، یہ پاکستان کا قانون ہے۔ اور یہ لوگ اس قانون کے پیچ و خم اچھی طرح جانتے ہیں۔ انہیں راستے بنانا آتے ہیں۔“

مہر اب تک گہرے شاک میں تھی۔

”آپ کا شک نیلوفر اور اس کے ہسپتال پر پہلے سے زیادہ پختہ ہو جانا چاہیے۔“

مہر ٹھنڈی پڑنے لگی۔ آنکھیں پر سوچ ہوئیں۔ واقعتاً نیلوفر کا کردار پہلے سے زیادہ مشکوک ہو گیا تھا۔

”ایک ڈاکٹر اکیلے اتنی دولت جمع نہیں کر سکتا جتنی نیلوفر نے کی۔ کچھ گڑبڑ ہے۔ اور وہ گڑبڑ آپ خود دیکھتی ہیں، جانتی ہیں۔ مگر اس کی اچھائی کی پٹی اتارنا نہیں چاہتیں۔“

وہ باتیں سچ تھیں۔ مگر کس قدر کڑوی تھیں؟

''اب بتائیں۔ کیا کرنا ہو گا؟'' وہ پریشانی سے بولی۔

احمد آگے کو جھکا۔ چہرے پر تناؤ حائل ہوا۔

''اب آپ کا امتحان شروع ہو گا مہر۔ کٹھن امتحان۔'' وہ دھیمی آواز میں بولا۔

مہر کا دل حلق میں آیا۔

''وہ لوگ جان گئے ہوں گے کہ ہم ساتھ ہیں۔ اب وہ اپنی چال چلیں گے۔ اب کھلم کھلا جنگ ہو گی۔ اور سب سے پہلے وہ آپ کی طرف لپکیں گے۔''

مہر کے بند بند کو خوف نے جکڑا۔ احمد کی بھوری آنکھوں میں تنبیہ تھی۔

''میں اتنے دنوں سے آپ کو یہاں سے وہاں لے کر جا رہا تھا۔ میں یہ سب جانتا تھا۔ میں اپنے دشمنوں کے ناموں تک سے واقف ہوں۔ لیکن اگر میں سب کچھ ایک ساتھ بتاتا آپ ہضم نہیں کر پاتیں۔ ایسے سچ خود دریافت کیے جاتے ہیں۔ جن حقیقتوں سے انسان آپ پردہ اٹھاتا ہے وہ دیر تک یاد رہتی ہیں۔''

مہر کو یکدم اس کی ہر ترغیب سمجھ آنے لگی۔

''میں آپ کے ساتھ ہوں۔ مگر مجھے نہیں معلوم وہ آگے کیا کریں گے۔ اور ہو سکتا ہے ہمیں کچھ وقت الگ کیا جائے۔ مہر، آپ کو اپنا بچاؤ خود کرنا ہو گا۔''

وہ پیچھے ہوا۔ کرسی سے ٹیک لگائی۔

''آپ سمجھ رہی ہیں نا؟'' آخر میں وہ مسکرایا۔ ''مجھے یقین ہے آپ دشمنوں کا مقابلہ کر لیں گی۔''

وہ کچھ دیر چپ سادھ کر بیٹھی رہی۔ دماغ میں جیسے مکڑی کے جالے بن چکے تھے۔ مگر پھر بھی، اس ایک مسکراہٹ نے اسے یقین دلایا کہ وہ یہ سب کر سکتی ہے۔

اس نے گردن ہاں میں ہلائی۔

"اب آگے میری ساری باتیں غور سے سنیں اور دماغ میں بٹھالیں۔"

اگلے چند لمحے احمد نے مہر کو چند ہدایات دیں۔

ہدایتیں کیا تھیں؟ تم جلد جان جاؤ گے۔

☆☆☆

رات کا پہر چل رہا تھا۔ قصر کی بالکونی میں لیڈی اقتدار کھڑی، ماہِ کامل کے نظارے تک رہی تھی۔ چہرہ سرد تھا۔ ہاتھ میں وائن گلاس تھا۔ وقتاً فوقتاً وہ سُرخ مائع کے گھونٹ اپنے حلق میں اتار رہی تھی۔

"میم، نیلوفر آئی ہیں۔" پیچھے سے ملازمہ کی آواز آئی۔

اس نے سر جھکائے سبزہ زار کو دیکھا۔ خوبصورتی سے تراشے گئے گھاس کے پتلے روشنیوں میں دمک رہے تھے۔ ہر سو ہر دم خاموشی تھی۔ طوفان سے پہلے کی خاموشی۔ وہ طوفانوں میں بسنے والوں میں سے تھی، ایک نئے طوفان کی آمد سے ڈر جانا اس کے شایانِ شان نہ تھا۔

"بھیجو۔" سُرخ مائع حلق میں اتارا۔

لمحے بیت گئے۔ وہ آنکھوں میں اسی گہرائی کے سنگ ماہِ کامل کو تکتی گئی۔ نیلوفر کی ہیلز کی چاپ نے اس کے آنے اطلاع دی۔ وہ پیچھے نہ مڑی۔

"تم وہ لے آئی، جو مجھے چاہیے تھا۔" آخری سپ بھرا اور پیچھے مڑ کر نیلوفر کو دیکھا۔

نیلوفر کے چہرے پر گھبراہٹ کے واضح آثار تھے۔

"جی لیڈی۔ لے آئی ہوں۔" آواز میں بے چینی۔

لیڈی اقتدار نے آنکھیں سکیڑیں اور نیلوفر کو کئی ساعتوں کے بیت جانے تک دیکھا۔

نیلوفر کی نگاہ اس گلاس پر گئی۔ آنکھوں میں خفیف سی حیرانی ابھری۔ لیڈی اقتدار سادگی سے مسکرائی۔

"پینی پڑتی ہے، نیلوفر۔ پینی پڑتی ہے۔ جب دل بھاری ہو جائے، دماغ پر ہر طرح کے خیالات وار کریں، تب پینی پڑتی ہے۔" وہ آنکھوں میں چمک لیے بولی۔

نیلوفر کے اندر کوئی ہلچل سی مچ رہی تھی، جیسے کوئی صحرا ہو اجس پر تیز ہوائیں چل رہی ہوں، خاک کے ریلے یہاں وہاں منتشر ہوں۔ اس کے دل میں بھی ایسی ہی دھند پھیلی ہوئی تھی۔

"لاؤ، دو مجھے۔" لیڈی اقتدار نے جھری زدہ ہاتھ آگے بڑھایا۔

نیلوفر نے جھک کر اس "چیز" کو دیکھا۔ اس کے دل کو کسی نے مٹھی میں جکڑا تھا۔ مگر اس نے وہ لیڈی اقتدار کے حوال کر دیا۔ دوسری طرف لیڈی اقتدار کو تشویش ستانے لگی۔

"تم کس چیز سے ڈر رہی ہو، نیلوفر۔" اسے مٹھی میں دبوچ کر بولی۔

نیلوفر نے پر فسوں سانس خارج کی پھر چاند کی اور رُخ کیا۔

"تم ایمانداری کے ساتھ سچ بتاؤ۔ تم میری ٹیم ہو، میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔" وہ پیچھے سے بولی۔

وہ محویت سے چاند کو تکتے ہوئے بالکونی کے کونے تک پہنچی۔ دل بھاری ہو رہا تھا۔ آنکھیں مغموم تھیں۔

"اس کے بعد مہر جرائم کی دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پھنس جائے گی۔" نیلوفر کی آواز خلاء سے نکلی۔

لیڈی اقتدار نے گہری سانس لی۔ وہ اس کے برابر میں پہنچی۔

"وہ سادہ سی زندگی گزارتی تھی۔ اسے عبداللہ کے دھندھے کے بارے میں کوئی علم نہ تھا۔ عبداللہ نے کبھی اسے اس طرف نہیں لگایا۔ ہم اسے برباد کر رہے ہیں۔" اس نے سچائی کے ساتھ سب بتایا۔

لیڈی اقتدار نے نیلوفر کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھا۔

"تم مہر کی وجہ سے اداس نہیں۔ تم اپنی وجہ سے اداس ہو۔" وہ نرمی سے کلام ہوئی۔

وہ الفاظ نہیں تھے، وہ آئینہ تھا جو لیڈی اقتدار نے اسے دکھایا تھا۔ اس کی خوبصورتی اور حسن کے بجائے وہ آئینہ اسے ایک بدصورت اور بدبودار عکس دکھا رہا تھا۔ بعض حقیقتیں وہ نہیں ہوتیں جو نظر آتی ہیں۔

"مہر کی بربادی قریب محسوس کر کے تمہیں اپنی بربادی یاد آ رہی ہے، نیلوفر۔"

نیلوفر نے نظریں پھیر کر آنکھیں میچیں۔ اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ بصیرت بھی اندھیر تھی۔ زندگی بھی اندھیر تھی۔

''اندھیروں میں بس جانے والے روشنی کی خواہش کرتے اچھے نہیں لگتے۔'' آواز نرم تھی، مگر اس میں ڈھکی چھپی تنبیہ تھی۔

''تم بہت آگے نکل گئی ہو۔ پیچھے مڑ کر دیکھو گی، تب بھی صرف اندھیرا نظر آئے گا۔''

نیلوفر نے آنکھیں کھولیں۔ لیڈی اقتدار ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔ ہر طرف اندھیرا ہی تو تھا۔ کہاں تھی روشنی؟ وہ روشنی کے چلے جانے کا گلہ بھی نہیں کر سکتی تھی، کیونکہ اس نے خود انہیں بے دخل کیا تھا۔

''میں بھی ایک زمانے میں تمہاری جگہ کھڑی تھی۔'' وہ اداس سا مسکرائی۔

نیلوفر نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔ یہ نظارا ہر گز عام نہ تھا۔

''میں تیرہ سال کی تھی جب بابا نے مجھ سے میری زندگی کا پہلا قتل کروایا تھا۔ میں نے ہفتوں تک سوگ منایا۔ مجھے احساس ہوا کہ میری پرورش صرف اس لیے کی گئی تا کہ ایک دن میں ان کے شانہ بشانہ چل سکوں۔ بہت اذیت ناک راتیں جھیلی ہیں میں نے۔ خود سے نفرت محسوس کی ہے۔ رات بھر آنسو بہائے ہیں۔ لیکن مجھے اس سب سے نکلنا پڑا۔ سالوں بعد، مجھے احساس ہوا کہ اس دنیا میں زندگی صرف ہمارے جیسے لوگ جی سکتے ہیں۔'' وہ خاموش پڑی۔

اداسی فنا ہوئی۔ چہرے پر اعتماد در آیا۔

”جو لوگ اقدار اور اصولوں کی پاسداری کرتے ہیں، ان کی کیا وقعت ہے؟ دیکھو تم نظر دوڑا کر۔ ہر طرف تمہیں مایوس عوام نظر آئے گی، جو بنیادی ضرورتوں کے لیے خاک چھان رہی ہے۔“ گردن سیدھی کی۔

چہرہ تن چکا تھا۔ وہ واپسی چاند کو تک رہی تھی۔

”مہر کو بھی ایک دن عادت ہو جائے گی۔ وہ اس دنیا میں بس جائے گی۔ وہ اسی دنیا کی ہو کر رہ جائے گی۔ تم خود کو ایک جنگ کے لیے تیار رکھو۔“

اس نے قدم پیچھے بڑھائے۔ نیلوفر کو ایسے دیکھا جیسے اسے خبردار کر رہی ہو۔

”کیونکہ جو ہم کرنے والے ہیں، اس کے بعد کچھ بھی پہلے جیسا رہنے نہیں والا۔“



ایک ہفتے بعد:

دوپہر کا وقت تھا۔ سورج کی طلائی کرنیں لاؤنج کے صوفے پر نچھاور ہو رہی تھیں، جس پر مہر براجمان تھی۔ ٹھنڈ کے دن تھے، اس لیے یہ گرمی اسے راحت پہنچا رہی تھی۔

عین اسے وقت ملازمہ لاؤنج میں آئی۔ اس کے ہاتھ میں خط دیکھ کر مہر کا دل باغ باغ ہوا۔ لمبے عرصے بعد ماں کو محسوس کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ زندگی میں مسرتیں لوٹ آئی تھیں۔

”میم آپ کی والدہ کی طرف سے خط آیا ہے۔“ مہر نے وہ خط تھام کر ملازمہ کے جانے کا انتظار کیا۔

جہاں ماں کا خط خوشگوار سا تاثر چھوڑتا تھا وہاں کئی مدفن تکالیف کو ابھرنے پر مجبور کرتا۔ مگر اب تو ان تکلیفوں کو عادت ہو گئی تھی۔ اور جب تکلیفوں کی عادت ہو جائے تو وہ اپنی حیثیت کھو دیتی ہیں۔

مہر نے لفافے سے بھورا کاغذ نکالا اور خط پڑھنا شروع کیا۔

”ہماری شہزادی!

ہم امید ہی کر سکتے ہیں کہ آپ خیریت سے ہوں گی۔ آپ کو تکلیف میں دیکھنے کا تصور ہی ہماری روح جھنجھوڑ دینے کے لیے کافی ہے۔

ہم روز آپ کا انتظار کرتے ہیں۔ رات کو اسی امید کے ساتھ سوتے ہیں کہ صبح آنکھ کھلے گی تو آپ ہماری آنکھوں کے سامنے ہوں گی۔ مگر آپ نہیں آتیں۔ اور شاید کبھی نہ آئیں۔ ہمارے بیٹے ملک سے باہر ہیں۔ ہمارے سر پر چند آیاؤں کو مسلط کر گئے۔ کیا ایک ماں کے لیے یہ کافی ہے؟

مہر ایک خبر ہے، جو ہم آپ کو دینا تو نہیں چاہتے تھے، مگر اب مجبور ہو گئے ہیں۔ ہمیں سٹیج فور بریسٹ کینسر ہے۔ شوگر کی وجہ سے ہماری کیمو ہونا ناممکن ہے۔ کینسر نے ہمارے جسم کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ ہمارے اعضاء ہمارے خلاف کام کر رہے ہیں۔ ہم آنکھیں کھولتے ہیں تو ناامیدی کی دھند کے سوا کچھ بھی نہیں دیکھتے۔ کیا ہماری آخری خواہش مان کر، آپ ہم سے ملنے نہیں آ سکتیں؟ کیا ہمارے آخری دنوں میں ہمارے ساتھ قیام نہیں کر سکتیں؟

ہمارے آخری ایام آپ کی یاد میں کٹ جانے والے ہیں۔

وہ جو بہت جلد اس دنیا سے رخصت ہونے والی ہے۔

آپ کی والدہ، شمائلہ عظیم۔"

مہر ہاتھ میں وہ خط تھامے کسی بت کی طرح بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے اور اس خط پہ ٹپ ٹپ برس رہے تھے۔ مہر کی روح کو سنگین پچھتاوے نے جکڑ لیا۔ وہ گہرے رنج میں مبتلا تھی۔ نادیدہ بوجھ اس کے دل پہ سوار ہو گیا تھا۔ وہ اس بوجھ زدہ دل کے ساتھ بھلا کیسے جی سکتی تھی؟ وہ کیسے اس پچھتاوے سے جان چھڑا سکتی تھی؟

کاش کھویا ہوا وقت لوٹ سکتا۔ کاش!

کاش زندگی دہرانے کا ایک موقع مل سکتا۔ اگر مل جاتا تو وہ کبھی اپنی ماں کو تنہائیوں کے سپرد نہیں کرتی۔

مگر زندگی آگے بڑھنے کا نام ہے۔ وہ رکتی نہیں ہے۔ نہ ہر کسی کو فراخ دلی سے موقع دیتی ہے۔ اس کے اپنے اصول ہیں، اپنے قوائد ہیں۔

مہر کو اس لمحے اپنے آپ سے نفرت محسوس ہوئی۔ اس کی پوری زندگی سوالیہ نشان بن گئی تھی۔ وہ اچھی باس نہیں تھی، اچھی ماں نہیں تھی، اور وہ اچھی بیٹی بھی نہ بن سکی۔

خط اس کے ہاتھوں سے پھسل کر گود میں جا گرا۔ مہر گیلی سانس اندر کھینچتے کھڑی ہوئی تو وہ خط زمین پہ گر گیا۔ اس نے پیر چپلوں میں گھسیڑے۔

چند لمحے بعد وہ گاڑی میں سوار تھی۔

اسے کسی چیز کا ہوش نہ رہا تھا۔ جن رکاوٹوں نے اسے ماں کے گھر جانے سے روک دیا تھا وہ سب کی سب چھوٹی ہو گئیں۔

اس نے گاڑی ماں کے گھر کے سامنے روکی۔ حواس باختہ سے عالم میں وہ گاڑی سے اتری اور اندر چلی گئی۔

اسے گھر کے گارڈز تک نے اسے اندر جانے سے نہ روکا۔

اس کا دماغ بالکل سن تھا۔ اسے کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ تو اس بات سے بھی انجان تھی کہ اس گھر میں اس کی ماں کا کمرہ کون سا تھا۔۔۔ اف مہر۔۔۔!

وہ ہر کمرے کا دروازہ کھولتی اور دیوانہ وار ماں کو تلاش کرتی۔ اور بالآخر اسے ایک کمرے میں وہ نظر آ گئیں۔ بستر پر لیٹی، کمزور اور بوڑھی ماں۔ دل پر جیسے خنجر چل پڑے۔

آنسوؤں کا سلسلہ جاری ہوا۔ اسے لگا جیسے وہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکے گی۔ اسے لگا جیسے وہ اپنی ماں کا سامنا نہیں کر سکے گی۔ وہ ایک دفعہ پھر سے بھاگ جانا چاہتی تھی، ٹھیک اسی طرح سے جس طرح وہ ہمیشہ اپنی ماں سے بھاگتی رہی تھی۔

ہر قدم بڑھانا اس کے لیے مشکل تر ہوتا گیا، وہ اپنے آپ سے جنگ لڑتی گئی۔ ان کے سرہانے کھڑے ہو کر ان کے نورانی چہرے کو دیکھا، جس پر نہ جانے کتنی لکیریں تھیں۔ اس کی آنکھوں میں ان کے لیے محبت جھلکتی تھی۔ سالوں کی دبی وہ محبت جس سے مہر بھاگتی رہی تھی، اس ہی محبت نے آج جوش لیا تھا۔ وہ ان کے سرہانے زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔

”ماں!“ مہر نے بالکل دھیمی سی آواز میں کہا۔ آنسوؤں کا ایک پھندا حلق میں نگلا۔

یک دم شمائلہ کی آنکھ کھلی۔ اپنے سامنے اپنی بیٹی کو دیکھ کے ان کی آنکھیں بے یقینی سے پھیلنے لگیں۔ ڈھیروں جدوجہد کر کے وہ اٹھ کر بیٹھیں۔ مہر کھڑی ہوئی اور ان کے سامنے بستر پر بیٹھ گئی، وہ ان سے نظریں نہیں ملا پا رہی تھی، وہ اب بھی شرمندہ تھی۔

وہ آنکھوں میں تعجب لیے مہر کو اوپر سے نیچے دیکھنے لگیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ مہر کو صدیوں کے انتظار کے بعد دیکھ رہی تھیں۔ آنکھوں میں محرومی اور چہرے پہ ترسا ہوا سا تاثر تھا۔

وہ بے یقینی کے عالم میں بھاری سانسیں لینے لگیں۔ انہیں پلک جھپکنے سے خوف آرہا تھا۔ کہ کہیں یہ کوئی خواب، کوئی سراب نہ ہو جو پلک جھپکتے ہی تمام ہو جائے۔

"مہر!" شمائلہ اونچی سانسیں لیتے ہوئے بولیں۔

"کہہ دیں، یہ خواب نہیں ہے!"

مہر نے شفقت سے شمائلہ کے جھری زدہ چہرے پہ ہاتھ پھیرا۔ وہ اداس سا مسکرا دی۔ سالوں سے جو دیوار ان دونوں کے بیچ میں نافذ تھی وہ آج ڈھے گئی۔ اسے محبت نے نہیں، محبت کو کھو دینے کے خوف نے گرایا تھا۔

"میں آپ کو اپنے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لے جانے آئی ہوں۔" مہر نے آنسوؤں کا ایک اور پھندا نگلتے کہا۔

"آج ہم مکمل ہو گئے ہیں مہر۔ اب ہم سکون سے مر سکیں گے۔" شمائلہ نے مہر کے شفاف چہرے پر نرمی سے ہاتھ پھیرا۔

مہر پھر سے رونے لگی۔

"کہیں نہیں جائیں گی آپ۔" مہر نے اپنے آنسو پونچھتے کہا۔

"کتنی بڑی ہو گئیں ہیں آپ۔ اور خوبصورت بھی۔ کیا واقعی آپ ہمیں نہیں چھوریں گی؟" شمائلہ کی آنکھوں میں اب بھی بے یقینی تھی۔

"نہیں! اور ہم آپ کے کینسر کا علاج کروائیں گے۔ آپ کو کچھ نہیں ہو گا، ماں۔ مجھے جو کرنا پڑا میں کروں گی۔"

شمائلہ کی مسکراہٹ ڈھیلی پڑی۔ ماتھے پر لکریں ابھریں۔ چہرے پہ الجھن لیے وہ مہر کو دیکھنے لگیں۔

"کون سا کینسر؟" شمائلہ نے جیسے ہی پوچھا تو مہر کرنٹ کھانے والی انداز میں کھڑی ہوئی۔

وہ اداسی، وہ سالوں بعد ملنے کی بے خودی ہوا ہوئی۔ اب سر پہ صرف اور صرف خطرہ منڈلانے لگا۔

"آپ نے خط بھیجا تھا؟ ماں آپ نے بتایا تھا آپ کو کینسر ہے؟" مہر بلند آواز میں بولی۔

سکون پذیر فضا میں انتشار گھلا۔ خوشیاں ایک ایک کر کے خاک ہونا شروع ہوئیں۔

"نہیں مہر ہم نے آپ کو کوئی خط نہیں بھیجا۔ ہم صحت سے ہیں!" شمائلہ نے بھی اونچی آواز میں جواب دیا۔

اور مہر۔۔۔ وہ جہاں تھیں وہیں کھڑی رہ گئی، اسے سب کچھ سمجھ آنے لگا۔

''ہم نے شکایتیں کرنا چھوڑ دیں ہیں۔۔۔'' مہر کے دماغ میں وہ قول آپ ہی دہرایا۔

''ہم نے شکایتیں کرنا چھوڑ دی ہیں۔''

ماں نے شکایتیں کرنا چھوڑ دی تھیں۔ لیکن۔

لیکن اس خط میں شکایتیں تھیں۔ وہ کیوں نہ سمجھ سکی؟

مہر نے نظر اٹھا کر شمائلہ کو دیکھا جو کہ بری طرح سے الجھی ہوئی تھیں۔ اسے احساس ہوا جیسے اچانک سے شمائلہ کی آنکھوں میں خوف منڈلایا تھا۔ اسے ان کی آنکھوں میں کسی کا عکس دکھائی دیا۔

''مہر پیچھے دیکھیں!'' شمائلہ چلائیں۔

بھاری شے اس کی سر کی پشت سے ٹکرائی۔ مہر کے کان بجنے لگے۔ وہ جھٹکا کھا کر گھٹنوں کے بل زمین پہ جا گری، اس کا سر بے اختیار جھک گیا۔ تکلیف اتنی زیادہ تھی کہ مہر اپنا سر اٹھا نہیں سکی۔ اس کی پلکیں بھاری ہوئیں۔ آنکھوں کے سامنے دھند پھیل گئی۔ سارا منظر گڈ مڈ ہونے لگا تھا۔

''مہر!'' شمائلہ کی آواز مہر کے کانوں میں گونجی۔

مہر کا سر بھاری ہوتا چلا گیا۔ آوازیں آنا بند ہوتی گئیں۔ دھند بڑھتی چلی گئی۔

''اٹھاؤ ان دونوں کو۔'' پیچھے سے آواز گونجی۔ آواز شناسا تھی مگر دماغ اس قدر مفلوج تھا کہ وہ آواز پہچان نہ سکی۔

اس کو محسوس ہوا، جیسے کسی نے اس کے بازو تھامے تھے۔ سر کے اوپر دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ اور ایک وقت آیا کہ مہر نے اپنا آپ اندھیروں کے سپرد کیا۔



لیڈی اقتدار اپنے دراز کمرے میں سنگھار میز کے سامنے کھڑی تھی۔

اس نے سفید ماتو پہنا ہوا تھا۔ گردن پر پتھروں کی خوبصورت مالا۔ اس نے لبوں پر لپ سٹک کا رنگ گہرا کیا۔

سفید ہیلز پر شاہانہ سی چال چلتی وہ قصر کے ڈرائنگ روم تک پہنچی۔ ایک لڑکی صوفے پر بیٹھی، اس کے منتظر لگ رہی تھی۔ لیڈی اقتدار شانِ بے نیازی سے سربراہی صوفے پر بیٹھی۔

''کیا نام بتایا تھا تم نے؟'' لیڈی اقتدار کے انداز میں مصنوعی نروٹھا پن تھا۔

اپنی انگلی کو کنپٹی کی طرف لے کر گئی جیسے یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

''درفشاں۔'' وہ درفشاں تھی۔ آنکھوں میں ٹھنڈا تاثر لیے، چہرے پر پُراعتماد، مگر بے رحم مسکراہٹ سجائے وہ گویا ہوئی۔

لیڈی اقتدار کے لب اوہ میں ڈھل گئے۔

''میرے گارڈز بتا رہے تھے کہ تمہارے پاس کچھ ایسا ہے جس سے مجھے بہت فائدہ ہوگا؟'' لیڈی اقتدار نے روایتی مغرور انداز اختیار کیا۔

''صرف یہی نہیں۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں بدلے میں بہت کچھ چاہتی ہوں۔'' وہ عام درفشاں سے مختلف لگتی تھی۔ اس کے انداز میں عام درفشاں جیسی نزاکت تھی نہ ہی اپنائیت۔ اس کی شخصیت میں صرف اور صرف بے دردی اور بے رحمی تھی۔

"اور تمہیں کیا چاہیے؟" لیڈی اقتدار نے بھنویں اٹھا کر کہا۔

"دولت اور طاقت۔ دیں گی؟" درفشاں آنکھوں میں چمک لیے بولی تھی۔ لیڈی اقتدار زیر لب ہنس دی۔

پھر مسکراہٹ دبائے چہرے پہ سنجیدگی طاری کیے وہ درفشاں کا جائزہ لینے لگی۔

"میں اپنی دولت مفت میں بانٹا نہیں کرتی۔ پہلے خبر بتاؤ۔" لیڈی اقتدار نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"آپ کے کالے دھندے کے بارے میں کچھ لوگ ہیں جو جانتے ہیں۔ تحریک حرر کے بارے میں سنا ہے آپ نے؟ وہ لوگ آپ کا نام، آپ کا کام، سب جانتے ہیں۔" درفشاں کے چہرے پہ مختصر مسکراہٹ تھی۔

لیڈی اقتدار کچھ سوچ میں پڑ گئی۔

"تو کیا مجھے ان کے علم سے ڈرنا چاہیے؟" لیڈی اقتدار نے اپنے آپ کو پر سکون ظاہر کیا۔

"بالکل۔ کیونکہ وہ لوگ آپ کے خلاف سازشیں رچیں گے۔ وہ آپ کو تباہ و برباد کرنا چاہتے ہیں۔ مگر" درفشاں کی مسکراہٹ گہری پڑی۔

"مگر؟" لیڈی اقتدار نے جواباً مسکرا کر درفشان کو دیکھا۔

"مگر اگر آپ مجھے اپنا دوست بنا سکتی ہیں۔" درفشاں معنی خیز انداز میں بولی۔ "میں آپ کو سب کچھ صحیح وقت پر سب کچھ بتاتی رہوں گی اور بدلے میں مجھے چاہیے دولت اور طاقت۔ بے شمار دولت، اور

بے شمار طاقت!" درفشاں کی آنکھوں میں آگ تھی۔ یہ شعلہ باز آنکھیں اس سے پہلے کسی نے نہ دیکھی تھیں۔

"مجھے تمہاری بات پر بھروسہ نہیں۔ پہلے میں تمہارا امتحان لوں گی۔ مجھے کچھ ایسا بتانا جو کہ مجھے فائدہ پہنچائے۔ اس کے بعد تمہاری دوستی کی آفر کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔" لیڈی اقتدار نے کہا ۔ درفشاں کی مسکراہٹ برقرار رہی۔

اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور کھڑی ہونے لگی۔

"میرا انتظار کریں، لیڈی۔ میں آپ کی شانِ حضور ایک خبر جلد پیش کروں گی۔" چہرے پہ سرد سا تاثر لیے وہ ڈرائنگ روم سے قدم بڑھانے لگی۔ لیڈی اقتدار متاثر کن نگاہوں سے اس پر اعتماد لڑکی کو جاتے دیکھ رہی تھی۔

"تو یعنی کھیل دلچسپ ہو جانے والا ہے۔" اس نے زیر لب تبصرہ کیا۔

درفشاں یوسف نے قصر کا صدر دروازہ عبور کیا۔

آنکھوں میں لگن اور جنون لیے وہ قصر سے دور جانے لگی۔

وہ واقعی درفشاں کا مختلف روپ تھا۔

وہ روپ، جو کسی کے وہم و گمان میں نہ تھا!

☆☆☆

باب ہشتم: ”بازار، انسانوں کا“

وہ لوگ جو ہم سے اوپر ہیں،

جو دولت مند ہیں،

جو طاقت ور ہیں،

وہ جو چاہے وہ کرتے ہیں۔

ہم جیسے لوگ،

تمہارے جیسے،

میرے جیسے،

انہیں ہماری پرواہ نہیں۔

ہم ان کی سڑکیں بناتے ہیں،

ہم ان کی جنگیں اور سب کچھ لڑتیں ہیں،

لیکن وہ،

وہ ہماری پرواہ نہیں کرتے۔

(سپائڈر مین ہوم کمنگ کا ولچر)



سبزہ پہاڑی کی اونچائیوں پر لکڑی کی جھونپڑی کھڑی تھی۔ آس پاس زمین ڈھلان زدہ تھی۔ دور کہیں گھنے درخت نظر آتے تھے۔

سورج کی کرنیں کھڑکیوں کو پار کر کے ایک کمرے پر مشتمل جھونپڑی میں داخل ہوئیں۔ بھورا فرش طلائی دکھائی دیا۔ کونے میں سٹریچر دھرا ہوا تھا جس پر شمائلہ کا بے ہوش وجود تھا۔ ان کے سرہانے ایک عورت کھڑی، دیکھ بھال کر رہی تھی۔

کمرے کے وسط میں کرسی پر مہر بنتِ عبداللہ سلطان بیٹھی تھی، ہاتھ اور پاؤں رسیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ بے ہوشی کے باعث گردن جھکی ہوئی تھی۔ لمبے سیاہ بال چہرے پر جھالر کے مانند بکھرے ہوئے تھے۔

اس کے سامنے، چہرے پر جارحانہ تیور چڑھائے شمس کھڑا تھا۔ ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا جگ تھا۔ ایک جھٹکے میں اس نے سارا پانی مہر کے چہرے پر انڈیل دیا۔ مہر اونچی آواز میں سانس خارج کیے بے ہوشی کے غلبے سے نکلی۔ سیاہ بال چہرے پر چپک گئے تھے۔

دماغ سن تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں، چہرے پر چپ چپاہٹ محسوس ہوئی، جس کے باعث منظر سیاہ تھا۔ کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے ہاتھ کی مدد سے بالوں کو پرے دھکیلنا چاہا۔ ہاتھوں کی رسی سے رگڑ ہوئی، ہتھیلیوں پر جیسے مرچیں لگیں۔ اس وقت مہر بنتِ عبداللہ سلطان کو احساس ہوا کہ وہ بندھی ہوئی تھی۔

یکے بعد دیگرے یادیں لوٹ آئیں۔ اس کے دماغ میں کچھ گھنٹے پہلے کا منظر دوڑا۔

مہر کے اندر انتشار برپا ہوا۔ اس نے اور زوروں سے رسی پر ہاتھ رگڑے۔ وہ پوری قوت سے چلانا چاہتی تھی، مگر منہ میں کاغذ ٹھونسا ہوا تھا، جس کے باعث ہر چیخ وہیں دب جاتی۔ اسے ماں کی فکر ستانے لگی۔ بس اتنی سی خوشیاں تھیں اس کی؟ آئیں اور چلی گئیں۔ نہ جشن منانے کا موقع دیا نہ گلے شکوے دور کرنے کا انتظار کیا۔

مہر کو احساس ہوا کہ کسی کا ہاتھ اس کے سر کو چھو رہا تھا۔ اس بھاری اور طاقتور ہاتھ کو وہ پہچان سکتی تھی۔

مہر کے اندر خوف ابلنے لگا تھا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ زور سے چلانے لگی تھی۔ اتنی زور سے کہ اس کے حلق میں درد ہونے لگا۔

شمس نے مہر کے چہرے پہ بکھرے بالوں کو منظر سے ہٹا کر کان کے پیچھے کیا۔ مہر سارا منظر ٹھیک سے دیکھ سکتی تھی۔ یہ کمرہ اس کے لیے انجان تھا۔ وہ یہاں پہلی بار لائی گئی تھی۔ مگر جانتی نہیں تھی، وہ یہاں آخری دفعہ بھی لائی گئی تھی۔

شمس کے آزو بازو دو مرد کھڑے تھے۔

شمس نے اس کے منہ سے کاغذ کھینچ کے نکالا۔ مہر کے لب آزاد ہوئے۔

”میری ماں کدھر ہے!“ مہر پوری قوت سے چلائی تھی۔

”بتاؤ مجھے میری ماں کدھر ہے!“ ماں کا خیال ہر خوف پر غالب آیا۔

”بتاؤ مجھے ورنہ، میں تمہیں کچا چبا۔۔۔“

مہر کے الفاظ اس کے منہ میں رہ گئے۔۔۔ ہوا ہی کچھ یوں تھا۔

شمس نے مہر کے منہ پہ جان لگا کر تھپڑ مارا۔ تھپڑ اتنا زور دار تھا کہ مہر کا سر ترچھا ہو گیا تھا۔ اس کا دماغ سن سا ہو گیا۔ اس کے لب کھلے کے کھلے رہ گئے تھے۔ ترچھا منہ کیے، چہرے پر بے یقینی لیے وہ برف کی بن گئی تھی۔

"بالکل چپ!" شمس نے مہر کو بالوں سے پکڑ کر اس کے منہ کو سیدھا کیا۔

مہر نے تکلیف بھری سسک جاری کی۔

"باس۔ لیڈی نے کہا تھا، زیادہ سختی نہیں کرنی ہے۔" شمس کے برابر میں کھڑے مرد نے کہا۔

اس کی پیشانی کے بل ڈھیلے پڑے۔ ٹھیک اسی وقت مہر کے دماغ میں ایک بتی جلی۔

"باس، لیڈی نے کہا تھا۔۔۔" مہر کے دماغ میں وہ الفاظ گونجنے لگے۔ "باس، لیڈی۔۔۔"

شمس نے مہر کی کرسی اچانک سے گھمائی۔ مہر کے خیالات کا تسلسل ٹوٹا۔ وہ ایک دم سے ہڑبڑا گئی۔

اس کی آنکھوں کے سامنے اسٹریچر پر اس کی ماں کا بے ہوش وجود تھا۔ اس کے چہرے پر نرمی در آئی، آنکھوں میں ترسا ہوا سا تاثر۔ تو وہ لوگ اس کی ماں کو بھی لے آئے تھے۔

وہ کتنے ہی لمبے انتظار کے بعد اپنی ماں سے مل رہی تھی، اور آخری وقت میں ہی دونوں کو جدا کر دیا گیا۔ ابھی تو دونوں نے اپنے ملن کا جشن تک نہ منایا تھا۔

مہر بنتِ عبداللہ سلطان کے نصیب میں ہر خوشی اتنی عارضی کیوں ہوتی ہے؟

”دیکھو۔“ شمس نے اب انداز پر سکون رکھا۔

”تمہاری ماں بالکل ٹھیک ہے۔ ہم اسے کچھ نہیں کریں گے۔ تم سمجھ رہی ہو؟“ مہر آنکھوں میں محرومی سے لبریز تاثر لیے اپنی ماں کے بے ہوش وجود کو دیکھے جا رہی تھی۔

وہ کتنی بدنصیب تھی۔ سالوں بعد ماں سے ملنے کی جرات ہوئی، اور وصل کے لمحات ظالمین کی نذر ہو گئی۔

”سمجھ رہی ہو نا؟“ شمس دوبارہ سے بولا۔ اب کی بار انداز تھوڑا سخت ہوا۔

مہر نے کرب کے مارے آنکھیں میچ لیں۔

”میری ماں کا کیا قصور تھا؟ ان کے ساتھ کیوں کر رہے ہو ایسا؟“ آواز گیلی تھی۔ بند آنکھوں کی سمت آنسو نکلا۔

”ہم نے تمہاری ماں کو ہمیشہ کے لیے قید میں نہیں ڈالا۔ تمہیں ہمارا چھوٹا، بہت چھوٹا کام کرنا ہو گا۔ اس کے بعد ہمارے راستے جدا جدا۔“ شمس نے ایک مرتبہ پھر سے انداز نرم بنایا۔

مہر اپنے آپ کو پر سکون کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

آنکھیں بند کیں، اسے احمد کا چہرہ نظر آیا۔ وہ اسے اس گھڑی کے لیے تیار کر چکا تھا۔ اسے اس کی ساری باتیں یاد آئیں۔

مہر نے آنکھیں بند کیے ذہن پر زور ڈالا۔

”میں ہوں نا آپ کے ساتھ۔“ احمد کے وہ نرمی سے کہے گئے الفاظ اس کے دماغ میں گونجے۔

ایک دفعہ پھر اس کی آنکھیں نم پڑیں۔

وہی تو نہیں تھا اس کے ساتھ، وہ اب کیا کرتی۔ وہ اکیلے ان سب کا کیسے مقابلہ کرتی؟

اسے احمد شدت سے یاد آیا۔

"میری برداشت ختم ہو رہی ہے۔" شمس کو تپ چڑھنے لگی تھی۔

"بتاؤ بھی۔ کیا تم وہ سب کرنے کے لیے تیار ہو جو ہم کروانا چاہتے ہیں؟"

"آپ نے اپنے دماغ کو حاضر رکھنا ہے مہر۔ چھوٹی سی چھوٹی اور معمولی سی معمولی تفصیل پر غور و فکر کریں۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا اور اب دہرا رہا ہوں۔ یہ تفصیلات ہمیں ہمارے دشمن کے قریب لے جائیں گی۔"

احمد کا جملہ دماغ میں گردش کرنے لگا۔

مہر نے اپنی آنکھیں کھولیں، اب کی بار آنکھوں میں خوف نہیں، اطمینان تھا۔

وہ اس کے ساتھ نہ ہو کر بھی اس کی مدد کر رہا تھا۔

وہ اس کے پاس نہ ہو کر بھی اس کی ہمت بن چکا تھا۔

اس نے اپنی گردن اٹھائی۔ سرد، پر اطمینان نگاہیں بے صبر سے شمس کے اوپر ڈالیں۔ مہر کے چہرے پہ سختی تھی۔ شمس بھی اس کے بدلتے انداز کو بھانپ چکا تھا۔

"کیا تم کچھ بولو گی بھی؟" دل برداشتہ ہو کر شمس چلایا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ مہر کو ایک اور تھپڑ سے نواز دے۔

"میں تم لوگوں کے اوپر بھروسہ نہیں کر سکتی۔" اس کے انداز میں شمس کے لیے ذرہ برابر بھی ڈر یا خوف نہ تھا۔

"تمہارے پاس کوئی راستہ نہیں ہے۔ سمجھی؟ یا تو تم ہمارا کام کرو گی یا تو ہم تمہاری ماں کو مار دیں گے۔"

مہر کا اطمینان گھاٹے میں آنے لگا تھا۔ گلے پر جیسے پھندا اٹکا ہوا تھا، جو لمحہ بہ لمحہ تنگ ہو رہا تھا۔

وہ اب کیا کرے؟ اسے لگا جیسے وہ ایک مرتبہ پھر سے ٹوٹ رہی ہے۔

"ہو سکتا ہے ہمیں کچھ وقت الگ کیا جائے۔ مہر، آپ کو اپنا بچاؤ خود کرنا ہو گا۔"

اب کی بار مہر کو حیرت ہوئی۔ وہ شخص اس کی اس طرح مدد کر رہا تھا جس طرح اس نے سوچا بھی نہ تھا۔ اس نے آنکھیں بند کیں اور دماغ پر زور ڈالا۔

"کون سا کام۔" آنکھیں اب بھی کستی سے بند تھیں۔

شمس ایک گھٹنے کے بل زمین پر بیٹھا۔ مہر کے چہرے کے سامنے اپنا چہرہ ٹکایا۔ چہرے پر کمینی مسکراہٹ تھی۔

شمس سے قرب محسوس ہوا تو مہر نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ وہ بھلے سے گھبرا رہی تھی مگر اس نے گھبراہٹ چہرے پر آنے نہ دی۔ چہرے پہ اب بھی اطمینان تھا۔

"تمہیں کچھ دنوں تک بتادوں گا۔ اس سے پہلے تمہیں ہمارے بہت سے اور بھی کام کرنے ہوں گے۔ پھر تمہاری ماں ہماری قید سے آزاد۔" شمس نے سرگوشیانہ انداز اختیار کیا۔

"اور اگر تم لوگوں نے میری ماں کو پھر بھی نہ چھوڑا تو؟" مہر نے تشویش ظاہر کی۔

شمس چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے سر نفی میں ہلانے لگا۔

"تم ہماری ٹیم ہو مہر۔ تم جب تک ہمارے ساتھ تعاون کرنے کے لیے تیار ہو ہم تمہارے شانہ بشانہ چلیں گے۔ لیکن اگر تم ہمارے احکام نہیں مانو گی تو ممکن ہے ہم تمہیں نقصان پہنچنے سے روک نہیں پائیں گے۔"

مہر نے صورتحال کا تفصیلی جائزہ لیا۔ وہ یہ تو جان گئی تھی کہ ان سب کو اس کی ضرورت تھی۔ کوئی کام تھا جو وہ کروانا چاہ رہے تھے۔ اور کام ہو جانے تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑنے والے تھے۔ اس کے پاس شاید حامی بھرنے کے علاوہ فی الوقت کوئی راستہ نہ تھا۔

لیکن پھر بھی، مہر نے ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنے کا فیصلہ کیا۔

"کون سے کام۔" وہ بولی۔

"پہلے میرے ایک سوال کا سچ سچ جواب دو۔ احمد کو تم نے کیا کیا بتایا ہے؟ اور یاد سے، جھوٹ بولنے کی جرات بھی نہ کرنا۔"

مہر کی آنکھوں میں ستائش ابھری۔ تو یہ سب اس لیے ہو رہا تھا؟ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

وہ جان گئی تھی کہ یہ لوگ کسی نہ کسی طرح سے احمد اور اسے الگ کرنا چاہتے تھے۔

''وہ بس میری ہیرے ڈھونڈنے میں مدد کر رہا ہے۔'' مہر کی پر اطمینان نظریں شمس کے چہرے پہ گڑی ہوئی تھیں۔

شمس کے ماتھے پر بل پڑے۔

''بس ہیرے؟ اور کچھ؟ اتنے ہفتے کیا کرتے پھر رہے تھے تم دونوں؟'' شمس مہر کے چہرے پر معصومانہ سی نظر ڈالتے ہوئے بولا۔

''ہم ہیرے تلاش کر رہے تھے۔ اس نے مدد کی آفر دی میں نے قبول کرلی۔ بس۔'' مہر شمس کے چہرے کو گھورتے ہوئے شانے اچکا گئی۔

''اور وہ موبائلز۔ تمہارے گھر کی تلاشی لی تو موبائل ملا ہمیں۔ اس میں صرف احمد کا نمبر تھا۔'' شمس کے انداز میں اضطراب گھلا ہوا تھا۔

''یہ بھی احمد کی تجویز تھی۔ کام کی بات ہم اسی موبائل پر کرتے تھے۔'' مہر نے سب سچائی سے بتایا۔

''اور اپنے فون پر بھی باتیں کرتے تھے۔ اس کا کیا؟'' شمس کے انداز میں کچھ ذو معنی تھا۔

''یہ بھی احمد کا ہی آئیڈیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ان سب کو علم نہیں ہونا چاہیے کہ ہم ساتھ مل کر ہیرے تلاش کر رہے ہیں۔'' مہر کا لہجہ سپاٹ تھا۔

شمس پورے دل سے مسکرایا۔ مہر کو یہ مسکراہٹ ٹھٹکنے لگی تھی۔ شمس کھڑا ہوا اور ہاتھ جیبوں میں ڈالے۔

"اور یقیناً تمہیں تفتیش کے وقت سب کچھ سچ سچ کہنے کی تلقین احمد نے کی ہو گی۔"

مہر بری طرح سے چونک گئی۔

☆☆☆

ایک ہفتے پہلے:

وہ دونوں ریستوران میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

"اب آگے میری باتیں غور سے سنیں اور دماغ میں بٹھالیں۔"

مہر اسے پوری یکسوئی سے سننے لگی۔

"مجھے یقین ہے کہ ان کا اگلہ قدم تفتیش ہو گا۔ وہ آپ سے سب پوچھیں گے۔ وہ یہ جاننا چاہیں گے کہ ہم نے اب تک کیا کیا ہے۔ آپ نے ان کو سب کچھ سچائی کے ساتھ بتانا ہے۔"

مہر الجھی۔

"جھوٹ بولنا بہتر نہیں ہو گا؟"

احمد نے سر نفی میں ہلایا۔

"جھوٹ بولنے کا فائدہ نہیں۔ وہ اس سے پہلے ہمارے بارے میں اندازے لگا چکے ہیں۔ بس آپ نے ایک چیز کا دھیان رکھنا ہے۔" احمد نے آخری فقرے پر زور دیا۔ "آپ نے انہیں صرف اتنا بتانا ہو گا

کہ میں آپ کی ہیرے ڈھونڈنے میں مدد کر رہا ہوں۔ انہیں بھولے سے بھی اس بات کی خبر نہیں ہونی چاہیے کہ آپ انہیں تباہ کرنا چاہتی ہیں۔"

"مگر اگر سب سچ بتانا ہی ہے تو پھر یہ کیوں چھپائیں؟"

احمد کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری۔

"کیونکہ، میں جانتا ہوں تفتیش کے وقت وہ لوگ سمجھ جائیں گے کہ آپ جو بھی کہہ رہی ہیں میری وجہ سے کہہ رہی ہیں۔ انہیں معلوم ہو گا کہ میں نے آپ سے سچ کہنے کا کہا ہے۔ تو اگر آپ صرف ہیروں کا ذکر کریں گی تو وہ آپ کی طرف سے مطمئن ہو جائیں گے۔ آپ ان کے لیے خطرہ نہیں رہیں گی۔"

☆☆☆

"جینیس!" وہ دل ہی دل میں بولی۔

احمد نے ٹھیک کہا تھا۔ دشمنوں کو جاننے کے بعد کھیل محظوظ کرنے لگتا ہے۔ وہ بھی لطف اٹھا رہی تھی۔

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" مہر کے انداز میں مصنوعی حیرانی تھی۔

"کیونکہ ہم احمد کو جانتے ہیں۔ اور تم جو بھی کر لو۔ ہماری ناک کے نیچے ہمیں دھوکہ نہیں دے سکتی۔ کتنا ہی اچھا ہوا کہ تم اپنی اوقات میں رہ کے بس ہیرے ہی تلاش کرتی رہی ہو۔"

مہر کے دل کو قرار آنے لگا۔ وہ جو ظاہر کرنا چاہتی تھی، اس میں وہ کامیاب ٹھہری تھی۔

مگر خطرہ پوری طرح سے ٹلا نہیں تھا۔ اس کی ماں اب بھی ان کے قبضے میں تھی۔

”ٹھیک ہے۔ اپنی ماں کو جی بھر کر دیکھ لو۔ کیونکہ ایک لمبے عرصے کے لیے تم ان سے دور جانے والی ہو۔“

مہر کی سانسیں تھمنے لگیں۔ دل ایک دم سے تڑپ اٹھا۔ تو جدائی کا وقت ایک مرتبہ پھر آ پہنچا تھا۔ سالوں پہلے بھی وہ اپنی ماں سے جدا ہوئی تھی۔ اس وقت اس نے فیصلہ لیا تھا کہ وہ کبھی واپس نہیں جائے گی۔ آج دوبارہ وہ ان سے الگ ہو رہی تھی، وہ لوٹنا چاہتی تھی۔ وہ ملن کے لیے تڑپ رہی تھی۔ مگر اس مرتبہ قسمت نے انجام کو پردے میں رکھا ہوا تھا۔

مگر یہ جدائی اٹل تھی، اس نے ہونا ہی ہونا تھا۔ وہ اپنی ماں کو جی بھر کر دیکھنے لگی۔ آنکھوں سے آنسو روانہ ہوئے۔

”تیار ہو؟“ شمس نے پوچھا۔

مہر نے آنکھیں بند کیں اور اپنی گردن جھکا لی۔

”کیا واقعی میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں؟“ وہ آواز میں تکلیف سمائے بولی۔

”ہاں۔ نہیں ہے۔“ شمس نے بے دردی سے جواب دیا۔

مہر کا دل تیزی سے دھڑکا۔ اس کی ماں اس کے دشمنوں کے پاس رہنے والی تھی۔ دل میں خوف سوار تھا۔ مگر اسے یہ کسی بھی صورت کرنا تھا۔ اپنے دشمنوں کو برباد کرنے کے لیے، اس نے اپنے دل پر پتھر رکھا۔

اس نے گردن اٹھائی۔ اب کی بار اس کی آنکھوں میں آگ تھی۔

مہر بنت عبداللہ سلطان ایک پہاڑ بن چکی تھی۔

وہ ٹوٹنے والی نہیں تھی۔

وہ گرنے والی نہیں تھی۔

جو چاہے وہ لوگ کر لیتے، وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ ان سب کو برباد کر کے ہی دم لے گی!



مہر کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ شمس کے ساتھ اس کی ویگن میں سوار تھی۔ دونوں ویگن کی پچھلی نشست میں بیٹھے تھے۔ درمیان میں فاصلہ تھا۔ مہر کے چہرے پہ سکوت تھا، مگر دل میں ماں کے متعلق خدشات زور لے رہے تھے۔

''میری ماں کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔'' وہ بے تاثر لہجے میں بولی، گویا درخواست نہیں حکم دے رہی ہے۔

''جب تک تم ہمارے احکام مانو گی، ہم تمہیں چوٹ پہچانے کا سوچیں گے بھی نہیں۔''شمس بولا۔

''میں بتا رہی ہوں، شمس۔ میں کانٹوں سے گزر کر اپنی ماں سے ملی تھی۔ اگر تم لوگوں نے انہیں کچھ کیا تو میں قسم کھاتی ہوں کہ تم سب کو جیتے جی زمین میں گاڑ دوں گی۔''مہر کا انداز شعلہ باز تھا۔

شمس پر مہر کی دھمکی کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ زور سے ہنسنے لگا۔

''اچھی لگتی ہو جب یوں غصہ کرتی ہو۔ کیوٹ۔''شمس قہقہہ بلند کرتے ہی بولا۔

''تمہارے قصر کی تلاشی لیتے وقت مجھے یہ فون ملا۔'' شمس نے جیب سے موبائل نکالا۔ ''میں احمد کو کال ملا رہا ہوں۔ تم اسے صاف لفظوں میں بتاؤ گی کہ تمہیں ہیرے مل چکے ہیں۔ اس کا شکریہ ادا کرنا اور بس۔''

اسی اثناء میں احمد کا نمبر ڈائل ہو چکا تھا۔

''یاد سے، ہوشیاری نہیں چلے گی۔''

مہر نے مختصر سا سر ہاں میں ہلایا۔

اس کے چہرے پر مختصر سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اگلے لمحے اس نے اپنے چہرے کو نارمل کر لیا۔ شمس نے سپیکر آن کیا۔ کچھ دیر ٹوٹو کے بعد احمد نے کال اٹھالی۔

احمد اپنے آفس میں مصروف تھا۔

''احمد آپ کہاں ہیں؟'' مہر فوراً بولی۔ شمس شکی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

آفس میں بیٹھا احمد یہ سنتے ہی چونک اٹھا۔ اس کے چہرے پر مسکان ابھری۔

☆☆☆

ایک ہفتے پہلے:

ریستوران میں احمد کا ہدایات دینے کا سلسلہ جاری تھا۔

”ہوسکتا ہے انہیں ہمارے فونز کے بارے میں علم ہو جائے۔“ احمد کچھ سوچتے ہوئے اچانک سے بولا۔

”کیا بات کر رہے ہیں۔ یہ تو بہت بڑا مسئلہ ہو جائے گا۔“ مہر کچھ بوکھلا گئی تھی جب کہ احمد پر سکون تھا۔

”نہیں۔ اگر کبھی آپ کو مجھے یہ اشارہ کرنا ہو کہ فون ان کے پاس ہے۔ یا وہ ہماری گفتگو سن رہے ہیں تو آپ نے بات کا آغاز اس سوال سے کرنا ہے: کہاں ہو احمد؟ ٹھیک؟“ مہر نے سوچتے سمجھتے سر اثبات میں ہلایا۔

☆☆☆

”ویل ڈن مہر! مجھے آپ سے اسی طرح کی امید تھی۔“ احمد دل ہی دل میں بولا۔

”آفس میں ہوں۔ آپ بتائیں، ہیروں کا کچھ پتا چلا؟“ احمد پر سکون سا ہو کر بولا۔

شمس کے ماتھے پہ پھیلے بل ڈھیلے ہوئے۔ چہرہ نارمل تھا۔

”جی۔ مجھے ہیرے مل گئے ہیں۔ ایک ویئر ہاؤس تھا ڈیڈ کا۔ وہاں پر تھے۔“ آواز میں مصنوعی تشکر تھا۔

”ویئر ہاؤس۔ ہنہہ؟“ احمد نے سوچا۔ بولا کچھ نہیں۔

”اوہ۔ آپ مجھے بھی لے چلتیں۔ میں نے کہا تھا ہم ہیروں کی تلاش میں جہاں بھی جائیں گے ساتھ جائیں گے۔“ احمد بولا۔

”نہیں بس۔ فوراً خیال آیا تو چلی گئی۔ آپ کی مدد کا بہت شکریہ۔ کبھی مجھ سے کوئی کام نکلوانا ہو تو میں حاضر ہوں۔“ مہر کا انداز خوشگوار سا تھا۔

”مہر۔ ہم آگے بھی مل کر کام کر سکتے ہیں۔ شاید آپ کو ہیروں پر بس نہیں کرنی چاہیے۔“ احمد کا انداز ایسا تھا جیسے وہ ہار رہا ہو۔

شمس کی آنکھوں میں چمک اترنے لگی۔

”نہیں احمد۔ میں تھک گئی ہوں۔ ہیرے لوٹا کر اپنی معمول کی زندگی کی طرف لوٹنا چاہوں گی۔“

شمس نے تیزی سے کال منقطع کی۔ اس کی باچھیں کھل اٹھی تھیں۔ اس کے نزدیک احمد کا قصہ ختم ہو گیا تھا۔ شمس نے ایک پرسکون سانس خارج کی۔ سب پلان کے مطابق ہو رہا تھا۔

”اب کیا کرنا ہے؟“ مہر بولی۔ شمس زیرلب ہنس دیا۔

”کچھ دن انتظار کرو۔ میں تمہیں ٹھیک وقت پر سب بتا دوں گا۔“

اس کا کام یہاں پہ ختم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

”کچھ دن انتظار کرو۔ میں تمہیں ٹھیک وقت پر سب بتا دوں گا۔“

وہ تینوں عافیتِ زندگی کے ملاقاتی کمرے میں موجود تھے۔ میز پر سپیکر دھرا ہوا تھا، جو کہ شمس کی شرٹ پر لگے چھوٹے مائیک سے جڑا ہوا تھا۔

سب نے آخری فقرہ سن کر سکون بھری سانس خارج کی۔ شمس نے اپنا کردار بخوبی نبھایا تھا۔

''اب دونوں کو الگ کرنا آسان ہونا چاہیے۔'' درانی ٹیک لگاتے بولا۔

لیڈی اقتدار کے ماتھے پر بل تھے۔ کچھ تھا جو اسے اب بھی ٹھٹک رہا تھا۔

''جب تک مہر دبئی نہیں چلی جاتی تب تک ہم مطمئن نہیں ہو سکتے۔ احمد نے اتنی آسانی سے اس کا پیچھا نہیں چھوڑنا۔'' لیڈی اقتدار کی پر اطمینان آواز گونجی۔

درانی نے سرعت سے سر اوپر نیچے ہلایا۔

نیلوفر گہری سوچ میں تھی۔ اس نے سر جھٹک کر کچھ بولنے کے لیے لب کھولے۔

''ہو سکتا ہے کہ احمد کو اندازہ ہو گیا ہو کہ مہر دباؤ میں آکر یہ سب کہہ رہی تھی۔'' نیلوفر نے اپنی تھیوری پیش کی۔

''بہت حد تک یہی ممکن ہے۔ اس لیے درانی تم مہر کے گھر کے آس پاس پہرا بڑھا دو۔ وہ اس سے رابطہ استوار کرنا چاہے گا اس بات کو یقینی بنانا ہو گا کہ احمد کو ہمارے پلان کی بھنک نہ پڑے اور مہر بغیر مداخلت کے دبئی پہنچ جائے۔'' لیڈی اقتدار حکم جاری کر کے کھڑی ہو گئی۔

''ٹھیک ہے لیڈی۔ سب کچھ آپ کے حکم کے مطابق ہی ہو گا۔'' درانی تابعداری سے بولا۔

☆☆☆

مہر اپنے کمرے میں موجود تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھی شیشے کی دیوار کے پار منظر دیکھ رہی تھی۔ اندھیر آسمان پر نصف القمر کا راج تھا۔ آج آسمان پہ ستارے نہیں تھے اور چاند تنہا تھا۔ بالکل اسی کی طرح۔ وہ بھی

اکیلی تھی اپنے دراز سے قصر میں۔ ڈیڈ چلے گئے، ماں سے ملی، اتنے سالوں بعد ان سے قربت محسوس کی۔ لیکن، وہ بھی اس سے دور ہو گئیں۔ وہ ایک بار پھر اکیلی رہ گئی تھی۔

انسان کچھ بھی کر لے، مقدر سے نہیں لڑ سکتا۔

اس نے کرسی سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کیں۔ اس کے چہرے پر واضح تکلیف تھی۔ روح بے چین تھی۔

''کیا کچھ اب بھی ہونا باقی ہے، میرے اللہ؟'' وہ نم لہجے میں شکایت کرنے لگی۔

''یا اللہ کیا میری تکلیف ختم ہو گی؟'' اس کا دل بھرنے لگا تھا۔ وہ ہر چیز سے لاتعلق ہوئی۔

ٹھیک اسی وقت اس کی گود میں پڑا موبائل بجنے لگا۔ شمس کالنگ۔ مہر ہڑبڑا کر کھڑی ہوئی۔ اس نے تیزی سے کال اٹھائی اور فون کان سے لگایا۔

''اپنی ماں سے بات کرنی ہے؟'' شمس کی آواز سن کے مہر کا دل جیسے اچھل کود کرنے لگا۔

''ہاں۔'' مہر کی آواز میں لرزش تھی۔

کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔

''مہر! آپ ٹھیک ہیں ناں؟'' شمائلہ کی متفکر آواز دوسری طرف سے گونجی تھی۔ مہر کچھ لمحوں کے لیے ساکن ہو گئی۔ اس سے کچھ بھی بولا نہ گیا۔ آنکھیں اشک بار ہو گئیں اور آبشار کی صورت بہنے لگیں۔

''میں آپ کو آزاد کروالوں گی، ماں۔'' مہر کی آواز بھری ہوئی تھی۔ ''ہم ایک ہوں گے۔ میں اب آپ سے دور نہیں رہنا چاہتی۔'' مہر نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھے۔

"اوہ مہر! آپ کیوں رو رہی ہیں۔" شمائلہ آواز میں تکلیف لیے بولیں۔ مہر کی بھری ہوئی آواز سن کر ان کے دل پر جیسے خنجر چل گئے تھے۔

"اس طرح سے نہ روئیں، ہمارا کلیجہ کٹنے لگتا ہے۔ آپ کیوں اپنے آپ کو ہلکان کر رہی ہیں؟ ہماری آپ سے ملاقات ہوئی تھی وہی کافی تھی۔ ہم اس وقت مکمل ہو گئے تھے۔ ہمارے زخم بھر گئے تھے۔" شمائلہ نے نرمی سے کہا۔

پریشان وہ بھی بہت تھیں۔ ایک نئی جگہ پر اچانک سے قید ہو جانے پر وہ بہت خوف زدہ تھیں۔ مگر شمائلہ ایک مضبوط اور صابر خاتون تھیں۔ معاًوہ ایک ماں تھیں، جس کے سامنے اس کی بچی تکلیف سے بلک رہی تھی۔

"ہم ملیں گے، ماں۔ آپ کی مہر آپ کو نکال لے گی۔ ہم وہ سارے سال جییں گے جو ضائع ہوئے۔ میں آپ کو جلد نکالوں گی۔" مہر نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

"ہمیں آپ پر یقین ہے۔ آپ ہلکان نہ ہوں۔ ہم یہاں پر ٹھیک ہیں۔ ہمیں کھانا مل رہا ہے۔ ہماری ضروریات کا خیال رکھا جا رہا ہے۔ اس سے زیادہ ایک بوڑھے وجود کو کیا درکار ہے؟ آپ پرسکون ہو جائیں۔" شمائلہ نے مہر کو دلاسا دینا چاہا۔

مہر کے گلے میں گلٹی بن کے معدوم ہوئی۔

"مجھے معاف کر دیں ماں۔ میں نے آپ کے اوپر بہت ظلم ڈھائے ہیں۔" اس کا نفس اسے ملامت کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑ رہا تھا۔

"مہر! آپ ایسی باتیں نہ کریں۔" شمائلہ نے جیسے ڈھیروں آنسو اپنے اندر اتارے۔ "ہم نے آج تک آپ کو کوئی الزام نہیں دیا۔ اور ویسے بھی ہم نے شکایتیں کرنا چھوڑ دی ہیں۔ آپ بھی چھوڑ دیں۔ جس آزمائش میں خدا آپ کو ڈالے اسے پورے دل کے ساتھ قبول کر لیں۔ لوٹنا آپ نے اسی رب کے پاس ہے۔ تو کیوں آپ خود کو ہلکان کر رہی ہیں؟" شمائلہ کا انداز اپنائیت سے لبریز تھا۔ اور پھر جیسے کسی نے ان کے ہاتھ سے موبائل چھینا۔

"بس اب بہت ہو گئی ڈرامے بازی۔ تم سو جاؤ۔ ہم جلد ملیں گے۔" شمس جیسے اکتا گیا تھا۔

کال کٹ گئی تھی۔

مہر گیلے چہرے کے ساتھ اپنی جگہ منجمد رہی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے بہے جا رہے تھے۔۔۔

فَأَمَّا الْإِنسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ

وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ

(سورہ فجر آیت ۱۵:۱۶)

مہر کے دماغ میں ایک دم سے سورہ فجر کی یہ دو آیات ابھریں۔ اس نے سر اٹھا کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔

"مگر انسان کا حال یہ ہے کہ اس کا رب جب اُس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اُسے عزت اور نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دار بنا دیا

اور جب وہ اُس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اُس کا رزق اُس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا"

مہر نے ان آیات کا ترجمہ مدھم آواز میں دہرایا۔ اس کے لب اداس سی مسکراہٹ میں ڈھل گئے۔ اس کے سینے میں ایک خوشگوار سا احساس بھرنے لگا۔

"یا اللہ۔ ماں ٹھیک ہی کہتی ہے۔ مجھے شکایتیں نہیں کرنی چاہییں۔ مجھے اس آزمائش کو قبول کر لینا چاہیے۔ یہ سمجھ کر کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ آپ کی اجازت سے ہو رہا ہے۔ میں ان لوگوں جیسا نہیں بننا چاہتی جن کی مثال اس آیت میں دی گئی ہے۔ ایک وقت تھا جب میری زندگی میں ہر طرف بے فکری تھی۔ میں جس چیز پر ہاتھ رکھتی وہ خرید سکتی تھی۔ میں ملک سے ملک سفر کرتی تھی۔ اور اگر آپ نے مجھ سے وہ سب لے لیا ہے تو مجھے اس سب کو کھلے دل کے ساتھ قبول کرنا چاہیے۔ میرے اللہ، بس آپ مجھے اس آزمائش سے جلد نکال لیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں میں شکایتیں کرنا چھوڑ دوں گی۔ اور میں اپنی مصیبتوں کا سامنا کروں گی۔ میری مدد کریں میرے رب۔" مہر کی آنکھیں نم تھیں۔

اس کے دل کو قرار آنے لگا۔ وہ بالکل پر سکون ہو گئی تھی۔

☆☆☆

رات کی سیاہی کو نصف القمر کی سفید کرنوں نے چیرا۔ سرسراتی ہوا نے جنگل کے درمیان سے گزر کر مدھر گیت گنگنایا۔ جنگلی جانوروں کے بین نے اس گیت کو ہولناک بنایا۔ یہ گیت ہوا میں رقص کرتے ہوئے لکڑی کی دو منزلہ عمارت تک پہنچا۔

عمارت کے ارد گرد پہرا تھا۔ سیاہ شرٹ میں ملبوس مرد، ہاتھ میں باندوق تھامے ہوئے تھے۔

نچلی منزل کے ایک کمرے کا رُخ کرتے ہیں۔ کھڑکی کے ساتھ سنگل بیڈ رکھا گیا تھا، جس پر شمائلہ بیٹھیں، شمس کو شکوہ کناں نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ دروازے پر نیلوفر بے تاثر چہرہ لیے کھڑی تھی۔

"ہمیں تھوڑی دیر اور بات کرنے دیتے۔" وہ اداسی سے بولیں۔

شمس کی آنکھوں میں غصہ اترنے لگا۔ وہ شمائلہ کی طرف لپکا اور ان کے بال کھینچے۔ شمائلہ کی درد بری چیخیں لکڑی کی دیواروں سے ٹکرائیں اور نیلوفر کے کان میں داخل ہوئیں۔ اس کے دل میں کچھ ہوا۔ ان چیخوں نے اس کی روح کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ پتھر کی بن گئی۔ شمائلہ کی آہ و بکا نے اسے ماضی کے ایک منظر میں پہنچایا۔

اس منظر میں وہ چودہ سالہ لڑکی تھی۔

اس کی ماں بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ چاچی نور بیگم کے بالوں کو پکڑے، نجانے کون کون سے طعنوں سے نواز رہی تھیں۔ نیلوفر کے اندر انگارے برسے۔ ایک جست میں وہ چاچی کی طرف لپکی اور انہیں پوری قوت سے دھکا دیا۔ ان کے اوپر بیٹھ کر پے در پے تھپڑوں کی بارش کی۔ وہ غصے سے پاگل ہونے لگی تھی۔

حال کی نیلوفر کپکپائی۔ غصے نے اس کے جسم کو دہکایا۔ ہاتھ مٹھی میں بھینچے۔ وہ جارحانہ انداز میں شمس کی طرف بڑھی اور اس کی ناک پر مکہ دے مارا۔ شمس ہکا بکا رہ گیا۔ نیلوفر رکی نہیں، اسے ایک اور زناٹے دار تھپڑ سے نوازا۔ ناک سے خون بہہ رہا تھا اور چہرہ ٹماٹر کی طرح سُرخ تھا۔ آنکھوں میں شرمساری تھی۔

نیلوفر کی آنکھوں سے شرارے پھوٹے۔ اس نے شہادت کی انگلی شمس کی طرف بڑھائی۔

"اگر آئندہ ان کو ہاتھ لگایا تو میں تمہارے جسم میں اتنی گولیاں اتاروں گی کہ کوئی چاہ کر بھی سوراخ نہیں گن پائے گا۔" وہ آنکھیں پھاڑ کر دھاڑی۔

"اب دفع ہو یہاں سے۔" دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

شمس چہرے پر بے یقینی اور خوف کے تاثرات لیے کمرے سے بھاگا۔

نیلوفر ٹھنڈی پڑی۔ کندھے شل ہوئے۔ چہرے پر الجھن در آئی۔ آخر کیوں اس پر جنون کا غلبہ طاری ہوا تھا وہ بھی اس اجنبی عورت کے لیے جو اس کے مرے ہوئے شوہر کی پہلی بیوی بھی تھی؟ اس نے مڑ کر شمائلہ کو دیکھا، جو کہ سہم کر پلکیں جھپکا رہی تھیں۔ نیلوفر کو نجانے کیوں ان میں نور بیگم کا عکس دکھائی دیا۔ وہی معصومیت تھی ان کے چہرے پر۔ وہ بے اختیار مسکرائی۔

"آپ ڈریں نہیں۔ میں آپ کو کچھ نہیں کروں گی۔" وہ نرمی سے بولی۔ اپنی نرمی پر وہ خود بھی چونکی تھی۔

شمائلہ کا خوف سرکا۔

"آئندہ وہ کچھ الٹا سیدھا کرنے کی کوشش کرے، مجھے بتایئے گا، میں اس کا حشر نشر بگاڑ دوں گی۔"

شمائلہ نے متذبذب سے انداز میں سر اثبات میں ہلایا۔

نیلوفر ان کے قریب پہنچی۔ مسکراہٹ برقرار تھی۔

"آپ ہمیں اچھی لگیں۔ ہمیں یوں بچانے کے لیے بہت شکریہ، بیٹی۔" شمائلہ نے مسکرا کر ممنوع لہجے میں کہا۔

"بیٹی؟" وہ الجھ کے زیر لب بڑبڑائی۔

وہ شمائلہ کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ آنکھوں میں ستائش لیے وہ ان کی نورانی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ میں بہت بری ہوں۔ بہت زیادہ۔" مسکراہٹ اداس ہوئی۔

"مجھے یوں اچھا نہ کہیں۔" نیلوفر استہزاء سے خود پر ہنس دی۔

شمائلہ اپنا سر نفی میں ہلانے لگیں۔

"کوئی انسان برائی کے ساتھ پیدا نہیں ہوتا، بیٹی۔ ہم آپ کی آنکھوں میں جھانکتے ہیں تو ہمیں اچھائی کا گوشہ نظر آتا ہے۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ وہ حصہ قید ہے، وہ حصہ اس قید سے جان چھڑانا چاہتا ہے۔ وہ گوشہ آپ کے اندر امید کے چراغ روشن کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس راستے سے پلٹ جانا ممکن ہے، مگر آپ مایوسی کی انتہاؤں پر ہیں۔ اس لیے دانستہ چراغ بجھا دیتی ہیں۔ ہم صحیح کہہ رہے ہیں ناں؟"

نیلوفر ششدر سی ہو کر انہیں دیکھتی رہ گئی۔ وہ سست روی سے کھڑی ہوئی۔ چہرے پہ تناؤ بڑھتا چلا گیا۔ اس نے دو قدم پیچھے بڑھائے۔

"آپ کو کیسے پتا چلا؟" نیلوفر کے لب کھلے کے کھلے رہ گئے تھے۔ شمائلہ مسکرائیں۔

"تجربہ ہماری بیٹی۔ کیا یہ سچ نہیں کہ آپ اس زندگی سے فرار چاہتی ہیں؟" شمائلہ کی آنکھوں میں امید سی تھی، وہ ان پر امید آنکھوں سے نیلوفر کو امید کا راستہ دکھانا چاہتی تھیں۔

نیلوفر تیزی سے سر نفی میں ہلانے لگی۔

''بہت دیر ہو گئی ہے۔'' کرب سے آنکھیں میچ کر وہ تیز قدم بڑھاتے کمرے سے نکل گئی۔

آج کسی نے اسے پڑھ لیا تھا۔

کوئی تھا جو اسے دیکھتے ہی اس کے اصل کو جان گیا تھا۔ نیلوفر کے لیے یہ سب بے حد غیر معمولی تھا۔



کھڑکیوں سے جھانکتی ہوئی دھوپ نے مہر کو نیند سے بیدار کیا۔ اس نے موبائل پر وقت دیکھا۔ وہ آج معمول کے برعکس دیر سے اٹھی تھی۔ سب سے پہلا خیال عنایا کا آیا۔ کل اتوار تھا، سو وہ حسام کے ساتھ تھی۔ اسے عنایا کو سکول سے پک کرنا تھا۔ پیر چپلوں میں گھسیڑتے وہ غسل خانے کی اور جانے لگی۔ اس کی نظر سنگھار میز پر پڑے ڈبے پر گئی۔

وہ سب چھوڑ چھاڑ کر ڈبے تک پہنچی۔ اس کے اوپر نوٹ چسپاں تھا۔

''کال می۔'' دل زور و شور سے دھڑکا۔ سیاہ آنکھوں کی بے قراری انتہاء کو پہنچی۔

مہر نے جارحانہ انداز میں اس پارسل کو پھاڑنا شروع کیا۔ اس نے قینچی کا استعمال کرنے کی زحمت نہ کی اور ناخنوں سے پارسل کی ریپنگ کو چیرا۔

اندر بٹنوں والا چھوٹا موبائل تھا۔ اس میں احمد کا نمبر پہلے ہی موجود تھا۔ مہر نے بغیر کچھ سوچے احمد کا نمبر ملایا اور فون کان سے لگالیا۔ کچھ دیر بعد احمد نے کال اٹھالی۔

''کیسی ہیں، مہر؟''

یکبارگی دنیا جہاں کا قرار نصیب ہوا۔ بے اختیار آنکھیں نم ہوئیں۔ اس نے خود کو صحرا میں بھٹکتے ہوئے مسافر کی طرح محسوس کیا، جسے دہائیوں تک پیاس جھیلنے کے بعد ایک بوند پانی میسر ہو۔

''احمد!'' مہر گہری سانس لیتے بولی۔ چہرے پہ رندھا ہوا سا تاثر در آیا۔

''کیا ہوا ہے مہر؟ بتائیں۔'' احمد کو فکر ستانے لگی۔

''میری ماں کو لے گئے وہ۔ میں کیا کروں؟ میں شدید پریشان ہوں، احمد۔'' مہر کی آواز گیلی تھی۔

احمد کی فکر مندی میں اضافہ ہوا۔

''ایک سیکنڈ۔ سب سے پہلے تو پر سکون ہو جائیں۔'' اپنے آفس میں بیٹھا احمد بھلے سے خود پر سکون نہ تھا، مگر مہر کے لیے اسے اطمینان کا خول اوڑھنا پڑا۔

''مجھے شروع سے سب کچھ سننا ہے، ہر ایک تفصیل جاننی ہے۔'' احمد سنجیدہ تھا۔

مہر نے اپنی نم آنکھیں پونچھیں۔ گہری سانسیں لیتے وہ اپنے آپ کو پر سکون کرنے لگی۔

''مجھے ایک خط آیا تھا۔۔۔'' مہر نے شروع سے احمد کو سب کچھ بتایا۔ احمد نے ساری تفصیلات غور سے سنیں۔

''آپ کے مطابق خط بالکل ویسا ہی تھا جیسے آپ کی ماں لکھتی تھیں۔ کیا آپ کے پاس کہیں اپنی ماں کے خط موجود ہیں؟'' احمد نے پوچھا۔

"ہاں۔ میری الماری میں ہی ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"میرا اندازہ درست تھا۔ کوئی آپ کے گھر آیا تھا۔ اس نے ان خطوط کا جائزہ لیا اور ایک بے عیب نقل تیار کی۔ ماننا پڑے گا، یہ لوگ پر فیکشنسٹ ہیں۔" وہ متاثر کن سے انداز میں بولا۔

یہ بھی کوئی متاثر ہونے کا وقت تھا؟ مہر نے سوچا۔

"آپ فون سپکیر پر رکھیں۔ اور کسی ملازمہ سے پوچھیں کہ پچھلے دنوں کون آیا تھا۔"

مہر موبائل مٹھی میں دبوچتے کمرے سے باہر نکلی۔ ریلنگ کے پاس ایک ملازمہ پوچھا لگا رہی تھی۔

"سنیں۔ کیا پچھلے دنوں کوئی میری غیر موجودگی میں آیا تھا؟" مہر نے انداز حتی الوسع عام رکھا۔

ملازمہ نے دماغ پر زور ڈالا۔

"جی۔ نیلوفر میڈم اپنا کچھ سامان لینے آئی تھیں۔" ملازمہ دوبارہ اپنے کام میں لگ گئی۔

اور اس جملے نے نیلوفر کے دھوکہ پر مہر ثبت کی۔ مہر کا دل کرچیوں میں بکھر کر اس کی روح میں چبھا۔ اس نے کچھ دیر آنکھیں میچیں۔ وہ ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ کمرے میں لوٹی۔

"اب آپ کے شک کو حقیقت بن جانا چاہیے۔ نیلوفر آپ کے دشمنوں کے ساتھ ہے۔" احمد نے باور کروایا۔

"اب کیا کرنا ہے؟" مہر کا انداز روکھا سا تھا۔ دل مرجھا گیا تھا۔ نیلوفر کے معاملے کوئی آخری امید تھی بھی تو وہ دم توڑ گئی تھی۔

”انہوں نے کہا تھا وہ آپ سے کوئی کام کروانا چاہتے ہیں۔ آپ کو اس کام کی تفصیلات ملیں تو مجھے بتائیے۔ ٹھیک؟“ احمد جواب کا انتظار کرنے لگا۔

”ٹھیک ہے۔“

”اور مہر۔ پلیز۔ اپنا خیال رکھیں۔ میں سمجھ سکتا ہوں آپ کے اوپر دباؤ بہت ہے۔ لیکن یہ وقت ڈھے جانے کا نہیں ہے۔“ احمد کی آواز میں واضح طور پر فکر تھی۔

مہر ڈھیلی ہو کر بستر پر بیٹھی۔ لبوں پر آزردہ مسکراہٹ تھی۔

”احمد۔ میں کوشش کر رہی ہوں۔ مگر۔ مگر۔۔“ اس نے ضبط سے آنکھیں میچ لیں۔ پھر آنکھیں کھولیں تو وہ نم تھیں۔ اس نے دیوار پر ٹنگی تصویر دیکھی جس میں عنایا مسکرا رہی تھی۔

”ایسا لگتا ہے کہ میں کسی باریک رسی پر چل رہی ہوں۔ میرے کندھوں پر بوجھ ہی بوجھ ہے۔ آگے پیچھے، اوپر نیچے ہر طرف کانٹے ہیں۔ مجھے ہر کسی نے دھوکہ دیا۔ ڈیڈ، نیلوفر۔ جنہیں اپنا مانا وہ تک مجھے اس عذاب میں چھوڑ کر چلے گئے۔“ وہ روئی نہیں، بس تکلیف سے اسے سب بتاتی گئی۔

اپنے آفس میں بیٹھے احمد کے دل پر برچھیاں گھپ گئیں۔ اس نے ہاتھ سے سر مسلا۔ اس عورت سے کوئی تعلق ناطہ نہ کر بھی اس کے درد پر اس قدر درد کیوں ہوتا تھا؟

”یہ بوجھ آپ اکیلے نہیں اٹھا رہی ہیں، مہر۔ میں آپ کے ساتھ ہوں، اور ساتھ رہوں گا۔ وعدہ رہا، مہر۔ آپ کے سارے بوجھ میرے بوجھ ہوئے۔“

مہر کی پیشانی کشادہ ہوئی۔ آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکلا۔ وہ شخص کچھ نہ ہو کر بھی اسے اپنا کیوں لگتا تھا؟

"اپنا خیال رکھیے گا۔ اللہ حافظ۔"

احمد نے کال کاٹ دی۔

مہر نے فون کان سے جدا کیا اور گود میں رکھ دیا۔ اس نے مڑ کر خالی بستر کو دیکھا۔

ٹھیک اس جگہ پر عنایا سویا کرتی تھی۔ دماغ میں اس کی باتیں، اس کی کھکھلاہٹیں گونجیں۔ مگر ان دشوار وقتوں میں وہ اسے وقت نہیں دے سکتی تھی۔

مہر اگلے لمحے مرینا کو کال ملا رہی تھی۔ وہ ان سے عنایا کو پورا ہفتہ رکھنے کی بات کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

☆☆☆

دُرِفشاں چھ منزلہ عمارت کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ بار بار کلائی میں بندھی گھڑی پر وقت دیکھتی۔ سڑک پر رش تھا۔

دفعتاً حسام گاڑی اس کے سامنے رکی اور اندر سے وہ نکلا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سُرخ رنگ کا مٹھائی کا ڈبا تھا۔ چہرے پر تروتازگی تھی۔ دُرِفشاں کے انتظار کو قرار آیا۔

"شکر ہے کوئی تو آیا۔ میں دس منٹ سے انتظار کر رہی ہوں۔" اس نے اکتا کر کہا۔ "مناج اب بھی لیٹ ہے۔"

حسام نے سر کو خم دیتے سُرخ ڈبا اس کی طرف بڑھایا۔ درے کے چہرے پر پہلے سوال ابھرا، پھر ستائش۔

”میں آپ کے لیے برفی لے کر آیا تھا۔“ اس نے درِفشاں کو دیکھتے، خلوص سے کہا۔

درے اندر ہی اندر ہنس دی۔

”اوہ۔ تو مجھے charm کرنے کی کوشش کی جارہی ہیں۔“ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

اس نے مسکرا کر مٹھائی کا ڈبا تھاما۔

”شکریہ۔ مگر کیا پتا مجھے مٹھائی پسند نہ ہو؟“ اس نے حسام کا سرسری جائزہ لیا۔

حسام جیب میں ہاتھ ڈالے گردن جھکائے ہنسا۔

”میں نے کہیں سنا تھا۔ جو لوگ میٹھا بہت کھاتے ہیں، ان کی شخصیت میں مٹھاس ہوتی ہے۔ اب اگر آپ کو مٹھائی پسند نہیں تو قصور ان لوگوں کا ہو گا جنھوں نے یہ کہا تھا۔“ وہ عقیدت سے بھرپور لہجے میں بات کر رہا تھا۔

”اور اب فلرٹ کیا جارہا ہے؟“ اس نے نچلا لب دبائے سوچا۔

”لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ کسی کے تحفے میں دی گئی مٹھائی نہیں کھانی چاہیے۔ کیا پتا اس میں جادو کیا گیا ہو؟“

وہ دل تھام کر حسام کے جواب کا انتظار کرنے لگی۔ مٹھائی کا ڈبا پرس میں رکھا۔

"مجھے آپ پر جادو کرنے کے لیے کسی منتر یا کسی مٹھائی کی ضرورت نہیں۔"

وہ لمحے بھر کو تھمی تھی۔ گالوں میں سُرخی دوڑی تھی۔ وہ دھیما سا دکھنے والا مرد پھر اتنا معصوم بھی نہ تھا۔

وہ کچھ کہتی، اس سے پہلے مناج بھی آگئی۔ چہرے پر عجلت سوار تھی۔

"ٹریفک میں اتنی بری طرح پھنسی کہ کچھ بتانے کا موقع ہی نہ ملا۔" ماتھے پر مصروفیت کے بل تھے۔

"مگر مس مناج، آپ نے بتایا نہیں، ہم کس سے ملنے آئے ہیں۔" عمارت کے اندر تینوں ہم قدم چل رہے تھے۔

"راحیلہ صدیقی سے۔ وہ آزاد جرنلسٹ ہے۔ بہت ایزجیٹک ہے۔"

دُرِفشاں نے لفٹ کا بٹن دبایا۔

"نہیں۔ ہم سیڑھیوں سے اوپر جائیں گے۔" مناج پیچھے سے بولی۔

دُرِفشاں نے پلٹ کر دیکھا۔

"لفٹ آلسی لوگوں کے لیے ہوتی ہے، درے۔"

دُرِفشاں ہنس دی۔

"تھیراپی کا اثر اب تک قائم ہے۔ چلو، سیڑھیوں سے چلتے ہیں۔"

وہ تینوں سیڑھیاں پھلانگنے لگے۔

"تو وہ ہماری کیسے مدد کریں گی؟" پوچھنے والا حسام تھا۔

"راحیلہ نے آٹھ سال تک ہیومن ٹریفکنگ پر ریسرچ کی ہے۔ سروائیورز سے بات چیت کی ہے۔ اس کے پاس معلومات کا خزانہ ہے، اور یہی وجہ ہے کہ کوئی چینل اسے کام کرنے نہیں دیتا۔ کیونکہ وہ سچ کو بلاملاوٹ سامنے رکھتی ہے۔" مناج نے سرسری انداز میں احوال سنایا۔

راحیلہ کا آفس تیسری منزل میں واقع تھا۔ راحیلہ میز کے ایک طرف بیٹھی تھی، مناج، درے اور حسام دوسری طرف۔ درے کی گود میں ڈائری تھی اور ہاتھ میں قلم۔

"پہلے تو میں آپ سب کو تحریک حرر فاؤنڈیشن کی افتتاح پہ ڈھیر ساری مبارکباد پیش کروں گی۔" اپنے چہرے پہ مودب سی مسکراہٹ سجائے راحیلہ مخاطب ہوئی۔ "مجھ سے جتنا ہو سکے گا، میں آپ سب کی اتنی مدد کروں گی۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھتے خوش دلی سے بولی۔ مناج پھیکا سا مسکرا دی۔

"ہم دراصل اعضاء کے غیر قانونی کاروبار کو ایکسپوز کرنے کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ہمیں لگتا ہے کہ آپ کی ریسرچ ہماری بہت مدد کر سکتی ہے۔ ہمارا اندازہ ہے کہ اعضاء کا مافیا ہیومن ٹریفکنگ کے مافیا سے جڑا ہوا ہے۔ ہمارے اس اندازے میں کتنی سچائی ہے؟" بات سمیٹ کے مناج نے جواب طلب نگاہوں سے راحیلہ کو دیکھا۔

"مجھے بھی یہی لگتا ہے۔ جہاں تک میری ریسرچ ہے، یہ بہت حد تک ممکن ہے۔ مناج آپ خود بتائیں، میں کہاں سے بتانا شروع کروں۔" راحیلہ نے نرمی سے کہا۔

"آپ ہمیں جہاں سے بھی بتانا چاہیں، وہاں سے بتائیں۔" مناج سننے کے لیے تیار تھی۔ حسام اور درے بھی لکھنے کے لیے تیار لگتے تھے۔

اور راحیلہ، بطور ایک جرنلسٹ بولنے کے لیے تیار تھی۔



پاکستان میں یہ غلیظ کام بیشتر مقامات پہ ہوتا ہے۔ پنجاب ان جگہوں کا مرکز مانا جاتا ہے۔ یہ کام کسی پوش علاقے کے بڑے سے گھر میں بھی ہو سکتا ہے یا کسی گاؤں دیہات میں واقع حویلی میں۔ ہم اس کام کے لیے مختص ایسے ہی ایک گھر پر نظر ڈالتے ہیں۔

گھر کے باہر دو گارڈز پہرا دے رہے تھے۔ ایک چھوٹا سا باغیچہ عبور کر کے گھر کے اندر داخل ہوتے ہیں۔ ہر طرف چمکتے دمکتے خوبصورت چہرے نظر آئیں گے۔ کچھ مسکراتے ہوئے۔ کچھ اداس سے۔ کچھ کی آنکھیں نم۔ اور کچھ خوش ہونے کا محض ناٹک ہی کر رہے تھے۔

اس گھر کے مکین اپنی بد قسمتی سے بخوبی واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کا اس قید خانے سے رہائی کا کوئی امکان نہ تھا۔ اگر وہ کچھ کرتے تو مار دیے جاتے۔

اب ان کے پاس یہ دوزخ زدہ زندگی گزارنے کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا۔ خوشی سے جیتے، یا اپنے آپ کو ملامت کر کے۔

تھی تو یہ زندگی ہی۔

اور جینی بھی ان سب نے تھی۔

(”انیس سوستر تک پاکستان میں ریڈ لائٹس ایریا کافی عام تھے۔ضیاء الحق نے ان ریڈ لائٹ ایریاز پر پابندی نافذ کی۔اس طرح جسم فروشی کو رکاوٹ کا سامنہ کرنا پڑا۔ مگر انسان بڑی چالاک مخلوق ہے۔اس کے لیے برائی کا ایک راستہ بند ہو تو وہ اور راستے تلاش کر لیتا ہے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ اب میں تمھیں ماڈرن ڈے ریڈ لائٹ ایریاز کے بارے میں بتاتی ہوں۔ جو کہ در حقیقت ریڈ لائٹ ایریاز نہیں بس ان کا کردار ادا کرتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ان سب کو یہ دو ٹکے کے سیاست دان سپورٹ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہیومن ٹریفکنگ کا مافیا اتنا مضبوط ہے، کیونکہ اس سب کے پیچھے طاقتور امراء اور پالیٹیشنز ہیں۔ یہاں پر عورتیں بہت طریقوں سے لائی جاتی ہیں۔ گاؤں دیہات کے علاقوں سے کبھی انہیں خریدہ جاتا ہے۔ کبھی انہیں اغواء کیا جاتا ہے۔ کبھی انہیں خوابوں کے جال میں پھنسایا جاتا ہے۔ جو چیز سالوں پہلے کھلے عام ہو رہی تھی اب بس بند دروازوں کے پیچھے ہو رہی ہے۔“)

یہ ایک دیہاتی علاقے کا منظر لگتا تھا۔

یہ ایک کمرہ تھا جسے آفس کے طرز پر بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ چھت پہ چھپر اڈالا ہوا تھا۔اس کچے پکے آفس میں ایک میز رکھی ہوئی تھی جس کے ارد گرد تین کرسیاں تھیں۔ماحول میں گیلی مٹی کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔

آفس میں دو شخص کسی گفتگو میں مگن تھے۔ ایک اس آفس کا انچارج اور ایک شخص اس گاؤں کا رہائشی تھا۔

”سر مگر ویزا کیوں نہیں لگتا۔“ گاؤں کے اس رہائشی کے ماتھے پر مایوسی کے بل تھے۔

''بھائی میرے، مسئلے ہی اتنے ہیں۔ پیسے ہی اتنے لگتے ہیں۔ اب بتاؤ میں کیا کر سکتا ہوں۔'' آفس کے انچارج نے کہا۔ اس کے انداز میں مصنوعی سی ہمدردی تھی۔

''سب گھر والے بڑی آس لگائے بیٹھے ہیں۔ میرے ملائی شیا جانے سے جیسے ان سب کے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ میں انہیں کیا منہ دکھاؤں میرے بھائی۔'' آنکھوں میں خواب کی کرچیاں سمیٹی ہوئی تھیں۔

''اچھا چل۔ میں تجھے ایک دوسرا راستہ بتاؤں گا۔'' انچارج کے چہرے پر کمینی سی مسکراہٹ بکھری۔

''تو ایلیگل طریقے سے چلا جا۔ آسان ہے۔ پیسے بھی کم۔ اور محفوظ بھی۔ اور جلدی پہنچ جائے گا۔ بتا؟'' وہ نوجوان گہری سوچ میں پڑ گیا۔ کیا واقعی یہ ایک اچھا راستہ تھا؟ وہ جانتا نہ تھا۔

اور یہ لاعلمی ہی تو تھی جس کی بدولت ان کا کاروبار آج تک سلامت تھا۔

(''اب میں آپ سب کو ہیومن سمگلنگ کے ایک دوسرے طریقے کے بارے میں آگاہ کرتی چلوں۔ آج کل نوجوانوں کا سب سے بڑا مسئلہ بے روزگاری ہے۔ اسی مسئلے کا استعمال کر کے ان کو جال میں پھنسایا جاتا ہے۔ میں بتاتی ہوں یہ سب کیسے ہوتا ہے۔ انسٹا یا فیس بک پر پیجز بنائے جاتے ہیں۔ اور عارضی طور پہ جگہ جگہ آفیسز کھولے جاتے ہیں۔ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ لوگ کم پیسوں میں، آسان طریقے سے نوجوانوں کو باہر ملک بھیج سکتے ہیں۔ جیسے ترکی، ملائی شیا کوئی سا بھی اور ملک۔ یہ لوگ نوجوانوں کے کچے ذہنوں سے کھیلتے ہیں، انہیں یہ تاثر دیتے ہیں کہ باہر کے ملک جانے سے ان کا ہر مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اور پھر جب ان سب میں باہر جانے کا جنون آجاتا ہے تو یہ انہیں مایوس کر دیتے ہیں۔ لیگل طریقے سے باہر جانا مشکل بنا کر

پیش کرتے ہیں۔ غیر قانونی طریقہ کار کی تلقین کی جاتی ہے۔ ان سے پیسے بٹورتے ہیں، اور پھر انہیں چور راستوں سے ملک سے باہر نکالتے ہیں۔"

اس لمحے درفشاں کا لکھتا ہاتھ تھم گیا۔ وہ بالکل ساکن پڑ گئی۔ اچانک اسے فیروز یاد آیا۔ اس کا پیارا بھائی۔ جو اسے ایک انسٹا پیج کے بارے میں بتاتا تھا۔ جو اسے بتاتا تھا کہ ایک آفس تھا۔ اور ایک دن وہ خط چھوڑ کر چلا گیا۔ درفشاں کو لگا جیسے سالوں پرانی پہیلی آج حل ہونے لگی تھی۔

"اور پھر کیا ہوتا ہے؟ یعنی یہ لوگ انہیں باہر ملک لے جاتے ہیں؟" حسام نے لکھتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ چلے جاتے ہیں اور کچھ مار دیے جاتے ہیں۔"

درے کی آنکھیں نم پڑنے لگیں۔ سالوں پرانے راز کھل رہے تھے۔

"مار دیے جاتے ہیں؟ یہ بہت مشکل نہیں ہو جاتا ہو گا؟" حسام نے ایک بار پھر سے سوال کیا۔

"نہیں وہ لوگ بہت طاقتور ہوتے ہیں۔ اکثر وہ بیچ سمندر میں پوری کی پوری کشتیاں الٹ دیتے ہیں۔ اور اکثر کو ایسے ہی مار دیا جاتا ہے۔ ان کے لیے اس طرح سے اپنا جرم چھپانا کوئی مشکل کام نہیں۔" راحیلہ آگے اور بھی بولنا چاہتی تھی مگر وہ سمجھ گئی تھی کہ حسام کچھ اور پوچھنے لگا تھا تو وہ تھم گئی۔

"مگر وہ پیسے لے کر ہی کیوں نہیں بھاگ جایا کرتے؟" حسام کے اندر کا نرڈ جاگ گیا تھا۔

"یہ زیادہ رسکی ہو گا۔ اس طرح سے لوگ احتجاج کریں گے اور عوام میں شعور پیدا ہو گا۔ شعور ان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔" راحیلہ نے موضوع سمیٹا، اب وہ اگلی بات پر آئی۔)

وہ ایک گودام تھا۔۔۔ لیکن انسانوں کا۔۔۔!

شہر سے کافی دور تھا، اور ایسے علاقے میں تھا جہاں آبادی نہ ہونے کے برابر تھی۔ ڈھیر سارے گارڈز پہرا دے رہے تھے۔ اس بڑے سے گودام کی طرف ایک نیلی شرٹ والا بندہ چلتا آرہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ فائلز تھیں۔ اسے گارڈز نے نہیں روکا۔ گودام کے دروازے کے پاس ایک سفید شرٹ میں ملبوث بندہ بیٹھا تھا۔

"ہاں کیا ہوا۔" سفید شرٹ والے بندے نے پوچھا۔

"یہ فائل بڑے ہسپتال سے آئی ہے۔ میچ ڈھونڈو اور بتاؤ۔ کل صبح تک یہ چار میچز روانہ کر دینا۔" نیلی شرٹ والے نے لاپرواہی سے بتایا۔ سفید شرٹ والے نے فائلز پکڑیں اور انہیں بغور دیکھنے لگا۔

"ارے یہ تو بہت عام ہیں۔ مل جائیں گے۔" سفید شرٹ والے نے فائلز پڑھتے ہوئے کہا۔

"اچھا سن، کل دو بچے آئے تھے۔" سفید شرٹ والے نے فائل بغل میں دباتے ہوئے بات جاری رکھی۔

"کوئی تھا تو نہیں ان کے ساتھ؟" نیلی شرٹ والے نے تفتیش شروع کی۔ جواباً سفید شرٹ والے نے گردن نفی میں ہلائی۔

"بس پھر فکر نہ کرو۔ میچ نکلوالو اور محفوظ کر دو۔"

ان سب کی زندگیوں کا یہی معمول تھا۔

گودام میں قید انسان ان کے لیے انسان نہیں، کسی بکاؤ مال کی طرح تھے۔

(”ہومن ٹریفکنگ اعضاء کے لیے بھی کی جاتی ہے۔ کبھی لوگوں کی مرضی سے ان کے اعضاء خریدے جاتے ہیں کبھی زبردستی ان سے چھین لیے جاتے ہیں۔ ہم اس اعضاء کے کاروبار کو سمجھنے سے پہلے ملک کے قانون کو دیکھتے ہیں۔ ملک کا قانون یہ کہتا ہے کہ اعضاء رشتہ دار دوسرے رشتہ دار کو ڈونیٹ کر سکتا ہے۔ یہ قانون اس لیے موجود ہے تاکہ کوئی کسی اجنبی کو زبردستی اعضاء دینے پر آمادہ نہ کر سکے۔ اور اس قانون کی پاس داری تمام ہسپتال ہی کرتے ہیں سوائے کچھ کے، جو کہ اس کاروبار میں ملوث ہیں۔ ان کے گہرے تعلقات ہیں۔ ان کو سیاست دانوں کی سپورٹ حاصل ہے۔ جگہ جگہ سے لوگوں کو اغواء کیا جاتا ہے۔ کبھی گاؤں دیہات جا کر لوگوں کو اکسایا جاتا ہے کہ وہ پیسوں کے بدلے اپنے اعضاء بیچیں۔ امیر ممالک کے امراء ان کے بہت بڑے کلائنٹ ہیں۔ ڈارک ویب کے ذریعے ساری ڈیلنگز کی جاتی ہیں۔“)

☆☆☆

مناج اپنی گاڑی سے اپنے گھر جا چکی تھی۔ درِفشاں حسام کے ساتھ گھر جا رہی تھی۔ وہ اگلی نشست پر بیٹھی، کچھ بوجھل لگ رہی تھی۔ حسام نے اس کے انداز پر غور کیا۔

”یہ سب کتنا بھیانک ہے ویسے۔“ حسام نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔

”بہت۔۔“ درے کی آواز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کسی گہرے خیال میں کھوئی ہوئی تھی۔

حسام نے درفشاں کے اوپر تشویش بھری نظر ڈالی۔ یہ منظر نایاب تھا۔ وہ ہفتوں سے اس کے ساتھ کام کر رہا تھا اور اسے یاد نہیں پڑا کہ وہ آخری مرتبہ کب اس طرح سے مرجھائی تھی۔

”آپ نے اپنے بھائی کو سب بتایا، درے؟“ حسام نے پوچھا۔

”نہیں۔ فی الحال تو نہیں۔“ وہ بدستور روکھے پن سے بولی۔

”مگر کیوں؟ آپ کو اپنے بھائی کو اعتماد میں لے لینا چاہیے۔ آپ ایک خطرناک کام کر رہی ہیں۔ آپ کے بھائی کو سب علم ہونا چاہیے۔“ حسام نے سمجھانے والا انداز اختیار کیا۔

”اس نے منع ہی کرنا ہے۔ وہ بہت پروٹیکٹو ہے۔“ درے کچھ بیزار سی نظر آئی۔

”تو کیا ہوا؟ وہ آپ کا بھائی ہے۔ اسے منائیں گی تو وہ مان جائے گا۔ آپ دونوں فیملی ہیں، اس لیے کسی سے کچھ بھی نہ چھپایا کریں۔“

درے بے دلی سے مسکرائی۔

”شاید، چیزیں چھپانا ہماری رگوں میں دوڑتا ہے۔ وہ بھی ایسا ہی ہے۔ بہت سی چیزیں ہیں جو مجھے نہیں بتاتا۔“

حسام مختصر سا مسکرا دیا۔

”آپ کچھ بوجھل لگ رہی ہیں۔ سب خیریت؟“ حسام سے رہا نہ گیا اور آخرکار پوچھ ہی بیٹھا۔

درے نے سر نفی مین ہلایا۔ چہرے پہ واضح کرب تھا۔ حسام کی تشویش میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

”تین سال پرانی پہیلی آج حل ہوئی ہے، حسام۔ میرے لیے یہ سب بہت غیر معمولی ہے۔“ درے نے کھوئے ہوئے انداز میں حسام کو بتایا۔

حسام کا سینہ تنگ ہوا۔ اسے احساس ہوا کہ یہ منظر صرف نایاب نہیں بلکہ تکلیفدہ بھی تھا۔

”آپ مجھ سے شیئر کر سکتی ہیں۔ شاید آپ کا دل ہلکا ہو جائے۔“ حسام نے نرمی سے کہا۔

درفشاں کے چہرے پر اداس سی مسکراہٹ بکھری۔ وہ بھی گھنٹوں لوگوں کو سنا کرتی تھی، اور آج کوئی تھا جو اسے سننا چاہ رہا تھا۔

''میرے ایک بھائی تھے، فیروز۔'' درے کی آواز گیلی تھی۔ مگر وہ روئی نہیں۔ وہ احمد کے علاوہ کسی کے سامنے نہیں رویا کرتی تھی۔

''وہ تین سال پہلے کہیں کھو گئے تھے۔ اور آج معلوم ہوا کہ ان کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ وہ بھی یہی کہتے تھے۔ ایک انسٹا پیج ہے۔ ایک آفس ہے۔ جس کے ذریعے وہ استنبول جائیں گے۔ اور ایک رات، وہ اچانک سے غائب ہو گئے۔ ہم نے بہت ڈھونڈا مگر وہ کہیں نہیں ملے۔ اب دل تسلیم کرنے لگا ہے کہ فیروز بھائی نہیں رہے۔ وہ بھی اس مافیا کے ہاتھوں یقیناً مارے گئے ہیں۔'' درے کا لہجہ غمگین تھا۔

حسام کی آنکھیں بھی اداس رنگوں میں ڈھلنے لگیں۔

''میں جانتا ہوں کہ سچ کا سامنا کرنا مشکل ہے۔ مگر آپ کو نہیں لگتا کہ اس میں خدا کی طرف سے رحمت بھی ہے؟''

درے نے آنکھیں چھوٹی کیے اس بات پر غور کیا۔

''جن سوالات کے جوابات پردوں کے پیچھے ہوں ہوں، وہ زندگی بھر پریشان کرتے ہیں۔ تجسس بلا ہے، درِفشاں۔''

وہ جب اس کا نام لیتا تھا، دل بے اختیار رفتار پکڑ لیتا تھا۔

"آپ یقیناً اداس ہوں گی۔ مگر مطمئن بھی ہوں گی۔ کیونکہ اب آپ کو ایک راز کی کھوج میں ہلکان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

درے زیرِ لب مسکرا دی۔ واہ! وہ جو سب کو تھیراپیز دیا کرتی تھی، آج اسے بھی کوئی تھیراپی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

"آپ ابھی فارغ ہیں نا؟" حسام درے سے مخاطب ہوا۔

"جی۔ کوئی کام؟"

"پھر ہم کہیں چلتے ہیں۔ آپ کا موڈ بھی اچھا ہو جائے گا۔ اور میرا بھی گھومنے کا دل کر رہا ہے۔ بتایئے چلیں گی؟" حسام کا انداز پر خلوص تھا۔

درے تھکی ہوئی تھی۔ شاید انکار کر دیتی۔ مگر اس کی آنکھوں میں درخواستانہ تاثر دیکھ کر وہ انکار نہ کر سکی۔

"ہاں کیوں نہیں۔ کہاں جائیں گے؟" درے نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"راول لیک چلتے ہیں۔ بچپن میں ڈید کے ساتھ آیا کرتا تھا۔" حسام نے پرانے وقتوں کو یاد کرتے ہوئے کہا۔

درے خوشگوار سا مسکرا دی۔

☆☆☆

حسام اور درے پتھروں کے بنے راستے پہ چل رہے تھے۔ درے نے سیاہ شرٹ پر جینز کی سکرٹ پہنی ہوئی تھی۔ آنکھوں پر موٹا چشمہ تھا۔ بال سلیقے سے پونی ٹیل میں بندھے ہوئے تھے جو کہ ہوا کے باعث اس کے کندھے کی طرف جھول رہے تھے۔ حسام نے سفید شرٹ اور جینز کی پینٹ پہنی ہوئی تھی۔ آنکھوں پر اس کے نظر کا چشمہ تھا پر درے جتنا موٹا نہیں۔ سرمئی بادل ہر طرف چھائے ہوئے تھے۔

"کتنا خوب صورت موسم ہے۔" درے نے بادلوں کو دیکھا۔ حسام مسکرایا۔

"اگر موسم آپ کا موڈ بحال کرنے میں کامیاب ہوا ہے تو میرے لیے واقعی خوبصورت ہو گا۔" کہتے ہوئے رخسار سُرخ ہوئے۔

درے نے مسکراہٹ دبائی۔ "اور یہ پھر شروع ہو گئے۔" اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ یہ پہلی مرتبہ تھا کہ کسی مرد نے اس میں اتنی دلچسپی لی تھی اور یہ کہنا غلط نہیں ہو گا کہ درِفشاں اس تجربے سے لطف اٹھا رہی تھی۔

"موڈ تو اسی وقت بہتر ہو گیا تھا جب آپ نے ساتھ چلنے کی آفر دی تھی۔" درفشاں نے نرمی سے کندھے اچکا دیے۔

حسام خود میں ہنسنے لگا۔

"اوہ۔ یعنی مجھے آپ کو یہاں لا کر اپنا پیٹرول ضائع نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

وہ ندی کنارے کھڑے تھے۔ ندی کا صاف شفاف پانی نظر آ رہا تھا۔ دور دراز سبز پہاڑیاں کھڑی تھیں۔ ندی میں سیاحوں کو بوٹ رائڈنگ کرتے دیکھ کر حسام کا دل للچایا۔

"آپ بوٹ رائڈنگ کرنا چاہیں گی؟" حسام نے درے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ میں نے آج تک نہیں کی۔" درے نے صاف انکار کر دیا۔

"ایک دفعہ کر کے تو دیکھیں۔"

"میں تیس کی ہو گئی ہوں۔ اب نئے تجربے کرنے کا جی نہیں چاہتا۔"

"کوئی بات نہیں۔ تیس کا ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ زندگی جینا چھوڑ دی جائے۔" اس نے کسی بھی حال میں درے کو منانے کی ٹھانی۔

درے مسکرا دی۔

"اب ایسی بات نہیں کہ میں ایک بور انسان ہوں۔" درفشاں کچھ دیر بعد بولی۔

"ایک دفعہ میرے کہنے پر کر لیں۔ مزہ نہیں آیا تو ہم فوراً واپس آجائیں گے۔ ٹھیک؟"

وہ اس کے چہرے کو تکتی گئی۔ انکار کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھی۔ اس نے ہاری ہوئی سانس خارج کی۔

"چلیں ٹھیک ہے۔" درفشان بالآخر مان ہی گئی۔

دونوں کشتی میں اترے۔ درے نے اسپورٹس شوز پہنے تھے تو اس کے لیے بوٹ میں اترنا مشکل نہ تھا۔ اس کے اترتے ساتھ بوٹ ذرا سا لہرائی، اور اسی کے ساتھ اسے اپنا دل بند ہوتے محسوس ہوا۔ اس نے پھٹی ہوئی آنکھوں کے ساتھ حسام کو دیکھا جو کہ مسکراہٹ کو دبا رہا تھا۔

"ڈریں مت۔ کچھ نہیں ہوتا۔" حسام نے کشتی میں اترتے ہوئے کہا۔ حسام کے اترتے ہی کشتی مزید ڈگ مگ ہوئی۔ درے کی گھبراہٹ میں اضافہ ہونے لگا تھا۔

"یہ لیں جیکٹ پہن لیں۔" حسام نے درے کی طرف نارنجی لائف جیکٹ بڑھائی۔

درے نے حسام کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"ان کی کیا ضرورت ہے۔ کیا یہ محفوظ نہیں؟" اس کے خدشات بڑھنے لگے۔

حسام کو کھلکھلی آنے لگی۔

"فکر نہ کریں۔ یہ بس فورمیلٹی ہے۔"

درے پرسکون نہ ہوئی۔ اس نے بے دلی سے لائف جیکٹ پہنی اور بیٹھ گئی۔ درے آگے تھی اور حسام اس کے پیچھے، وہ دونوں اس طرز پر بیٹھے تھے کہ درے کی حسام کی طرف پشت تھی۔

دونوں نے چپو گھمانا شروع کیے۔ درے کی گھبراہٹ میں اضافہ ہوا۔ دماغ میں ہر طرح کی منفی سوچ امڈ رہی تھی۔ اسے وہ سارے بوٹ رائڈنگ کے حادثات یاد آئے جو اس نے گزرے زمانے میں سنے تھے۔ دل ڈوبتا چلا گیا۔

وہ بے دھیانی میں، غلط رخ میں چپو گھمانے لگی۔ اس کے باعث کشتی پانی میں عجیب وغریب طرز میں جھومنے لگی۔ اس نے دل ہی دل میں کلمہ شہادت پڑھا۔ لحظے بھر کے لیے موت کا یقین ہوا تھا۔

"دوسری طرف چلائیں۔ کوئی بات نہیں ابھی سب نارمل ہو جائے گا۔" حسام پیچھے سے بولا۔

درے نے کپکپاتے ہاتھوں سے درست رخ میں چپو گھمایا۔

کشتی سیدھ میں پانی میں اپنا رستہ بنا رہی تھی۔ رفتہ رفتہ گھبراہٹ میں کمی محسوس ہوئی۔ اور پھر ایک وقت آیا جب گھبراہٹ منظر عام سے غائب ہو گئی۔ ایک الگ نوع کا لطف تھا بیچ ندی میں چپو اس طرح سے گھمانے کا۔ چپو پانی سے ٹکراتا تو ایک خوبصورت سی آواز پیدا ہوتی۔ آواز کانوں میں رس گھولتی تھی اور دل کو بھی قرار بخشتی تھی۔ بے پناہ سکوت ماحول میں چھایا ہوا تھا۔

"بس شروع میں تھوڑا مشکل تھا۔" درفشاں بالکل پر سکون ہو کر بولی۔

"اور پھر جب اس کی عادت ہو گئی تو یہ بہت اچھا لگنے لگا۔ بہت حسین۔"

"سچ میں بہت حسین۔" حسام کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ وہ کسی گہرے خیال میں تھا۔

یہ ندی سے چپو کے ٹکرانے کی خوبصورت آواز تھی یا یہ درے کا ساتھ تھا جو اس کے دل کو اتنا سکون بخش رہا تھا؟

وہ دونوں، ہموار سی خاموش ندی کے نیلی پانے میں کشتی چلاتے گئے۔ ندی کے پانی میں دو سفید ہنس نظر آئے جو ان کی کشتی کے عقب میں تیر رہے تھے۔ وہ دونوں تعجب سے ان خوبصورت پرندوں کو دیکھتے گئے۔

پہاڑیوں کے اوٹ میں سورج دکھائی دے رہا تھا جو آسمان سے رخصت ہو جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اندھیرا اچھیل جاتا، اس سے قبل دونوں واپس مڑ گئے۔

درے کے چہرے پر بھرپور مسکراہٹ تھی۔ دونوں کے دلوں میں خوشگوار سا احساس سمایا ہوا تھا۔

"یہاں پر میرا فیورٹ رول والا ہے۔ جب بھی آتا ہوں تو ان کے رول ضرور کھاتا ہوں۔ اب تو وہ بہت بوڑھے بھی ہو گئے ہیں۔ آئیں چلتے ہیں۔" وہ پتھریلے راستے پر واپسی کی راہ پہ گامزن تھے۔

درے اس کے پیچھے چلنا شروع ہوئی۔ کشتی سے واپس آنے کے بعد آنکھوں کی چمک ماند ہی نہ پڑتی۔

ایک چھوٹا سا اسٹال تھا جس کے پیچھے ایک بوڑھا شخص کھڑا تھا۔ حسام نے دو رول بنوائے۔ ایک درے کو دیا اور دوسرا خود کھایا۔

"یہ واقعی بہت مزے کا ہے۔" درے نے رول کا لقمہ بھرتے کہا۔ رول میں چٹپٹا سا چکن تھا جس پر کوئلے کا داغ لگایا گیا تھا۔ ساتھ میں کھیرے ٹماٹر تھے، اور ایک دہی اور مایو سے بنایا گیا، گارلک ساس تھا جو کہ چکن کے چٹپٹے ذائقے کے ساتھ توازن قائم کر رہا تھا۔

"کہا تھا ناں۔" حسام نے لقمہ بھرتے ہوئے کہا۔

رول ختم کر کے دونوں پھر سے گاڑی میں سوار ہو گئے۔ بالآخر ایک خوبصورت شام کا اختتام ہوا تھا، خوبصورت اور حسین شام، شام جو درفشاں اور حسام جلد بھولنے والے نہ تھے۔

☆☆☆

رات کے پہر بوندا باندی شروع ہوئی۔ پانی کی بوندیں شمائلہ کے کمرے کی کھڑکیوں پر دستک دے رہی تھیں۔

وہ کسی گہرے خیال میں گم صم تھی۔ بوندوں کی کھڑکی سے ٹکرانے کی آوازیں سوچوں میں خلل پیدا کرتیں۔ یکبارگی دروازہ چرچرانے کی آواز نے انہیں خیالات کی زد سے آزاد کیا۔

انہیں وہ عورت نظر آئی، جو پچھتاوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی اور ہر لمحے زندگی کو کوستی تھی۔

نیلوفر کے ہاتھ میں چاولوں کی پلیٹ تھی۔ نیلوفر کو دیکھتے ہی شمائلہ کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھری، گویا وہ نیلوفر کی راہ تک رہی ہوں۔

نیلوفر نے چاولوں کی پلیٹ بستر پر رکھی اور خود ان کے سامنے بیٹھ گئی۔

”آپ کو شمس نے دوپہر کا کھانا دیا؟“ نیلوفر نے پوچھا۔

شمائلہ نے گردن نفی ہلا کر ہاتھوں سے چاول کھانا شروع کیے۔ نیلوفر نے گردن کو جنبش دی۔

”اسے نظر انداز کریں، شمائلہ۔ وہ بالکل بچوں جیسا ہے۔ کل آپ کی وجہ سے اسے میں نے پیٹ دیا اس لیے اس نے انتقاماً، کھانا نہیں دیا۔“ نیلوفر چہرے پر کوفت لیے بولی تھی۔

شمائلہ نے کوئی جواب نہ دیا، بس چپ چاپ پیٹ کی آگ بجھاتی گئیں۔

نیلوفر بھی خاموش رہی۔ وہ جیسے کچھ بولنا چاہ رہی تھی، مگر کشمکش میں تھی کہ بات کرنے والی تھی بھی یا نہیں۔ جب شمائلہ نے کھانا ختم کر لیا تب نیلوفر نے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

”شمائلہ، آپ نے کل کہا تھا کہ میں جرائم کی دنیا سے جانا چاہتی ہوں۔ آپ نے مجھے صحیح پہچانا تھا۔ میں دو حصوں میں بٹی ہوئی ہوں۔“ نیلوفر اپنے اوپر استہزائیہ ہنسی ہنسی۔ اس کی آنکھوں میں کچھ غمگین کر دینے والا تھا۔

”میں اپنے لیے واپسی کے تمام دروازے بند کر چکی ہوں۔ میں ایک کے بعد ایک، برے سے برا جرم کرتی گئی۔ اور میرے جس گوشے کی بات کرتی ہیں آپ۔ میں اسے جھڑک کر چپ کرا دیتی ہوں۔“ نیلوفر اداس سا مسکرا دی۔ دل میں ٹیسیں اٹھ کر معدوم ہو رہی تھیں۔

شمائلہ کے چہرے پہ افسوس تھا۔

”نیلوفر نامی لڑکی اندھیروں میں ڈوب چکی ہے شمائلہ۔ وہ جکڑی جا چکی ہے۔“ نیلوفر کی آنکھیں نم ہوئیں۔

”آپ اپنی برائی میں کبھی خوش نہیں ہو سکیں گی۔“ شمائلہ نے نرمی سے کہا۔

”یہی تو بات ہے شمائلہ، میں کبھی خوش ہی نہیں ہوتی۔“ نیلوفر استہزائیہ انداز میں بولی۔ ”میں سابقہ زندگی میں بھی خوش نہ تھی۔ جب اس دنیا کا حصہ بنی تب بھی مطمئن نہ ہو سکی۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ خوشی، اطمینان، سکون جیسے احساسات فریب کے سوا کچھ نہیں ہے۔“ وہ آنکھوں میں بے بسی اور لاچارگی لیے شمائلہ کو دیکھنے لگی۔

شمائلہ کے چہرے پہ آسودہ سا تاثر تھا۔ وہ جیسے نیلوفر کی ہر الجھن کا جواب اپنے پاس رکھتی تھیں۔ انہوں نے ایک شفقت بھری نگاہ نیلوفر پہ ڈالی۔ نیلوفر موم کی طرح پگھلی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ محبت بھری نگاہ کے لیے لاشعوری طور پر کتنا ترس رہی تھی۔ لمبے عرصے سے خود کی نظر میں ان چاہی بننے کے بعد، کسی اور کی نظروں میں اپنے لیے چاہت دیکھ کر دل نے حقیقی مسرت محسوس کی۔

”آپ کو اب تک اطمینان اس لیے نہیں مل سکا نیلوفر، کیونکہ آپ غلط چیزوں میں سکون تلاش کر رہی تھیں۔“ شمائلہ سادگی سے بولیں۔

نیلوفر کی آنکھوں میں الجھن در آئی۔

"کیا فائدہ، شمائلہ۔ میں برباد تو ہو چکی ہوں۔" نیلوفر نے ہاتھ اٹھا کر حتمی سے انداز میں کہا اور منہ شمائلہ کی طرف سے پھیر لیا۔

"آپ ایک دفعہ پوچھیں خود سے، اگر آپ کے پاس واپسی کا راستہ موجود ہوتا تو کیا آپ اس سب کو چھوڑ نہ چکی ہوتیں؟" شمائلہ نے نیلوفر کے چہرے پہ نظر گاڑی۔

بہت سے جذبات بس اس ایک جملے نے جگا دیے تھے۔ نیلوفر نے سست روی سے سر ہاں میں ہلایا۔ آنسوؤں کا ریلا آنکھوں سے نکلا۔

"بہت پہلے ہی!" وہ گیلی سانس اندر کھینچتے بولی۔ شمائلہ آسودہ سا مسکرا دیں۔

"تو ہم آپ کو بتانا چاہتے ہیں کہ آپ غلط گمان کرتی ہیں۔ واپسی ممکن ہے۔ واپسی ہمیشہ ممکن ہوتی ہے، نیلوفر۔ ہمارا خدا، وہ رحیم ہے نیلوفر، وہ رحمن ہے۔ وہ غفور ہے!" شمائلہ کی آنکھوں میں چمک در آئی۔

"پھر اس خدا نے مجھ پر اتنے ظلم کیوں ڈھائے؟ کیوں مجھ سے میری جائداد چھینی؟ جنہوں نے میری جائداد چھینی انہیں برباد نہ کیا؟ کیوں جنہوں نے میری ماں کو مارا انہیں برباد نہیں کیا؟ اس کا رحم تب کہاں تھا شمائلہ؟ اس کا عدل و انصاف اس وقت کہاں تھا؟" نیلوفر کے انداز میں شکایت تھی۔ اس کے جذبات ابل ابل کر باہر آ رہے تھے۔

شمائلہ نے افسوس سے سر نفی میں ہلایا۔ اپنے پیارے اللہ کے بارے میں یہ باتیں سننا مشکل ضرور تھیں لیکن شمائلہ نے صبر کی راہ کو چنا اور نیلوفر کے ناجائز شکووں کو دور کرنے کی کوشش کی۔

”آپ اس دنیا میں انصاف کی تلاش کیوں کرنے بیٹھ گئیں، نیلوفر؟ جب اصل عدالت تو اس دنیا میں لگنی ہی نہیں ہے۔“ انہوں نے پر سوچ وقفہ لیا۔

”اللہ نے ظالمین کو سزا دینے کا وعدہ کیا ہے، نیلوفر۔ اگر اس دنیا میں نہیں تو دوسری دنیا میں۔ اس دن نیلوفر، جہنم ہم سب کے سامنے لائی جائے گی۔ زنجیروں میں جکڑی ہوئی۔ وہ کسی بھوکے شیر کی مانند نظر آئے گی۔“

شمائلہ کا انداز ہی ایسا تھا کہ ہر لفظ سیدھا نیلوفر کے دل پہ اثر کرتا تھا۔ نیلوفر کی آنکھوں میں خوف کا گزر ہوا۔

”اور اس وقت ہوگا صحیح معنوں میں انصاف، نیلوفر۔ خدا اس وقت جس کو چاہے جہنم میں ڈال دے۔ جس کو چاہے جنت میں۔ اور ہم انسانوں کا خدا کے فیصلوں پہ سوال کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہوگا۔ اس وقت صرف ہمیں اپنی فکر ہوگی، کہ بس ہم کسی طرح جنت میں پہنچ جائیں۔ اور وہ دن ہوگا جب گناہگاروں کو پتا چلے گا کہ وہ کتنی بڑی حماقت کر آئے ہیں۔ وہ جانتے ہوں گے کہ ان کا ٹھکانا کیا ہونے والا ہے، مگر افسوس، تب بہت دیر ہو گئی ہو گی نیلوفر۔ بہت دیر۔ اور پھر وہی گناہگار اس دن اپنے رب کے حضور پکاریں گے:

”کاش میں نے اپنی اس زندگی کے لیے کچھ پیشگی سامان کیا ہوتا۔ (سورۃ فجر)“

کتنا ہی دردناک انجام ہے ناں یہ نیلوفر؟ لمبی طویل زندگی گزار کر بھی ایسا کوئی عمل نہ کرنا جو ہمارے کام آئے۔ کاش! کاش نیلوفر، ہم اپنے رب کی قدر اس دنیا میں ہی کرنا سیکھ جائیں، کاش! کاش، ہم اس کے پکارنے پر اس کی طرف لوٹ آئیں۔“

شمائلہ نے اپنی بات سمیٹی۔ ان کی آنکھیں گیلی تھیں۔ نظر نیلوفر پہ پڑی تو انہیں ایک مختلف نیلوفر نظر آئی۔ نیلوفر پہ ہیبت سوار تھی۔ آنکھوں میں بے پناہ خوف تھا۔ وہ جیسے سکتے میں آگئی تھی۔ اس لمحے اس کی پوری زندگی سوالیہ نشان بن گئی تھی۔

نیلوفر ایک دم سے کھڑی ہوئی۔ اس کا دل خوف کے مارے لرز رہا تھا۔ وہ الٹے قدم اس کمرے سے بھاگ نکلی۔ وہ کیسے مزے سے کہا کرتی تھی کہ اس کا درجہ ابلیس سے بھی نیچے ہو گا۔ اب وہ سوچ میں پڑگئی تھی کہ کیا واقعی وہ جہنم کی آگ کی بھنک تک برداشت کر سکے گی؟

☆☆☆

رات اپنے اختتام کو پہنچی اور سورج نے آسمان میں اڑان بھری۔ مگر سورج کی اڑان زیادہ دیر نہ ٹکی، جلد ہی اسلام آباد کو گہرے بادلوں، اور ٹھنڈی ٹھنڈی نم ہواؤں نے گھیر لیا۔ گہرے سرمئی بادلوں کی اوٹ میں چھپا سورج اسلام آباد کے مکینوں پر اپنی کرنوں سے وار کرنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر بے فیض۔

مہر قصر کے سامنے کھڑی تھی اور سڑک پار نیلی ویگن کو تک رہی تھی، جس کے پچھلے دروازے کے ساتھ شمس کھڑا تھا۔ اس نے سانس اندر کھینچی اور خود کو کٹھن وقت کے لیے تیار کیا۔

شمس نے چہرے پر مکروہ تاثر سجائے اس کے لیے دروازہ کھولا۔ وہ بے دھیانی میں کوفت زدہ سانسیں خارج کرتی ویگن میں سوار ہو گئی۔ اسے احساس ہوا کہ اس کے برابر میں کوئی تھا۔ نتھنوں سے اعلیٰ پرفیوم کی مہک ٹکرائی۔

مہر کی نگاہیں شکی ہوئیں۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ سانسیں لمحے بھر کے لیے روانہ ہونا رک گئیں۔ وہ جہاں تھی وہیں تھم گئی۔

"کیسی ہو مہر؟" تنی ہوئی گردن لیے، لیڈی اقتدار بولی تھی۔ چہرے پر تکبرانہ مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

"میں تم سے ملنے کے لیے بے تاب تھی۔" وہ مصنوعی نروٹھے انداز میں بولی۔

مہر کے الفاظ اس کے حلق میں رہ گئے۔ وہ بالکل سن رہ گئی۔ اسے اندازہ نہ تھا کہ اندھیرے اور بدی کی سفاک ملکہ اس سے خود ملنے آئے گی۔

"دیکھو۔ کیا کرتی پھر رہی ہو تم۔" وہ بے نیاز سے انداز میں بولی۔ خفگی سے کندھے اچکائے۔

مہر ٹکٹکی باندھ کر لیڈی اقتدار کو گھورتی گئی۔

"جانتے ہوئے کہ، تم جو کر رہی ہو اس کا نقصان صرف اور صرف تمہاری ماں کو پہنچے گا مہر!" لیڈی اقتدار ہر لفظ پہ زور دیتے بولی۔ انداز میں واضح دھمکی تھی۔

مہر کا حلق خشک ہوا۔ سر پر دہشت ناک عورت کا خوف سوار تھا۔

"تم احمد سے اب بھی بات کر رہی ہو۔"

مہر چونکی۔ تو وہ سب جانتے تھے۔

"تم ہمیں دھوکہ نہیں دے سکتی۔ تم کیا سمجھتی ہو خود کو؟ اگر اپنی اور اپنی ماں کی زندگی عزیز ہے تو احمد سے جان چھڑوالو۔" لیڈی اقتدار نے دانت پیستے سختی سے کہا۔

مہر نے اپنی گردن سیدھی کی۔ اسے گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔

”وہ خود غرض انسان ہے مہر۔ اسے تمہاری اور تمہاری ماں کی پرواہ نہیں ہے۔ وہ صرف ہمیں برباد کرنا چاہتا ہے اور بس۔ اپنا مقصد پورا کرنے کے لیے وہ کچھ بھی کر کے دم لے گا، یہاں تک وہ تمہیں اور تمہاری ماں کو قربان بھی کر سکتا ہے۔ اور تم دیکھو، اس کے بھروسے کیا کر رہی ہو۔“ تحقیر آمیز نگاہ مہر پر ڈالی۔

”تم اس کے پیچھے اپنی ماں کی زندگی داؤ پر لگا رہی ہو۔“ وہ چبا چبا کر بولی۔

مہر کو یہ الفاظ شدید ناگوار لگے۔ آنکھوں میں آگ نے جنم لیا۔

”میں جس احمد کو جانتی ہوں، وہ ایسا کچھ نہیں کر سکتا۔“ وہ سیدھ میں دیکھتے آہستہ آواز میں بولی۔

لیڈی اقتدار کے چہرے پر ستائشی تاثر سجا۔ لب ”اوہ“ میں ڈھلے۔

”اوہ؟ واقعی؟“ تمسخر سے بولی۔ ”کیا اس نے تمہیں بتایا وہ ہمیں کیسے جانتا ہے؟“ طنزیہ مسکراہٹ لبوں پر بکھری۔

مہر نے گردن جھکالی۔ اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

”تم اسے کہاں جانتی ہو؟ تم اس پر اعتماد کرتی ہو۔ مگر وہ، تمہیں اپنے گہرے راز نہیں بتاتا۔“ آواز سرگوشیانہ تھی اور انداز کچھ بھڑکانے والا۔

”مگر۔۔“ مہر دفاع میں کہنے کو کچھ تلاشنے لگی۔

"تم جسے دیکھ رہی ہو وہ روشنی کی تیز کرن کی طرح ہے۔ چمکدار۔ روشن۔ مگر زیادہ دیر دیکھنے پر تمہیں بصیرت سے محروم کر دے گا۔۔"

مہر کے دماغ میں وسوسوں نے جنم لیا۔ وہ کچھ لمحے احمد کے بارے میں سوچتی گئی۔ پھر اس نے خیالات کو جھٹکا۔ یہ وہی احمد تھا، جس نے اس کا پل بھر ساتھ دیا تھا۔ کوئی کچھ بھی کہہ لے، احمد خود غرض یا دھوکے باز نہیں ہو سکتا۔ اس نے مضبوطی کا جام پیا۔ وہ ملکہ کے سامنے دب نہیں سکتی تھی۔

اس نے ٹھنڈی ٹھار آنکھوں سے مڑ کر لیڈی کو دیکھا۔

"مجھے نہیں لگتا آپ صرف احمد کے متعلق بات کرنے آئی ہیں۔"

انداز میں تبدیلی لیڈی اقتدار کو خوشگوار معلوم ہوئی۔ وہ ستائش سے مسکرائی۔

"چلو تم بتاؤ۔ میں کیوں آئی ہوں تم سے ملنے؟" سرمئی آنکھوں نے مہر کو چیلنج کیا۔

"شمس نے کسی کام کا ذکر کیا تھا۔ مجھے یقین ہے آپ وہ کام مجھے خود بتانے آئی ہیں۔"

لیڈی اقتدار نے اپنے سر کو جنبش دی۔ اسے محسوس ہوا کہ صرف وہی عورت عبد اللہ سلطان کی بیٹی ہو سکتی تھی۔ اپنی بات بلا جھجک دوٹوک انداز میں کرنے والی۔

"اب دیکھو، یہی بتانے تو مجھے یہاں تک آنا پڑا۔" ملکہ نے مصنوعی خفگی سے ناک سکیڑی۔

"مگر صرف کام کا ہو جانا اہم نہیں، کام کا احمد کی مداخلت کے بغیر ہونا ضروری ہے۔ اور اس بار احمد تمہارے آس پاس بھٹکا تو میں ایک لمحے میں تمہاری ماں کو ضائع کروں گی۔" لیڈی اقتدار نے مہر کو دھمکی دی۔

"میں آسان موت نہیں دیتی۔ میں پہلے تمہاری ماں کے اعضاء اکھٹا کروں گی۔" لیڈی اقتدار سرگوشی کرنے والے انداز میں بولی۔ چہرے پہ مکروہ مسکراہٹ تھی۔

مہر کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ یہ الفاظ اس کے کان میں پگھلے ہوئے سیسے کی مانند اترے تھے۔

"میں تمہیں بھی نہیں چھوڑوں گی۔ تمہیں اتنی تکلیف سے نوازوں گی کہ تم مجھ سے موت کی بھیک مانگو گی۔ تم میرے سامنے گڑگڑاؤ گی۔ مگر میں تمہیں ایک لمبے وقت کے لیے موت نہیں دوں گی۔ تم جانتی ہو کہ میں یہ سب کر سکتی ہوں۔" لیڈی اقتدار کہہ کے دبی دبی آواز میں ہنسنے لگی۔

مہر کے دل پہ لیڈی اقتدار کی دہشت سوار ہو گئی تھی۔ وہ جس کے ساتھ بات کر رہی تھی وہ کوئی عام عورت نہیں تھی۔ وہ ملکہ تھی اس مافیا کی جو کہ نہ جانے کتنی زندگیاں برباد کر چکا تھا۔ وہ ایک خطرناک عورت تھی۔ ظالم اور سفاک عورت تھی۔

"جیسا آپ کہیں گی، ویسا ہی ہو گا۔" اس نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

"تو یعنی احمد سے رابطہ ختم ہو جائے گا؟"

مہر کے دل پر پھندا لگا۔ اس نے گردن ہاں میں ہلائی۔

"اسی میں بھلائی ہے۔ کیونکہ میں نے تمہاری ماں کو چھوڑنا نہیں تھا۔"

آنکھوں میں فاتحانہ تاثر تھا۔ اب وہ مدعے پر آنے لگی۔

"تمہارا باپ، ہم سب کے لیے منی لانڈرنگ کرتا تھا۔"

مہر نے بے یقینی کے عالم میں لیڈی اقتدار کو دیکھا۔ کیا وہ لوگ اس سے وہ کروانا چاہ رہے تھے جو وہ سوچ رہی تھی؟ اوہ خدایا۔ مہر کو ایک دم سے ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ پوری شان سے ایک نئی آفت سر پر منڈلا رہی تھی اور اس بار بھی اسے اپاہج کیا جا چکا تھا۔

”صرف ہمارے لیے نہیں۔ وہ بڑے بڑے سیاہ کاروں کے لیے یہ کرتا تھا۔ اس کی موت کے بعد اس کے اکاؤنٹس جام ہو چکے ہیں۔ چونکہ تم اس کی وارث ہو تو وہ اکاؤنٹس تم ہی کھول سکتی ہو۔“ مہر کے چہرے پہ واضح خوف و گھبراہٹ دیکھ کر لیڈی اقتدار کی مسکراہٹ گہری ہوتی گئی۔

مہر بے ساختہ سی ہو کر تیزی سے گردن نفی میں ہلانے لگی۔ وہ ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں لینے لگی۔

مہر کا یہ ردعمل دیکھ کے لیڈی اقتدار محظوظ ہو رہی تھی۔

”اس لیے ہمارا پیسہ لے کر تم دبئی جاؤ گی۔ تمہیں رقم اکاؤنٹس میں ڈالنی ہو گی اور وہ اکاؤنٹس کھل جائیں گے۔ اس کے بعد ہمیں تمہاری ضرورت نہیں ہو گی۔ تم واپس پاکستان میں قدم رکھو گی تب ہم تمہاری ماں تمہارے حوالے کر دیں گے۔“

”یہ جرم ہے۔ میں یہ نہیں کر سکتی!“ مہر بلند آواز میں زور دے کر بولی۔

لیڈی اقتدار لبوں پہ ہاتھ جما کر نزاکت سے ہنسی۔

”تمہارے پاس کوئی دوسرا راستہ ہے؟ اگر ہے تو مجھے بتاؤ۔“

مہر کو لگا جیسے وہ تپتی ہوئی ریت پر دوڑ رہی ہو۔ ہر طرف بے بسی تھی، تڑپ تھی۔ زندگی بھر بھاگتی رہتی تب بھی ٹھکانا نہیں ملنا تھا۔

"ایک کال مہر۔ ایک کال اور تمہاری ماں کو مار دیا جائے گا۔" لیڈی اقتدار نے انداز میں سختی برقرار رکھی۔

مہر ہنوز آنکھیں بند کیے گردن جھکائے بیٹھی رہی۔ کیا واقعی اس کے پاس کوئی راستہ نہ تھا؟ کیا وہ اب بری طرح سے پھنس چکی تھی؟ نہ جانے اور کتنے تلخ حقائق پر سے پردہ اٹھنا باقی تھا۔ اسے احمد یاد آنے لگا۔ کاش وہ جان سکتا کہ یہ ظالم لوگ اس کے ساتھ کیا کرنے والے تھے، لیکن اب تو وہ اسے بتانے تک کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔

"سوچ لو مہر۔ اچھے سے سوچ لو۔ کچھ دنوں میں تمہاری ماں تمہارے ساتھ ہو گی، محفوظ اور خوش باش۔" لیڈی اقتدار چہرے پہ مکروہ مسکراہٹ سجائے بولی۔

مہر نے اپنی آنکھیں کھولیں اور گردن اٹھائی۔ چہرے کا تناؤ سمٹ چکا تھا۔ ہر بل ڈھیلا ہو چکا تھا۔

مہر نے گردن موڑ کر سرد نگاہ لیڈی اقتدار پر ڈالی۔

"تیار ہوں۔" مہر بے تاثر انداز میں بولی۔ لیڈی اقتدار کی باچھے کھل اٹھیں۔

"مجھے اچھا لگا۔۔" لیڈی اقتدار کہتے کہتے رک گئی۔ مہر کے انداز میں کچھ تھا جو اسے بری طرح سے ٹھٹکنے لگا تھا۔ وہ شکی نگاہیں مہر پر مرکوز کیے اس کا جائزہ لینے لگی۔ مہر کے چہرے پہ مدھم مسکراہٹ دیکھ کے لیڈی اقتدار کے چہرے پہ پھیلی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ یہ مسکراہٹ بہت ہی غیر متوقع تھی، بہت زیادہ۔

"مگر، میری ایک شرط ہے!"

لیڈی اقتدار کے چہرے کا ہر زاویہ بگڑتا چلا گیا۔

وہ اندھیرے اور برائی کی ملکہ تھی تو کیا ہوا۔ جس عورت سے وہ کلام ہو رہی تھی وہ ٹوٹنے والوں میں سے نہ تھی۔

☆☆☆

اسلام آباد کے مضافات پر فجر قصا ہو چکی تھی۔ مہر نے فوراً پیکنگ شروع کر دی تھی۔ لیڈی اقتدار کا ماننا تھا کہ احمد سے رازداری برقرار رکھنے کے لیے اس کا جلد از چلے جانا بہتر تھا۔

اسے لاتعداد مرتبہ چھوٹے موبائل پر کالز موصول ہوئیں۔ مگر اس نے ہر کال کو نظر انداز کیا۔ ایسا کرتے ہوئے دل جل جاتا۔

"ہم ساتھ ہیں۔"

"میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

احمد کی باتیں اس کے ذہن میں گونجتیں۔ مگر پھر لیڈی اقتدار کی دھمکیاں یاد آجاتیں۔ ماں سے بچھڑ جانے کا خوف سر پر حاوی ہوتا۔ اس نے موبائل سائلنٹ پر لگاتے ہوئے دیوار پر ٹنگے فریم کو دیکھا، جس پر عنایا کی تصویر تھی۔ وہ رنجیدہ ہوئی۔ اس سب میں نقصان اس کی بیٹی کا بھی ہو رہا تھا۔ وہ ماں کے ہوتے ہوئے بن ماں کی زندگی گزار رہی تھی۔

"اسی میں بہتری تھی، مہر۔ تم اس کے ساتھ کے خواب سجانے لگی تھی۔ جب کہ یہ ممکن نہیں۔ تم دونوں ایک ہونے کے لیے نہیں بنے۔"

اس نے خود کو کہہ کر اذیت میں چھوڑ دیا اور بے دلی سے پیکنگ مکمل کی۔



احمد اپنے بستر کے کنارے پہ بے چین سا ہو کر بیٹھا ہوا تھا۔ ہاتھ میں چھوٹا موبائل دبوچے وہ بے چینی کے عالم میں اپنا پاؤں زمین پہ تھپتھپائے جا رہا تھا۔ چہرے پہ نہ جانے کتنے بل تھے۔ اسے مہر پہ رہ رہ کے غصہ آ رہا تھا۔ وہ اچانک سے ایسا کیوں کرنے لگی تھی؟ وہ کیوں اس سے راز داری اختیار کرنے لگی تھی؟ وہ جو کل تک ساری دنیا سے دھوکہ کھا جانے کی باتیں کر رہی تھی، آج اسے دھوکہ دے رہی تھی۔ دل میں کہیں تکلیف ہو رہی تھی۔

اس نے ہاتھ کی مٹھی بنائی اور گھٹنے پہ ماردی۔

اگلے لمحے وہ کھڑا ہوا۔ چھوٹا موبائل اس نے ڈیسک پر رکھا اور اپنا عام موبائل اٹھایا۔ اپنی انگلیوں کا تیزی سے استعمال کرتے ہوئے وہ کسی کو کال ملانے لگا۔ کچھ دیر بعد کال اٹھالی گئی۔

"ہاں ذالقرنین۔" کال اٹھ گئی تو احمد اپنے آپ کو نارمل کرتے بولا۔ اندر سے وہ غصے سے کپکپا رہا تھا۔ "ذرا چیک کرو قریب کے دنوں میں کسی مہر بنت عبداللہ سلطان کی کہیں فلائٹ تو نہیں؟" اس کی آنکھوں میں شک ابھرا۔

"جی احمد بھائی، ابھی کر دیتا ہوں۔ تھوڑی دیر ہولڈ کیجیے۔" ذوالقرنین نے کہا۔ احمد بھی بے چینی کے مارے کمرے میں ٹہلنے لگا۔

"جی۔ مہر بنت عبداللہ سلطان۔" کچھ دیر بعد ذالقرنین بولا۔ "ان کی فلائٹ شام پانچ بجے کی ہے۔ دبئی کی۔"

احمد کو اس لمحے سانپ سونگھ گیا۔ وہ اپنا سر پکڑتے رہ گیا۔ اس کا اندازہ بالکل نشانے پر جا کر لگا تھا۔ احمد اضطراب کے عالم میں اپنی کنپٹی مسلنے لگا۔ غصہ اپنی جگہ، اب فکر ستانے لگی۔

کیوں ہو رہی تھی اس عورت کی اتنی فکر جو عین موقعے پر اسے لات مار کر جانے کے لیے تیار تھی؟ اسے اپنا آپ سمجھ نہ آسکا۔ آخری کیوں اب بھی دل اس کے لیے بے چین تھا؟ وہ تھی کیا اس کے لیے؟ دوست، ساتھی یا کچھ اور؟ کیوں احمد کی سوچوں کے نخلستاں میں صرف اس ہی کا آپ بھٹکا ہوا تھا۔

"سنو۔" احمد نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "میری بھی اسی جہاز پر فلائٹ بک کر دو۔" اس کی آنکھوں میں شدید نا گواری تھی۔ اب مہر کے خاطر اسے اپنا نیا نویلا آفس یوں اکیلا چھوڑ کر دبئی جانا پڑ رہا تھا۔ اف۔ احمد بس سانسیں بھرتا رہ گیا تھا۔

"اکونومک یا بزنس؟" ذالقرنین نے پوچھا۔

"اکونومک۔" احمد کی آواز میں کوفت سی تھی۔

"ٹھیک ہے بھائی ہو جائے گی۔ یہاں آکر ٹکٹس لے لینا مجھ سے۔"

احمد نے کال کاٹ دی۔ اس نے نامحسوس انداز میں پیر پٹخا اور موبائل بستر کی طرف اچھالا۔ غصہ ہر طرف غالب آچکا تھا۔ چہرہ سُرخ پڑا۔

"ایسی کی تیسی۔ میں بھی دیکھتا ہوں کیسے بھاگتی ہیں آپ مجھ سے۔" احمد زیرِلب بڑبڑایا۔

وہ آسیب بن چکا تھا، جو مہر کی خواہش کی پرواہ کیے بغیر اس پر جھپٹنے کی تیاری کر رہا تھا۔

اس نے عجلت کے عالم میں پیکنگ شروع کی۔ جو کپڑے ملتے وہ اپنے بیگ میں ڈال دیتا۔ اپنے کریڈٹ کارڈز اور ڈاکومنٹس سب اس نے سوٹ کیس میں اچھال دیے۔ اور پھر وہ سوٹ کیس ہاتھ میں پکڑے کندھے پر بیگ پیک لٹکائے کمرے سے نکلا۔ سیڑھیاں اترا تو درفشاں آئی لینڈ کچن میں مصروف تھی۔

''احمد اتنی جلدی میں کہا جا رہے ہو۔'' درے نے پیچھے سے پکارا۔

''وقت نہیں ہے آپا، تفصیل نہیں پوچھنا۔ دبئی جا رہا ہوں۔'' احمد نے نیچے اترتے ہوئے کہا۔ چہرے کا ہر زاویہ بگڑا ہوا تھا۔

درے بری طرح سے چونکی۔ اسے لگا اس نے کچھ غلط سن لیا تھا۔

''دماغ تو نہیں خراب ہو گیا ہے؟ ایسے کیسے منہ اٹھا کر دبئی جا رہے ہو؟'' درفشاں نے غصے میں کہا۔

''میرا پیچھا چھوڑ دو۔ میرا سر ویسے ہی گھوما ہوا ہے۔ کچھ الٹا سیدھا بول دوں گا پھر روتی رہ جاؤ گی۔'' احمد کا غصہ اس پہ حاوی ہونے لگا تھا۔ درے بھی پھر احمد کی بہن تھی، ہو گئی آگ بگولہ۔

''دفع ہو۔'' وہ اپنے بھائی کی بدلحاظی بھلا کیوں برداشت کرتی؟

''ہاں ہاں۔ دفع ہو۔'' احمد اب دروازے کی طرف پہنچا۔

''کچھ کھا کر تو چلے جاتے۔'' ایک لمحے میں وہ احمد کے لیے اپنی ناراضگی بھلا بیٹھی۔

''راستے سے بہت سامان لینا ہے ابھی تمہارا سڑا ہوا کھانا کھا کر اپنا وقت نہیں ضائع کر سکتا۔''

یہ سن کے تو درے کی روح میں آگ سی لگ گئی۔

''بھاڑ میں جاؤ۔''

احمد سر جھٹکتے ہوئے گھر سے نکل گیا۔

☆☆☆

حسام اپنی گاڑی اسلام آباد کی سڑکوں پر بھگا رہا تھا۔ پچھلی نشست پر مناج اور درِفشاں براجمان تھے۔ دونوں نے جلباب زیب تن کیے ہوئے تھے، جس نے سر سے پاؤں تک ڈھکا ہوا تھا۔

''آخر، عمارہ ہی کیوں، مناج؟'' حسام نے دورانِ سفر پوچھا۔

''میں نے عافیتِ زندگی کے ملازمین کا ڈیٹا نکلوایا تھا۔ وہاں سے پتا چلا کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔ وکیشن پر گئی ہوئی ہے۔ اور اس کے بینک بیلنس سے اتنا تو پتا لگ گیا ہے کہ وہ کوئی سیدھا کام نہیں کر رہی۔'' مناج نے جواب دیا۔

حسام نے سر اوپر نیچے ہلایا۔

حسام کی گاڑی پنڈی کے ایک پرانے علاقے میں داخل ہوئی۔

''پہنچ گئے۔'' حسام نے گاڑی ایک پرانی عمارت سے دور پارک کی۔

''حسام اس بوڑھے چوکیدار کو باتوں میں لگا کر رکھنا، تب تک ہم اپنا کام مکمل کریں گے۔'' مناج کے کہتے ہی حسام کسی کشمکش میں مبتلا ہوا۔

اس کے دل میں لہریں سی ابھر رہی تھیں۔

"مناج، میں ایک انٹروورٹ ہوں۔ مجھ سے اس طرح کی ڈرامے بازی نہیں ہو گی۔"

اس سے پہلے مناج کچھ بولتی، درے اندر ہی اندر ہنس دی۔

"پچھلے دنوں میرا دل موہ لینے کی کوشش آپ کا بھوت کر رہا تھا؟" اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

"حسام۔ حرر کا معنی ہے آزادی۔ میرے لیے اس آزادی کا مفہوم روحانی ہے۔ میں نے حرر تب بنایا جب میں نے اپنے ماضی سے جان چھڑائی۔ تمہیں، مجھے اور باقی سب کو اپنے مخصوص قفس سے آزاد ہونا ہو گا، تب جا کر ہم حرر کے لائق بنیں گے۔ جاؤ۔ اس کمزوری کا مقابلہ کرو۔" مناج نے اٹل انداز میں کہا۔

حسام مسکرا کر گاڑی سے اتر گیا۔ مناج اب تک بہترین لیڈر ثابت ہو رہی تھی۔

چوکیدار بوڑھا تھا۔ چہرے پر لمبی داڑھی تھی اور ماتھے پر نماز کے باعث سیاہ نشان۔ انہوں نے سر پہ سفید ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ حسام ان کی طرف بڑھا۔ اس کے چہرے پہ گھبراہٹ سی تھی۔

"ہاں بیٹا کہاں جانا ہے؟" چوکیدار پختون لب و لہجے میں بولے تھے۔ حسام کے چہرے پہ سنجیدگی تھی۔ اس نے موبائل نکالا چوکیدار بھی حسام کے موبائل میں جھانکنے لگے۔ موبائل میں کسی عمارت کی تصویر کھلی تھی۔

"یہ بلڈنگ کدھر ہے؟ آپ بتا سکتے ہیں؟" اسے بات کرنے کا اس سے بہتر بحانہ نہ ملا۔

"ہاں بیٹا۔ یہ ادھر سے سیدھا جا کر بائیں مڑو گے، رفیق درزی کی دکان کے ساتھ والی گلی میں ہی ہو گی۔" بوڑھے پٹھان چوکیدار نے ہاتھ ہلا ہلا کے بتانا شروع کیا۔

اور یہی وقت تھا جب درے اور مناج جلباب پہنے ہوئے بلڈنگ کے اندر داخل ہوئیں۔ وہ بوڑھے چوکیدار کی نظروں میں نہیں آئی تھیں۔ حسام نے بہر حال دونوں کو جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

''آپ کا بہت شکریہ چچا جی۔ ویسے داڑھی کتنی خوبصورت ہے آپ کی۔ عرصے سے رکھنا چاہتا تھا میں۔'' حسام نے بات جاری رکھنے کی کوشش کی۔

گردن اور پیشانی میں ٹھنڈے پسینے پھوٹے۔

مناج اور درے تیزی سے سیڑھیاں پھلانگ رہی تھیں۔ وہ بہت چوکنا تھیں۔ جیسے ہی کسی کی آہٹ سنائی دیتی تو اپنی رفتار آہستہ کر لیتیں۔ وہ تیسری منزل پر پہنچیں۔ ایک پتلی راہداری سیڑھیاں ختم ہوتے ہی نمودار ہوئی تھی۔ دائیں اور بائیں طرف گھروں کے دروازے تھے۔ صد شکر عمارہ کا گھر راہداری کے شروع میں ہی واقع تھا۔

''تم اب دیکھنا۔ تالہ کیسے توڑا جاتا ہے۔'' مناج نے اپنے کندھے سے بیگ اتارا۔ درے آس پاس نظر دوڑا رہی تھی۔ کچھ بھی غلط ہوتا تو ان دونوں کو بغیر سوچے سمجھے یہاں سے بھاگ جانا تھا۔ وہ ہر چیز کی تیاری کر کے آئی تھیں۔

''یہ چاندنی تالے سب سے آسان ہوتے ہیں۔'' مناج نے اپنے بیک پیک سے ایک پاکٹ نائف نکالی۔ درے متوجہ ہوئی۔

''ان کی سائڈ پہ ایک لیب لگا ہوتا ہے جسے ہم اکھاڑ دیں گے۔'' مناج اس تالے کی سائڈ پہ لگا لیب پاکٹ نائف کی مدد سے اکھاڑنا شروع ہوئی۔ لیب اکھڑ گیا تو چار گول دائرے نظر آئے۔ یہ سوراخ تھے

جن میں لوہے کی باریک تاریں ڈالی گئی تھیں۔ مناج نے تالا ترچھا کیا تو چاروں باریک تاریں نکل کر زمین پر گر گئیں۔

”اب کام آسان ہے۔ چھری سے اس تالے کو کھول دینا ہے۔“ مناج نے کی ہول میں پاکٹ نائف گھسائی اور اسے گھما دیا۔ تالہ مخصوص آواز کے ساتھ کھل گیا۔

درفشاں تعجب سے سب دیکھتی رہی۔ تالہ ٹوٹ جانے کے بعد مناج نے کنڈی کھولی۔ دروازہ کھل گیا۔ انہوں نے گھر میں داخل ہو کر پیچھے سے دروازہ بند کیا۔ گھر کی فضا میں سانسیں لیے خود کو پر سکون کیا۔

”تمہیں تالہ توڑنا کیوں آتا ہے؟“ درے کو تعجب ہوا۔

دونوں اپارٹمنٹ کا معائنہ کرتے ہوئے ہم قدم چل رہی تھیں۔

”میں وکیل ہوں، درِفشاں۔ بعض اوقات ہم وکیلوں کو ٹیڑھے راستے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔“ مناج نے مشینی انداز میں بتایا۔

گھر میں بہر حال ایک ہی کمرہ تھا۔ وہ اس کمرے میں بہت محتاط ہو کر چل رہے تھے۔ اگر کوئی چیز اٹھاتے تو اسے جگہ پر رکھنا نہ بھولتے۔ الماری کے اندر نرس والا کوٹ تھا۔ انہوں نے اسے نکالا۔

”جلدی بٹنز دو۔“ درے نے مناج سے خاص بٹنز مانگے جن میں مائکروسکاپک کیمرا انسٹال تھا۔ مناج نے اپنے بیگ سے بٹنز سے بھرا ہوا ایک تھیلا نکالا۔ بٹن سفید تھے لیکن بیچ میں ایک نقطے جتنا سرمئی نشان تھا۔ مناج نے ساتھ دھاگا نکال کر درفشاں کے حوالے کر دیا۔

"ویسے مناج تم نے آج تک کتنے تالے توڑیں ہیں؟" درے نے سوئی دھاگے سے کوٹ میں نئے بٹنز لگاتے شرارتی سے انداز میں پوچھا۔

"تم اس بارے میں نہ پوچھو تو اچھا ہے۔" مناج کے مشینی انداز میں مدھم سی شرارت تھی۔ درے مسکرادی۔

"کیوں بھئی؟" درے زیرلب ہنس دی۔

"درست تعداد جان کر تمہیں میرے انسان ہونے پر شرمندگی ہوگی۔" دونوں ہنس پڑے۔

درفشاں اب بھی بٹنز لگارہی تھی۔

"میں نے کبھی نہیں سوچا تھا میں یوں کسی کے گھر میں تالا توڑ کر گھسوں گی۔" درفشاں مسکراہٹ دباتے بولی۔

"اچھا ہے۔ زندگی میں کچھ نہ کچھ غیر معمولی کرنا چاہیے۔ ایک جیسی زندگی انسان کو بور کر دیتی ہے۔" مناج بولی۔

"اگر احمد کو بھنک بھی پڑگئی ناں کہ میں یوں تالے توڑ رہیہوں تو اسے ہارٹ اٹیک ہی آجانا ہے۔"

سارے بٹنز سل چکے تھے۔ مناج کوٹ نظروں کے قریب کیے بٹنز کا جائزہ لینے لگی۔

"اگر میں ہوتی تو سمجھ جاتی کہ کسی نے میرے کوٹ کے بٹن تبدیل کیے ہیں۔ مگر ہر کوئی مناج نہیں ہوتا۔" مناج نے تبصرہ کیا۔ درفشاں کچھ بے چین ہونے لگی۔

"بس دعا کرتے ہیں کہ وہ لڑکی بہت بد دماغ ہو۔" درے نے کہتے ہوئے کوٹ پر تہہ لگانا شروع کی۔ دونوں نے الماری میں ہر چیز کو ترتیب دی۔

"اب تم باہر جا کر اشارہ دینا مجھے۔" الماری کے پٹ بند کرنے کے بعد مناج بولی۔

دونوں کی سانسیں پھول گئی تھیں۔

درے بہت آہستگی سے قدم بڑھاتے دروازے تک گئی۔ دروازے کو ہلکے سے کھول کے باہر آئی۔ باہر کوئی نہیں تھا۔ جب وہ مطمئن ہوئی تو اس نے دروازہ بجا دیا۔ مناج بھی باہر آگئی۔ اس نے دروازے کی کنڈی لگائی اور بیگ سے نیا تالہ نکال کر دروازے پر لگایا۔ وہ تیز دھڑکتے دلوں کے ساتھ نیچے اتریں۔

حسام بدستور بوڑھے چوکیدار سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کوفت صاف ظاہر ہوتی تھی۔ دونوں اپنے جلباب کے پیچھے ہی ہنسنے لگیں۔ ان دونوں کو واپس آتا دیکھ کے حسام نے سکون بھری سانس فضا کے سپرد کی۔

"ہیں؟ یہ کیسی عورت جو بیچ راہ اپنے شوہر کو چھوڑ کر چلے گئی۔" بوڑھے چوکیدار حسام کے ساتھ باتوں میں مست تھے۔ انہیں حسام خاصا شریف معلوم ہوا تھا۔

"چلیں میں چلتا ہوں۔" حسام کی بھی بس ہو چکی تھی۔

"دوبارہ چکر ضرور لگانا بیٹا۔" بوڑھے چوکیدار نے خوشگواری سے کہا۔ حسام نے اونچا "جی ضرور" کہا اور واپس گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی میں بیٹھ کر وہ ٹھنڈی سانسیں لینے لگا، جیسے کندھوں سے کوئی بہت بڑا بوجھ سرک گیا ہو۔

”تمہارا کام سب سے مشکل تھا حسام۔“ مناج کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ درے اپنا جلباب کھینچ کر اتار چکی تھی اور اب سانسیں برابر کر رہی تھی۔

”اڑا لو مذاق۔ ویسے بڑے ہی کوئی نیک انسان تھے۔ یوں آنکھوں میں دھول جھونکنا اچھا نہیں لگا۔“ حسام کا دل کچھ بھاری سا ہو رہا تھا۔

”ہاں مجھے یقین ہے جلد تمہارے گھر اپنی بیٹی کا رشتہ بھی بھیج دیں گے۔“ مناج تمسخرانہ سے انداز میں بولی تو سب ایک ساتھ ہی ہنس دیئے۔

زندگی اچانک سے کتنی ایڈونچرس ہو گئی تھی۔۔۔ ہے ناں؟

☆☆☆

نیلی ویگن ایئرپورٹ کے باہر رکی۔

مہر کو لگا جیسے اسے مقتل گاہ میں اتارا جا رہا ہو۔ عنقریب وہ سولی چڑھنے والی ہو۔ اس کے ہاتھ جلد سیاہی میں رنگنے والے تھے۔ اس فضا میں نحوست محسوس ہو رہی تھی۔ وہ مضطرب سے عالم میں گاڑی سے اتری۔ شمس نے ڈگی سے سیاہ سوٹ کیس نکال کر اس کے حوالے کیے۔ اسے تھامتے ہوئے ہاتھ کپکپائے۔ ہتھیلیاں نم پڑیں۔ سانسیں بے ترتیب تھیں۔

”تم کب تک آؤ گے؟“ اس نے گھبرا کر شمس سے پوچھا۔

”کل صبح۔ رات کو میں تم سے کال کر کے تمہارے ہوٹل کا پوچھ لوں گا۔ کل اپنی امانت لے جاؤں گا۔“ شمس نے سوٹ کیس کی طرف اشارہ کیا۔

”میں پکڑی تو نہیں جاؤں گی؟“ اس کی آواز کمزور تھی۔

”اگر اس طرح گھبراتی رہی تو پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں، پکڑی جاؤ گی۔“

ہاتھ بے اختیار پیشانی کو پہنچا۔ پیشانی بھی تر تھی۔

”اور کام؟ وہ کب تک ہو جائے گا؟“

”تھوڑا صبر تو کرو۔ سب جلد پتا لگے گا۔“

مہر سوالات کو ذہن سے جھٹک کر مڑ گئی۔

”سنو!“ شمس نے اسے پیچھے سے پکارا۔

قدم زنجیر ہوئے۔

”تم آج سے ہم میں سے ہوئی۔ اب تمہیں مجھ سے خوف کھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

اس کا دل کسی آبگینے کی طرح ٹوٹ گیا۔ اس لمحے ذہن پر صرف اس ایک مرد کا خاکہ اترا۔ وہ مرد جو نہ جانے کیسے اس کا سب کچھ بن چکا تھا۔ وہ ہر وقت محسوس ہوتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ کو جھڑک کر جا رہی تھی۔ ایک ایسی جگہ، جہاں سے واپسی ناممکن تھی۔

اس نے نادیدہ زنجیروں کو توڑ کر قدم اندر بڑھائے۔

شمس نے گاڑی سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیں۔ ایک عرصے بعد اس نے پر سکون نیند سونے کا ارادہ کیا تھا۔ اسے گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ جسم کے گوشے گوشے میں سکون بھر چکا تھا۔

”کیا حال ہے شمس؟“

وہ صرف آواز نہیں تھی، موت کے فرشتے کی آواز تھی جیسے۔ شمس برف کا بن گیا۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ وہ آنکھیں کھولنے سے قاصر تھا۔ نہیں نہیں۔ یہ خواب تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا۔ اس نے خود کا بارہا یقین دلایا۔

”آنکھیں تو کھولو۔“ پھر آواز آئی۔

شمس کو لگا کہ وہ زمین کی گہرائیوں میں دھنس جائے گا۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ اس کے سامنے جیسے کوئی عفریت کھڑی تھی جو عنقریب اپنے پنجے اس کی گردن میں گاڑ دینے کو تیار تھی۔

”احمد!“ لبوں سے بے اختیار نکلا۔

اس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ روح جسم سے نکل جانے کو تھی۔

”میں نہ جانے کب سے تم سے ملنا چاہ رہا تھا۔“ وہ اس کے قریب ہوا۔ بھوری آنکھوں میں کاٹ تھی۔

”کیا ہوا؟ کیا میرا آنا اچھا نہیں لگا؟ چچ۔ چچ۔ ہمیں گلے ملنا چاہیے تھا، دوست۔“

شمس اندر تک جل کر راکھ ہو چکا تھا۔



اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا مگر اس نے اپنا چہرہ پر اطمینان رکھا۔ سب کچھ اس کے سامنے سلو موشن میں ہو رہا تھا۔ اسے دھڑکا لگا تھا کہ اب کوئی اسے پیچھے سے پکارے گا۔ اب کوئی اس کے سوٹ کیس کی تلاشی لے گا۔ وہ برباد ہو سکتی تھی۔ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو سکتی تھی۔

مہر نے اپنا بیگ ٹریڈ مل پر رکھا۔ اس کے ماتھے پہ ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ اس نے بھرپور کوشش کی کہ اس کی گھبراہٹ اس کے چہرے پر نہ جھلکے۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ چیک پار کیا۔

اسے بس کوئی پیچھے سے رکنے کا نہ بول دے۔

مہر کو خوف ستائے جا رہا تھا۔

پھر وہ چیک سے نکل کر بیگز کا انتظار کرنے لگی۔ اس کے کپڑوں کا بیگ باہر آ گیا تھا۔ مہر کی سانسیں تھمنے لگیں۔ کچھ وقت گزرا لیکن شمس والا بیگ باہر نہ آیا۔ مہر کی نبض مزید تیز ہو گئی۔ دل کی دھک دھک کانوں میں چبھی۔

شمس والا بیگ بھی بالآخر باہر آ گیا۔ مہر نے سکون کی سانس باہر کو نکالی۔ اس نے دونوں بیگ ہاتھ میں تھامے اور چلنے لگی۔ ایک مشکل مرحلہ تو پار ہو گیا تھا۔

وہ انجان تھی کہ اب تک کا سب سے کٹھن مرحلہ تو اس کے لیے جہاز میں منتظر تھا۔

بورڈنگ شروع ہو چکی تھی۔ مہر نے اپنے کپڑوں والا بیگ کارگو میں بھیج دیا اور خود شمس والا بیگ جہاز کے اندر لے آئی۔

اس کا ٹکٹ بزنس کلاس کا تھا۔ وہ راہداری میں چلتی جا رہی تھی۔ اس کے آگے بھی پیسنجرز تھے اور پیچھے بھی۔ جرم کرنے کا بوجھ الگ تھا، اور احمد کو دھوکہ دینے کا پچھتاوہ اپنی جگہ قائم تھا۔ وہ خود ساختگی کے عالم میں اپنی جگہوں پر بیٹھتے ہوئے پیسنجرز کو دیکھتی۔

"کدھر جا رہی ہیں، محترمہ؟" اس کے کان میں کسی نے سرگوشی کی تو وہ اچانک سے بت بن گئی۔

یہ نہیں ہو سکتا تھا۔ احمد ادھر؟ اوہ نہیں۔ مہر نے سر جھٹکا اور ایک بار پھر سے چلنا شروع کیا۔ قدم اب پہلے سے زیادہ سست تھے۔ آنکھوں میں گہری الجھن۔ وہ اسے اپنے پیچھے محسوس کر سکتی تھی۔ لیکن وہ یہاں تک کیسے آ گیا؟

"آپ نے میرا بھروسہ کیسے توڑ دیا مہر؟ آپ نے اگر یہ کرنا تھا تو مجھے اتنی امیدیں کیوں دلائیں؟" احمد کا انداز شکوہ گو تھا۔ وہ بہت مدھم آواز میں مہر کے کان میں بولا۔ مہر کے قدم مزید سست پڑے۔ یہ الفاظ، اور یہ انداز، اس کے دل پہ خنجر کی طرح وار کر رہا تھا۔

"آپ نے ایک لمحہ نہیں لگایا میرا اعتماد توڑنے کرنے میں؟ کیا میں اتنا فالتو تھا آپ کے لیے؟ لیکن میں اب بھی دل میں آپ کے لیے کچھ نہیں رکھ رہا۔ شاید آپ کی مجبوری ہو۔ شاید۔ مگر میں آپ سے خفا ضرور ہوں۔ اور میں آپ کی وضاحت کا انتظار کروں گا۔"

یہ جملہ جیسے ہی ادا ہوا مہر کے قدم زنجیر ہوئے۔ کچھ تھا ان الفاظ میں جو اس کے دل میں کانٹوں کی طرح چبھ رہا تھا۔ یہ تکلیف۔۔۔ احمد کے تلخ ہو جانے پہ یہ تکلیف، آخر اسے اتنی شدت سے کیوں ہو رہی تھی؟

وہ تحفظ بنا۔ پہیلی بنا۔ سکون کی ضمانت بنا۔ اور اب، وہ مرد اس کی زندگی کا سب سے بڑا روگ بن رہا تھا۔

''آپ اپنی زبان سے پیچھے ہٹی ہیں، میں اس بات کو بھلانے کے لیے تیار ہوں۔ میں آپ کا انتظار کروں گا۔ آپ کسی بھی وقت مجھے سب کچھ سچ بتا دیں، بس۔ بس یہی چیز ہمارے درمیان سب کچھ پہلے جیسا کر سکتی ہے۔'' وہ جھٹکا کھا کر پھر سے چلنا شروع ہوئی۔

احمد کی سیٹ آگئی تھی، وہ اب بیٹھنے لگا تھا۔

''اگر مجھے احساس ہوا کہ اب آپ کو میری ضرورت نہیں، تو میں اپنے آپ کو آپ کے اوپر مسلط نہیں کروں گا۔ میں چلا جاؤں گا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ اور میں کسی کی زندگی سے چلا جاؤں تو واپس مڑ کر نہیں دیکھتا۔'' آخری الفاظ کہہ کے احمد اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

مہر نے گردن موڑ کے نظر احمد پہ ڈالی جو کہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے آنکھوں آنکھ مہر سے ڈھیروں شکایتیں کیں۔

مہر اسے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی، لیکن ابھی وقت نہیں تھا۔

مہر کے چہرے پر کرب جھلکا۔ روح تکلیف کے مارے مچلنے لگی۔ اپنی سیٹ تک جانا اس کے لیے دہکتے ہوئے کانٹوں پر چلنے جیسا تھا۔

وہ اپنی سیٹ پہ پہنچی۔ شمس والا سوٹ کیس جگہ پر رکھا۔ سیٹ پہ بیٹھ کر اس نے کرب کے مارے آنکھیں میچ لیں۔ وہ رونا چاہتی تھی۔ جو تکلیف اسے ہو رہی تھی، وہ الگ نوعیت کی تھی۔ وہ زندگی کو بے رنگ بنا رہی تھی۔

”تم اسے اپنا دل نہیں دے سکتی مہر!“ مہر زیر لب بڑبڑائی۔ ”وہ تم سے بہتر کا حقدار ہے۔“

تکلیف۔۔۔تکلیف۔۔۔اور صرف تکلیف۔

وہ اپنے آپ کو کس قدر تکلیف سے گزار کر یہ سب کہہ رہی تھی۔ اس تکلیف کا اندازہ مہر کے علاوہ کسی کو تھا نہ ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

حسام کی گاڑی درِ فشاں کے علاقے میں داخل ہوئی۔ وہ بار بار درے کو ریئر ویو مرر سے دیکھتا۔ مناج کو اپنے گھر پہلے ہی اتار چکا تھا۔ وہ کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھی۔ چہرے پر قدرتی مسکراہٹ تھی۔ وہ اسے ہر طرح سے مکمل لگی۔ اس کی ایک جھلک ہی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی تھی۔

دل میں سیلاب آ چکا تھا۔ وہ بس اس سیلاب کو روک دینا چاہتا تھا۔ بعض دفعہ دل کی باتیں دل میں دبائی جائیں تو وہ زندگی بھر کا روگ بن جاتی ہیں۔

گاڑی درِ فشاں کے گھر کے باہر رکی۔

”ایک سیکنڈ۔ درِ فشاں۔ کیا میں آپ سے کوئی بات کر سکتا ہوں؟“

اس نے ریئر ویو مرر ہلایا، اب کہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھیں دیکھ پا رہے تھے۔ درے نے اس مرد کی آنکھوں میں بے پناہ جذبات بھانپے۔ یکبارگی دل زور سے دھڑکا۔

نہ جانے کیوں وہ مرد اپنی نظروں سے اس کی نبض بڑھا دیا کرتا تھا۔

"درِفشاں۔ میں نے آپ کو پہلے بتایا تھا کہ میں نے ایک عرصہ نشے سے جنگ لڑی ہے۔ میں اپنی زندگی کا ایک اور بھید کھولنا چاہوں گا۔ میں طلاق یافتہ ہوں۔ میری ایک بیٹی بھی ہے۔"

وہ ٹکٹکی باندھ کر اس کی آنکھوں کو گھور رہی تھی۔ اسے سمجھ نہ آیا یہ گفتگو کس سمت جا رہی تھی۔

"میں نے اپنی بیوی کے قیمتی سال ضائع کیے تھے۔ ساتھ ساتھ اپنے بھی۔ اب میں صحتیاب ہوں۔ میں زندگی کی طرف لوٹ رہا ہوں۔ میری زندگی میں استحکام ہیں۔ مگر میں تنہا ہوں۔" حسام نے گردن جھکائی۔

درِفشاں کا دل بند ہوا۔ اس کا پہلی فرصت میں گاڑی سے اتر کر بھاگ جانے کا جی چاہا۔ مگر پاؤں ہلنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

"مجھے آپ اچھی لگیں۔ اپنے ساتھی کے طور پر مکمل لگیں۔ آپ کی زندگی میں بھی استحکام ہے اور آپ کی سوچ، ارادے اور نیت خالص ہیں۔ درِفشاں، کیا آپ زندگی کا سفر میرے ساتھ، کندھے سے کندھا ملا کر گزارنا چاہیں گی۔ کیا آپ میری بیوی بنیں گی؟" دل سینے کو پھلانگنے کو تھا۔ آواز میں کپکپی طاری ہوئی۔ اس کے اندر درِفشاں کو نظر اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

درے بت بنی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ جو کل تک صرف باتیں کر رہا تھا، آج اتنی بڑی بات کہہ گیا تھا؟

حسام نے نظر اٹھانے کی جرات کی۔ پیچھے مڑ کر حواس باختہ درے کو دیکھا۔ اس کے لب وا تھے۔ جیسے اب ہی کچھ بولنے والی ہو۔ ہلکی بھوری آنکھوں میں نہ کیوں اجنبیت بھری ہوئی تھی۔

"مجھے جانا ہے۔" وہ پرس اٹھاتے گاڑی سے اتری اور تیزی سے گھر میں چلی گئی۔

حسام کو لگا جیسے اس کا دل اس عورت کے قدموں تلے کچل دیا گیا ہو۔

باب نہم: ”جرائم کی دنیا میں خوش آمدید“

اس دور کے رسم ورواجوں سے

ان تختوں سے ان تاجوں سے

جو ظلم کی کوکھ سے جنتے ہیں

انسانی خون سے پلتے ہیں

جو نفرت کی بنیادیں ہیں

اور خونی کھیت کی کھادیں ہیں

میں باغی ہوں میں باغی ہوں

جو چاہے مجھ پہ ظلم کرو

وہ جن کے ہونٹ کی جنبش سے

وہ جن کی آنکھ کی لرزش سے

قانون بدلتے رہتے ہیں

اور مجرم پلتے رہتے ہیں

ان چوروں کے سرداروں سے

انصاف کے پہرے داروں سے

میں باغی ہوں میں باغی ہوں

جو چاہے مجھے پہ ظلم کرو

جو عورت کو نچواتے ہیں

بازار کی جنس بنواتے ہیں

پھر اس کی عصمت کے غم میں

تحریکیں بھی چلواتے ہیں

ان ظالم اور بدکاروں سے

بازار کے ان معماروں سے

میں باغی ہوں میں باغی ہوں

جو چاہے مجھ پہ ظلم کرو

جو قوم کے غم میں روتے ہیں

اور قوم کی دولت دھوتے ہیں

وہ محلوں میں جو رہتے ہیں

اور بات غریب کی کہتے ہیں

ان دھوکے باز لٹیروں سے

سرداروں اور وڈیروں سے

میں باغی ہوں میں باغی ہوں

جو چاہے مجھ پہ ظلم کرو

(حبیب جالب)

☆☆☆

شمس نے ویگن کا سٹیر نگ وھیل کستی سے تھاما ہوا تھا۔

مگر اس کے انداز میں کچھ بھی عام نہ تھا۔ اس کے دانت نکلے ہوئے تھے۔ رنگت سُرخ ہو رہی تھی۔ چہرے پر رگیں بھڑکی ہوئی تھیں۔ غصہ اس قدر حاوی تھا کہ اس کا دل کیا ایک لمحے میں سٹیر نگ وھیل اکھاڑ پھینکے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ سیٹس پر ناخن گاڑ کر انہیں چیر پھاڑ دے۔

موبائل پر رنگ ہوئی۔ لیڈی اقتدار کالنگ۔ نام پڑھ کر شمس کے جیسے چھکے چھوٹ گئے۔ ہتھیلیاں اس قدر نم ہوئیں کہ وہ سٹیرنگ وھیل کو تھام نہ سکا۔ آج سے پہلے اس نے خود کو کبھی اتنا بے بس محسوس نہ کیا تھا۔

اس نے گہری سانسیں لیتے ہوئے اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کی اور کال اٹھائی۔

"سب ہو گیا؟ کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟" لیڈی اقتدار کی بھاری، گرج دار آواز میں بے چینی گھلی ہوئی تھی۔

شمس کی آنکھیں سُرخ ہوئیں۔ غصے کے باعث آنکھیں نم ہونے لگیں۔ اس کے لیے کچھ کہنا محال تھا۔

"جی لیڈی۔ سب ہو گیا۔" آواز میں غصہ نہ جھلکے، اس لیے قدرے دھیمے لہجے میں بولا۔

"اور احمد؟ وہ نہیں آیا؟"

شمس کا تنفس تیز ہونے لگا۔ اس کا زور و شور سے چلانے کا جی چاہا۔

"مہر اکیلے گئی ہے۔" شمس نے دل پر پتھر رکھ کر جھوٹ کہا۔

جو وہ احمد کے لیے محسوس کر رہا تھا وہ نفرت سے بڑھ کر تھا۔ جس وفاداری پر کبھی اسے ناز ہوا کرتا تھا، اسے وفاداری کو احمد نامی بلا کی وجہ سے پیروں تلے روندنا پڑ رہا تھا۔ تکلیف سی تکلیف تھی اور بے چارگی سی بے چارگی۔

"بہت خوب۔ ہسپتال سے اپنا انعام لے جانا۔" وہ سکون سے بولی۔ کال منقطع ہو گئی۔

شمس نے موبائل برابر والی سیٹ پر اچھالا۔

شمس کا تنفس مزید تیز ہوا۔ وہ جنگلیوں کی طرح ڈیش بورڈ میں مکے برسانے لگا۔ مگر آگ اب بھی نہ بجھی۔ اس نے اپنے گالوں پر تھپڑوں کی برسات کی۔ گال سُرخ ہو گئے، آنکھوں کے نیچے نیل پڑ گیا۔ بے بسی بھرے غصے کے باعث اس کے آنسو روانہ ہوئے۔

اس کی چیخیں نکلیں۔ وہ کسی وحشی بھیڑیے جیسا معلوم ہو رہا تھا جو رات کے پہر میں اونچی آواز میں بین کرتا ہے۔

"ایک دن سب کو عقل آئے گی۔ اور وہ تمہیں مارنے کا منصوبہ بنائیں گے۔" اس کی آواز لرزی۔

"اور اس دن، میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے ماروں گا، احمد۔"

اس نے ہاتھ اٹھائے۔ انہیں دیکھتے ہوئے اس کے دماغ میں وہی منظر ابھرا۔

وہ منظر جس میں احمد نے ایک جھٹکے میں اس کا انچ انچ اپاہج کر دیا تھا۔

کچھ دیر پہلے۔۔۔

شمس آنکھوں میں خوف اور وحشت لیے احمد کو دیکھ رہا تھا۔ لمحے بھر کے لیے قوتِ گویائی سلب ہوئی۔

"تم؟ تم یہاں کیسے؟" وہ اتنا ہی کہہ سکا۔

احمد کے چہرے پر تپانے والے مسکراہٹ کا راج تھا۔

''ہے ناں؟ کیسے پہنچ گیا۔'' وہ معصومانہ سے انداز میں کہہ کے پھر سے ہنسنے لگا۔

''بس اسے اتفاق سمجھ لو؟ خوبصورت اتفاق۔ یاد کرو شمس کہ پہلے تم مجھے کتنی دھمکیاں دیا کرتے تھے؟ موت کی؟ مجھے معذور کرنے کی؟'' احمد نے دو قدم آگے بڑھائے۔ چہرے پہ کڑواہٹ ابھری۔

''اب کیوں چپ لگ گئی ہے؟ کیوں خوف کے مارے آنکھیں پھٹ رہی ہیں؟'' ہر لفظ پر زور دیتے ہوئے وہ کہے جا رہا تھا۔

شمس کے جسم میں وہ الفاظ نشتر کی طرح چبھ رہے تھے۔ فشار خون آسمانوں کو سر کر رہا تھا۔

''میں نے اس وقت کا انتظار کیا جب یہ دھمکیاں حقیقت کے رنگ اوڑھیں گی۔ لیکن تم لوگوں کی دھمکیاں، تم لوگوں کی طرح کھوکھلی ثابت ہوئیں۔ ڈھائی سال پہلے جیسے تیسے کر کے تم لوگوں نے مجھے روک لیا، لیکن اب کیسے روکو گے؟ میں نے اس وقت بھی کہا تھا کہ میں لوٹوں گا۔ اور اس بار حق اور باطل کی جنگ جیتے بغیر پیچھے نہیں ہٹوں گا۔''

اس کی باتوں نے جیسے اس کی گردن پر غیر مرئی ہاتھ حائل کر دیا تھا جس کی گرفت لمحہ بہ لمحہ مضبوط ہو رہی تھی۔

''تم لوگ عبداللہ سلطان کو ایک جھٹکے میں مار سکتے ہو، مہر کی ماں کو ان ہی کے گھر سے اغواء کر سکتے ہو، تو پھر مجھے کیوں نہیں مار سکتے؟ میرے پاس ایسا کیا ہے جو تم لوگوں کو روک رہا ہے؟'' آنکھوں میں سوالیہ تاثر تھا۔

شمس نے کچھ کہنے کو لب کھولے، پھر بند کیے۔ یہ سلسلہ کچھ دیر کے لیے جاری رکھا۔

"تم۔۔۔ تم بہت پچھتاؤ گے۔" آخر میں بس اتنا ہی کہہ سکا۔

احمد شمس کی جدوجہد دیکھ کے اور بھی زور سے مسکرایا۔ مسکراہٹ شمس کو اندر تک چھلنی کر چکی تھی۔

"ہماری قربت میں تمہاری بربادی لکھی ہے، احمد۔ ڈھائی سال پہلے بھی تمہارا حال کچھ اچھا نہیں تھا۔" شمس نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں کا استعمال کیا۔

"اچھا مار دو گے مجھے؟ جیسے پچھلے کئی سالوں سے مجھے مارنا چاہ رہے ہو؟" احمد طنزاً بولا۔

"ہاں یہ سچ ہے ہم تمہیں نہیں ماریں گے، احمد۔ لیکن پھر بھی تم برباد ہو جاؤ گے۔ یہ سب ویسا نہیں ہے، جیسا تمہیں نظر آتا ہے۔ تم ہم سے قریب تر ہوتے جاؤ گے، اور اسی سلسلے میں تم ایک دن اپنے آپ سے نفرت کرنے لگو گے۔ یہ زندگی تمہارا قید خانہ بن جائے گی۔" شمس پھولتی ہوئی سانسوں کے ساتھ بولا۔

"اوہ۔۔۔ واقعی؟" احمد نے مصنوعی حیرانی کے سنگ جواب دیا۔

"تمہاری یہاں موجودگی، مہر کی ماں کی زندگی خطرے میں ڈال رہی ہے۔" شمس نے دانستہ موضوع بدلا۔

"وہ تب ہوتا، اگر تم اپنے مالکوں کو بتاتے کہ میں دبئی جا رہا ہوں۔ اور میں ایسا ہونے نہیں دوں گا۔" احمد کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ بکھری۔

"اور تم مجھے کیسے روکو گے؟" شمس نے چیلنج دینے والے انداز میں کہا۔

"میں جانتا ہوں وہ ہیرے تمہارے پاس ہیں، شمس۔" شمس کا رنگ فق ہو گیا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

"تم نے عبداللہ سے ڈیل کی تھی کہ تم انہیں عافیت زندگی کی بیسمنٹ کی چابیاں فراہم کرو گے؟ اور پھر دو ہیرے تمہارے دو ہیرے ان کے۔ میرے پاس فوٹیج موجود ہے۔"

شمس کا ہاتھ احمد کی طرف اٹھتے اٹھتے رہ گیا۔

"دھیان سے۔ اس وقت میں تمہیں برباد کرنے کی طاقت رکھتا ہوں۔" احمد نے چبا چبا کر تنبیہ کی۔

شمس سر نفی میں ہلانے لگا۔

"وہ بڈھا میرے ساتھ گیم کھیل گیا۔ نہ اس نے چابیاں لیں، نہ ہی کوئی مدد۔ اس نے وہ ہیرے ہوشیاری سے چرا لیے۔ میرا یقین کرو وہ ہیرے میرے پاس نہیں ہیں۔" شمس نے بے بسی سے کہا۔

احمد دانت باہر نکال کر ایک دفعہ پھر سے ہنسنے لگا۔

"مجھے کیوں وضاحتیں دے رہے ہو؟ اپنی وضاحتیں اپنی لیڈی اقتدار اور نیلوفر میڈم کے لیے بچا کر رکھو۔"

پہاڑ ٹوٹ کر اس پر برس جاتا تو وہ برداشت کر لیتا۔ مگر اپنی بے وفائی کا مسخ ہونا اسے گوارا نہ تھا۔

"مجھے اور بھی بہت کچھ پتا ہے، شمس۔" شمس کو ڈرا ہوا دیکھ کے احمد سرگوشی نما انداز میں گویا ہوا۔

"کیا ہے کہ، تم لوگ چاہے جتنا بھی مل جل کر کام کر لو۔ آخر میں تم سب ہو تو ایک مجرم ہی۔ کسی سے مخلص نہیں ہو سکتے۔ تم اس دن فارم ہاؤس میں نشے میں تھے۔ تمہارا دھیان کیمرا ز پر نہیں گیا۔ نشے کی حالت میں تم نے عبداللہ سلطان کو کال کی تھی، انہیں چابیاں فراہم کرنے کی آفر دی تھی۔ میں نے بہت محنت کر کے وہ ٹیپ نکالی ہے۔ فرض کرو اگر میں نے وہ ٹیپ تمہاری لیڈی اقتدار کو دے دی۔ تو کیا ہو گا ناں؟ لحاظ کیے بنا سیدھا جہنم میں بھیجے گی وہ تمہیں۔" احمد کے چہرے پہ مصنوعی سی اداسی اترنے لگی۔

شمس سر نفی میں ہلاتا گیا۔

"تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔" شمس چبا چبا کر بولا۔

"ٹھیک کہا تم نے۔ میں ایسا ہر گز نہیں کروں گا، اگر تم اپنا منہ بند رکھو۔ مہر کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور اس کی ماں کو کچھ نہیں کرو۔ منظور ہے؟" احمد خوش مگین سا مسکرایا۔

ایک طرف موت تھی، ایک طرف وفاداری کو جھوٹا مکھوٹا۔ شمس نے وفاداری کے مکھوٹے کو پہنے رکھنا چاہا۔

"منظور ہے۔" شمس نے جواب دیا۔

"اب چلتا ہوں۔ یاد سے، مہر کو ایک خراش بھی نہیں آنی چاہیے۔ تم پہلے اس پر ہاتھ اٹھا چکے ہو، اس وقت جان بخش دی تھی۔ اس بار جان بخشی نہیں جائے گی، شمس۔" احمد دھمکا کر مڑ گیا۔

"تم پچھتاؤ گے۔ احمد۔"

احمد نے ایک کان سے سنا دوسرے سے نکالا۔

”یہ سب ویسا نہیں جیسا تم سمجھ رہے ہو۔ اس کھیل کے اختتام میں سب سے زیادہ تکلیف تمہیں پہنچے گی۔ تم مروگے نہیں، نہ ہی تمہیں کوئی چوٹ پہنچے گی، لیکن تمہاری روح گھائل ہوجائے گی۔“ آواز کپکپائی مگر وہ کہتا گیا۔

احمد واپس شمس کی طرف مڑا۔

”اچھا چھا۔ رومت۔“ احمد نے نرمی سے اس کے گال تھپتھپائے اور چلا گیا۔

شمس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔

اس سفر کی شروعات تین سال پہلے، کسی کھوئے ہوئے کی تلاش سے ہوئی، تین سال گزر گئے تھے۔

اس سفر کا رخ بھی بدل گیا تھا۔

اب اس سفر نے انتقام کا بھیانک روپ اختیار کر لیا تھا۔

اور سفر انتقام کے مسافر کی تقدیر میں تباہیاں ازل سے مکتوب ہوتی ہیں۔

☆☆☆

”لگتا ہے، بارش کی وجہ سے سب کو دیر ہو رہی ہے۔“

حرر میں اس وقت مناج اور حسام موجود تھے۔ عمارت ایک حصے کو شوٹنگ کے لیے مختص کر دیا گیا تھا۔ دیوار پر مرون پردہ تھا، اور اس کے سامنے کرسی، جس پر حسام براجمان تھا۔ کرسی سے تھوڑا فاصلے پر کیمرا اسٹینڈ پر لگایا ہوا تھا۔

"کیا ہوا حسام، تم ٹھیک نہیں لگ رہے؟" مناج نے ہاتھ میں کچھ کاغذات پلٹتے ہوئے کہا۔

حسام کا چہرہ کچھ بجھا ہوا تھا۔ اسے بار بار دوپہر کا وقت یاد آرہا تھا، جب دُرِفشاں اس کا پرپوزل روندھ کر گاڑی سے نکلی تھی۔ اس نے یہی سمجھا تھا کہ درّے بھی اس میں دلچسپی رکھتی تھی صرف اس لیے اس نے دلیر ہو کر اتنا بڑا اقدم اٹھایا تھا۔ مگر وہ غلط ثابت ہوا تھا۔

"مس مناج، مجھے لگتا ہے مجھ سے آج نہیں ہو پائے گا۔" وہ گردن جھکائے بولا۔ آواز میں تکلیف تھی۔

ٹھیک اسی وقت دروازہ کھلا تھا۔ دُرِفشاں کندھے پر پرس لٹکائے اندر آئی۔ حسام کو دیکھ کر وہ اپنی جگہ تھم گئی۔ چہرے کی ہوائیاں اڑ گئیں۔

"کیوں نہیں ہو سکے گا؟ میں نے کہا تھا نا، حرر کا face of campaign تم ہو۔ میں کسی اور کو منتخب نہیں کرنا چاہتی۔"

دُرِفشاں ایک قدم آگے نہ بڑھا سکی۔

"وہ سب ٹھیک ہے۔ بس آج کا دن دے دیں۔ آج دل میں نئی نویلی تکلیف حاضر ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کے لیے کچھ وقت درکار ہے۔" اس نے نظریں اٹھا کر کہا۔ چہرے پر کرب آلود مسکراہٹ تھی۔

درّے کی رنگت فق ہوئی۔ دور سے ہی اس کی آواز سن کر دل پر بوجھ حائل ہوا۔

"کیا ہوا ہے۔ مجھے بتاؤ۔ میں تم سب کی لیڈر رہوں۔ کام سے ہٹ کر، زندگی کے ذاتی مسئلے مسائل بتا سکتے ہو۔" مناج اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھی۔ البتہ چہرے کے تاثرات بدستور روکھے تھے۔

حسام نے گہری سانس خارج کی۔

"میں زندگی میں آگے بڑھنا چاہتا تھا، مناج۔ اور اس لیے میں نے کسی کو پروپوز کیا تھا۔"

درِفشاں کی روح پر برچھیاں چبھیں۔ اس کا سانس لینا محال ہو رہا تھا۔ ایک طرف زمہ داری تھی، اور دوسری طرف اس کے اندر رونما ہوتے شدید جذبات جنہیں وہ چاہ کر بھی جھٹلا نہیں پا رہی تھی۔

"مگر مجھے انکار موصول ہوا۔ شاید میری یہی سزا ہے۔ میں نے اتنے سال ڈرگز کی وجہ سے اپنی سابقہ بیوی کی زندگی تباہ کی۔ میرا خوشیوں سے محروم ہونا بنتا ہے۔" آنکھیں بے ساختہ نم ہوئیں۔

مناج نے اسے خاموشی سے سنا۔

"محبت تھی اس سے؟"

درِفشاں کو لگا وہ یہیں کھڑی کھڑی نیست و نابود ہو جائے گی۔

"مجھے معلوم نہیں، محبت ہے یا نہیں۔ مگر وہ جب میرے سامنے ہوتی ہے، میرا دل خوشیوں سے بھر جاتا ہے۔ میں اس کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچ نہیں پاتا۔ دوسروں کا پتا نہیں، مگر وہ عورت مجھے دنیا کی سب سی خوبصورت عورت لگتی ہے۔ صرف صورت نہیں، اس کی سیرت بھی حسین ہے۔ اگر میری آنکھوں کے سامنے دنیا کی تمام روشنیاں فنا ہو جائیں، تب اس کی شخصیت سے پھوٹتی ہوئی روشنیاں کافی ہیں میری بصیرت کو اندھا کرنے کے لیے۔"

ایک جذباتی وبال آیا، جو ان لفظوں کے ساتھ اس کے دل سے نکلا۔ اور درے کی سماعت سے ٹکرا کر اس کے دل میں طوفان برپا کر گیا۔ آج سے پہلے کسی نے اس کے بارے میں اس طرح سے بات نہیں کی تھی۔ وہ عجیب چوراہے پر کھڑی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ لمحے بھر میں قدم ڈگمگائیں گے اور گر پڑے گی۔

"دیکھو حسام۔" مناج نے بات شروع کی۔

"میں نے کہا تھا، حرر صرف دوسروں کی نہیں، ہماری آزادی کا نام ہے۔ حرر ہمیں آزاد کر رہا ہے۔ تم کمزور رہو۔ ٹوٹے ہوئے ہو۔ لیکن تم اس سب کے باوجود آج ویڈیو شوٹ کرو گے۔ کیوں؟ کیونکہ تم اپنے احساسات کے غلام نہیں۔ تمہارے اوپر ان کی من مانی نہیں چلتی۔ تم وہ کرو گے، جو درست ہے۔"

مناج مختصر سا کہہ کر کھڑی ہوئی۔ حسام اداس سا مسکرایا۔

"ٹھیک ہے۔ ویسے بھی، میں یہ تکلیف ڈیزرو کرتا۔۔۔" وہ یکدم رک گیا۔

"مناج!" دِرفشاں بھنویں سکیڑتے آگے بڑھی۔ اس کا رُخ مناج کی طرف تھا۔ چہرے پر جیسے غصہ بھرا ہوا تھا۔

"ان سے کہو کہ خود کو ملامت کرنا چھوڑ دیں۔" اسے تپ چڑھنے لگی تھی۔ سانسیں تیز ہو رہی تھیں۔

حسام دم سادھے اسے دیکھ رہا تھا۔

"ہاں ٹھیک ہے، ان سے غلطیاں ہوئی ہیں ماضی میں، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر وقت خود کو ملامت کیا جائے۔" وہ انگلی اٹھا کر ایسے کہہ رہی تھی جیسے مناج کو ڈانٹ لگا رہی ہو۔

''اس بات پر مجھے کیوں سنا رہی، درے۔'' مناج کے کچھ پلے نہ پڑا۔

''اور ان سے یہ بھی کہہ دو، کہ یہ جان بوجھ کر خود کو ماضی کی غلطیوں پر ملامت کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ خود دو کو آج تک معاف نہیں کر سکے۔ یہ جان کر خود کو ذہنی تکلیف پہنچاتے ہیں۔ ان سے کہہ دو۔ یاد سے مناج۔ ان سے کہہ دینا۔'' وہ چبا چبا کر بولی اور پرس سے کاغذات نکالے۔

''سکرپٹ لے آئی ہوں میں۔ اپنا سامان رکھ کر آئی۔'' وہ اسی تپش سے کہتے ہوئے بیک روم چلی گئی۔

مناج کے الفاظ ڈگ مگ ہوئے۔ اس نے مڑ کر شرمسار سے حسام کو دیکھا جو گردن جھکائے بیٹھا تھا۔

''سن لیا نا، آپ نے؟''لبوں پر شریر مسکراہٹ بکھری۔

اور اسی وقت دو اور لوگ آ گئے تھے۔ مناج نے مڑ کر درے کو دیکھا جو بیک روم سے باہر نکلی تھی، پھر حسام کو۔ اس کے لیے سرے سے سر املانا مشکل نہ تھا۔

''تو حرر میں اب دل بھی ٹوٹیں گے۔'' اس نے مسکراہٹ دباتے سوچا تھا۔

☆☆☆

دبئی انٹرنیشنل ایئرپورٹ، دبئی۔

سفید بتیاں دبئ ایئرپورٹ کی پر تعیش عمارت کو منور کرتی تھیں۔ سفید، چمکتے دمکتے ٹائلز پہ جب یہ روشنی پڑتیں تو وہ اِنعکاس ہو کر آنکھوں سے ٹکراتی ہے۔ سب اتنا پر کشش اور ہشاش بشاش نظر آتا ہے کہ اگر بندہ نیند کے گہرے غلبے میں بھی ہو تو اس خوبصورتی کو دیکھ کر ایک جھٹکے میں جاگ جائے۔

اس خوبصورتی، اور سہولیات کی وجہ سے یہاں پہ لوگ گھنٹوں اپنا وقت گزار سکتے ہیں، بغیر کسی بے زاری کے۔ دبئ ایئرپورٹ واقعتاً خوبصورتی کا دوسرا نام ہے۔ جدید آسائشوں سے آراستہ، زندگی میں ایک بار تو یہاں کا چکر لگانا ہی چاہیے۔

مہر اور احمد چیکس پار کر کے روشنیوں میں نہائے منظر میں چل رہے تھے۔ انہیں مختلف رنگوں کے لوگ نظر آرہے تھے جو کہ اپنی راہوں میں رواں تھے۔ سیاہ رنگت کا حبشی ہو یا سفید رنگت والا کوئی انگریز۔ کوئی کورین کوئی جاپانی اور کوئی ایشیائی تو کوئی عربی، سب گرد و نواح سے بے خبر آپ ہی میں مست مگن تھے۔

احمد نے آدھی آستین کی سیاہ شرٹ پر جینز کی پینٹ پہنی ہوئی تھی۔ مہر نے گھٹنوں تک آتی لوز سی سیاہ شرٹ پہنی ہوئی تھی اور جینز کی پینٹ۔ دونوں ساتھ تھے، مگر ایک دوسرے کو ساتھ محسوس نہیں کر رہے تھے۔ کوئی دیوار بیچ میں آچکی تھی۔

وہ اسے دیکھ نہیں پارہی تھی، جب کہ دل اسے زور و شور سے دیکھنا چاہتا تھا۔

وہ اسے دیکھنا نہیں چاہتا تھا، جب کہ اس کی جھلک اس کی مدتوں کے لیے کفالت کر دیتی تھی۔

"تھوڑی دیر بیٹھ کر کچھ کھا لیتے ہیں۔" احمد کا انداز سرد سا تھا۔

اس نے خاموشی سے سر اثبات میں ہلایا۔

دونوں نے ایک ریستوران سے برگرز لیے اور آمنے سامنے ٹیبل پر بیٹھ کے لذیذ سے برگر کے لقمے بھرنے لگے۔ یہاں کھانے کا ذائقہ مختلف تھا، اور برگر پاکستان کے عمومی برگرز سے قدرے بڑا تھا۔

”آپ کو یہاں آکر میری ماں کی جان کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہیے تھا۔“ مہر لاتعلق سے انداز میں بولی تھی۔ سر پر خطرے کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔

”یہی تو مسئلہ ہے آپ کا۔ آپ مجھے جانتی ہیں، نہ سمجھتی ہیں۔“ وہ تلخی سے بولا۔

مہر برف بنی۔

”میں اس کا انتظام کر چکا تھا۔ ان سب کو میرے بارے میں کچھ پتا نہیں لگنا تھا۔ آپ کو مجھ پر بھروسہ نہیں، وہ الگ بات ہے۔“

وہ الفاظ خار دار کوڑے کی طرح مہر کی روح پر برسے۔ برگر کو تھامتی ہوئی انگلیاں کپکپائیں۔

”مجھے آپ پر خود سے زیادہ بھروسہ ہے۔“ آواز خلاء سے نکلی۔ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی جرات نہ کر سکی۔

”بس کر دیں، مہر۔ اور اب جانے دیں۔“ احمد نے بے زاری سے کہا۔

مہر کی آنکھیں بند ہوئیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے کل کا منظر دوڑ گیا۔ جب گاڑی میں تاریکی کی ملکہ کے سامنے اس نے کہا تھا: ”مگر، میری ایک شرط ہے۔“

اس کے بعد کہے گئے ایک ایک لفظ پر اسے شدت سے ندامت ہوئی۔ اس نے بمشکل برگر کا لقمہ بھرا۔

”ویسے آپ کو ایک دفعہ جمیرا جانا چاہیے۔ دبئ کا بہت خوبصورت اور عالی شان سٹیٹ ہے۔“ وہ گیلی سانس اندر کھینچتے، مسکرا کر گویا ہوئی تھی۔

احمد کے چہرے کے تاثرات اچانک نرم پڑے۔ اس کی نکھوں میں شرارت جھلکی۔

”ایک دفعہ ایمریٹ ہلز بھی ضرور جائیں۔ یہ تو میر افیورٹ سٹیٹ ہے۔ یہاں کا نظارہ اس سے پہلے آپ نے کبھی نہیں دیکھا ہو گا۔ اور دبئ مرینا تو بہت ہی حسین ہے۔ اب اگر آ ہی گئے ہیں، تو دبئ گھومنا آپ پر فرض ہوا۔“

وہ احمد کو نہیں دیکھ رہی تھی جو کے بنا آواز کے ہنسے جا رہا تھا۔ احمد نے ڈھیروں جدوجہد کے بعد اپنی ہنسی قابو کی۔ چہرے پر واپسی خفگی کا خول اوڑھ لیا۔ اوہ خدایا، وہ احمد جو اپنے جذبات پر کمال کی قدر رکھتا تھا، اس عورت سے خفا کیونکر نہ ہو پا رہا تھا؟

”آپ کہاں جائیں گی؟“ احمد نے اپنے انداز کو سرد رکھنے کی بھرپور کوشش کی۔

”جمیرا جاؤں گی یا ایمریٹ ہلز۔“ مہر کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ”ڈیڈ کے ساتھ جب بھی آتی تھی وہیں پر رکتی تھی۔“

احمد کی آنکھوں میں سایہ سا گزرا۔

”ویسے مجھے نہیں لگتا آپ کو وہاں جانا چاہیے۔“ احمد نے سرسری سا کہا۔

”وہ کیوں؟“ مہر نے پوچھا۔

"کیونکہ آپ کا کاروبار ڈوب رہا ہے، مہر۔ آپ کے اوپر قرضے کا بوجھ سوار ہے۔ جمیرا اور ایمریٹ ہلز انتہائی مہنگے علاقے ہیں۔ کیا ان کرائسز میں آپ کو اتنا پیسہ برباد کرنا چاہیے؟" احمد نے بھرپور کوشش کی اپنا انداز بے نیاز سا رکھے۔ گویا مہر کو یہ تاثر دینا چاہتا ہو کہ وہ جہاں رکے، اسے کوئی غرض نہیں۔

مہر سوچ میں پڑ گئی تھی۔

"ہاں آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میرے ایمپلائیز، وہ کیا سوچیں گے۔ اب آپ بتائیں میں کہاں جاؤں؟"

احمد نے اندر ہی پرسکون سانسیں خارج کیں۔ اب اسے اس عورت کے لیے ایک دن کے تین لاکھ ضائع کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

"القصیص چلتے ہیں۔ وہاں ایک مناسب سا ہوٹل موجود ہے۔" احمد نے کہہ کر شانے اچکا دیے۔

"ٹھیک ہے ہم چلیں۔۔" مہر کا برگر کا لقمہ بھرتا ہاتھ تھما۔ الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔

"ایک سیکنڈ۔ آپ کو یہ سب کیسے پتا؟ القصیص کے بارے میں؟ جمیرا کے بارے میں؟" مہر نے اچنبھے سے پوچھا۔ احمد کے چہرے پہ جتاتی مسکراہٹ بکھری۔

"کیونکہ میں دبئی میں بڑا ہوا ہوں، محترمہ۔ دبئی میرا پہلا گھر ہے۔" احمد کھڑا ہوا اور اپنے ہاتھ جھاڑنے لگا۔ وہ مڑ کر جانے لگا۔

مہر کے لب کھلے کے کھلے رہ گئے۔ وہ یہ سب پہلے بھی بتا سکتا تھا۔ وہ بھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے کھڑی ہوئی اور احمد کے ساتھ، اپنے بیگز ہاتھ میں تھامے باہر جانے لگی۔

رات کے اس وقت جب ائیر پورٹ کی ٹھنڈی اور خوشگوار فضا سے قدم باہر نکالے تو گرم گرم بھپکے دونوں کے جسم سے ٹکرائے۔

سڑکوں کی پیومنٹ میں انہیں ہر طرح کے لوگ نظر آرہے تھے۔ انگریز، ایفریکن، پاکستانی اور انڈین۔ مگر کسی کا بھی لباس زیادہ بے پردہ نہ تھا۔

"مگر آپ نے پہلے کبھی نہیں بتایا کہ آپ دبئی کے ہیں؟" مہر نے باہر نکل کر پوچھا۔ احمد نے مسکراہٹ دبائی اور خاموش رہا۔

دبئی کی سڑکوں میں پولیس کی ہیوی بائیکز کے علاوہ کوئی دوسری بائیک عموماً نظر نہیں آتی۔ ہر طرف گاڑیاں ہی گاڑیاں ہوتی ہیں۔ اسٹائیلش اسٹریٹ لائیٹس کے باعث سڑکیں کافی منور تھیں۔ پاکستان کے برعکس سڑکوں کی سطح بہت ہموار تھی۔

دبئی میں درجہ حرارت بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ہوا بھی کافی حبس آلود ہوتی ہے۔ یہاں سالہ سال گرمی ہی رہتی ہے کیونکہ دبئی دراصل ہے تو صحرا ہی۔ اسی درجہ حرارت کی وجہ سے دبئی میں زیادہ دیر باہر نہیں رہا جا سکتا۔

گرم فضا سے جان چھڑانے کے لیے احمد اور مہر نے فوراً ہی سفید ٹیکسی پکڑی۔ اپنے بیگز ڈگی میں ڈال کر دونوں پچھلی نشست پر براجمان ہو گئے۔ اے سی کی ٹھنڈک کی وجہ سے ماحول کافی خوشگوار تھا۔ احمد اب بھی مہر سے زیادہ بات چیت نہیں کر رہا تھا۔

"لیونڈر ہوٹل الناہدا جانا ہے۔" احمد نے ٹیکسی والے کو انگیریز میں بتایا۔

"آپ کتنے سال دبئی میں رہے ہیں؟" مہر نے دونوں کے درمیان حائل تناؤ کو کم کرنا چاہا۔

”پندرہ سال۔ میں پندرہ سال کا تھا، جب بابا کی جاب چلی گئی تھی اور ہمیں پاکستان آنا پڑا۔ ورنہ میں نے آدھی زندگی تو دبئی میں گزاری ہے۔ اسی لیے میں دبئی کو اپنا دوسرا گھر مانتا ہوں۔“ احمد کی آواز میں دبا دبا جوش تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ دل ہی دل میں دبئی کو بہت پسند کرتا تھا۔

”آپ نے مجھے آج تک نہیں بتایا۔“ مہر نے جیسے شکوہ کرنا چاہا۔

”آپ نے پوچھا نہیں۔“ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ ایسا کرنے پر، وہ دل ہی دل میں نادم تھا۔ مگر یہ کمبخت انا بھی نا بعض اوقات سخت ناپسندیدہ کام کروا کر دم لیتی ہے۔

”احمد، آپ نے مجھ سے بہت کچھ راز رکھا۔ آپ کہاں سے ہیں، کیا کرتے ہیں۔ میرے دشمنوں سے کیا تعلق ہے، آپ نے سب چھپایا۔ پھر آپ میرے وقت میں اتنے خفا کیوں ہیں۔“

اب احمد مڑا تھا۔ بھنویں سکیڑی ہوئی تھیں۔ چہرے پر خفگی تھی۔ اس عورت کو دیکھتی ہے، چہرے کا تناؤ چھٹنے کی ضد کر رہا تھا۔ وہ چہرہ کسی ٹھنڈے ہوا کے جھونکے جیسا تھا جو شدید سے شدید آگ کو بجھا دے۔

”نہیں مہر۔ چیزیں ایک خاص مدت کے لیے راز رکھنے میں، اور چوروں کی طرح، کسی کے ساتھ ساری باتی چیت خاک میں ملا کر بھاگ جانے میں فرق ہے۔“ وہ تلخی سے کہہ کر گردن کا رُخ موڑ گیا۔

مہر بھی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ دل چکنا چور ہو گیا تھا۔

”تم دونوں کی راہیں جدا ہونے کے لیے ملی تھیں، مہر۔ تم ایک مجرم ہو، اور وہ تمہارے جیسے مجرموں کے خلاف جنگ لڑ رہا ہے۔“

اس نے خود کو یاد دلایا، اور باقی کا سفر خاموشی سے کاٹا۔



درِ فشاں شیشے کے دروازے کے ساتھ کھڑی تھی۔ سڑک پر تراتر بارش برس رہی تھی۔ رات گہری ہو چکی تھی، اس لیے سڑک سنسان تھی۔ درے کا دل بھی اس سڑک کی طرح سنسان پڑا ہوا تھا۔

''تم گئی نہیں اب تک؟''

مناج کے سوال نے اسے بیدار کیا۔ وہ پیچھے مڑی۔ مناج کندھے پر بیگ لٹکائے جانے کے لیے تیار لگتی تھی۔

''میں تم سے کچھ بات کر سکتی ہوں، مناج؟'' جی سنبھلتا ہی نہیں تھا۔

مناج پھیکا سا مسکرائی۔

''میرے لیے اعزاز ہو گا، کہ میں درِ فشاں کو سنوں۔'' وہ بولی۔ اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ پرس فرش پر دھرا۔

درے دھیمے قدم بڑھا رہی تھی۔ حرر کے اندر پنپتی ہوئی خاموشی میں بجلی کی گرج دخل اندازی کر رہی تھی۔

وہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھی۔ خالی نظروں سے مناج کو دیکھا۔

''میں۔'' درے کہتے کہتے رکی۔ گردن جھکائی۔

"تم کہتی تھی نا، اعتراف سے پہلے کی گھڑی اعتراف کی گھڑی سے زیادہ کٹھن ہوتی ہے۔ بس ایک سانس لو۔ اور سب نگل دو۔" مناج نے ہاتھ بڑھا کر اس کے کندھے پر رکھا۔

دِرفشاں بے اختیار مسکرا دی۔ وہ عورت کتنا بدل گئی تھی؟

"مناج۔ مجھے حسام نے پروپوز کیا ہے۔" دِرفشاں نے سادگی سے بتایا۔

مناج کے چہرے پر کوئی تبدیلی نہ تھی۔ نہ حیرانی، نہ شاک۔ دِرفشاں پھر بے اختیار مسکرا دی۔ ایک وقت تھا مقابل بیٹھی عورت اس کے سامنے اعتراف کر رہی تھی، اور وہ چہرے پر عامیانہ تاثر سجائے ہوئے تھی۔ قدرت نے کس طرح کردار بدل دیے تھے۔

"مجھے نہیں لگتا، یہ مسئلہ ہے۔ مسئلہ کچھ اور ہے۔ کچھ ایسا، جو تمہیں پریشان کر رہا ہے۔ بتاؤ، درے۔"

دِرفشاں نے گردن اوپر نیچے ہلائی۔

"تمہیں پتا ہے، مناج۔ احمد مجھ سے کہتا تھا کہ مجھے شادی کر لینی چاہیے۔ میں منع کرتی تھی۔ کہتی تھی کہ میرے سر پر اس کی زمہ داری ہے۔ وہ کوئی بچہ نہیں۔ وہ سمجھ جاتا ہو گا، کہ مسئلہ کچھ اور ہے۔ میں تمہیں اپنی بتاؤں۔ میں بہت complexes کا شکار رہی ہوں۔ بچپن سے آج تک، میری شکل، میری جسامت، اور نہ جانے کس کس چیز کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ پھر ماما بابا چلے گئے، اور باتوں کا سلسلہ طاقتور ہو گیا۔"

دِرفشاں نے چشمے اتارے۔ آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے تھے۔

”مجھے نظر کا مسئلہ نہیں ہے، مناج۔ مجھے ان حلقوں پر اتنے طعنے ملے ہیں کہ میں یہ موٹے چشمے پہنتی ہوں۔ تا کہ یہ چھپ جائیں۔ میں کھلی قمیص اور ڈھیلی سکرٹس پہنتی ہوں تا کہ میری جسامت دبلی لگے۔ جو درِفشاں سب کو مکمل لگتی ہے، وہ اندر سے ایسی ہے۔ وہ کچھ چیزوں کو چاہ کر بھی فکس نہیں کر سکی۔“

درے نے گہری سانس خارج کیے مناج کو دیکھا۔ مناج مغموم چہرے کے سنگ اسے گھور رہی تھی۔

”جب حسام نے مجھے پروپوز کیا۔ تو ایک لمحے کے لیے میرے دل میں خوشیاں بھر گئیں۔ کیونکہ اب تک میری شادی نہ ہونے پر مجھے کتنے طعنے ملے تھے، میں ہی جانتی تھی۔ پھر اس کا شادی کی آفر کرنا۔ اس کا زندگی میں اتنا سٹیبل ہونا، مجھے پر سکون کر گیا تھا کہ اتنی بڑی عمر میں مجھے اتنا بہتر جوڑ مل رہا ہے۔“ آنکھیں نم ہوئیں۔

”پھر کیا مسئلہ تھا، درِفشاں؟ کیوں نہیں راضی ہو جاتی؟“

”اگلے لمحے مجھے خود پر ترس آ رہا تھا، مناج۔ میں اتنی زیادہ desperate تھی۔ مجھے تب پتا لگا۔ میں کسی مرد کی توجہ کی اندر ہی اندر اس قدر خواہش مند تھی۔ میری عزتِ نفس کو یہ بات بہت گراں گزری۔ میری انا بہت بڑی ہے۔ میں کسی انسان کے ساتھ اس لیے نہیں جڑنا چاہتی، کیونکہ میں اس معاشرے پر کچھ ثابت کرنا چاہتی ہوں۔ میں اس انسان کے ساتھ اپنی ذاتی خوشی کے لیے جڑنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ اس معاشرے نے کبھی خوش نہیں ہونا۔“

درِفشاں نے ایک وقفہ لیا۔ آنکھوں کے گوشوں نے پانی سمایا، اور وہ برس پڑے۔

"بات صرف اتنی نہیں تھی، مناج۔ میں در حقیقت ایک insecure عورت ہوں۔ میں خود کو شیشے میں دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ پھر کیوں میں کسی اور کے ساتھ رشتے میں بندھوں؟"

مناج کے رونگٹے کھڑے ہوئے۔ وہ درِفشاں جو ہمیشہ مکمل تصویر کی طرح لگتی تھی، اندر سے اس قدر مسخ تھی؟ وہ جو دوسروں کے زخموں کو بھرتی تھی، خود کے زخموں کو بھرنے میں اس قدر ناکام ٹھہری تھی؟

"درے۔" مناج نے گلہ کھنکھارا۔ آواز نم تھی۔

"میں نے حسام کو بھی یہی کہا، میں تمہیں بھی کہوں گی۔ حرر ہم سب کو آزاد کر رہا ہے۔ تمہیں اپنے عدم تحافظ (insecurity) سے آزادی حاصل کرنی ہے۔ تمہیں قسمت ایک موقع دے رہی ہے، اپنی زندگی پر نظرِ ثانی کرنے کا۔ اپنی محرومیوں کو آپ بھرنے کا۔" مناج نے کرسی آگے کھسکائی اور اس کے قریب پہنچی۔

"حسام نے تمہیں پسند کیا۔ اس نے تمہیں ہر چیز کے ساتھ قبول کیا۔ تم اپنی insecurities کو دیکھنے سے پہلے اپنے دل پر نظرِ ثانی کرو۔ کیا تمہیں اس سے محبت ہے۔ کیا تمہیں وہ پسند ہے؟"

درِفشاں نے آنکھیں بند کیں۔

"کیا اسے دیکھ کر تمہیں جذباتی لگاؤ محسوس ہوتا ہے؟"

کچھ دیر پہلے، درِفشاں دروازے پر کھڑی تھی۔ حسام خود کو ملامت کر رہا تھا، اور وہ حل تجویز کیے بنا رہ نہ سکی تھی۔

”کیا تمہارا دل خوشیوں سے بھر جاتا ہے؟“

راول لیک میں اس کے ساتھ کشتی میں سوار تھی۔ وہ منظر اسے یاد آیا۔ اس نے اس دن سے پہلے کبھی اتنی مسرتیں ایک ساتھ محسوس نہیں کی تھیں۔

”یہ باتیں تمہیں خود سے کرنی ہوں گی۔ جنہیں تم اپنی خامیاں سمجھتی ہوں، وہ خامیاں نہیں۔ وہ تمہاری پہچان ہیں۔ وہ تمہیں انفرادیت بخشتی ہیں۔ تمہاری سکرٹس، تمہارا ڈھیلا لباس، جن چیزوں پر تم عدم تحافظ کا شکار ہو، وہ تمہیں درِفشاں بناتی ہیں۔ درِفشاں، تم مجھے کہتی تھی کہ مجھے ماضی کو سینے سے نہیں لگانا۔ تمہیں بھی ان طعنوں کو سینے سے نہیں لگانا۔ باتیں نہیں رک سکتیں۔ مگر ہمیں ان باتوں کے ساتھ رکنا نہیں چاہیے۔ ہمیں گرو کرتے رہنا چاہیے۔“ مناج کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئی۔

درِفشاں گردن جھکائے سوچتی چلی گئی۔

”اور تم نے ٹھیک کیا، جو حسام کو جواب نہیں دیا۔ تمہیں سچ میں اس کے ساتھ اس لیے نہیں جڑنا چاہیے تاکہ تم باتوں کو لگام پہنچا سکو۔ تمہیں اپنی خوشی کے لیے اس کے ساتھ جڑنا چاہیے۔ پھر بتاؤ۔ کیا تمہیں وہ پسند ہے؟“

درِفشاں ایک بار پھر سوچ میں ڈوبی۔ اسے پہلی ملاقات یاد آئی۔ وہ بلی کا بچہ ہاتھ میں تھامے ہوئے تھا۔ وہ اس پر رشک محسوس کر رہی تھی۔

”معلوم نہیں۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکی۔ ”وہ اچھا ہے۔ بلاشبہ، ایک ڈیسنٹ آدمی ہے۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ وہ کچھ چھپاتا نہیں ہے۔ اس نے سب میرے سامنے رکھا، اور مجھے فیصلے کرنے کی آزادی دی۔“ وہ سوچ میں غرق بولتی گئی۔

”مگر محبت۔ نہیں۔“ گردن نفی میں ہلائی۔

مناج کے چہرے پر ذو معنی مسکراہٹ بکھری۔

”کشش کہہ سکتے ہیں۔ شاید، وقتی کشش۔“

”پھر وقت گزرنے دو۔ اور خود دیکھ لو۔“ مناج نے فرش بوس پرس اٹھایا۔

بارش تھم چکی تھی۔

”کہ کشش وقتی ہے۔ یا تم اسے وقتی قرار دے کر خود کو وقتی طور پر دھوکہ دے رہی ہو۔“ مسکراہٹ درِفشاں کی طرف اچھالی۔

”اچھی طرح سوچ لینا، درے۔ بہت اچھی طرح سے۔“

اور وہ چلی گئی۔ درِفشاں اپنے منتشر خیالات کے ساتھ ایک بار پھر تنہا رہ گئی۔



ٹیکسی لوینڈر ہوٹل الناہدا کے سامنے رکی۔ دو مسافر اپنے سوٹ کیس سمیت باہر نکلے۔

مہر نے نظریں گھماتے اس حسین ہوٹل کو دیکھا۔ عمارت اونچی تھی، یوں لگتا تھا جیسے آسمان کی بلندیوں کو سر کر رہی ہو۔ روشنیوں نے اندھیری سڑک کو چمکا دیا تھا۔ وہ کچھ لمحے اسے دیکھتی رہی اور جدید اور پرکشش عمارت کے نقش کو ذہن میں اتارا۔

”آپ کو اس ہوٹل کے بارے میں کیسے پتا تھا؟“ وہ بولی۔

"چار سال پہلے آپا اور فیروز بھائی کے ساتھ آیا تھا تو ادھر ہی رکا تھا۔ اس ہوٹل کا کرایہ زیادہ نہیں اور سہولیات بہترین ہیں۔ پول ایریا ہے، بڑے بڑے کمرے ہیں۔ بھلا اور کیا چاہیے ہمیں؟"

دونوں حبس زدہ ماحول کو پیچھے چھوڑ کر ہوٹل کی ٹھنڈی اور خوشگوار فضا میں داخل ہوئے۔ لیونڈر ہوٹل کی لابی کافی خوبصورت تھی۔ چھت پہ لگی بتیوں کے باعث لابی چمک رہی تھی۔ جگہ جگہ نرم و ملائم صوفے رکھے ہوئے تھے۔

"آپ کی چوائس اچھی ہے۔" اس نے زیر لب تبصرہ کیا۔

احمد نے مڑ کر اسے سر تا پیر گھورا۔

"واقعی اچھی ہے۔" وہ بس دل میں بولا، اور نظریں پھیر گیا۔

دونوں ریسیپشن پر گئے۔ اپنے کمرے بوک کروائے۔ احمد نے دانستہ طور پر مہر کے برابر والا کمرہ لیا۔ اپنے کارڈ سوائپ کر کے، لفٹ کی جانب چل پڑے۔

آہستگی سے اڑان بھرتی لفٹ میں وہ دونوں تنہا تھے۔

"آپ اب تک ناراض ہیں مجھ سے؟" وہ بول اٹھی۔

"آپ کو میری ناراضگی کی اتنا پرواہ کیوں ہے؟"

مہر کے ماتھے پر بل پڑے۔ اس سوال کا جواب، کاش اس کے پاس موجود ہوتا۔ کچھ چیزوں کی جیسی کوئی منطق، کوئی وضاحت نہیں ہوتیں۔ وہ بس ہوتی ہیں۔ جیسے پتھر پر ضرب لگا دی گئی ہو، اور اب اس ضرب کو مٹایا نہیں جا سکتا۔

"آپ کے سامنے تھا سب۔ چیزیں ٹھیک جا رہی تھیں۔"

مہراب بھی کچھ کھوئی کھوئی سی تھی۔

"مگر پھر آپ نے چیزیں چھپانا شروع کر دیں۔ جب تک آپ چیزیں چھپانا نہیں چھوڑیں گی ہم شاید کبھی ساتھ کام نہ کر سکیں۔ میں آپ کا انتظار کروں گا، جب بھی چاہیں مجھے سب سچ سچ بتا دیں۔"

احمد کی بات ختم ہوئی۔ لفٹ کا دروازہ کھلتا چلا گیا۔ راہداری کا جگمگاتا منظر آنکھوں کے سامنے نمودار ہوا۔

احمد مہر کو پیچھے چھوڑ کر اپنے کمرے کی جانب چل پڑا۔

مہر کے قدم زنجیر ہو گئے۔ وہ بھلا اسے کیسے بتاتی کہ وہ اس ظالم ملکہ کے ساتھ ایک معاہدہ طے کر آئی تھی۔ وہ معاہدہ جو اس کے لبوں کو سی چکا تھا۔

لفٹ کا دروازہ بند ہونے لگا۔ مہر بیدار ہوئی، اپنے بیگز پکڑتی باہر پھدک گئی۔ احمد اپنے کمرے کا دروازہ کھول رہا تھا، جب وہ اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچی۔

"آپ صرف میری وجہ سے آئے ہیں؟" وہ اونچی آواز میں بولی۔

"میں اب کچھ بھی بتانا ضروری نہیں سمجھتا۔ کل ملیں گے۔" احمد نے دروازے پر کارڈ لگایا۔ دروازہ کھل گیا اور وہ اسے دیکھے بنا کمرے میں بند ہو گیا۔

اس کی تلخ باتیں اس کی سینے پر گولیوں کی طرح لگتیں۔ وہ روح پر لگے زخموں کو سہلاتی کمرے میں داخل ہوئی۔

مہر کا کمرہ کافی بڑا تھا۔ دیواروں پر آف وائٹ پینٹ تھا، اور ایک طرف شیشے کی دیوار تھی جہاں سے پول ایریا کا منظر دکھائی دیتا تھا۔

کمرے کی خوبصورتی اور جدید سہولتیں مہر کا دل نہ بہلا سکیں۔ زندگی تو درہم برہم ہو ہی چکی تھی۔ اس کی بیٹی اس سے دور تھی۔ اس کی ماں کسی انجان جگہ پر قید تھی۔ وہ مجرم بن جانے والی تھی۔ دنیا سمجھتی تھی کہ مہر بنتِ عبداللہ سلطان عیاشی کرنے دبئی پہنچی ہے، وہ اس دنیا کو کیسے بتائے کہ وہ تو بس اپنے باپ کے گناہوں کی سزا کاٹ رہی تھی۔

وہ نرم بستر پر ہاتھ پھیلا کر لیٹ گئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ بستر اس کی تھکان جذب کر رہا ہو۔ دفعتاً موبائل بج اٹھا۔ مہر اٹھ بیٹھی اور موبائل اٹھایا۔

شمس کالنگ۔ مہر نے بیزاری سے کال اٹھائی۔

"پہنچ گئی؟" شمس نے کہا۔

مہر کے چہرے پر ناگواری ابھری۔

"ہاں۔ ماں کیسی ہیں؟" مہر نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"ماشاءاللہ سے بالکل ٹھیک ہیں۔ کہاں ٹھہر رہی ہو تم؟" شمس کا انداز لاپرواہ سا تھا۔

"لیونڈر ہوٹل الناہدا۔ یہ نوٹوں سے بھرا بیگ کب لے جاؤ گے۔ اور یہ کام سارا کب تک ختم ہو گا۔ میں اس سب سے جلد از جلد نکل جانا چاہتی ہوں۔" مہر نے کوفت کے عالم میں پوچھا۔

"کل بیگز لے جاؤں گا۔ کام میں تھوڑے دن لگیں گے، تم جب تک دبئی گھومو پھرو اور مزے اڑاؤ۔ تمہاری ماں محفوظ ہاتھوں میں ہے۔" شمس نے تسلی بخش سے انداز میں کہتے ہوئے کال کاٹ دی۔

مہر نے موبائل بیڈ پہ اچھالا۔ اس کا سر درد سے پھٹنے کو تھا۔

☆☆☆

دیوار کے اس پار، احمد کا کمرہ الگ منظر پیش کر رہا تھا۔

بستر پر بیٹھے احمد کے ماتھے پر لاتعداد بل تھے۔ دل میں گرہیں لگ رہی تھیں۔ وہ بے چینی کے عالم میں پیر زمین پر تھپتھپا رہا تھا۔ کان سے فون لگا ہوا تھا۔

"ہاں اچھا کیا مجھے بتا دیا۔ ٹھیک۔" کال کاٹ کر وہ کھڑا ہوا۔ شیشے کی دیوار کے سامنے یہاں سے وہاں ٹہلنے لگا۔

اس نے ہاتھ اٹھا کر گردن کی پشت کھجائی۔ اپنے کندھے بھاری محسوس ہوئے، حالات ہاتھوں سے جیسے نکل چکے تھے۔ اس نے آنکھیں میچ کر پیر پٹخا۔

"اف میری زندگی میں ہر بندہ الٹے کام کیوں کر رہا ہے؟ یہ کیا کرتی پھر رہی ہے، آپا؟" وہ طیش کے عالم میں زیر لب بڑبڑایا۔

اس نے تپ کر صوفوں پر لات کھینچ کر ماری۔ وہ کب تک تنہا سارا بکھیڑا اسمیٹتا رہے گا؟

اگلے لمحے وہ تیز انگلیاں چلاتے ہوئے درفشاں کو کال ملا رہا تھا۔ سر میں درد بھری ٹیسیں ابھر رہی تھیں۔

کچھ دیر بعد درفشاں نے کال اٹھالی۔

"ہاں احمد پہنچ گئے، دبئی؟" درے نے عام سے انداز میں پوچھا۔ یقیناوہ کچھ گھنٹے پہلے کی لڑائی کو سرے سے بھلاچکی تھی۔

"ہاں۔ تم بتاؤ تم کیا کرتی پھر رہی ہو؟"

درے جو کہ کچن کی صفائی کر رہی تھی ایک دم سے چونکی۔

"میں کیا کر رہی ہوں؟" لاعلم بننے کی بھیانک اداکاری کی۔

"تم اپنے آپ کو کیا سمجھ رہی ہو؟ یہ ڈبل ایجنٹ والا ڈرامہ بند کرو، آپا۔ میں بتارہاہوں یہ کھیل بہت خطرناک ہے۔ تم کیوں اتنی خطرناک چیزیں کر رہی ہو؟ اپنی جان کی پرواہ نہیں ہے تمہیں؟" وہ چباچبا کر بولا۔

آخر وہ ایسا کیا کرتا جو درِفشاں اس وقت بعض آجاتی؟ وہ تو اپنے ملک تک میں نہ تھا۔ اسے بے بسی محسوس ہوئی۔

درے نے دل ہی دل میں احمد کے بھیجے ہیکرز کو لعن طعن سے نوازا۔

"تمہارے چچوں نے تمہیں بتاہی دیا یعنی۔ خیر میں کیوں ڈروں؟ میں کوئی غلط کام نہیں کر رہی۔" درے کا انداز قدرے بدلحاظ تھا۔

احمد کا چہرہ سُرخ ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ درے نے اس کی ایک نہیں سنی۔

"آپا، بس اب کوئی تمہیں مجبور اور سمجھدار کہے۔ میں نے چھوڑنا نہیں اسے۔" وہ غصے سے تڑپ کر بولا اور کال کاٹ دی۔

احمد کی بے چینی انتہاء کو پہنچی۔ ایک طرف درِفشاں تھی، جو اپنے قد سے اونچی چھلانگ لگا چکی تھی۔ دوسری طرف مہر تھی جو دم دبا کر چوروں کی طرح بھاگی تھی۔ نہ جانے ہر کوئی اس کی زندگی مشکل بنانے پر کیوں تلا ہوا تھا؟ ایک لمحے کے لیے اسے ساری انسانیت سے نفرت محسوس ہوئی۔

احمد نے ٹیبل سے پانی کی بوتل اٹھائی اور سارا پانی غٹاغٹ نگلا۔ گہری سانسیں لیتے ہوئے، غصے کو بھگانا چاہا۔ اسی اثناء میں اس کی نظر شیشے کی دیوار کے پار پڑی۔ مہر بنت عبد اللہ سلطان پول کے سرہانے چہل قدمی کر رہی تھی۔

ہر فکر پر اس عورت کا چہرہ غالب آیا۔

ہر جذبے پر وہ جذبہ غالب آیا، جو وہ اس عورت کے لیے محسوس کرتا تھا۔

مہر ہاتھ اٹھا کر اپنے آنکھوں تک لے گئی۔ وہ سمجھ گیا تھا، وہ رو رہی تھی۔ وہ ٹوٹ رہی تھی۔ اور وہ خاکستر ہو رہا تھا۔ اس عورت نے نہ جانے کیسے اس کی زندگی پر اپنی تسلط قائم کر دی تھی۔ اب وہ تھی، تو زندگی تھی۔ وہ ساری ناراضیاں، سارے گلے شکوے بھلا کر پول ایریا میں پہنچا۔

وہ سویمنگ پول کے سرہانے کھڑی صاف اور شفاف پانی کو گھور رہی تھی۔ نم آلود ہواؤں کے رُخ پر کندھوں پر پڑی شال رقص کر رہی تھی۔ سینے کی طرف موبائل دبوچا ہوا تھا۔ وہ اس کے برابر میں کھڑا ہوا۔ اور وہ نہ جانے کن خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی کہ اس کی موجودگی کی خبر تک نہ رکھ سکی۔ دفعتاً اس نے موبائل کھولا۔ سکرین پر عنایا کی تصویر جگمگا رہی تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہوئے بے اختیار مسکرا دی۔ جی چاہتا

تھا کہ وہ پلک جھپکے اور اس کی بیٹی اس کی گود میں آ جائے۔ مگر فاصلے نافذ ہو چکے تھے، وہ چاہ کر بھی وقت سے پہلے انہیں ختم نہیں کر سکتی تھی۔

"کیا ہوا، محترمہ؟"

وہ چونک گئی۔ موبائل بند کیے سینے میں دبوچا۔

وہ اس آواز کو یاد نہیں کر رہی تھی، بس وہ آواز میں بے تکلفی، اپنائیت اور نرمی کو یاد کر رہی تھی۔ کئی ساعتیں تو اسے یقین کرنے میں لگیں، کہ وہ آ چکا تھا۔

"کہیں سویمنگ پول میں کود جانے کا تو ارادہ نہیں؟ مجھے سویمنگ نہیں آتی، بچا نہیں سکوں گا۔" وہ شریر انداز میں بولا۔

وہ مڑی۔ اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ بے اعتنائی وفات پا چکی تھی۔ بھوری آنکھوں میں صرف عقیدت تھی۔

"نہیں۔" سینے سے بوجھ سرک گیا۔ "میں نے شکایتیں کرنا چھوڑ دی ہیں۔" آواز تر و تازہ ہو چکی تھی۔

اس کے چہرے پر تازگی دیکھ کر احمد کو جہاں خوشی ہوئی، وہاں اپنے سابقہ رویے پر ندامت محسوس ہوئی۔

"میں نے کرنے بھی نہیں دینیں۔" وہ پورے اعتماد سے بولا۔

وہ کھل کر مسکرا دی۔ اور احمد کے لب بے اختیار پھیلتے چلے گئے۔ جو فضا کچھ لمحے تک اداس اور بوجھل محسوس ہو رہی تھی، اس میں اب سرشاری کے سوا کچھ نہ تھا۔

"احمد۔" اس نے مسکراہٹ سمیٹی۔ "میں مجبور ہوں۔ بہت مجبور۔ میں شرمندہ ہوں میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتی۔" وہ بول اٹھی۔

احمد نے چند ثانیے اپنی نظریں پھیریں۔ وہ اب ان آنکھوں میں اڈتی خفگی کی جھلک اس عورت پر پڑنے نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے سارے خیالات جھٹک کر رخ اس کی طرف کیا۔

"ہمیں چلنا چاہیے کہیں۔ کیا کہتی ہیں؟ کچھ دن تک دبئی گھومنے چلیں؟" احمد نے تجویز پیش کی۔

مہر نے رُخ سویمنگ پول کی طرف موڑا۔

"میری کمپنی دیوالیہ ہو چکی ہے۔ ماں قید ہے۔ میری بیٹی مجھ سے دور ہے۔ اور میں گھومنے پھرنے جاؤں؟" اس نے کندھے اچکا دیے۔

احمد نے رُخ سویمنگ پول کی جانب کیا۔ دونوں کا عکس شانہ بشانہ تھا۔

"تو کیا ہوا؟ زندگی پریشانیوں کے ساتھ جینے کا نام ہے۔ ویسے بھی، تھوڑے سیر سپاٹے آپ کی مدد کریں گے۔" وہ اس کے عکس کو گھورتے ہوئے بولا۔

وہ آزردگی سے مسکرائی۔

"ٹھیک ہے۔ چلیں گے۔"

خاموشی کا راج قائم ہوا۔ اس کے ساتھ خاموشیاں چبھتی نہیں تھیں۔ وہ سکون بخش بن جاتی تھیں۔

جوں ہی ایک یاد نے ذہن کے در کھٹکھٹائے، دل پر چھریاں چل گئیں۔ سکون غارت ہوا۔ وہ ساتھ تھے۔ مگر یہ ساتھ کتنا عارضی تھا؟ اسے وہ معاہدہ یاد آیا۔ دل نے بے اختیار خواہش ظاہر کی جو لبوں کے ذریعے باہر بھی آ گئی۔

”کیا آپ ہمیشہ ایسے نہیں رہ سکتے؟“

اس کی آواز نے اسے خود بھی چونکایا۔ اور احمد کو بھی۔ وہ متذبذب کے عالم میں اسے تکتا رہا۔

”دیر ہو گئی ہے۔ مجھے جانا چاہیے۔“ وہ گردن جھکائے بولا، اور چلا گیا۔

اس نے مڑ کر اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ نظروں سے اوجھل ہوا، تو دل کسی آبگینے کی طرح ٹوٹ کر بکھر گیا۔

اس نے آنکھیں کرب سے میچیں۔ رُخ پانی کی اور کیا۔

”یہ راہیں الگ ہو جائیں گی، مہر۔ تم جو ڈیل کر کے آئی ہو، اس کے بعد ایک ہونے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔“

اس نے خود کو یاد دلایا۔

دردِ فراق کی گھڑی سر پر منڈلائی۔ آنکھیں کھولیں تو وہاں کل کا منظر چل پڑا۔

وہ منظر جس میں وہ برائی کی ملکہ سے معاہدہ طے کر آئی تھی۔



پچھلے دن:

"مگر، میری ایک شرط ہے!"

لیڈی اقدار کے چہرے کا ہر زاویہ بگڑ تا چلا گیا۔

"تم شرط سامنے رکھنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔" وہ حیرانی کو چھپاتے، حتمی انداز میں بولی۔

"آپ غلط ہیں۔ کیونکہ اس وقت آپ میری شرط نہ ماننے کی پوزیشن میں نہیں۔" مہر چہرے پر شاطر مسکراہٹ سجائے بولی تھی۔

لیڈی اقتدار کو کچھ بہت ناگوار لگا۔ اس عورت نے انہیں اندر تک چونکایا تھا۔

"کیا تمہیں اپنی جان کی فکر نہیں، مہر؟" لیڈی اقتدار چہرے پہ معنی خیز مسکراہٹ لیے بولی تھی۔

مہر مدھم سا ہنس دی۔ لیڈی اقتدار کو یہ ہنسی، بری طرح سے کھٹکی۔

"آپ اس وقت مجھے مارنے کی بیوقوفی نہیں کریں گی۔ وہ اکاؤنٹس میری ملکیت میں ہیں۔ اگر میں خودکشی کر لوں، تو مجھے یقین ہے سب سے زیادہ نقصان آپ سب کا ہو گا۔ ہے نا؟" وہ بھنویں اٹھا کر اعتماد سے بولی۔

لیڈی اقتدار کے لب کھلے کے کھلے رہ گئے۔ اب کی بار اس کے چہرے پہ حیرانگی صاف عیاں تھی۔

"اور اگر آپ نے میری ماں کو کچھ بھی کیا، تو کیا لگتا ہے آپ کو؟ میں آپ کا کوئی کام کروں گی؟ نہیں۔ آپ کی کڑوڑوں کی ملکیت جام ہوئی پڑی ہے۔ آپ کو میری ضرورت ہے، اور میری شرط ماننا مجبوری۔"

مہر نے سینے پر انگلی سے دستک دی اور گردن اٹھائی۔ پر تپش نگاہیں لیڈی اقتدار کے چہرے سے نہ ہٹیں۔

"ٹھیک ہے۔ بتاؤ۔" لیڈی اقتدار کا انداز عام تھا۔

"آپ کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ احمد ہے۔ آپ کو ہمارا ساتھ اچھا نہیں لگتا۔ کیونکہ آپ کو یہ ڈر ہے کہ وہ میرے ذریعے آپ لوگوں تک پہنچ جائے گا۔ میں آپ کا سب سے بڑا مسئلہ حل کر دوں گی۔ دبئی سے واپس آکر میں اس بات کو یقینی بناؤں گی کہ وہ میرے پاس نہ بھٹکے۔ بدلے میں میرے اوپر جتنا قرضہ ہے وہ سب معاف کیا جائے گا۔"

لیڈی اقتدار کی آنکھوں میں بے یقینی اتری۔ یہ ناممکن تھا! یہ لڑکی حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔

"تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہے؟" لیڈی اقتدار غصیلی آواز میں بولی۔ اس لڑکی نے اس کا پیمانہ لبریز کر دیا تھا۔ "اگر وہ قرضہ معاف کیا تو ہمیں وہ ہیرے کون لا کر دے گا۔" لیڈی اقتدار کی نسیں بھڑکنے لگیں۔

مہر کے چہرے پہ مسکراہٹ ہنوز برقرار رہی۔

”آپ کے کاروبار کو احمد سے خطرہ ہے، لیڈی۔ اور آپ کو میری ضرورت ہے۔ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہے۔ یہ قرضہ معاف کروائے بغیر تو میں دبئی نہیں جانے والی۔ مجھے نہیں لگتا کہ آپ میرے ساتھ کوئی زبردستی کر سکتی ہیں۔“

لیڈی اقتدار تھم گئی۔ وہ کیا کہتی؟ وہ عورت سارے پیچ و خم جانتی تھی۔ کسی دھمکی نے اب کام نہیں کرنا تھا۔

”کبھی نہیں لیڈی۔ یہ ڈیل ہم کبھی نہیں کر سکتے۔“کان میں لگے ہیڈ فون میں درانی کی آواز گونجی۔ گاڑی میں مائکروفون تھا، جس کے ذریعے درانی ساری گفتگو سن رہا تھا۔

لیڈی اقتدار کسی گہری سوچ میں تھی۔ بہت دیر وہ اس لڑکی کو دیکھتی رہی۔

”منظور ہے۔“لیڈی اقتدار نے فیصلہ سنایا۔

مہر کے چہرے پہ فاتحانہ مسکراہٹ بکھری۔

”یہ آپ نے کیا کر دیا، لیڈی؟“ درانی کی آواز کان میں گونجی

”ٹھیک ہے۔ میں آج شام تک آپ کے وکیل سے ملنا چاہوں گی، قرضے کا یہ معاملہ آج کے آج ہی اپنے اختتام

کو پہنچ جانا چاہیے۔“حتمی انداز میں کہہ کر مہر نے دوستی کا ہاتھ آگے بڑھایا۔

لیڈی اقتدار نے اپنا جھری زدہ ہاتھ مہر کے ہاتھ سے ملایا۔ وہ بھی اب مدھم سا مسکرا رہی تھی۔

لیڈی اقتدار اب گاڑی میں اکیلی تھی۔

”آپ کو یہ ڈیل نہیں کرنی چاہیے تھی۔“ درانی خائف ہو کر بولا، جب کہ لیڈی اقتدار پر سکون تھی۔

”نہیں۔ ہم نے کچھ غلط نہیں کیا۔ اس نے ہمارے بہت کام کرنے ہیں۔ میں اسے ہمارے شانہ بشانہ چلتے، خطرناک اور مشکل فیصلے لیتے دیکھنا چاہتی ہوں۔ وہ احمد کے ساتھ نہیں ہمارے ساتھ، ہماری ٹیم کا حصہ بن کر زیادہ اچھی لگے گی، درانی۔ وہ اس کاروبار کے لیے بہت منافع بخش ثابت ہو گی۔ یہ لڑکی جرائم کی دنیا میں حکومت کرنے کے لیے بنی ہے۔“

☆☆☆

درِفشاں صبح سویرے حرر پہنچی تھی۔ چہرہ اب بھی بوجھل تھا البتہ وہ رات سے کافی بہتر تھی۔

”میری بات سنیں، درِفشاں!“ وہ دروازہ کھول رہی تھی، جب پیچھے سے جانی پہچانی آواز نے اس کے قدم پتھرائے۔

وہ مڑی۔ اور بہت دیر اس مرد کو دیکھتی گئی، جو ہانپ رہا تھا۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں تھیں، گویا دوڑ کر آیا ہو۔ سڑک رات کی بارش کے باعث گیلی تھی۔ فضا میں سوندھی خوشبو رچ بس گئی تھی۔

”آپ مجھے پریشان لگ رہی ہیں۔“ وہ کمر پر ہاتھ جمائے بولا۔

درِفشاں نے اپنے موٹے چشمے اتارے، اور اس کے چہرے کو بغور تکا۔ آنکھوں کے حلقے عیاں ہو چکے تھے۔ وہ کچھ لمحے انتظار کرتی گئی کہ اب اس کے چہرے پر کوئی تبدیلی آئے، مگر وہ بدستور عقیدت کے ساتھ اسے تک رہا تھا۔

”اگر میں پریشان ہوں بھی تو آپ اسے کیسے حل کریں گے؟“ وہ ہاتھ باندھ کر بولی۔

”مجھے لگتا ہے، آپ کل میری گاڑی میں کہی گئی باتوں کے باعث پریشان ہیں۔“ حسام گردن جھکائے بولا۔

”آپ کو درست لگتا ہے۔“ وہ بے رخی سے بولی۔

”جب کہ، آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ اس نے گردن اٹھائی۔ لبوں پر مسکراہٹ ابھری۔

”میں نے آپ سے پوچھا۔ آپ نے انکار کیا۔ بات وہیں ختم ہوگئی۔ میں اپنے راستے چل پڑا۔ آپ اپنے چل پڑیں۔ پھر اس بات کو دل سے لگا کر رکھنے کا کیا فائدہ؟“

اس معاملے کو لے کر حسام کی پختگی نے اسے اچھا خاصا متاثر کیا۔ مگر اس نے چہرے کو سرد سپاٹ رکھا۔

”دیکھیں حسام۔ یہ حرر ہے۔ حرر۔ ہم یہاں کام کرنے آتے ہیں۔ جذبات کا پرچار کرنے نہیں۔ مجھے اچھا لگے گا اگر کم سے کم حرر کے اندر، باہر، کہیں بھی اس بارے میں بات نہ کی جائے۔ میں آپ کی کولیگ ہوں۔ کولیگ رہوں گی۔ اب اندر چلیں، آپ جانتے ہیں آج حرر کے لیے ایک بڑا دن ہے۔“ وہ دوٹوک انداز میں کہتے ہوئے اندر چلی گئی۔

حسام اسی کے ساتھ اندر گیا۔ درِ کے ترش الفاظ نے اس کی تکلیف میں مداوا نہیں کیا تھا، البتہ وہ تکالیف سہنے کا عادی ہو چکا تھا۔ ان کے ساتھ سمجھوتے کرنا جانتا تھا۔

بنکر میں آج ساری پلٹن جمع تھی۔ میز پر لیپ ٹاپ دھرا ہوا تھا۔ مناج، حسام، درِفشاں اور راحیلہ کرسیوں پر براجمان تھے۔ سکرین پر لوڈنگ چل رہی تھی۔

"دعا کرو، اسے پتا نہ چلے کہ اس کے کوٹ میں کیمرا زہیں۔" مناج نے کہا۔

سب نے دل ہی دل میں ورد شروع کیا۔ لوڈنگ ختم ہوئی۔ سامنے کمرے کا منظر اجاگر ہوا۔ ایک عورت تحکم سے کرسی پر بیٹھی تھی۔

"چلو جی۔ اٹس شو ٹائم۔" پورے ہجوم میں درفشاں سب سے زیادہ پرجوش تھی۔

"یہ کون ہے؟" راحیلہ نے پوچھا۔

"نیلوفر۔ عبداللہ سلطان کی بیوہ۔" حسام نے جواب دیا۔

"عمارہ پندرہ منٹ میں حال میں پہنچو۔ لیڈی اقتدار نے تمام نرسز اور ڈاکٹرز کو ہال میں مطلوب کیا ہے۔" نیلوفر سرد سے انداز میں بولی۔ میز سے کچھ فائلز سمیٹیں اور کمرے سے نکلی۔

"کس ہال کی بات کر رہے ہیں؟" درفشاں نے پوچھا۔

"دیکھنے تو دو درے۔"

درے نے چپ سادھ لی۔

"جی میم۔ کچھ خاص ہے کیا؟" آواز میں گھبراہٹ تھی۔

”مجھے معلوم نہیں۔ لیکن لیڈی اقتدار کافی برہم تھیں، اس لیے وقت کی پابندی کا خاص خیال رکھنا ۔“نیلوفر کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

لیڈی اقتدار کا نام سن کر مناج کے اندر آگ لگ گئی۔

عمارہ پہلے ایک پیشنٹ سے ملی۔ ضروری چیک اپس کے بعد وہ بیسمنٹ میں چلی گئی۔

سب نے وہ تمام مناظر دیکھے تھے۔

”واہ! ایک خفیہ انڈر گراؤنڈ بیسمنٹ۔“ مناج سے بولے بغیر رہا نہیں گیا۔

لفٹ کا دروازہ کھلا تو سب کے سامنے اس تین دروازے والے ہال کا منظر نمایاں ہوا۔ مگر تین دروازے ان کی اسکرین پر صاف نظر نہ آئے کیونکہ ہال میں نرسز اور ڈاکٹرز کا ہجوم موجود تھا۔ سب قطار در قطار کھڑے تھے، بالکل ویسے جیسے سکول کی اسیمبلی میں طلباء کھڑے ہوتے ہیں۔ عمارہ بھی ایک جگہ کھڑی ہو گئی۔

لیڈی اقتدار ان ساری قطاروں کے سامنے کھڑی تھی۔ ہال میں کاٹ دار خاموشی کا راج تھا۔

متحررین کا تجسس انتہاء کو پہنچا۔

”سب آ گئے نیلوفر؟“لیڈی اقتدار نے نیلوفر کے کان میں سرگوشی کی۔ نیلوفر نے گردن اثبات میں ہلائی۔ لیڈی اقتدار کے پیچھے، دو بھاری جسامت والے مرد کھڑے تھے۔ لیڈی اقتدار کی گردن مزید تن گئی۔ اس نے اپنے چہرے پہ برہمی طاری کی۔

''آج آپ سب لوگوں کو بھلا کیوں مدعو کیا گیا ہے؟'' لیڈی اقتدار کی مغرور آواز ہال میں گونجی تھی۔ وہ ہاتھ پشت پر باندھے ان کے سامنے ٹہلنے لگی۔ چال میں ازلی ملکہ والا رعب تھا اور شان و شوکت بھی۔

''کیونکہ آج مجھے، معلوم ہوا ہے کہ ہمارے درمیان ایک غدار موجود ہے۔ مگر یہ تو چلتا ہی رہے گا۔ جب تک یہ کاروبار قائم ہے' تب تک ہمیں وقتاً فوقتاً کیڑے مکوڑے دکھتے رہیں گے۔'' ملکہ بے نیازی سے کہہ کے شانے اچکا گئی۔

''ان کیڑے مکوڑوں کو کچلنا ہمارا کام ہے۔'' وہ تھم کر سب کو دیکھنے لگی۔ ''آج میں تم سب کے سامنے اس ایک کیڑے کا خاتمہ کروں گی۔ تا کہ وہ تمہارے لیے عبرت بن سکے۔'' آخری فقرہ لیڈی اقتدار نے چبا چبا کے ادا کیا۔ بھاری نسوانی آواز میں تپش کی آمیزش تھی۔

ہال میں موجود ہر ذی نفس کی رنگت فق ہوئی۔

لیڈی اقتدار نے ہاتھ بڑھایا۔ نیلوفر نے اس کے ہاتھ میں ایک رسی تھما دی۔

وہ ایک ایک کر کے سب کا جائزہ لے رہی تھی۔ بھاری بھر کم مرد اس کے پیچھے چل رہے تھے۔ کسی کے اندر اتنی ہمت نہ تھی کہ ظالم لیڈی اقتدار کی آنکھوں میں جھانک بھی لے۔

لیڈی اقتدار عمارہ کی طرف آئی۔ حرر کے کارندے لیڈی اقتدار کو بہت پاس سے دیکھ سکتے تھے، اس کے انداز میں کچھ ایسا تھا جو ان سب کے اوپر دہشت چھوڑ گیا تھا۔

لیڈی اقتدار نے عمارہ کا جائزہ لیا۔ اسے کچھ دیر گھورا۔ اور گھورتی چلی گئی۔ اپنی جگہ سے نہ ہلی۔

عمارہ کی سانسیں بے قابو ہوئیں۔لیڈی اقتدار کا رک جانا اسے موت کا عندیہ دے رہا تھا۔اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پسینے نمودار ہوئے۔عمارہ چاہ کر بھی لیڈی اقتدار کی آنکھوں میں نہ دیکھ سکی۔

''پکڑو اسے۔''لیڈی اقتدار کی آواز گونجی۔

بھاری بھرکم مردوں نے حکم بجالاتے عمارہ کے بازوؤں کو دبوچا۔

عمارہ بوکھلا کر لیڈی اقتدار کو دیکھتی رہ گئی۔دماغ پر زور ڈالنے کی کوشش کی تاکہ کچھ ایسا یاد پڑ جائے جو اس نے ان جانے میں کر دیا ہو؟ مگر اسے چاہ کر بھی کوئی بھول، کوئی خطا یاد نہ آئی۔

ہال میں انتشار پھیلا، بھنبھناہٹیں شروع ہوئیں۔قطاریں ٹوٹتی چلی گئیں۔تمام ملازمین ایک ہجوم کی صورت میں، کسی سامع کی طرح وہ منظر دیکھ رہے تھے۔

''میں نے کچھ نہیں کیا لیڈی۔میرا یقین کریں۔''عمارہ گڑگڑانے لگی۔

لیڈی اقتدار کی آنکھوں میں بے دردی استدعا تھی۔

''تمہارا مرنا ضروری ہے۔تم ضرور مرو گی۔''وہ برفیلے سے انداز میں بولی تھی۔

عمارہ کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دوڑی۔کلیجہ حلق میں آگیا تھا۔وہ یہاں وہاں دیکھنے لگی کہ اب اسے بھاگنے کا راستہ مل جائے۔کہ گردونواح میں کوئی ذی نفس اس کی مدد کو آجائے۔مگر وہ بھول گئی تھی کہ اس ہال میں موجود ہر انسان اس کی طرح کا مجرم تھا۔اور مجرم سے بڑا دوغلہ، دغاباز اور مفاد پرست کوئی نہیں ہوتا۔

لیڈی اقتدار نے چہرہ عمارہ کے بالکل قریب کیا۔لبوں پر مکروہ مسکراہٹ تھی۔

"میں جانتی ہوں تم بے گناہ ہو۔"

عمارہ ششدر رہ گئی۔

"مگر میں تمہیں مار کر اپنے دھندے کو بچا رہی ہوں۔ ان لوگوں سے جو اس کیمرے کے پیچھے بیٹھے ہیں۔" وہ اتنی دھیمی آواز میں بولی کہ آواز کیمرے کے اس پار باآسانی پہنچ گئی۔

عمارہ کی سانسیں بے ترتیب ہوئیں۔ تو وہ صرف قربانی کا بکرہ تھی؟ کیا اس کی جان اتنی بے معنی تھی۔ عمارہ کا وجود شل پڑا۔ اس نے مزاحمت ترک کر دی۔

"تم لوگوں کو میں چن چن کر ماروں گی۔ تمہارے آشیانوں کو جلا کر راکھ کر دوں گی میں۔ تم سب کو مجھ سے ڈرنا چاہیے۔ لیڈی اقتدار کے گھونسلے میں قدم رکھنے کی سزا، تم سب بھگتو گے۔" لیڈی اقتدار غرائی تھی۔

سیاہ کمرے میں موجود ہر شخص کے رونگٹے کھڑے ہوئے۔ درے کی آنکھیں خوف سے پھٹیں۔ اس کا ہاتھ سینے تک پہنچا۔

لیڈی اقتدار نے رسی کا پھندا بنایا۔

"پلیز لیڈی مجھے مت ماریں۔ مجھے چھوڑ دیں۔" عمارہ گڑگڑائی۔

لیکن لیڈی اقتدار کے اوپر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے پھندے کو عمارہ کی گردن پہ کسا اور اسے زور دے کر کھینچا۔ عمارہ کا دم گھٹنے لگا۔ حلق میں تکلیف ابھرنے لگی۔ سانسیں لینا محال ہوا۔ حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکلیں۔ چہرہ پھولنے لگا۔ ٹانگ اور ہاتھ تھرتھرائے۔

عمارہ کا چہرہ نیلا پڑا۔ آنکھیں جیسے کو د جانے کو تھیں۔ وہ تکلیف سے تڑپتی گئی۔ اس کی سسکیاں، ہر فرد نے سنی۔ سب کے جسم برف ہوئے۔ موت رفتہ رفتہ عمارہ کے اوپر اپنی گرفت مضبوط کرتی چلی گئی۔

اور ایک وقت آیا جب عمارہ کے جسم کی حرارت ختم ہوئی، اس نے حرکت کرنا بند کر دی۔ لیڈی اقتدار نے رسی پر سے گرفت ڈھیلی کی۔ عمارہ کا بے جان وجود ڈھیلا پڑ کر زمین پر گر گیا۔

لیڈی اقتدار عمارہ کے بے جان وجود کو چھوڑ کر مڑی۔ آنکھوں میں دھمکی تھی، گویا سب پر باور کروانا چاہا کہ ان کی وقعت بس اتنی تھی۔

''بے وفائی کی سزا، صرف موت۔ صرف اور صرف موت۔'' وہ آنکھیں پھاڑ کر غرائی۔

نیلوفر کے چہرے پر سرد بر فیلا تاثر قائم تھا۔ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ اس وقت کیا محسوس کر رہی تھی۔

''چلو اب سب کام پر لگو۔'' نیلوفر بلند آواز میں بولی۔ مرعوب ملازمین ایک ایک کر کے ہال سے رُخصت ہوئے۔

لیڈی اقتدار نیلوفر کے پاس پہنچی۔

مناج نے ایک جھٹکے میں لیپ ٹاپ بند کیا۔ وہ منظر مزید کسی سے نہ دیکھا گیا۔

درفشاں سینے پہ ہاتھ رکھ کر ابکائیاں لے رہی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہوئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس نے کوئی جن دیکھ لیا ہو۔

درفشاں سب کچھ چھوڑ کر بنکر سے باہر نکلی۔ سب اسے سکتے کے عالم میں دیکھتے گئے۔

دوسری مناج کی سانسیں ہموار تھیں۔ لیکن دماغ کچھ بھی ہضم کرنے سے قاصر تھا۔ یہ سب اس نے کیا دیکھ لیا تھا؟ کیا کسی کی جان لینا اتنا آسان تھا؟ اس وقت مناج کو احساس ہوا، کہ برائی کی انتہاء تو انسانوں پر شروع ہوتی تھی۔

مناج نے ہمت جمع کی۔ وہ ان سب کی لیڈر تھی۔ وہ ڈھے رہے تھے، اسے ان سب کو ایک بار پھر کھڑا کرنا تھا۔ وہ اٹھ کر باہر نکلی۔ غسل خانے سے بین کی آوازیں آرہی تھیں، وہ وہیں چلی گئی۔

درِفشاں نلکے میں جھکی ہوئی تھی اور الٹی کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد نمی اکھٹا تھی۔ ہاتھ بری طرح کپکپا رہے تھے۔

مناج جامد رہ گئی۔ اسے یقین نہ آیا یہ وہی درے تھی جو ہر وقت مسکراتی تھی۔ جو اسے دنیا کی سب سے مضبوط عورت لگتی تھی۔ وہ بری طرح تہس نہس ہو گئی تھی۔ درے نے نلکے سے سر نکالا اور مناج کو پھٹی پھٹی آنکھوں کے سنگ دیکھا۔

"یہ مجھ سے کیا ہو گیا، مناج؟" بال پونی سے نکل کے اس کی نم پیشانی پہ چپک گئے تھے۔ "مجھ سے ایک قتل ہو گیا۔ میں نے اپنے آپ کو برباد کر دیا۔" لرزتی انگلیاں کنپٹی تک پہنچیں۔

وہ اونچی سانسیں لے رہی تھی۔ وہ دیوانوں جیسی لگ رہی تھی۔

بعض لوگ اپنے آپ کو اتنا مضبوط ظاہر کرتے ہیں کہ دنیا بھلا بیٹھتی ہے کہ وہ بھی ہر انسان کی طرح ٹوٹ سکتے ہیں۔

"نہیں درے۔ ہوش میں آؤ۔" مناج نے درے کو اس کے کندھوں سے تھاما۔ مضبوط اعصاب کا ہونے کے باوجود اس لمحے مناج اعصاب کھونے لگی تھی۔

”درے میری بات اطمینان سے سنو۔“

درے اپنا سر تیزی سے نفی میں ہلانے لگی۔ وہ دہشت، خوف اور جنون کی کیفیت میں مبتلا تھی۔ مناج نے درے کے گالوں کو کستی سے تھاما۔ اپنا چہرہ درے کے چہرے کے قریب کیا۔

”اس سب میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ تم نے لویزا کو قتل کرنے کا نہیں کہا تھا۔ ہمارے پلان میں قتل کبھی بھی شامل نہیں تھا۔“ مناج بلند آواز میں بولی۔

درے بدستور گردن نفی میں ہلاتی گئی۔

”مگر وہ میری وجہ سے قتل ہوئی۔ وہ میری وجہ سے مر گئی ہے۔“ درے نے مناج کو دیکھتے ہوئے کہا۔

آنکھ سے آنسو نکلا۔ اسے دیکھتے رہنا مناج کے لیے بہت دشوار تھا۔

”نہیں درے۔ ہوش کرو۔ تم نے کچھ غلط نہیں کیا۔ ہوش کرو۔“ مناج کی سانسیں پھولنے لگیں، آنکھیں نم ہوئیں۔ وہ اسے کندھوں سے دبوچ کر باہر لے آئی۔

سب درے اور مناج کے پریشان چہروں کو تک رہے تھے۔ مناج نے درے کو صوفے پر بٹھایا۔

”پانی لاؤ جلدی۔“ مناج نے اونچی آواز میں کہا۔ حسام نے جگ سے پانی نکال کر مناج کے حوالے کیا۔ وہ درِ فشاں کو دیکھ نہیں پا رہا تھا۔

”میں قاتل بن گئی ہوں۔“ درے نے بدحواسی کے عالم میں کہا۔ مناج نے درے کے منہ پہ سارا پانی پھینکا۔ درے نے جھٹکا لیا۔ اس کی کپکپاہٹ دم توڑ گئی۔ وہ جیسے نیند سے ایک دم جاگی تھی۔

"تم نے کچھ نہیں کیا درفشاں۔ تم اس کی ذمہ دار نہیں ہو۔"

درے کی کپکپاہٹ مکمل طور پر فنا ہوئی۔ وہ صوفے پر ڈھیلی ہو کر بیٹھ گئی۔ عمارہ کی موت کا منظر آنکھوں کے سامنے دوڑا۔ اس کی سسکیاں، کراہتیں اور لیڈی اقتدار کا سفاک چہرہ ذہن کے پردوں پر اترا۔

یہ منظر اتنا جلدی بھلانے والا نہیں تھا۔

☆☆☆

دو دن پہلے:

درفشاں لیڈی اقتدار کے قصر کے باہر موجود تھی۔ اس نے بال پونی ٹیل میں باندھے ہوئے تھے۔ چیکس والی شرٹ کے نیچے جینز کی سکرٹ پہنی ہوئی تھی۔

"لیڈی سے کہو، تحریک حرر سے ان کا خاص مہمان آیا ہے، ایک اہم خبر لے کر۔" اس نے گارڈ کو اطلاع دی۔

گارڈ اندر انٹر کام تک گیا اور پھر اس نے درے کو اندر جانے کا کہا۔ درفشاں تحکم سے اندر گئی۔ ملازمہ نے اسے ڈرائنگ روم کے صوفے پر بٹھایا۔ دفعتاً لیڈی اقتدار مغرور سی چال چلتی اس کے سامنے بیٹھی۔

"ہاں تو درفشاں۔ کچھ کھاؤ گی یا کچھ پینا چاہو گی؟" لیڈی اقتدار کے چہرے پہ تکبرانہ مسکراہٹ تھی۔

"نہیں لیڈی، بس آپ کو کچھ بتاؤں گی اور چلتی بنوں گی۔" درفشاں نے سرد لہجے میں کہا۔

"اگر خبر واقعی اچھی ہوئی تو میں تمھیں انعام سے نوازوں گی۔" لیڈی اقتدار نے کہا۔

"کیا میں آپ لوگوں کے لیے کام نہیں کر سکتی لیڈی؟"

لیڈی اقتدار کی آنکھوں میں شک ابھرا۔

"تم آخر کیا کر سکتی ہو ہمارے لیے؟" لیڈی اقتدار نے پوچھا۔

"یہ تو آپ ہی بہتر بتا سکتی ہیں۔ میں ایک ماہرِ نفسیات ہوں۔ لوگوں سے میٹھی میٹھی باتیں کر کے ان کا دل بہلاتی ہوں۔ ان کا سچا ہمدرد بننے کی بہترین اداکاری کرتی ہوں۔ کیا آپ کے اس کاروبار میں میری جگہ نہیں بن سکتی؟"

لیڈی اقتدار کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھری۔

"میں سوچوں گی۔ تم ابھی اپنی خبر سناؤ۔" لیڈی اقتدار لاپرواہی سے بولی۔

"پرسوں، عافیتِ زندگی میں ایک لڑکی بھیجی جا رہی ہے۔ اس کے کوٹ پر بٹنز لگائے گئے ہیں جن میں کیمرا ہے، وہ لڑکی اس سب سے انجان ہے۔ وہ آپ کے ہسپتال کے تاریک راز اس لڑکی کے ذریعے اکھٹا کرنا چاہتے ہیں۔ کیا یہ خبر آپ کو اچھی لگی؟"

لیڈی اقتدار کے چہرے پہ سختی در آئی۔ ان سب کی اتنی مجال، کہ اس کے آشیانے میں قدم رکھیں؟ اس نے غصے کے کڑوے گھونٹ پیے۔

"تمہارا بہت شکریہ۔ تمہارا انعام تمہارے بینک اکاؤنٹ میں جمع ہو جائے گا۔ میری کال کا تم انتظار کرنا۔ مجھے لگتا ہے میرے پاس تمہارے لیے ایک کام ہے۔"

درفشاں کے چہرے پہ سرد مسکراہٹ بکھری۔ اپنا بیگ کندھوں پر لٹکائے وہ رخصت ہو گئی۔

حال کی لیڈی اقتدار نیلوفر کے ساتھ موجود تھی۔ نیلوفر کے چہرے پر خفیف سی ناگواری تھی۔

"آپ نے کہا تھا کہ وہ نرس ان کیمراز کے بارے میں جانتی نہیں ہے۔ پھر اس پر غداری کا الزام کیوں لگایا؟" نیلوفر نے اپنا انداز نارمل رکھا۔

"میں حرر کی چیونٹیوں سے جان چھڑانا چاہتی تھی۔ موت کا منظر لمبے عرصے کے لیے ان پر میری دہشت قائم کرنے کے لیے کافی ہے۔ مجھے اس ماہرِ نفسیات کو بھی سبق سکھانا تھا، تاکہ وہ اس سب سے خود کو دور کر لے۔ دونوں تیر نشانے پر لگے ہوں گے۔"

"مسٹر درانی کو اس سب کے بارے میں بتایا؟" نیلوفر نے پوچھا۔

لیڈی اقتدار زیر لب ہنسی۔ نیلوفر کو دیکھ کر گردن نفی میں ہلائی اور لفٹ کی طرف جانے لگی۔

نیلوفر کچھ دیر سوچ میں گم رہی۔ یکبارگی دماغ میں ایک خیال نے جنم لیا۔ جس اندھیرے میں وہ مدت سے جکڑی ہوئی تھی، وہاں روشنی کی مندمل کرن نظر آئی۔

جس رب سے وہ عرصے سے بدظن تھی، کیا وہی رب اسے راستہ دکھا رہا تھا؟

☆☆☆

دبئ کا آسمان ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہر طرف نیلی روشنائی بکھیر دی ہو۔ بادل روئی کی گولوں کی مانند اس میں تیر رہے تھے۔

مہر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ باہر احمد اس کا منتظر تھا۔ سفید شرٹ اور سیاہ پجامے میں ملبوس، سر پر کیپ پہنی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں جوش و خروش بھرا ہوا تھا۔ ہاتھ میں دو بیڈ منٹن ریکٹس تھے۔ وہ اسے دیکھ کر تعجب سے مسکرائی۔

''بیڈ منٹن کھیلیں گی، میرے ساتھ؟'' اس نے خلوصانہ انداز میں آفر کی۔

''انکار کر سکتی ہوں۔'' اس نے جواب دے کر دروازہ بند کیا۔

چند لمحے بعد وہ سر پر ہیٹ پہنے باہر نکلی۔ احمد نیا سے ایک ریکٹ تھمایا۔ اس کے چہرے پر آسودہ مسکراہٹ تھی۔

''آپ کو کیسے پتا چلا کہ مجھے بیڈ منٹن پسند ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہو سکتا ہے، یہ اتفاق ہو۔'' احمد نے لاتعلق سے انداز میں جواب دیا۔

شروع ہو گئیں اس کی پہیلیاں۔ اب اس کی حرکتیں اتنی بری نہیں لگتی تھیں۔

''میں آپ کو جانتی ہوں، احمد۔ آپ یقیناً کچھ سوچ کر بیڈ منٹن کھیل رہے ہیں۔''

وہ دونوں لفٹ میں سوار ہو چکے تھے۔ احمد نے ستائش سے بھنویں اٹھائیں۔

''میں نے آپ کی فیس بوک پروفائل دیکھی تھی۔ آپ بیڈ منٹن کی شوقین معلوم ہوئیں۔'' اس نے عام سے انداز میں بتایا۔

"یعنی آپ مجھے سٹاک کر رہے تھے؟"

احمد گڑبڑایا۔ اسے پل بھر کے لیے کوئی جواب نہ ملا۔ مہر محظوظ ہوئی۔

"نہیں تو۔" وہ یہاں وہاں دیکھنے لگا۔

"بس چیک کر رہا تھا۔ کچھ غلط کیا؟" لفٹ کھل چکی تھی۔

مہر نے سر جھٹک دیا۔

"آپ کر سکتے ہیں۔" وہ دونوں راہداری پر چلنے لگے جو پول تک جاتی تھی۔

"میں بچپن میں اپنی ماں کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ انہیں دیکھ دیکھ کر شوق چڑھا تھا۔" اداس مسکراہٹ لبوں پر در آئی۔

کھلا آسمان ان کے سروں پر تھا۔ سویمنگ پول کے نیلے پانی میں سورج کی کرنیں چمک رہی تھیں۔

دونوں نے کھیل شروع کیا۔ اور ایک گھنٹے تک خوب کھیلے۔ احمد کو کھیل میں مہر سے برتری حاصل تھی۔ وہ شروع کی چند بازیاں ہار گئی تھی۔ اس کا دل برا ہو رہا تھا، اس لیے احمد نے آخری چند بازیاں اس کے نام کر دیں۔

گرمی اتنی شدید تھی، کہ دونوں کو کھیل جلد روکنا پڑ گیا اور ہوٹل کی ٹھنڈی فضا میں لوٹ آئے۔ شیشے کی دیوار کے پار دبئی کا سہانا منظر نظر آرہا تھا۔

اونچی عمارتیں، جگہ جگہ پر خوبصورتی سے تراشی ہوئی گھاس اور پام کے درخت۔ صاف ستھری سڑکیں جن پر گاڑیاں رواں تھیں۔

”دبئی بہت خوبصورت ہے۔“ مہر کسی سحر کے زیر بولی۔

”پھر ایک کام کرتے ہیں۔ ہم کل دبئی کے دل، ڈاؤن ٹاؤن دبئی چلیں گے۔“ احمد نے نرمی سے پیشکش دی۔

مہر نے کچھ دیر سوچنے کے بعد سر ہاں میں ہلا دیا۔

☆☆☆

شام کا سماں تھا۔ البتہ دبئی کی شامیں دوپہر جیسی معلوم ہوتی تھیں۔ وہی نمی، وہی چپ چپ، اور گرمی۔

مہر اور احمد ٹیکسی پر سوار تھے۔ کوئی پندرہ سے تیس منٹ تک کا سفر طے کرنا تھا۔ راستے میں بیشتر عمارتیں دکھائی دیں۔ ہر عمارت آنکھوں کو خیرہ ضرور کرتی۔ عنقریب وہ برج ال خلیفہ کے پاس گزرے۔ مہر نے جھانک کر اس عمارت کو دیکھا۔ وہ جس طرح سے بلندیاں چڑھتی اس طرح سے پتلی ہوتی چلی جاتی۔ اس نے سر اندر کر کے احمد کو مخاطب کیا۔

”میں پوری دنیا گھومی ہوں، یو ایس، ملائشیا، جرمنی۔ بہت سی بلند عمارتیں دیکھی ہیں، مگر دبئی کی عمارتوں کی بات ہی کچھ اور ہے۔“

احمد نے موبائل بند کر کے جیب میں ڈالا۔

”اس کی دو وجہ ہیں۔“ وہ کسی باعلم شخص کی طرح بولا۔

”دبئ کا آسمان اکثر صاف رہتا ہے۔ اس لیے عمارت اونچائی تک نظر آتی ہیں۔ باقی ممالک میں اکثر کئی عمارتیں بادلوں میں چھپ جاتی ہیں۔“

”اور دوسری؟“ مہر نے پوچھا۔

”یہ عمارتیں سیاحوں کو دماغ میں رکھ کر بنائی گئی ہیں، اور صرف رہائش کے لیے نہیں۔ ہر عمارت کے پیچھے کوئی نہ کوئی کانسیپٹ ہے، اس کے تعمیراتی کام میں کچھ اچھوتا چھپا ہوا ہے، جو لاشعوری طور پر سیاحوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ یہ صرف عمارتیں نہیں، بلکہ آرٹ ہیں۔ آرٹ۔“ احمد نے بات سمیٹی اور موبائل میں لگ گیا۔

بلاشبہ، یہ معلومات مہر کے لیے نئی تھیں۔ کچھ منٹ کے سفر کے بعد وہ دبئی مال پہنچے۔

دبئی مال، رقبے کے حساب سے دنیا کا سب سے بڑا مال مانا جاتا ہے۔ عمارت کی ایک جانب صاف اور شفاف پانی تھا، جو گانوں کی دھن پر رقص کرتا تھا۔ البتہ زیادہ تر سیاح رات کے پہر اس سے جی لبھاتے تھے۔ سورج کی کرنوں نے بھوری عمارت کو سنہرا رنگ بخشا ہوا تھا۔

مال میں گہما گہمی تھی، مگر وسیع رقبے کے باعث اس رش کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

دبئی مال میں ایک قدم رکھنے کی دیر ہوتی ہے۔ رونقیں، چھل پہل، رنگینیاں اور پر تعیش آسائشیں انسان کو دنیا ومافیہا سے بیگانہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔

وہ دونوں مصنوعی واٹر فال تک پہنچے، جو اونچی دیوار سے بہتا تھا۔ روشنیوں کی وجہ سے یوں لگتا تھا جیسے پگھلی ہوئی چاندنی دیوار سے اتر رہی ہو۔ پانی کی جلترنگ سریلہ گیت پیدا کرتی۔

"یہ انسانوں نے بنایا ہے۔" مہراب تک سحر زدہ تھی۔ "حیرت ہوتی ہے، ہم انسان اتنا کچھ کرنے کے قابل ہیں۔ ہم دبئ جیسے شہر تعمیر کر سکتے ہیں۔ یہ مال بنا سکتے ہیں۔ اور پھر بھی ہم انسان اپنی صلاحیتوں پر کتنا شک کرتے ہیں؟" مال کا شور، پھر پانی کے سروں کے باعث اسے اونچا بولنا پڑا۔

"کہتے ہیں نا، مہر۔ انسان سے بڑا ناشکرا کوئی نہیں۔ انسان اپنی سہولتوں کے لیے ایسے شاہکار تعمیر کر سکتا ہے، مگر دنیا بھر میں نسل کشی، غربت و افلاس کو روک نہیں سکتا؟ کیوں؟ کیونکہ وہاں سے اس کے مفاد وابستہ نہیں۔ انسان صرف ناشکرا نہیں۔ انسان مفاد پرست اور خود غرض بھی ہے۔"

مصنوعی آبشار دیکھ کر جب دل بھر گیا، تو وہ دونوں دیگر سٹورز میں چلے گئے۔ سٹورز کی وسعت کا تو کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ ایک سے بڑھ کر ایک بین الاوامی برینڈ موجود تھا۔

"پتا ہے احمد۔ ایک وقت تھا جب میں اس سٹور کی بہت سی چیزیں خرید سکتی تھی۔"

وہ دونوں کسی کپڑوں کے سٹور میں تھے۔ البتہ شور نہ ہونے کے برابر تھا۔

"مگر آج والی مہر یہ سب خرید نہیں سکتی۔ مجھے احساس ہوتا ہے، میں کتنی shelteredزندگی گزار رہی تھی۔ ہر طرف بے فکری تھی۔ دولت کا خوف تھا، نہ جان کا۔ سب بدل گیا، احمد۔ میں بھی بدل گئی۔" چہرے پر زخمی مسکراہٹ تھی۔

احمد آسودگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"یہ تبدیلیاں خدا کی طرف سے نعمت ہے۔ وہ سختیاں کرتا ہے، تاکہ ہماری آنکھ کھلے۔ ہم یہاں اتنے پر تعیش مال میں گھوم رہے ہیں، اور ہمارے ملک میں ہمارے پیچھے ایک بڑی عوام عام ضرورتوں کے لیے ترس رہی ہے۔"

"سختیوں نے میری بصیرت سے غفلت کی دھند ہٹائی ہے۔ مجھے اب وہ نظر آرہا ہے جو پہلے نظر نہیں آرہا تھا۔"

وہ دونوں سٹور سے باہر آئے۔ شور و غل کانوں میں واپس آیا۔ نگاہیں کچھ دیر ملی رہیں۔ مسکراہٹوں کا خوشنما تبادلہ ہوا۔ وہ مسکراہٹیں مکمل تھیں۔ آنکھوں میں پنپتی ہوئی خوشیاں مکمل تھیں۔ زندگی کا تصور بھی مکمل تھا۔ وہ خود بھی مکمل تھے۔

"اب ایکویریم چلتے ہیں؟" وہ بولی۔

احمد بس مہر کو دیکھتا رہ گیا۔ اس نے پہلی دفعہ مہر کو اتنا خوش و خرم دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جو کہ آج سے پہلے اس نے مہر میں نہیں دیکھی تھی۔ دل کا ایک کونا خواہش کرتا تھا کہ وہ اسی طرح سے ہمیشہ خوش و خرم رہے، وہ یوں ہی چمکتی دمکتی رہے۔ وہ مرجھاتی تھی تو دل کٹنے لگتا تھا۔

دونوں اکویریم پہنچے۔ وہ دیوار جتنا اونچا اور دراز تھا۔ نیلے پانی میں دیگر اقسام کی مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ مچھلیوں کا ایک جھنڈ احمد اور مہر کی طرف آیا۔ یہ ایک توے کے سائز جتنی مچھلیاں تھیں اور انتہائی خوبصورت تھیں۔ ان کا رنگ گہرا نیلا تھا۔ پنکھ اور پونچھ ان کی پیلی تھی اور پنکھ کے پاس زرا سی کالک لگی ہوئی تھی۔

"یہ سب کتنا خوبصورت ہے۔ تصویروں میں دیکھا تھا مگر یہ تو میری سوچ سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔" مہر کی آواز پرجوش تھی۔ چہرے پہ جہاں بھر کی خوشی تھی۔

"ابھی تو آپ نے کچھ دیکھا ہی نہیں ہے۔ ابھی سرنگ باقی ہے، مہر۔" احمد جتانے والے انداز میں بولا۔

مہر پہلے سے بھی زیادہ پرجوش ہو گئی تھی۔

دونوں نے ٹکٹ خریدے اور پھر آبزیدان کی سرنگ میں چل دیے۔

وہ منظر غیر معمولی تھا۔ اوپر نیچے دائیں بائیں ہر طرف پانی تھا جو کہ مضبوط شیشوں میں قید تھا۔ شیشے کے پار ہر طرح کی مچھلی نظر آتی تھی۔ شارک ہو یا ڈالفن ہو یا گولڈ فش۔ مہر کو یک دم گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔

"اگر یہ ٹوٹ گیا تو؟" مہر کی آواز میں خوف سا تھا۔

وہ پیروں تلے شیشے کے فرش کو دیکھنے لگی جس کے پار پانی نظر آرہا تھا۔

"یہ شیشے بہت مضبوط ہیں، اور بہت مہارت سے اس سرنگ کو بنایا گیا ہے۔ بے فکری کے ساتھ اس منظر کو انجوائے کریں۔" احمد نے کہا۔ مہر پر سکون ہو گئی۔

عموماً کوئی خوبصورت منظر دیکھ کر ایک وقت آتا ہے کہ دل بھر جاتا ہے۔ مگر یہ منظر اتنا نیا اور دلکش تھا کہ بس دیکھتے رہنے کا جی چاہتا تھا۔ یا شاید، جس کے ساتھ وہ منظر دیکھے جا رہے تھے وہ اتنا خاص تھا کہ خوبصورتی کو چار چاند لگ گئے تھے۔

ایسا لگتا تھا جیسے وہ لوگ کسی دوسری دنیا میں سفر کر رہے تھے۔ اجنبی سی انجان دنیا میں۔ حیرت ہوتی تھی کہ ہم ان مچھلیوں کو اتنے قریب سے دیکھ سکتے تھے۔ ان کی ہر ایک چال کو ان کے ہر ایک نقش کو اتنی باریکی سے پرکھ سکتے تھے۔ وہ آبزیدان سے لوٹ آئے تو روح سرشار تھی۔ آبزیدان کی سرنگ کے مناظر ذہن میں زندگی بھر کے لیے مرتسم ہو چکے تھے۔

”آپ آئس کریم کھائیں گی؟“ احمد نے پوچھا تو مہر نے سر اثبات میں ہلایا۔

غم، تکالیف، پریشانیاں، پچھتاوے، مستقبل کو لے کر تمام خوف کہیں دور رہ گئے تھے۔

وہ دونوں پہلی مرتبہ زندگی کو اتنا کھل کے جی رہے تھے۔ وہ پہلی مرتبہ زندگی کے رنگوں میں خود کو رنگ رہے تھے۔

دونوں نے فوڈ کورٹ تک کا سفر کیا اور اپنے لیے آئس کریمز خریدیں۔ آئس کریم کون کے اندر تک بھری ہوئی تھی۔ فلنگ کو کون کے اوپر کسی پہاڑ کی طرح ڈالا ہوا تھا۔ آئیس کریم اتنی لذیذ تھی کہ منہ میں جاتے ہی گھل جاتی تھی۔ خالص مٹھاس حلق سے ٹکراتی تھی جو کہ ذہن کے ہر خانے میں سکون بھر دیتی تھی۔

”یہ اتنی لذیذ کیسے ہو سکتی ہے؟ یعنی سوچ سے باہر ہے۔“ مہر نے تبصرہ کیا۔

جب تک وہ باہر آئے تب تک رات اتر گئی تھی۔ خاص لوگوں کے ساتھ وقت کے گزرنے کا کہاں پتا لگتا ہے؟

رات کے وقت باہر کا منظر دن سے بے حد مختلف تھا۔ رنگ برنگی لائٹیں ہر طرف روشن تھیں۔

فاؤنٹین کا ناچ شروع ہونے لگا تھا اس لیے دونوں فاؤن ٹین کی طرف آ گئے۔

کچھ دیر بعد ایک عربی گانا اونچی آواز میں بجنے لگا۔ فاؤنٹین کے پانی نے جوش لیا۔ پانی کے اندر رنگین بتیاں لگی ہوئی تھیں جس کے باعث ایسا لگتا تھا جیسے پانی رنگین ہے۔ پانی گانے کے گیت پر رقص

کرنے لگا۔ وہ کرتب دکھانے لگا تھا۔ جیسے ہی گانے کے سر اونچے ہوتے وہ دھار کی صورت میں آسمانوں کی بلندیوں کو چھوتا۔ وہ چکر کاٹتا، اور جھوم کر آپس میں ٹکراتا۔

اس خوبصورت منظر کو الوداع کہنا مشکل تھا۔ دلوں پہ پتھر رکھ کر دونوں نے بالآخر دبئی مال کی اس وسیع و عریض عمارت کو الوداع کہا۔ ٹیکسی میں سوار ہوئے، اور لیونڈر ہوٹل النابدا کی جانب چل پڑے۔

"مجھے اب تک یقین نہیں آرہا کہ میری آنکھوں نے یہ سب دیکھا ہے، احمد۔" مہر کی آواز میں تھکان تھی۔

"مجھے اچھا لگا کہ آپ ان مشکل حالات میں بھی اپنی زندگی کو جینا نہیں چھوڑ رہی ہیں، مہر۔ میں آپ کے لیے دل سے خوش ہوں۔" احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ بے وقوف عورت اسے دھوکہ دے کر دبئی جانے کی تیاری کر رہی تھی، پھر کیوں اس عورت کی خوشیاں اسے مکمل کر رہی تھیں؟

"آپ نہ ہوتے تو یہ کبھی نہیں ہو پاتا۔" مہر نے احمد کو سادگی سے دیکھتے کہا۔

نگاہوں کی مالا ایک رہی۔ اور پھر دونوں نے نظریں پھیر لیں۔

"میں زندگی میں ایک بار پھر یہاں واپس آنا چاہوں گی۔ جب سب ٹھیک ہو جائے گا، میں یہاں دوبارہ ضرور آؤں گی۔" ٹیکسی لیونڈر کے باہر رکی تھی جب مہر بولی۔

"اکیلے ہی؟" وہ کہہ کر گاڑی سے اتر گیا۔

مہر کچھ الجھ گئی، اس بات کا آخر کیا مطلب تھا؟

ہوٹل کی لابی کے نرم و ملائم صوفوں پر دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

"ویسے احمد۔ میں نے کچھ نوٹس کیا ہے۔" مہر صوفے پہ آرام دہ ہو کر بولی تھی۔

"کیا؟" احمد نے دلچسپی ظاہر کی۔

"آپ کسی الجھن کا شکار ہیں۔" مہر اسی انداز میں بولی جس انداز میں احمد اپنی تھیوریز پیش کرتا تھا۔ وہی اسپاٹ سا لہجہ، اٹھے ہوئے کندھے اور پر اعتماد انداز۔ احمد سے مسکرائے بغیر رہا نہیں گیا۔

"اوہ؟" احمد کے چہرے پر مصنوعی حیرانی تھی۔ "اور آپ کو ایسا کیوں لگتا ہے؟" احمد چیلنج دینے والے انداز میں گویا ہوا۔

"مجھے آپ کی طرح ہر کسی کے چہرے پڑھنا نہیں آتے، مگر آپ کا چہرہ پڑھنا آتا ہے۔" اس نے پر سوچ وقفہ لیا۔

"لگتا ہے مجھے بہت تفصیل سے پڑھ لیا ہے آپ نے۔" انداز نٹ کھٹ تھا۔

"ویسے، میں اپنے اندازے کی تصدیق نہیں چاہ رہی۔ آپ کی مرضی ہے، بتانا چاہیں تو بتا دیں۔" مہر نے شانے اچکائے۔

احمد کے چہرے پر سنجیدگی پھیلی۔

"آپ کی مجبور اور سمجھدار نے میرا جینا دوبھر کیا ہوا ہے، مہر۔" وہ اچانک سے بولا

مہر چونک گئی۔ اس نے اسے اچنبھے سے دیکھا۔ کیا سچ میں وہ کوئی ذاتی بات بتانے لگا تھا؟

"وہ عجیب سی حرکتیں کرتی پھر رہی ہے۔اس کی دوست نے ایک تنظیم بنائی تھی اور اس نے اسے تنظیم کو جوائن کر لیا۔ صرف یہ ہی نہیں وہ ڈبل ایجنٹ بننے کی کوشش کر رہی ہے۔مجھے بس اس کی فکر ہے۔"احمد نے مختصر سا بتایا۔

مہر اسے دیکھ کر نرمی سے مسکرائی۔

"فکر نہ کریں۔ درفشاں کبھی کچھ غلط نہیں کرے گی۔"وہ دل جوئی کرنے والے انداز میں بولی تو احمد زیر لب ہنس دیا۔

وہ اسے مسکراتے دیکھ رہی تھی۔ کتنا اچھا لگتا تھا اس کا ہنسنا، مسکرانا۔اس کا یوں باتیں کرنا۔ لیکن۔ لیکن تکلیف کیوں ہوتی تھی؟ دل میں اتنی چبھن کیوں ہوتی تھی؟ وہ معاہدہ، اور وہ شرائط بار بار مہر کے سامنے آرہی تھیں۔ وہ دونوں خوش رہ سکتے تھے، مگر اس ڈیل کے ہوتے ہوئے وہ بھلا کیسے احمد کے ساتھ رہ سکتی تھی؟

مہر کا دل بھاری ہونے لگا۔ مسکراہٹ فنا ہوئی۔ چہرے پر رندھا ہوا سا تاثر ابھرا۔

"احمد۔"اس کی آواز لڑکھڑائی تھی۔ احمد نے مسکراہٹ کر نظر مہر پر ڈالی۔

"کیا ہم۔ میں اور آپ؟"مہر کی آنکھیں نم پڑنے لگیں۔ احمد اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

"کیا ہم دونوں ہمیشہ کے لیے یوں نہیں رہ سکتے؟ ایک دوسرے کی خوشیوں میں خوش؟ غموں میں غم زدہ؟ ایک دوسرے کا کندھا بن کر؟ یوں ہی شانہ بشانہ؟ ایک دوسرے کے ہمراہ؟ کیا ہم یہ زندگی کا سفر ایک ساتھ نہیں گزار سکتے، احمد؟"

گیلا لہجہ۔ سادہ سے الفاظ۔ جن میں جذبات کی شدت تھی۔ ان لفظوں میں کہیں نہ کہیں محرومی بھی جھلکتی تھی۔

احمد بس اسے دیکھتا رہا۔ چہرے پر حیرانی تھی نہ بے یقینی۔

اس کے چہرے پہ گہری مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ مسکراہٹ، خود ہی میں بہت کچھ کہہ رہی تھی۔ بہت کچھ جو احمد اب تک بولا بھی نہ تھا۔ مہر بھی اس مسکراہٹ کی نوعیت کو سمجھ چکی تھی۔

وہ مسکراہٹ اقرار کی علامت تھی، احمد کی مہر کے لیے محبت کا اقرار۔

"اس جھنجھٹ سے نکلنے دیں، مہر۔ ہم اس بارے میں ضرور سوچیں گے۔" وہ بس اتنا سا بولا۔ اتنا سا ہی بولنا، مہر کو بہت کچھ بتا رہا تھا۔

وہ بھی اسے اپنا دل دے چکا تھا۔ وہ بھی اس کی خوشیوں میں خوش ہونا چاہتا تھا اور اس کے غموں میں غمگین، وہ بھی اس کے ساتھ زندگی کا یہ سفر طے کرنا چاہتا تھا۔

احمد کھڑا ہوا۔ ایک دفعہ پھر سے اس نے مسکرا کر مہر کو دیکھا۔ وہ پلٹ گیا اور لفٹ میں سوار ہوا۔ کاش وہ کچھ دیر اور رک جاتا؟

مہر کی آنکھیں بے ساختہ نم ہوئیں۔

یہ کیسی محبت کی کہانی تھی جس کا آغاز زوال کی پیشگوئی سے ہو رہا تھا؟

یہ کیسی محبت کی کہانی تھی جو کہ ادھوری رہ جانے کے لیے لکھی جا رہی تھی؟



درِفشاں کا بنگلہ بظاہر پُر رونق تھا، مگر اندر کسی قبرستان سا منظر پیش کر رہا تھا۔

وہ صوفے پر نڈھال سی بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے مناج اور حسام تھے۔ وہ کسی ایسی عمارت سا نظارہ پیش کر رہی تھی جس پر بمباری کر دی گئی ہو۔

"میں تباہ ہو گئی ہوں۔ کوئی کچھ بھی کہے۔ وہ قتل میں نے کیا تھا۔" درِفشاں دونوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔

مناج نے تھکی ہوئی سانس خارج کی۔ وہ دونوں پچھلے ایک گھنٹے سے اسے سمجھا رہے تھے مگر وہ بڑی ڈھیٹ ثابت ہو رہی تھی۔

"تم جانتی ہو، یہ ہمارے پلان میں نہیں تھا۔" مناج بلا تاثر آواز میں بولی۔ ہمت اس کی بھی پست تھی۔

درِفشاں نے گردن نفی میں ہلائی۔

"درِفشاں۔" بولنے والا حسام تھا۔ "ہمارا پلان کیا تھا؟ ہماری نیت کیا تھی؟ کیا اس میں قتل شامل تھا؟ نہیں۔ اس قتل کا بوجھ ہمارے کندھوں پر نہیں۔"

درِفشاں سن پڑی۔

"ہم صرف یہ چاہتے تھے کہ لیڈی اقتدار آپ پر بھروسہ کریں، اور آپ ان کے کاروبار میں داخل ہو جائیں۔ اس لیے سارا عمارہ والا ڈرامہ رچا۔ مگر وہ عورت ہماری سوچ سے زیادہ شاطر تھی۔ ہم سے غلطی ہوئی اسے پرکھنے میں۔" حسام نے نرمی اختیار کی۔

"لیکن میں گئی تھی اس کے پاس۔ میں نے اس عورت کو عمارہ کا نام بتایا۔ اگر میں نہ بتاتی تو وہ نہ مرتی۔" آنسو آنکھوں روانہ ہوئے۔

مناج نے گردن نفی میں ہلائی۔ وہ تقریباً ہار مان چکی تھی۔

"آپ نہ کرتیں تو کوئی اور کرتا۔ میں چلا جاتا۔ یا کوئی بھی۔ قتل تو پھر بھی ہوتا نا، درے؟ آپ صرف اتنا بتائیں، اگر آپ کی جگہ اگر میں جاتا، اور میں خود کو قتل کا موردِ الزام ٹھہراتا، آپ اس صورتحال میں مجھے قاتل سمجھتیں؟"

اس سوال نے درِفشاں کے آنسوؤں کو لگام دی۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ مناج نے سکون کی سانسیں لیں۔ اس ایک گھنٹے میں پہلی مرتبہ کسی بات نے درِفشاں پر اثر کیا تھا۔

"بلکہ آپ اس وقت مجھے دلاسہ دینے کے لیے تقریریں شروع کر دیتیں۔ آپ دوسروں کی اتنی فکر کرتی ہیں۔ دوسروں کو دلاسے دیتی ہیں۔ دوسروں کو غلطیوں پر امید دلاتی ہیں۔ مگر اپنی باری اتنی سخت کیوں ہو جاتی ہیں؟ بتائیں؟ اپنے ساتھ اتنا ظلم کیوں، درِفشاں؟" حسام کی آواز میں کرب اترا۔

درے بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئی۔

"آپ خود کو وہ سب کیوں نہیں کہتیں جو دنیا والوں سے کہتی ہیں؟"

وہ خاموش پڑا۔ مناج درِفشاں کے چہرے کے اتار چڑھاؤ پڑھ چکی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں حسام کو ڈھیروں داد بھیجی۔

''درے۔ میں نے تمہیں ہمیشہ ایک مضبوط عورت کے طور پر دیکھا ہے۔ جو زندگی کی دشواری کے باوجود تلخ اور کڑوی نہیں بنی۔ تم نے مجھے روشنیاں دکھائیں۔ ان کا تعاقب کرنا سکھایا۔ آج تم خود کیوں اندھیروں میں خود کو سونپ رہی ہو؟'' مناج کا لہجہ ترحم تھا۔

''میں تمہیں پھر کھڑا ہوتا دیکھنا چاہوں گی۔ جو ہوا سو ہوا۔ ہم سے غلطی ہوئی۔ ہم نے مات کھائی۔ ہم اسے قبول کر کے آگے بڑھتے ہیں۔ آگے نہ جانے کتنی غلطیاں ہوں گی؟ ہمارے اوپر کتنے حملے ہوں گے؟ ہمارے جسموں پر کتنے زخم لگیں گے۔ کیونکہ ایک بات تو طے ہے، جس راستے پر ہم چل رہے ہیں اس میں ہماری جانوں کی ضمانت نہیں۔''

حسام اور درِفشاں کی گردنیں اٹھیں۔

''میں بار بار کہتی ہوں۔ حرر ہم سب کو آزاد کر رہا ہے۔ حرر ہمیں جان اور مال کے خوف سے بھی آزاد کر رہا ہے۔'' وہ خاموش ہوئی اور درے کے برابر میں بیٹھی۔ اس کے چہرے کی نمی رگڑی اور اسے نرمی سے دیکھا۔

''آرام کر لو۔ وقت لو۔ مگر مجھے تم واپس حرر میں چاہیے ہو۔ پہلے سے زیادہ مضبوط، پہلے سے زیادہ دلیر۔''

درے اس سارے مرحلے میں پہلی دفعہ مسکرا دی۔ حسام اور مناج دونوں کی فاتحانہ نگاہوں کا تبادلہ ہوا۔

''میں خوش نصیب ہوں۔ مجھے تم دونوں جیسے دوست ملے۔'' وہ رندھے ہوئے چہرے کے ساتھ ہنس پڑی۔

وہ ایک لمحہ تھا، اور اس لمحے سے زیادہ کوئی لمحہ آج سے پہلے حسام فاروق کو اتنا حسین نہ لگا۔

☆☆☆

درِ فشاں سنگھار میز کے سامنے کھڑی اپنے عکس کو تک رہی تھی۔ ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔

اس نے اپنے چشمے اتار کر میز پر رکھے۔ گہرے حلقے نظر آئے۔ اسے وہ ساری باتیں یاد آئی جو ان حلقوں کے بارے میں سنی تھیں۔

”درے، تمہاری نیند پوری نہیں ہوتی؟“

”جاگ جاگ کر کرتی کیا ہو؟“

”اپنا خیال رکھو۔ لڑکیوں کو خیال رکھنا چاہیے اپنی شکل وصورت کا۔“

اس کا جی چاہا وہ ایک بار پھر اپنے چشمے پہن کر ان حلقوں کو چھپائے۔ مگر نہیں۔ ایک اور آواز آئی۔ ایک ایسی آواز جو درے کے دل میں گھر کر چکی تھی۔

”آپ خود کو وہ سب کیوں نہیں کہتیں جو دنیا والوں سے کہتی ہیں؟“

لب بے اختیار مسکرا دیے۔

”حلقے ہیں تو کیا ہوا؟ اس دنیا میں کتنے لوگوں کی ٹانگیں نہیں، ہاتھ نہیں۔ وہ دیکھ نہیں سکتے۔ اور تم درِ فشاں حلقوں پر رو رہی؟ تمہاری بصیرت سلامت ہے۔ یہ کافی ہونا چاہیے۔“

دل میں ایک راحت بخش دینے والا احساس جگمایا۔ آج پہلی بار اس نے خود سے نرمی برتی تھی۔

اس کی نظر اپنی سکرٹ پر پڑی۔ بھرے بھرے بازو، اور بھرا ابھرا یا جسم ڈھیلی ڈھالی شرٹ کے اندر چھپا ہوا تھا۔

"موٹاپا کم کرو درِے، موٹی لڑکیوں کی کوئی ڈیمانڈ نہیں ہوتی۔"

"تم سے شادی کون کرے گا؟ ہر مرد کو ایک دبلی پتلی عورت چاہیے ہوتی ہے۔"

وہ آوازیں اس پر حاوی ہوئی۔ وہ ایک بار پھر بوجھل ہوئی۔

"آپ خود کو وہ سب کیوں نہیں کہتیں جو دنیا والوں سے کہتی ہیں؟"

آنکھوں میں اعتماد در آیا۔

"کیا ہوا اگر تمہارا جسم تھوڑا ابھرا ہوا ہے، درِفشاں؟ کثرت شروع کر لو۔ اور اپنے جسم کو ویسا بناؤ جیسا تمہیں پسند ہے۔"

یہ کتنا آسان تھا؟ وہ زیرِ لب ہنس پڑی۔

درِفشاں کی نظر ماتھے کی لکیر پر گئی۔ مسکراہٹ بجھ گئی۔

"درِفشاں شادی کر لو۔ عمر نکلی جا رہی ہے تمہاری۔"

"درِے بڑی عمر کی عورتوں سے بڑی عمر کے مرد ہی شادی کرتے ہیں۔ شکل وصورت اور آمدنی پر سمجھوتہ کرنا پڑے گا۔"

اس نے سب باتوں کو ذہن سے جھٹکا۔

"یہ عمر کی لکیر علامت ہے کہ تم ایک تجربہ کار انسان ہو، درِفشاں۔ تجربہ قیمتی ہوتا ہے۔ جو تمہاری قسمت میں ہو گا، وہ تمہیں مل کر رہے گا۔ جو تم سے محبت کرتا ہو گا، وہ تمہیں ہر خامی کے ساتھ قبول کرے گا۔ خواہ وہ تمہاری ڈرامے بازیاں ہوں، تمہارے ماتھے کی لکیر ہو، تمہارے گہرے حلقے ہوں یا پھر بھربھرایا جسم۔"

کوئی جنگ تھی جو ختم ہوئی تھی۔ کوئی پرانی رکاوٹیں تھیں جو وجود کھو رہی تھیں۔

روح کے گوشے گوشے میں سرشاری دوڑ گئی۔ وہ پھر مسکرائی۔ اور مسکراتی چلی گئی۔

ذہن میں بار بار اس چشمے والے مرد کا خاکہ اترا۔ کچھ تھا جو بدل رہا تھا۔ شاید اس آدمی کے لیے احساسات۔

☆☆☆

صبح سویرے مہر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ نیند کے زیرِ اثر تھی لیکن احمد کو یوں تیار دیکھ کے وہ ایک دم سے بیدار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں سوٹ کیس تھا، وہ جانے لگا تھا۔ مہر کا دل ڈوبنے لگا۔

"میں جا رہا ہوں۔" احمد نے مہر کو اطلاع دی۔

"اتنی جلدی؟" مہر کو جیسے یقین نہیں آیا۔

"ہاں۔ میں یہاں اپنی کمپنی کی ریجسٹریشن کے لیے آیا تھا۔ سارا کام ہو گیا ہے۔ بس اب ای میل کا انتظار ہے تو میں جا رہا ہوں۔ میری نئی نویلی کمپنی اکیلی ہے، مجھے اسے توجہ دینی ہے۔ اس لیے میرا جانا ضروری ہے۔" احمد نے سادہ سے لہجے میں بتایا۔

”ٹھیک ہے۔“مہر کے چہرے پر اداسی نمایاں تھی۔

کیا وہ حسین لمحات، وہ محبت بھرا ساتھ، خوشیوں بھرے قہقہے اتنے مختصر وقت کے لیے زندگی میں آئے تھے؟

احمد نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ وہ جیسے کچھ تلاش کر رہا تھا۔ مہر اسے تعجب سے دیکھ رہی تھی۔

اس کی مٹھی میں ایک لاکٹ تھا، جو دل کی شکل کا بنا ہوا تھا۔ مہر کی آنکھوں میں ستائش تھی۔ کیا وہ اس کے لیے لیا گیا تھا؟

”ہیپی برتھ ڈے مہر۔“ احمد سادگی سے بولا۔ مہر چونکی، آج۔ آج واقعی اس کی برتھ ڈے تھی، گیارہ ستمبر۔ وہ حیران رہ گئی۔ مہر نے چہرے پر بے یقینی لیے وہ لاکٹ اپنے ہاتھ میں تھاما۔

”آپ کو کیسے پتا چلا؟“ آواز میں خوش گوار حیرانی تھی۔

احمد نے لب کھولے ہی تھے کہ مہر نے آنکھ کے اشارے سے اسے چپ کروایا۔

”یقیناً میری فیس بوک پروفائل سے؟“

بھوری آنکھوں میں کسی استاد سا فخر سمایا۔ وہ کھکھلا دیا۔

”آپ پر اچھا لگے گا۔ اسے اتاریے گا نہیں۔“ وہ ایسے بولا جیسے درخواست کرنا چاہ رہا ہو۔

”یہ نہایت حسین ہے احمد۔“ مہر کی آنکھیں نم پڑیں۔ یہ تحفہ اس کی طرف سے دیا جانے والا پہلا تحفہ تھا، کیا ممکن تھا یہ تحفہ آخری بھی ہو؟ ”میں اسے کبھی نہیں اتاروں گی۔“ احمد نے سر اثبات میں ہلایا اور گردن جھکا لی۔

"مہر۔" اس نے بات شروع کی۔ بھوری آنکھوں میں کئی جذبات امڈ آئے۔ "مجھ سے بڑی بڑی باتیں نہیں ہوتیں۔ نہ بڑے بڑے دعوے اور وعدے ہوتے ہیں۔ مجھے مشکل الفاظ کا استعمال کر کے لمبے لمبے اظہار کرنا نہیں آتے۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا؟" وہ اپنائیت سے بولا۔

مہر نے سر اثبات میں ہلایا۔ احمد سر کو خم دے کر مڑ گیا اور جانے لگا۔

عنقریب وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ دبئی چھوڑ کر جا رہا تھا۔ مہر کو لگا جیسے احمد یوسف اس کی زندگی سے بھی جا رہا ہو۔ مگر وہ کیسے اس سے قطع تعلق کرتی؟

کیا محبت میں اتنا آگے نکل جانے کے بعد اس کے نصیب میں مات مکتوب تھی؟



اگلی صبح شمس مہر کو ٹیکسی میں لینے پہنچ گیا تھا۔ اس نے مرجھائی ہوئی آنکھوں کو چھپانے کے لیے سیاہ چشمہ پہنا ہوا تھا۔

"تمہیں بینک لے کر جا رہا ہوں۔ یہ نوٹوں والے بیگ کے ساتھ ایک کمرے میں جانا ہے۔ بیگ وہاں کے مینیجر کے حوالے کرنا ہے اور پھر کچھ کاغذات پر دستخط کرنے ہیں۔ وہ کاغذات تمہاری آزادی کا پروانہ ہیں۔ اس کھیل کو ختم کر کے میں تمہیں ایئرپورٹ چھوڑ آؤں گا۔" شمس نے سرد لہجے میں کہا۔

"اور میری ماں؟" آواز بلا تاثر تھی۔

"وہ ایئرپورٹ پر تمہاری راہ تک رہی ہو گی۔"

مہر کا دل ڈگمگانے لگا۔ وہ آج ایک جرم کرنے جا رہی تھی۔

"یہ پہلی بار ہے، مہر۔ اور آخری بار بھی۔ اس کے بعد تم اور ماں آزاد۔" اس نے خود کو یقین دلایا۔

ٹیکسی بینک کے سامنے رکی۔ وہ دونوں گاڑی سے نکلے، شمس نے ڈگی سے سوٹ کیس نکال کر مہر کو تھمایا۔

دونوں بینک کی عالی شان اور کشادہ عمارت کے اندر داخل ہوئے۔ بینک کے ناظم نے دونوں کا استقبال کیا۔ لب و لہجہ عربی تھا۔

"یہ مہر ہیں۔ آپ انہیں کاروائی کے لیے لے جائیں۔" شمس نے مسکراتے ناظم کو انگیریزی میں کہا۔

ناظم نے گھبرائی ہوئی مہر پر نظر ڈالی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کشادہ عمارت میں اس کی سانسیں تنگ ہو رہی ہوں۔

"شیور شیور۔ مہر، آپ آئیں۔" ناظم مسکرا کے بولا۔

مہر نے غیر آرامدہ ہو کر گنجے ناظم کو دیکھا۔ سیاہ چشمے ہاتھ میں دبوچے، اور دوسرے ہاتھ سے سوٹ کیس گھسیٹا۔

وہ دونوں ناظم کے آفس میں داخل ہوئے۔ ناظم کی ڈیسک کے پیچھے والی دیوار پر ایک دروازہ بنا ہوا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور خود اندر گیا، مہر بھی اس کے پیچھے چلتی گئی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ہر قدم اس پر کچھ نیا عیاں کر رہا تھا۔ اس کے ماتھے پہ ٹھنڈے پسینے پھوٹنے لگے تھے۔ کیا ہر مجرم کا جرم کرنے سے پہلے یہی حال ہوتا ہے؟ وہ سوچنے لگی۔

دروازے کے اس پار ایک پتلی راہداری تھی۔ راہداری کے ایک طرف شیشے کی بنی دیوار تھی جس پر ان کا عکس نظر آتا تھا۔ وہ ایک چھوٹے کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرہ بس دو ہی افراد کو اندر سمانے کی گنجائش رکھتا تھا۔ کمرے کے بیچ و بیچ ایک ڈیسک تھی۔ بینک کا ناظم ڈیسک کی دوسری طرف گیا۔ اس نے مہر کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ مہر اشارہ سمجھ گئی تھی۔

مہر نے سوٹ کیس ٹیبل پہ رکھا۔ اس کا دل اب اور بھی زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ دل جیسے اچھل اچھل کے اس کے حلق میں آرہا تھا۔ دل کی گہرائیوں سے ایک آواز آرہی تھی۔ ابھی بھی وقت ہے مہر بنت عبداللہ سلطان یہ سب چھوڑ کر بھاگ جاؤ۔ مگر وہ اپنے دل کی تمام آوازوں کو نظر انداز کرتی گئی۔

ناظم نے سوٹ کیس کھولا۔ اس میں ڈھیر سارے نوٹ تھے، اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری۔ اس نے سوٹ کیس بند کر کے نیچے رکھا۔ اور مہر کے سامنے کچھ کاغذات اور ایک قلم دھرا۔

اب دستخط کرنے کا وقت تھا۔ مہر کا پورا جسم نم ہو چکا تھا۔ اسے لگا کہ وہ یہ نہیں کر سکے گی۔ اس نے قلم کی نوک کو کاغذ پر کسا۔ اس کا ہاتھ ہلنے سے انکار کر رہا تھا۔ مہر کا اضطراب بڑھتا چلا گیا۔

مہر نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ایک گہری سانس اندر لی۔ اور گہری سانس باہر نکالتے ہوئے، ایک جھٹکے میں وہ ان کاغذات پہ دستخط کر گئی۔ کام مکمل ہو گیا تھا۔

مہر منی لانڈرنگ کر چکی تھی۔

☆☆☆

بینظیر انٹرنیشنل ایئرپورٹ، اسلام آباد۔

ایئرپورٹ پر معمول کی گہما گہمی تھی۔ مہر بنت عبداللہ سلطان کی چال مرجھائی ہوئی تھی۔ وہ اپنی ماں سے ملنے والی تھی، دل میں خوشی کا عنصر بھی کہیں نہ کہیں موجود تھا، لیکن پھر بھی دل بہت بھاری ہو رہا تھا۔ دل اداس تھا، غمگین تھا۔ وہ جرم کر آئی تھی، کوئی عام جرم نہیں بلکہ ایک سنگین جرم۔

اس نے چیکس پار کیے اور اپنا بیگ گھسیٹتے باہر نکلی۔ وہ ویٹنگ ایریا میں پہنچی تو اس کی نظر اس پہ پڑی۔ پہلے تو اسے یقین نہیں آیا، لیکن وہ واقعتاً ادھر تھا۔ احمد۔ جو آنکھوں میں شدت بھرا غصہ لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ مہر کا دل ڈوبنے لگا۔ قدم زنجیر ہو گئے۔ احمد ہاتھ باندھے اس کی طرف بڑھا۔ اس کی آنکھوں میں مہر کے لیے بے پناہ شکایت تھی۔ مہر کے سر پہ گھنٹیاں بجنے لگیں۔

"میں نے آپ کو کتنے ہی موقعے دیے مہر، کہ آپ مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دیں۔ لیکن آپ آخری وقت تک مجھ پر بھروسہ نہ کر سکیں۔ کیا میں بھروسے کے لائق نہیں تھا، مہر؟" احمد تلخی سے بولا۔

مہر کا چہرہ غمگین ہو گیا۔ کیا وہ سب جانتا تھا؟

"میں سمجھی نہیں۔" مہر بس اتنا ہی کہہ سکی۔

"میں نے جہاز میں کہا تھا کہ میں آپ کا انتظار کروں گا۔ آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں تھا؟ میں جانتا ہوں آپ منی لانڈرنگ کر کے آ رہی ہیں۔ آپ ان کے ساتھ مل گئیں، جنہیں میں برباد کرنے نکلا تھا۔"

مہر کے لب کھلے کے کھلے رہ گئے۔ وہ سب جانتا تھا؟ وہ جانتا تھا کہ وہ ایک مجرم تھی؟

"آپ نے سب کچھ اپنے ہاتھوں سے ختم کیا ہے، مہر۔ میں یہاں پر سب کچھ ختم کرتا ہوں۔ اللہ حافظ۔" احمد مڑا۔

مہر کی سانسیں بے ترتیب ہوئیں۔

"آپ مجھے نہیں سمجھ سکتے، احمد۔" مہر نے تلخی سے کہا۔ احمد تھم گیا۔

"میری ماں مجھ سے چھن گئی۔ میرے ڈیڈ قتل کر دیے گئے۔ میں آپ کو بتاتی تو وہ میری ماں کو کبھی واپس نہ کرتے۔" مہر کے انداز میں بے بسی تھی۔

احمد پلٹا، چہرے پہ تلخی برقرار تھی۔

"وہ اب بھی آپ کی ماں کو واپس نہیں کرنے والے۔ آپ اب پھنس چکی ہیں۔ لیکن اس بار میں آپ کی مدد کو نہیں پہنچوں گا۔ آپ کو اپنی جنگیں تنہا لڑنے کا شوق ہوا ہے، آپ کو یہ تنہائی مبارک ہو۔ اپنا خیال رکھیے گا۔" وہ کہہ کر پھر سے مڑ گیا اور تیز تیز قدم بڑھاتے ایئرپورٹ سے نکل گیا۔

مہر جہاں تھیں وہیں کھڑی رہی۔ ایئرپورٹ کے اس ہجوم میں وہ جیسے بھٹک گئی تھی۔

ایک جھٹکے میں سب ختم ہو گیا تھا۔۔۔ ایک جھٹکے میں۔۔۔ سارے رشتے۔۔۔ سب کچھ۔۔۔

وہ اتنی آسانی سے اسے کس طرح چھوڑ گیا؟ مہر کو اس وقت یقین نہ آیا۔ اگر وہ اسے نہ چھوڑتا، کیا تب بھی دونوں کی کہانیاں ایک ہو سکتی تھیں؟ دل کرچی کرچی ہو جانے کی یہ تکلیف اس کی روح پہ گراں گزر رہی تھی۔

وہ بدحواسی کے عالم میں وہیں کھڑی تھی، جب اس کا موبائل بجا۔ چونک کر اس نے کال اٹھائی۔

"پارکنگ ایریا میں تمہاری ماں تمہارا انتظار کر رہی ہے۔" شمس نے کہہ کر کال کاٹ دی۔

مہر اپنا سوٹ کیس گھسیٹتے چلنے لگی۔ کم سے کم ماں تو اسے مل ہی جائیں گی۔ ڈھیروں آنسو اندر نگلے۔ کیا ہوا اگر اس کی محبت کی داستان ایک بار پھر سے ادھوری رہ جانے والی تھی؟ وہ محبت کے معاملے میں ہمیشہ سے ہی بد قسمت تھی۔ اس نے یہ سب سوچتے ہوئے پارکنگ ایریا کا سفر طے کیا۔ اپنے چہرے پہ اس نے جبراً مسکراہٹ پھیلائی۔

اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے غموں کی بوچھار ماں پہ عیاں نہیں ہونے دے گی۔ وہ ان سے خوشی خوشی ملے گی۔

مہر پارکنگ ایریا میں آئی، اس امید سے کہ کہیں اسے کمینی شکل والا شمس نظر آئے گا۔ اور اس کی وین میں شمائلہ ہوں گی، جو اسے دیکھتے ہی مسکرا کر ہاتھ لہرائیں گی۔

پارکنگ ایریا میں کچھ گاڑیاں کھڑی تھیں۔ مہر شمس کی نیلی ویگن کو تلاش کرنے لگی۔ مگر شمس کی ویگن کا پارکنگ ایریا میں نام ونشان تک نہ تھا۔ مہر کے وجود میں انتشار پھیلنے لگا۔

اس نے ایک بار پھر سے پارکنگ ایریا کا چکر کاٹا۔ وقت کے ساتھ ساتھ انتشار بڑھتا جا رہا تھا۔ ماں ملنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ مہر پاگلوں کی طرح ایئرپورٹ کے چکر کاٹنے لگی تھی۔ یہ سب کیا تھا؟ اسے سمجھ ہی نہ آسکا۔

کیا ان لوگوں نے اسے دھوکہ دیا تھا؟ مہر کے ہاتھ کپکپانے لگے۔ رنگت زرد پڑنے لگی۔

اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے شمس کو کال ملائی۔

”کیسا لگا میرا مذاق؟“ شمس ہنستے ہوئے گویا ہوا۔

مہر کی روح کانپ اٹھی۔ دل پھڑ پھڑانے لگا تھا۔

”تم ایسا کیسے کر سکتے ہو؟“ وہ اونچی آواز میں بولی۔ آنسوؤں کی رسی کھلی اور وہ پارکنگ لاٹ میں رونے لگی تھی۔ اسے کسی چیز کا ہوش نہیں رہا تھا۔ اس کا دل جیسے کسی ٹرک کے نیچے آکر کچلا گیا تھا۔ ”میں نے تم لوگوں کی وجہ سے اپنے آپ کو برباد کیا۔ میں نے جرم کیا ہے۔ تم سب یہ کیسے کر سکتے ہو؟“ اس کی آواز میں بے یقینی تھی۔ آواز باقاعدگی سے لرز رہی تھی۔ کاش وہ پچھلے وقتوں میں واپس جا کر اپنے آپ کو وہ غلطی کرنے سے روک سکتی۔۔۔ کاش!

”ابھی وہ وقت نہیں آیا مہر۔“ شمس نے بے رحم سے لہجے میں کہا۔

”تم لوگ یہ کیسے کر سکتے ہو۔ پلیز شمس۔ رحم کرو۔ میری ماں سے مجھے ملوا دو۔“ مہر نے گڑ گڑاتے ہوئے کہا۔ مہر کے اندر توانائی جیسے ختم ہو گئی تھی۔ اس کی قوت کو ان ظالموں نے چوس لیا تھا۔ درد کی لہر اس کے وجود میں دوڑنے لگی۔ وہ ڈھیلی ہو کر زمین پہ گھٹنوں کے بل گر گئی۔ سوٹ کیس اس کے عقب میں لڑھک گیا۔

”اپنی ای میل پر ویڈیو دیکھو، مہر۔ اب تو اصل کھیل شروع ہوا ہے۔ جرائم کی دنیا میں خوش آمدید۔“ کال کٹ گئی۔

یہ شمس کس ویڈیو کی بات کر رہا تھا؟ کیا اس کی ماں کے ساتھ کچھ ہو گیا تھا؟ مہر کو طرح طرح کے خدشات ستانے لگے۔

اس نے کپکپاتے ہاتھوں کے ساتھ موبائل کان سے جدا کیا اور اپنی ای میل کھولی۔ ای میل پر شمس نے ایک ویڈیو بھیجی تھی۔ مہر کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔

مہر نے وہ ویڈیو پلے کی۔

اس کی آنکھ خوف کے مارے پھٹنے لگی۔ لب کھلے کے کھلے رہ گئے۔ اس نے جو دیکھا، اس پر وہ یقین کرنے سے قاصر تھی۔ اس نے بار بار وہ ویڈیو دیکھی، کہ کسی طرح سے بس یہ نظر کا دھوکہ نکل آئے۔

اس ویڈیو میں مہر کی فوٹیج تھی جس میں وہ منی لانڈرنگ کر رہی تھی۔ ویڈیو میں سب دیکھا جا سکتا تھا۔ ویڈیو اس زاویے سے بنائی گئی تھی کہ صرف مہر کا چہرہ ہی نمایاں تھا، ناظم کا چہرہ واضح نہ تھا۔

مہر دم بخود رہ گئی تھی۔ وہ گھٹنوں کے بل اسی طرح سے بیٹھی رہی۔ اس کا وجود کرچی کرچی ہو گیا تھا۔ وہ اس طرح سے توڑ دی گئی تھی کہ جڑنے کا کوئی امکان نہیں بچا تھا۔

وہ برباد ہو گئی تھی۔ اس کا گوشہ گوشہ جکڑا گیا تھا۔ اس ویڈیو نے اس کے مجرم ہونے پر مہر ثبت کر دی تھی۔

مہر کو اپنا آپ خالی خالی سا لگا۔ اسے لگا جیسے اسے ان دیکھی زنجیروں نے جکڑ لیا تھا۔ اندھیری، سیاہ زنجیروں نے۔ جو شیطانی قوتیں اپنے اندر سمائے ہوئے تھیں۔

وہ قیدی بن چکی تھی۔ ایسی قید جس سے فرار ناممکن تھی۔

☆☆☆

پچھلی رات:

ملاقاتی کمرے میں لیڈی اقتدار اور درانی بیٹھے ہوئے تھے۔

لیڈی اقتدار اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی پر پہنی انگوٹھی کو اپنے بائیں ہاتھ سے گھما رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کا تاثر تھا۔

دوسری طرف درانی ہاتھ میں سگار پکڑے، کش بھر رہا تھا۔ اس نے سگار کا کونا اپنے لبوں سے لگایا۔ دھوئیں کا مرغولہ لبوں سے نکلا۔ میٹھی خوشبو فضا میں بکھری۔

”کیا مہر کی ماں کو رہا کر دینا چاہیے، درانی؟“

درانی نے سگار کا ایک اور کش بھرا اور دھواں باہر نکالا۔

”مجھے نہیں لگتا۔ یہ کچھ زیادہ ہی جلدی ہو گا۔“ درانی کا انداز لاپرواہ تھا۔

لیڈی اقتدار نے سر اوپر نیچے ہلایا۔

”پھر کب؟“لیڈی اقتدار بولی۔

”ہمیں اسے تب چھوڑنا چاہیے جب وہ جرائم کرنے کی اتنی عادی بن جائے کہ اپنے جرم چھپانے کے لیے کسی بھی حد تک جانے کے لیے تیار ہو جائے۔ یہاں تک کہ جرائم کرنا اس کے لیے ایک معمولی بات بن جائے۔ تب اس کی ماں کو آزاد کرنے کا بہترین وقت ہو گا۔“

لیڈی اقتدار غور سے درانی کی بات سنتی گئی۔ چہرے پہ شیطانی مسکراہٹ بکھری۔

”بہترین۔“ وہ معنی خیز سے انداز میں کہتے کھڑی ہوئی۔

شیطانی نظروں کا تبادلہ ہوا۔ درانی نے اپنائیت سے مسکرا کر سر کو خم دیا۔



باب دہم: ''تناسخ''

یہ دنیا تاریک ہے۔۔۔،

خود پرست ہے۔۔،

ظالم ہے۔۔!

یہ دنیا اگر۔۔۔

اگر روشنی کی ایک کرن میں بھی دیکھتی ہے۔۔۔

تو اسے تباہ کر دیتی ہے۔۔۔!

(ٹینگلڈ کی مدر گادل)



وہ فنا ہو جانا چاہتی تھی، اسی وقت، اسی گھڑی۔

تکلیف اس کے وجود کے گوشے گوشے پر سمائے ہوئی تھی۔

وہ کرب میں جھلس رہی تھی۔

وہ تکلیف سے بلک رہی تھی۔

ہر گزرتے لمحے وہ اسی چیز کی خواہش کر رہی تھی کہ۔۔۔

کاش وہ فنا ہو جاتی!

خود کو سیاہی میں جو رنگ چکی تھی، پارکنگ ایریا میں نڈھال بیٹھی تھی۔ ہوش و حواس زائل ہو چکے تھے۔

سب دھرے کا دھرا رہ چکا تھا۔

سارے خواب، تمام محبتوں کو اپنے ہاتھوں سے روند آئی تھی۔ جھولی خالی تھی۔ اس میں اور کسی فقیر میں کوئی فرق کہاں رہا تھا؟ وہ دربدر ہو چکی تھی۔ یہ دنیا اس کا ٹھکانا نہیں رہی تھی۔ اس کی دنیا اور سیاہی کی دنیا کے درمیان صرف ایک قدم کا فاصلہ نافذ تھا جو اس نے جانتے بوجھتے عبور کر لیا تھا۔

"اٹھو!" پیچھے سے اسے کسی نے پکارا۔

وہ اس آواز کو پہچاننے سے قاصر تھی۔ ٹھوکر ہی ایسی لگی تھی۔ شعور، سماعت، بصیرت سب کچھ تہس نہس ہو کر رہ گیا تھا۔

"مہر اٹھ جاؤ، پلیز۔"

مہر کو جھٹکا لگا۔ تو اب اسے وہم ہونے لگے تھے؟ وہ کہاں سے آسکتا تھا۔ وہ تو اسے چھوڑ چکا تھا۔

"اٹھو جلدی۔"

گردن موڑی۔ وہ اس کی پشت پر کھڑا، مضطرب سے عالم میں یہاں وہاں دیکھ رہا تھا۔ مہر کی طرف ہاتھ بڑھایا ہوا تھا۔ تو اب اسے سراب نظر آرہے تھے؟ وہ کیا عقل و شعور سے اس قدر بیگانہ ہو چکی تھی کہ جاگتی آنکھوں سے اس لاحاصل خواب کو دیکھ رہی تھی؟

"کیا کر رہی ہو؟ سب دیکھ رہے ہیں۔" وہ نرمی سے بولا۔

اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ لگتا تھا کہ اس کے ہاتھ سے ٹکراتے ہی وہ ہوا ہو جائے گا۔ مگر احمد نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اسے شاک لگا۔ تو وہ واقعتاً آچکا تھا؟ مگر اب کیا فائدہ۔ وہ دلدل میں پھنس تو چکی تھی۔ اس کا ٹھکانا جیل تھا۔

وہ حواس باختہ سے عالم میں احمد کو دیکھ رہی تھی۔ احمد کو ندامت نے گھیر لیا۔ کیا وہ کچھ زیادہ ہی بول گیا تھا؟

وہ کچھ نہ بولی۔ بیگ اٹھائے اور پارکنگ ایریا میں بے ہنگم چلنے لگی۔ احمد اس کی طرف لپکا۔

"کہاں جا رہی ہو۔" احمد اس کی رفتار کا مقابلہ کر رہا تھا۔

مہر نے اس پر شکوہ کناں نظر ڈالی۔ وہ کیوں اس کے پیچھے تھا جب وہ سب کچھ اپنے ہاتھوں سے ختم کر آیا تھا۔

"گرفتار کروانے خود کو۔ سب برباد ہو گیا ہے۔" مہر نے دھیمی سی بے تاثر آواز میں کہا۔

احمد نے گہری سانس لی۔

"کچھ برباد نہیں ہوا ہے اور تم کوئی گرفتاری نہیں دے رہی۔ کم سے کم، میرے ہوتے ہوئے نہیں۔" احمد ہاتھ باندھتے بولا۔

مہر تھم کر اسے دیکھتی رہ گئی۔ کیا تھا وہ مرد؟ کچھ دیر پہلے اسے مایوسی کی کھائی میں دھکیل کر اب یہ سب کہہ رہا تھا؟ آنکھوں میں شکایت نے زور پکڑا۔ احمد کی شرمندگی انتہاء کو پہنچی۔

"مجھے معاف کر دو۔ میں بس تھوڑا غصے میں تھا۔ مجھے وہ سب نہیں کہنا چاہیے تھا۔ تم میرے ساتھ گاڑی میں چلو، میں سب بتاتا ہوں۔" وہ کہہ کر کلٹس کی جناب چلا گیا۔

مہر کے کچھ پلے نہ پڑا۔ کیا اب بھی امید کی کرنیں موجود تھیں؟ اگر تھیں تو اسے نظر کیونکر نہ آ رہی تھیں؟ یا احمد وقتی طور پر دل بہلانے کے لیے یہ سب کہہ رہا تھا؟

احمد ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ وہ اس کے برابر میں۔

اس کا دل بھر آیا۔ چہرہ رندھ گیا اور کچھ دیر خاموشی میں سسکیاں لیتی گئی۔ احمد نے خاموش رہ کر اسے رونے دیا۔

"یہ سب کیا ہو گیا احمد۔ میں نے یہ کیا کر دیا؟"

احمد چہرے پر اپنائیت بھری مسکراہٹ لیے، اسے سنتا گیا۔

”میں نے خود کو ان کے حوالے کر دیا۔ اتنا سنگین جرم کرنے کے باوجود میں وہیں پر کھڑی ہوں۔ میری ماں ان کے پاس ہے۔“ اس نے گیلی سانسیں اندر کھینچی۔ سر ہاتھوں میں گرایا۔

”میں نے اپنی بیٹی تک کا نہ سوچا۔ میں اس کی زندگی خطرے میں ڈال رہی ہوں۔ میں برباد ہو گئی۔ میں ختم ہو گئی۔ مجھے جیل میں ہونا چاہیے۔

احمد اسے یوں ہی سنتا گیا۔ وہ جانتا تھا اس وقت اسے کسی دلاسے کی ضرورت نہ تھی، بس دل کا ہلکا ہو جانا درکار تھا۔

”مجھے تو یہ تک نہیں معلوم کہ میری ماں واپس آئے گی یا نہیں۔ اگر میں نے اتنے سال ان سے دوری نہ اختیار کی ہوتی تو آج کم سے کم یہ گلٹ نہ ہوتا کہ میں نے سالوں ان کا حق مارا۔ اگر انہیں کچھ ہو گیا تو میں خود کو کیسے معاف کروں گی؟“

مہر چپ ہو گئی۔ دل ہلکا ہو چکا تھا۔ آنسو تھم گئے۔ احمد کے چہرے پر اپنائیت بھری مسکراہٹ برقرار تھی۔

کچھ دیر گاڑی میں خاموشی کا بسیرا رہا۔ اگر مہر احمد کی مسکراہٹ دیکھ لیتی تو ترنت جان جاتی کہ وہ اس دفعہ بھی اس کی مشکلات کا حل ساتھ لایا تھا۔

”مجھے شروع سے معلوم تھا کہ تم کیا کرنے جا رہی تھی۔“ احمد نے خاموشی کو توڑا۔

اس نے سوالیہ نگاہوں سے احمد کو دیکھا۔

”تمہیں ایسا کیوں لگا کہ میں اس سب کے بارے میں کچھ کیوں نہیں سوچوں گا؟“ احمد کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

”میں سمجھ نہیں پائی؟“

”اگر میں چاہتا تو تمہیں روک سکتا تھا۔ مگر میں نے نہیں روکا۔ میں نے تمہیں یہ کام کرنے دیا۔ کیونکہ اسی میں بہتری تھی۔ میں اس سب کی تیاری کر چکا تھا۔ اور تمہیں کوئی نہیں پکڑے گا، بے فکر رہو۔ بلکہ تم تو مجرم بھی نہیں ہو مہر!“ احمد نرمی سے مسکرایا۔

مہر کی آنکھیں بے یقینی سے پھیلنے لگیں۔ وہ چونکی۔ کیا اس نے درست سنا تھا؟ وہ مجرم نہیں تھی؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟

”مگر کیسے؟“

احمد نے اپنا موبائل نکالا۔ اس نے موبائل پر ایک ویڈیو کھولی اور مہر کو دکھائی۔

مہر کے لب کھلے کے کھلے رہ گئے۔ اس نے بے یقینی سے احمد کو دیکھا جو مسکرا کر اسے کہہ رہا تھا: ”کاش پہلے ہی بھروسہ کر لیا ہوتا۔“

اس ویڈیو میں شمس تھا جو گاڑی میں شائلہ کے اغواء کی گفتگو کر رہا تھا۔ بینک کے سارے مناظر قید تھے۔ ناظم کا چہرہ واضح تھا۔

مہر کچھ لمحے سوچتی رہ گئی کہ یہ سب ممکن کیسے ہوا؟ رجوں ہی اسے کچھ یاد آیا۔ اس کا ہاتھ نیکلس تک پہنچا۔ خوشگوار حیرانی کا راج قائم ہوا۔ وہ اتنے عرصے میں احمد کے طور طریقوں کو تو جان گئی تھی۔

اس نے آنکھوں میں داد لیے احمد کو دیکھا۔

”تعریف کا شکریہ۔“ احمد نے لاپرواہی سے کہا۔ ”تم مجرم نہیں۔ بلکہ ایک رضاکار ہو، جس نے پولیس کی مدد کی ہے منی لانڈرنگ کے مافیہ کو بے نقاب کرنے میں۔“

”مگر یہ کیسے ممکن ہوا، احمد؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔“ وہ ناسمجھی سے بولی۔

احمد کی مسکراہٹ فنا ہوئی۔ چہرے پہ کرختگی اور سختی در آئی۔ اس نے اگنیشن میں چابی گھسائی اور گاڑی اسٹار ٹکی۔ گاڑی کا اے سی چل پڑا۔ ماحول پر اسرار ہو گیا تھا۔

”پھر آج تمہاری ساری الجھنیں دور کر دیتا ہوں۔ تم جاننا چاہتی تھی میں تمہارے دشمنوں کو کیسے جانتا ہوں؟“

مہر کے چہرے کا تناؤ ڈھیلا ہوا۔ اس نے سر اثبات میں ہلایا۔

”پھر آج میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تمہارے دشمنوں نے احمد یوسف کے ساتھ کیا کیا تھا۔“ اس کے انداز میں شکایت تھی، لہجہ شعلہ باز تھا۔ اس کے چہرے پہ کہیں نہ کہیں گہرا کرب جھلکتا تھا۔ وہ آنکھوں میں تپش لیے مہر کو دیکھنے لگا۔

اس نے سب کچھ مہر کو بتانا شروع کیا۔

☆☆☆

تین سال پہلے:

فیروز کی گمشدگی کو ایک ماہ ہونے والا تھا۔ وہ لوگ اپنی زندگیوں میں آگے بڑھنے لگے تھے۔ ان سوالات کے ساتھ جینا، کہ ان کا پیارا محبوب بھائی کدھر ہے، زندہ بھی ہے کہ نہیں، زندہ ہے تو کس حال میں؟ اور اگر مردہ ہے تو اس کی لاش کہاں ہے؟

عدم یقینی کے ساتھ جینا نہایت مشکل تھا۔ لیکن وہ جی رہے تھے۔ وقت گزار رہے تھے۔ البتہ، انہوں نے فیروز کی تلاش اب تک چھوڑی نہیں تھی۔

دوپہر کا وقت تھا۔ درفشاں گھر کے لاؤنج میں خاندان کی کچھ عمر رسیدہ عورتوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ دونوں عورتیں اس کی خالہ تھیں، ایک ممتاز اور دوسری سمینا۔

میز پر چائے کے خالی کپ رکھے ہوئے تھے۔ نمکو کی پلیٹ میں سے آدھی سے زیادہ نمکو چٹ کری جا چکی تھی اور باقی بس، تکلفانہ ہی چھوڑ دی گئی تھی۔

درفشاں کافی غیر آرام دہ سی نظر آ رہی تھی۔

"ویسے۔" ممتاز خالہ نے ہاتھوں میں نمکو بھری۔ "پولیس کو کمپلین کی تم لوگوں نے؟" نمکو منہ میں ڈال کے وہ اب دانتوں سے کتر رہی تھیں۔ خستہ نمکو کے ٹوٹنے کی آواز ان کے منہ کی سمت سے نکلی۔

درفشاں نے محض سر اثبات میں ہلایا، بولی کچھ نہیں۔

"ہائے بیچارا۔ نہ جانے کہاں ہو گا۔ یہ سارے جو ہوتے ہیں نا، وہ ہوتے ہیں۔۔" سمینا خالہ جیسے ایک لفظ یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ "کیا کہتے ہیں انہیں؟ ہاں اسکیم۔ یہ سب اسکیم وغیرہ ہوتے ہیں۔"

درفشاں بس یوں ہی سنتی گئی۔ وہ پچھلے مہینوں سے گھسی پٹی باتیں سن سن کے بیزار آچکی تھی۔ یہ روز کا معمول بن چکا تھا، ہر کوئی آتا تھا، اس سے تفصیل پوچھتا تھا۔ تفصیل کے بات مشورے دیتا تھا، مشورے دینے کے بعد افسوس کا اظہار کرتا تھا۔

''چلو بس اب اللہ بہتر کرے۔ ہماری تو دعا ہے کہ جلد فیروز واپس آجائے۔ بڑا ہی پیارہ بچہ تھا۔ ملنسار اور خوش اخلاق۔'' ممتاز خالہ چہرے پہ اداسی لیے بولیں۔

درفشاں کی کوفت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

''اب نہ جانے کیا ہوگا تم دونوں کا۔ ماں باپ پہلے نہیں۔ اور ایک بھائی جو گھر کا معاشی نظام چلاتا تھا وہ بھی چلا گیا۔ بس اب اللہ ہی بھلا کرے۔'' سمینا خالہ نے مٹھی بھر کر نمکو اٹھائی اور منہ میں ڈالی۔

''ہاں مگر کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو بے جھجک پوچھ لینا۔ ہم ہمیشہ تمہارے ساتھ ہیں۔''

اس بات پہ درفشاں کے چہرے پر کڑوی مسکراہٹ بکھری۔ وہ جانتی تھی کہ درحقیقت کوئی ان کے ساتھ نہ تھا۔ ان کے والدین کے انتقال کے وقت بھی سب رشتہ داروں نے یہی سب باتیں کی تھیں۔ مگر مدد کے لیے جب بھی کسی کو پکارا، کوئی نہ کوئی بہانا پکڑا یا گیا۔ وہ ہمیشہ سے اکیلے تھے اور آئندہ بھی اکیلے رہنے والے تھے۔ یہی حقیقت تھی، تلخ تھی، لیکن حقیقت تھی۔

''ویسے درفشاں میرا مشورہ ہے کہ یہ گھر بیچ کر کسی چھوٹے گھر میں چلے جاؤ۔ اب پانچ کمرے ہیں ' احمد اور تم نے بھلا کیا کرنا اتنے بڑے گھر کا؟'' ممتاز خالہ نے مشورہ دیا۔

درفشاں نے بیزاری سے آنکھیں میچ لیں۔ لوگ اتنا ظالم کیسے ہو سکتے تھے؟ یہ گھر ان کے ماں باپ نے کتنی محبت سے بنایا تھا۔ درفشاں کو سوچ سوچ کے گھٹن محسوس ہونے لگی۔

”نہیں۔ اللہ کا شکر ہے، ابھی اتنے برے وقت نہیں آئے۔ ہم ٹھیک ہیں۔“ درے نے لہجہ عام سا بنایا۔

”بھئی میں تو ایسے ہی کہہ رہی تھی۔ نہ جانے آگے کیا ہونا ہو۔ وقت کا کچھ پتا ہے بھلا؟“ اب درفشاں کا سر پھٹنے لگے تھا، وہ اپنے آپ کو کچھ کڑوا بولنے سے روک رہی تھی۔

کچھ دیر معمول کی باتوں کے بعد اس کی خالہ چلی گئیں۔

ان دونوں کے جاتے ہیں اس نے کلینک کی انتظامیہ کو کال ملادی، وہ بس اب کل سے ہی دوبارہ جوائننگ دینے لگی تھی۔ وہ گھر بیٹھ کر، روز بروز کا زہریلا ماحول برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

رات کا وقت تھا جب احمد گھر واپس آیا۔ اس کے چہرے پہ شدید تھکان واضح تھی، کندھے تھکان کے باعث بھاری محسوس ہو رہے تھے۔ درفشاں نے اس کے آتے ہی کھانا میز پر لگایا۔ دونوں نے کھانا شروع کیا۔ فیروز بھائی کے بغیر کھانے کی عادت بھی دونوں کو آہستہ آہستہ ہونے لگی تھی۔

عادتیں ٹوٹ جاتی ہیں، بس ٹوٹتے وقت گہرا زخم دے جاتی ہیں۔

”پولیس کو کچھ پتا چلا؟“

ایک مہینے سے وہ روز اس وقت یہی سوال پوچھتی۔ احمد اسے ایک ہی جواب دیتا۔ وہ اپنا سر نفی میں ہلاتا۔

وہ مایوس ہو جاتی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ آنکھ بند کرے اور جب کھولے تو اس کے فیروز بھائی اس کے سامنے بیٹھے ہوں۔ اسے مسکرا کے دیکھ رہے ہوتے۔ مگر پلک جھپکانے سے ایسے معجزے کہاں ہوتے ہیں؟

"وہ کسی مجبوری کے تحت استنبول گئے ہوں گے، مجھے یقین ہے وہ خود بات کر لیں گے۔ مجھے یقین ہے۔" درے نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ وہ بس اپنی دم توڑتی امیدوں کو ہوا دینے کے لیے بہانے تلاش کر رہی تھی۔

امیدیں ہی تھیں جن کے سہارے وہ زندگی بسر کر رہی تھی۔

احمد کے ماتھے پر بل پڑے۔

"ایئرپورٹس کے ڈیٹا کے مطابق وہ استنبول نہیں گئے، آپا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ اگر وہ پاکستان میں ہیں تو کدھر ہیں؟"

درے کا دماغ مزید الجھ گیا۔

بھائی کے جانے سے سب کچھ کتنا مشکل ہو گیا تھا۔ سب کچھ کتنا خالی ہو گیا تھا۔ اسے خالی پن ہر جگہ محسوس ہوتا تھا۔

"کسی انہونی نے فیروز بھائی کو جکڑ لیا ہو گا، احمد۔ مگر مجھے امید ہے وہ ایک دن ضرور ملیں گے۔ ہمیں ہمارا بھائی ضرور ملے گا۔" درفشاں آواز میں آس لیے بولی تھی۔ وہ اس بات کا اقرار نہیں کر پا رہی تھی کہ وہ بھی اندر سے مایوس تھی۔

کھانے سے فارغ ہو کر وہ کمرے میں آیا اور رات گئے لیپ ٹاپ میں لگا رہا۔ وہ فری لانسنگ کر کے خرچ اٹھاتا تھا۔

کام ختم کر وہ بستر پر لیٹ گیا۔ وہ لیٹ کر موبائل استعمال کر رہا تھا۔ دفعتاً انسٹا پر ایک پوسٹ نے اس کی توجہ مرتکب کی۔ اسٹار ترکی آرگنائیزیشن(Star turkey organization)

"یہ دیکھو، سیٹل ان ترکی نام کا یہ پیج ہے۔ ان کا آفس بھی ہے، میں پوری تسلی کر چکا ہوں۔ بے فکر رہو۔"

احمد کے دماغ میں فیروز کا فقرہ گردش کرنے لگا جو ڈیڑھ مہینے پہلے اس نے اس سے کہا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ آنکھوں میں شک کی آمیزش ہوئی۔

احمد نے پیج کو فالو کیا اور تفصیلی جائزہ لیا۔ وہ تین ماہ پرانا تھا۔ کافی تسلسل سے پوسٹنگ کی جاتی تھی۔ تمام پوسٹ پیشہ ورانہ طرز پر بنی تھیں۔ دیکھنے پر یہی گمان ہوتا تھا کہ کوئی معیاری ادارہ ہے۔

احمد کے شک میں اضافہ ہوا۔ اسے بارہا وہی پیج یاد آیا جو فیروز بھائی نے دکھایا تھا۔

فیروز کے لاپتہ ہونے کے بعد وہ پیج غائب ہو گیا تھا۔ کیا یہ کوئی اشارہ تھا؟ کیا اسے تفتیش کرنی چاہیے تھی؟ وہ حتمی فیصلہ لے نہ سکا۔

احمد نے فی الحال موبائل پرے رکھ دیا۔ اب اس کے قرآن دہرانے کا وقت تھا۔



آنے والے دن اس گھر کے ٹوٹے ہوئے مکینوں کے لیے مصروف گزرے۔ احمد نے پولیس سٹیشن کی چکر لگانا چھوڑ دیے۔ وہ جان گیا تھا کہ پولیس بھائی کی گمشدگی کو لے کر سنجیدہ نہیں۔

دن کے کسی وقت، اس کی نظروں کے سامنے سٹارترکی آرگنائزیشن کی نئی پوسٹ گزری۔

پوسٹ میں ترکی جاکر جاب اور پڑھائی کرنے کے نہ جانے کون کون سے جھوٹے سچے فوائد گنوائے گئے تھے۔ کوئی بھی کچی عمر کا نا سمجھ نوجوان یہی سمجھتا، کہ ترکی جاکر اس کی زندگی کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ یہ پیج پہلے سے زیادہ ٹھٹکا۔

دو امکانات تھے، یا تو یہ کوئی بڑا اسکیم تھا۔ یا محض مارکیٹنگ کے لیے مبالغہ آرائی کی جارہی تھی۔ بہرحال، اس نے میسج بھیجنے کا ارادہ کیا۔

"کیا آپ لوگ مجھے مزید تفصیلات دے سکتے ہیں؟" احمد نے پیغام بھیج کے موبائل بند کر دیا۔

دل میں عجب سا احساس رونما تھا۔ کہیں کہیں اسے یقین تھا کہ اس کا پیج کا فیروز کی گمشدگی سے تعلق ہے۔

یہ وہ دلدل تھا، جس میں احمد یوسف نے پہلا قدم رکھا تھا۔ سالوں گزر گئے تھے۔ وہ آج تک خود کو اس دلدل سے نہ نکال سکا۔

☆☆☆

رات کا وقت تھا، معمول کے مطابق احمد پروگرامنگ کرنے میں مصروف تھا۔ لیپ ٹاپ پر اس کا ہاتھ تیزی سے کوڈز ٹائپ کر رہا تھا۔ وہ کچھ دیر ٹھہرتا، کچھ سوچتا، اور پھر سے ٹائپنگ شروع کرتا۔ یکبارگی موبائل تھرتھرایا، سکرین جگمگائی۔ احمد نے ٹائپنگ کرتے ہوئے سرسری سی نگاہ موبائل پر ڈالی۔

اسٹارٹر کی نے میسج کا جواب دے دیا تھا۔ احمد کا ٹائپنگ کرتا ہاتھ تھما۔ اس نے سب کام چھوڑ کر اپنا موبائل اٹھایا۔

"آپ کہاں جانے میں انٹرسٹڈ ہیں۔"

وہ میسج پڑھ کے کچھ سوچ میں پڑ گیا۔

"استنبول۔ آپ لوگ مجھے تفصیلات دے سکتے ہیں؟" احمد نے ٹائپ کیا۔

"آپ کس شہر سے ہیں؟"

"اسلام آباد۔"

"ٹھیک ہے پھر آپ ہمارے آفس آجائیں۔ ہمارے ادارے کے کونسلر آپ کو ہدایات فراہم کر دیں گے اور تمام اہم تفصیلات سے آگاہ کر دیں گے۔ آپ اپنا واٹس ایپ نمبر بھی دیں تاکہ ہم آپ کو لوکیشن بھیج سکیں۔"

احمد گہری سوچ میں پڑ گیا۔ کیا اس سب کا کچھ حاصل بھی تھا؟ کیا وہ کسی طرح سے فیروز تک رسائی حاصل کر سکتا تھا؟ احمد نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک دفعہ تو ان کے آفس کا چکر ضرور لگائے گا۔

”ٹھیک ہے۔“ احمد نے اپنا نمبر دے دیا۔ کچھ دیر میں اسے واٹس ایپ پر لوکیشن موصول ہو گئی۔ آفس راولپنڈی کے ایک کمرشل علاقے واقع میں تھا اور گھر سے تھوڑا دور تھا۔ دوری اب احمد کے لیے بے معنی تھی، وہ فیصلہ کر چکا تھا۔ اب کوئی بھی شے اس فیصلے کو بدل نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

دوپہر کے کٹھور دھوپ باشندوں پر وار کر رہی تھی۔ احمد گلیوں میں بھٹکتا اور تپتا ہوا بالآخر سٹارترکی پہنچ گیا۔

سٹارترکی کے آفس کی ٹھنڈی فضا میں اسے کچھ راحت ملی۔ پر سکون سانسیں لیتے وہ ریسیپشن کی جانب بڑھا۔ ایک مرد فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔

احمد کو دیکھتے ہی ریسیپشنسٹ نے فون پٹخا اور مسکرا کر اس کا استقبال کیا۔ احمد نظریں گھماتے آس پاس کا تفصیلی جائزہ لے رہا تھا۔

”جی سر، میرا نام جلیل ہے۔ میں آپ کی کیسے مدد کر سکتا ہوں؟“ جلیل نامی ریسیپشنسٹ نرمی سے بولا۔

احمد نے سر اوپر نیچے ہلایا۔

”میں نے کچھ تفصیلات لینی تھی۔ میں ترکی جانا چاہتا ہوں، جاب کے سلسلے میں۔“ احمد کا انداز سرسری تھا۔

''جی سر، ممکن ہے۔ اندر حسان صاحب ہیں جو کہ سارے انتظامات کرواتے ہیں۔ آپ دس منٹ میں ان سے مل لیں۔'' جلیل دراز سے کچھ نکالنے لگا۔ ''تب تک آپ یہ فارم بھر دیں۔''

دفعتاً دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ احمد نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ جلیل نے اندر آنے والے شخص کو دیکھ کر سر خم دیا۔ نامعلوم شخص احمد کے برابر میں کھڑا ہوا۔ اس کے پاس سے مردانہ پرفیوم کی تیز مہک آتی تھی۔ احمد اور اس اجنبی کی نظروں کا ملاپ اب تک نہ ہوا۔

''جی سر، آپ اپنا نام بتائیں؟'' جلیل نے فارم اور قلم احمد کی طرف بڑھاتے کہا۔

''احمد۔ احمد یوسف۔''

جلیل نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے لیکن بول نہ سکا۔ احمد کے برابر میں کھڑا مرد فارم کی طرف جھپٹا۔ اس نے جارحانہ انداز میں فارم چھین لیا تھا۔ احمد نے عجیب سی نگاہ اس شخص پر ڈالی جس کے غصیلے چہرے پر سوالات کا پنڈار تھا۔

''شمس، سب ٹھیک تو ہے؟'' جلیل بوکھلا گیا تھا۔

شمس نے گردن موڑ کے احمد کو دیکھا جو کہ پرسکون سی سرد نگاہیں لیے اسے گھور رہا تھا۔

شمس کی سانسیں بے ترتیب ہوئیں۔ وہ تیزی سے احمد کی طرف لپکا۔ اس کا کندھا دبوچ کر اسے دیوار سے لگایا۔ جلیل بالکل الجھ گیا۔ احمد کے لیے یہ حملہ غیر متوقع تھا۔ اس نے غصیلی نگاہوں سے شمس کو دیکھا۔

"دروازہ بند کرو جلیل!" شمس نے اونچی آواز میں کہا۔ جلیل نے پہلی فرصت میں دروازے پر کنڈی لگائی۔ آفس کی سرد فضا میں تناؤ پھیل گیا تھا۔

شمس کی غصیلی نگاہیں احمد پہ مرکوز تھیں۔ وہ سانسیں پھلا کے اسے خوفزدہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر بے یقینی کے بل تھے۔

احمد نے اپنی آنکھوں میں تپش برقرار رکھی۔ وہ کہیں سے مرعوب نہیں لگتا تھا۔

"ہاتھ نیچے!" احمد کی آواز مدھم تھی مگر انداز رعب دار تھا۔ شمس کو کچھ ٹھٹکنے لگا۔ سامنے کھڑے شخص میں ڈر کا کوئی عنصر موجود نہ تھا۔ شمس نے مزید سانسیں پھلائیں۔ ایسا کرتے ہوئے وہ وحشی درندے کی مانند دکھائی دیتا تھا۔

"آج کے بعد مجھے یہاں نظر نہیں آؤ گے تم۔ سمجھے؟" شمس نے چبا چبا کے ہر ایک لفظ ادا کیا۔

احمد کے دماغ میں سوال در سوال آنے لگے۔ وہ شخص اس کے لیے اجنبی تھا، پھر وہ اسے کیسے جانتا تھا؟

"ورنہ کیا؟" احمد بھی ڈرا نہیں تھا۔

شمس کی آنکھوں میں حیرانی پھیلی۔

شمس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک پستول نکالی۔ احمد بالکل ساکن ہو گیا۔ آنکھوں کی تپش فنا ہوئی۔ سانسیں حلق میں اٹک گئیں۔ شمس نے آہستگی سے پستول کی نال احمد کی کنپٹی پہ رکھی۔ احمد کے ماتھے پہ ٹھنڈے پسینے ابھرے۔

"ورنہ گولی تمہارے بھیجے میں اتار دوں گا!" شمس نے چبا چبا کر کہا اور احمد کے کندھے پر سے گرفت ڈھیلی کر کے اسے چھوڑ دیا۔

احمد گہری سانسیں لیتا دور ہٹا۔

"دفع ہو جاؤ اب۔ نظر نہیں آنا مجھے۔" احمد بھاگنے لگا۔ شمس پیچھے سے دھاڑا۔

احمد باہر آیا تو وہ تلملایا ہوا تھا۔ آخر کوئی اس کے ساتھ یہ سب کیسے کر سکتا تھا؟ یہ سوچ کے وہ آگ بگولا ہوئے جا رہا تھا۔

اسے ایک لینڈ کروزر نظر آئی۔ احمد نے لینڈ کروزر پر زور سے لات کھینچ کر ماری اور آگے بڑھ گیا۔ غصے میں اس کے اعصاب تن گئے تھے۔ احمد نے ایک دکان سے پانی کی بوتل خریدی اور روڈ کی پیومنٹ پر بیٹھ کر پانی اپنے حلق میں اتارا۔ جس طرح غصہ اس کے دماغ سے سرکنے لگا' دماغ نے کام کرنا شروع کیا۔ وہ پیش آنے والے واقعے پر گہری نظر ڈال رہا تھا۔

تو اب یہ ثابت ہو چکا تھا کہ اس جگہ پہ کچھ نا کچھ غلط ضرور ہو رہا تھا۔ مگر اس کے ساتھ احمد کے دماغ میں اور بھی کئی سوالات تھے۔

کیا ان کا فیروز سے کوئی تعلق تھا؟ اور یہ بھلا اسے کیسے جانتے تھے؟ اسے کچھ نہ کچھ کر کے ان سوالات کا جواب ڈھونڈنا تھا، مگر کیسے؟ وہ مضطرب ہوا۔

ٹھیک اسی وقت احمد کی جیب میں پڑا موبائل تھرتھرایا۔ احمد نے موبائل کھولا۔ اس کے پاس ای میل آئی تھی اس کمپنی سے جس میں کچھ دنوں پہلے اس نے انٹرویو دیا تھا۔ احمد نے پر سکون سانس خارج

کی۔ اسے مسلسل آمدنی درکار تھی۔ پہلے اس کے اوپر صرف اپنے خرچے تھے مگر اب اس کے اوپر در فشاں کی بھی ذمہ داری تھی۔

صرف یہی وجہ نہ تھی۔ بلکہ اس کا نیا آفس اسی سڑک پر واقع تھا۔ وہ یہاں سے سٹار ترکی کی سرگرمیوں پر نظر رکھ سکتا تھا۔

☆☆☆

احمد کو نئے آفس میں ایک ہفتہ بیت چکا تھا۔ آفس ایک عمارت کی چوتھی منزل میں واقع تھا۔ وہ اونچائی سے اکثر سٹار ترکی کے نظارے تکتا۔ شمس وہاں اپنی لینڈ کروزر میں آتا جاتا رہتا تھا۔ دل میں ہر وقت ہلچل سی مچی رہتی تھیں، اور دماغ کچھ کرنے کی خواہش ظاہر کرتا تھا۔ ایک دن، تنگ آکر اس نے کچھ خطرناک کرنے کا فیصلہ کیا۔

شمس کی گاڑی سٹار ترکی کے عین سامنے کھڑی تھی۔ احمد نے بریک کا فائدہ اٹھاتے واردات انجام دینے کا ارادہ کیا۔ وہ ہاتھ میں فائلز تھامے گاڑی تک پہنچا۔ لینڈ کروزر کی پشت پر کھڑا ہوا، اور گرد و نواح کا جائزہ لیا۔ یکبارگی اس نے تمام فائلز سڑک پر گرا دیں۔ احمد کا دل زور و شور سے دھڑکا۔ البتہ چہرے کو اس نے پرسکون ظاہر کیا۔

وہ فائلز جمع کرنے لگا۔ معاً جیب میں ہاتھ گیا، اور مٹھی میں ایک گول آلہ دبوچا۔ ماحول کا معائنہ کرتے، اور سب کی بے خبری کی تصدیق کیے اس نے اس آلے کی پشت سے ٹیپ نکالا۔ ڈیوائس کی سطح پر چپکم تھی۔ احمد نے ایک سانس اندر لی، اور ایک سانس باہر نکالی۔ تیزی سے آلہ گاڑی کی نچلی سطح پر چپکا دیا۔

وہ ہڑبڑا کر کھڑا ہوا۔ فٹافٹ فائلز سمیٹیں۔ کپڑوں سے دھول جھاڑی، پسینہ پونچھا اور آفس میں چلا گیا۔

یہ کوئی معمولی آلہ نہ تھا، مگر جی پی ایس ٹریکر تھا۔ وہ اپنی تفتیش کو اگلے مرحلے میں لے جانا چاہتا تھا۔

☆☆☆

اس دن کے بعد سے روز کا کچھ یوں معمول بن گیا تھا۔ احمد روز صبح کام پر جاتا، لوٹ کر شمس کی ہر حرکت کا جائزہ لیتا۔

پچھلے ایک ہفتے میں وہ ایک دفعہ ایئرپورٹ جا کر واپس آیا۔ ایک دن چھوڑ کر دوسرے دن وہ عافیتِ زندگی کا دورہ کرتا۔ اور بیچ میں وہ سٹارتر کی بھی پہنچا۔ پزل کے پیسز بکھرتے جا رہے تھے۔ اس کا عافیتِ زندگی میں کیا کام؟ اور بیچ میں ایئرپورٹ کہاں سے آ گیا؟

اتوار کے دن احمد کی چھٹی تھی۔ اس نے میدان میں اترنے کا فیصلہ کیا اور اپنی گاڑی پر شمس کا تعاقب کیا۔ شمس ایئرپورٹ کے راستے پر گامزن تھا۔ وہ اتنا تو سمجھ گیا تھا کہ ایئرپورٹ میں وہ کسی کو چھوڑا کرتا تھا۔ مگر کسے۔ اس سے زیادہ ضروری سوال تھا، کیوں؟

ایئرپورٹ کے سامنے شمس نے اپنی لینڈ کروزر روکی۔ احمد نے شمس کی لینڈ کروزر سے کافی دور، درختوں کی اوٹ میں اپنی کلٹس پارک کی۔ وہ دوربین کی مدد سے شمس کی لینڈ کروزر کو دیکھ رہا تھا۔

لینڈ کروزر کے شیشے ٹنٹڈ تھے اس لیے احمد اندر کا منظر نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ گاڑی کے دروازے کھلے، ڈرائونگ سیٹ سے شمس نکلا اور پچھلی نشست سے ایک جوان سی لڑکی۔ اس لڑکی نے نیلی سلیو لیس شرٹ

پہنی ہوئی تھی۔ بالوں کو بینڈ کی مدد سے پیچھے کسا ہوا تھا۔ وہ ایک ماڈل تھی جو کے اس نے کسی بلبورڈ میں دیکھی تھی۔

شمس کا بھلا اس لڑکی کے ساتھ کیا تعلق؟ احمد نے سوچا۔

اس ماڈل کو شمس نے ایک سوٹ کیس دیا۔ شمس ہاتھ ہلا کر اس لڑکی کو کچھ کہنے لگے۔ ماڈل کے چہرے پر گھبراہٹ واضح تھی۔ وہ اتنی سہمی ہوئی کیوں تھی؟ دماغ میں کہیں نہ کہیں تصویر بننے لگی تھی۔

شمس ماڈل سے بات کرتے ہوئے کمینگی سے مسکرایا۔ یہ کمینی مسکراہٹ دیکھ کے تو احمد کا خون کھولنے لگا تھا۔ ماڈل بیگ ہاتھ میں تھامے ایئرپورٹ کے اندر چلی گئی۔ شمس پھر دوبارہ سے گاڑی میں سوار ہو گیا۔ احمد کے دماغ میں مزید سوال ابھرے۔

اس وقت احمد کو کچھ یاد آیا۔ دو سال پہلے اس نے ایک خبر پڑھی تھی جس میں ماڈل ٗایک امیر پالیٹیشن کے لیے منی لانڈرنگ کرتی پکڑی گئی تھی۔ احمد کو احساس ہوا کہ یہاں پر بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔

تصویر واضح ہوئی۔ دماغ میں ایک کے بعد ایک جھماکہ ہوا۔

کوئی منی لانڈرنگ کیوں کرتا ہے؟ تاکہ اپنے کالے پیسے پر پردہ رکھ سکے۔ یقینا شمس صرف ایک مہرہ تھا، اور اس کے پیچھے کچھ لوگ ضرور ہوں گے۔ یہ لوگ یقیناً طاقتور ہوں گے۔ تو کیا یہ لوگ فیروز کے مجرم ہو سکتے تھے؟

☆☆☆

احمد نے شمس کے اوپر دور سے نظر رکھنا جاری رکھی۔ وہ دن رات شمس کے بارے میں سوچا کرتا تھا۔ شمس اسے ایک دفعہ پھر سے ایئرپورٹ کے قریب نظر آیا تھا۔ عافیت زندگی جانا تو اس کا روز کو معمول تھا۔ مگر سب کچھ بکھرا ہوا تھا۔

اس کے علاوہ آفس کے کاموں نے احمد کو ضرورت سے زیادہ تھکا دیا تھا۔ اس سے پہلے وہ کافی مرتبہ انٹرنشپز کر چکا تھا مگر یوں مسلسل کام کرنے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ یوں ہی وہ آفس پالیٹکس سے بھی متعارف ہوا تھا۔ اس کے علاوہ احمد کو لگ رہا تھا جیسے اس کی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال نہیں ہو رہا۔ بس ایک گھسا پٹا فارمیٹ تھا جس پر سب کو کام کرنا تھا۔ فری لانسنگ کرتے وقت احمد کے پاس کام کرنے کی آزادی ہوتی تھی، وہ اس آزادی کو مس کر رہا تھا۔

رات کا وقت تھا۔ احمد گھر کے راستے پر گامزن تھا۔

وہ ایک ویران سڑک میں اپنی کلٹس بھگا رہا تھا۔ اسی وقت احمد کے کانوں میں کسی گاڑی کے سڑک پہ تیز دوڑنے کی آواز آئی۔ احمد کو کچھ سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں ملا، گاڑی زن سے بھاگتی اس کے سامنے موڑ کاٹ کر رک گئی۔

احمد نے بوکھلا کر بریک دبائی۔ کلٹس اس گاڑی سے ٹکراتے ہوئے بچی۔ احمد کو تپ چڑھنے لگی۔

یہ بھلا کون جاہل تھا؟ چہرے پہ غصے کے باعث تناؤ پھیل گیا تھا۔

وہ گاڑی سے اترنے لگا تھا۔ مگر پھر ٹھٹک گیا۔ وہ کوئی معمولی گاڑی نہ تھی، شمس کی لینڈ کروزر تھی۔

احمد کا چہرہ سفید پڑا۔

"یہ گولی تمہارے بھیجے میں اتاروں گا۔" اسے وہ دھمکی یاد آئی۔

احمد کا دماغ تیزی سے کام کرنے لگا۔ اس نے ڈیش بورڈ کھولا اور کچھ نکال کر اپنی جیب میں ڈالا۔

شمس اپنی لینڈ کروزر سے نکلا۔ اس کی موٹی ناک پر غصہ سوار تھا۔ وہ احمد کی کلٹس کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ احمد گاڑی سے اترا۔

شمس اس کی طرف جارحانہ انداز میں لپکا۔ اس کے پیٹ میں دو گھوسے مارے اور اس کو کندھوں سے دبوچتے دیوار سے لگایا۔ احمد درد سے کراہ کر رہ گیا لیکن اگلے لمحے اس نے اپنے چہرے کو بالکل پر سکون کر لیا۔

شمس نے اپنے کوٹ کی جیب سے وہی گول ڈیوائس نکالی جو احمد نے لگائی تھی۔ وہ ڈیوائس دیکھ کے احمد کے چہرے پہ نہ حیرت ابھری نہ بے یقینی۔ وہ بالکل پر سکون رہا۔

”یہ تم نے لگائی ہے نا؟“ شمس نے چبا چبا کر کہا۔ احمد نے لاپرواہی سے آبرو اچکائے۔

”نہیں۔ اور چھوڑو مجھے۔ زیادہ دماغ نہ خراب کرو۔“ احمد بدلحاظی سے بولا۔ اس کا کندھا دیوار سے کستی سے دبایا ہوا تھا جس کے باعث کندھے میں تکلیف ہو رہی تھی۔

”دیکھو! میرے ساتھ گیمز نہ کھیلو! میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں۔ اس سب سے خود ہی دور ہو جاؤ۔“ شمس کو احمد کا پر سکون سا انداز کھلنے لگا۔

”میں نے کہا نا، میں کوئی کھیل نہیں کھیل رہا۔ مجھے جانے دو۔“ احمد تنک کر بولا۔

”میں بتا رہا ہوں احمد! میں نے تمہاری ٹانگیں توڑ کر تمہیں معذور کر دینا ہے!“

قتل کی دھمکی بس معذور کرنے کی دھمکی بن گئی تھی۔ بہت ہی دلچسپ۔

”میں نے کہا مجھے چھوڑو!“

احمد کا ہاتھ اس کی جیب میں گیا۔ وہ شیشے کی سی بوتل میں قید تیز مہک والا پرفیوم تھا۔ احمد نے ہاتھ اوپر اٹھا کر شمس کی آنکھوں میں وہ پرفیوم چھڑکا۔ شمس کی آنکھوں میں جلن ہونے لگی تھی۔ وہ چلانے لگا تھا۔ اس نے احمد کے کندھے سے اپنا ہاتھ اٹھا کر آنکھوں کو مسلا۔ احمد نے موقعے کا فائدہ اٹھاتے شمس کے منہ پہ زور دار تھپڑ لگائے۔

شمس کے لیے یہ وار غیر متوقع تھا، وہ چلا کر زمین پہ گر گیا۔ احمد نے دانت پیستے ہوئے، زمین بوس شمس کو دو لاتیں ماریں۔

جو آگ سٹار ترکی کی ذلت نے لگائی ہوئی تھی وہ بجھ گئی۔

”میں تم لوگوں کا پیچھا اتنی آسانی سے نہیں چھوڑنے والا۔“ احمد کی سانسیں غصے کے باعث پھولنے لگی تھیں۔

شمس چلائے جا رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ اندھا ہو جائے گا۔

احمد اب ایک جست میں گاڑی میں بیٹھا۔ موڑ کاٹتے ہوئے گاڑی بھگا گیا۔

احمد یوسف کو ایک بات پر یقین آ چکا تھا۔ کہ یہ طاقتیں اس کے بھائی کی مجرم تھیں۔ اس لیے ہی تو وہ اس سے جان چھڑوانا چاہ رہی تھیں۔

☆☆☆

سورج اپنی پر تپش کرنوں سے عافیت زندگی کی بلند و بالا عمارت کے اوپر وار کر رہا تھا۔ عافیت زندگی کی عالی شان عمارت دن کے اس پہر چمک رہی تھی۔

ان اوقات میں عموماً گہما گہمی زیادہ ہوتی ہے لیکن آج گہما گہمی کافی کم تھی۔ نیلوفر ہسپتال کی نئی مینجر بنی تھی اور وہ اپنی جاب کو بھرپور طریقے سے نبھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ آفس میں بیٹھے، کچھ پیپرز دیکھ رہی تھی جب لیڈی اقتدار آئی۔ لیڈی اقتدار کے چہرے پہ برہمی تھی۔ وہ نیلوفر کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ نیلوفر نے ملکہ کے وجود میں کھلے اضطراب کو بھانپ لیا۔

اس نے سب کام چھوڑ کر جگ سے پانی نکالا اور گلاس لیڈی اقتدار کی طرف بڑھایا۔ لیڈی اقتدار پانی غٹا غٹ پی گئی۔

"اتنا پریشان نہ ہوں۔" نیلوفر آواز میں تشویش لیے بولی۔

لیڈی اقتدار نے تاثرات عام یک دم احساس ہوا کہ وہ اپنی پریشانی چہرے پر لے آئی تھی۔

"مجھے ڈر ہے کہ میں احمد کے پیچھے ایک قیمتی اثاثہ کھو بیٹھوں گی۔" لیڈی اقتدار نے اپنا انداز پر سکون رکھا۔

نیلوفر نے سوچتی آنکھوں سے لیڈی اقتدار کو دیکھا۔ اگلا فقرہ کہنے کے لیے' اس نے ہمت جمع کی۔

"مجھے لگتا ہے ہمیں کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر احمد کو ختم کر دینا چاہیے۔ آپ نے دیکھا اس نے شمس کا کیا حشر کیا۔ وہ دلیر ہے لیڈی۔ مجھے لگتا ہے وہ آگے اور بھی مسئلے کھڑے کرے گا۔"

”اس کو مارنا دغا کرنے کے برابر ہو گا۔ میں اپنے کاروبار کے ساتھ دغا نہیں کر سکتی۔ ہمیں احمد کا معاملہ کسی دوسرے طریقے سے حل کرنا ہو گا۔“لیڈی اقتدار نے سرد، مرعوب کر دینے والی نظر نیلوفر پر ڈالی۔

”مگر شاید یہ ہی ضروری ہو۔“نیلوفر نے کہا۔لیڈی اقتدار کی آنکھوں کی سرد مہری بڑھی۔

”تم سوچ لو نیلوفر۔ میں دغا کرنے پر اتری تو تم بھی بچنے نہیں والی۔“لیڈی اقتدار نے تحکمانہ انداز میں دھمکی دی۔

نیلوفر کے چہرے کا ہر زاویہ بگڑتا چلا گیا۔

”مگر شاید آگے جا کر ہمیں یہی کرنا۔۔“نیلوفر کہنے ہی لگی تھی کہ لیڈی اقتدار نے ہاتھ زور سے ٹیبل پر مارا۔

نیلوفر چونک گئی۔لیڈی اقتدار کی آنکھوں میں برہمی لوٹ آئی۔

”ہمیں نہیں۔ مجھے!“ وہ دانت پیستے بولی۔ ”تم یاد رکھو۔ یہ دھندا میرا ہے۔“ انگلی سے سینے پر دستک دی۔

”اس دھندے کو میں نے کھڑا کیا ہے۔ اور اگر اسے کوئی نقصان پہنچتا ہے تو وہ صرف اور صرف میرا ہے۔ تم اپنا مقام نہ بھولو، نیلوفر۔ تمہیں یہ عہدہ دیا گیا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں 'کہ تم ملکہ بن گئی ہو۔ تم اب بھی میرے اندر کام کرتی ہو۔ تم میرے ٹکروں پر پلتی ہو۔ میں چاہوں تو ایک لمحے میں تمہیں سڑک کی خاک چھاننے کے لیے چھوڑ دوں۔“

لیڈی اقتدار کی جہاں گردن اکڑنے لگی وہاں نیلوفر کے تاثرات تن گئے۔ چہرے پر کچھ بہت ناگوار سا تھا۔

”اس لیے اپنی جگہ، اپنا مقام یاد رکھو۔“ لیڈی اقتدار کہہ کر کھڑی ہوئی۔ ”سمجھی؟“

نیلوفر نے سخت تاثرات کے ساتھ سر اثبات میں ہلایا۔

تضحیک کے احساس پر اس کا چہرہ سُرخ ہوا۔ ایسا لگتا تھا وہ جلد ہی رو جائے گی۔

”دیکھیے گا۔ ایک دن آپ اس کے قتل کا حکم جاری ضرور کریں گی۔“ وہ دل ہی دل میں بولی۔ انا کو ٹھیس پہنچی تھی۔

☆☆☆

گیارہ دن بعد:

احمد کی چھٹی ہوگئی تھی۔ وہ بائیک پر سوار تھا۔ کک مارنے لگا تھا، کہ اس کی نظر سڑک پار نوجوان پر پڑی۔ وہ پیومنٹ پر بیٹھا تھا، گردن جھکی ہوئی تھی۔ اعصاب شل تھے جیسے۔ وہ بائیک چھوڑ کر اس اجنبی کی طرف لپکا۔

”بھائی سب ٹھیک تو ہے؟“ احمد نوجوان کے عقب میں کھڑا تھا۔

نوجوان نے احمد پر مایوس کن نظر ڈالی۔

”بھائی میں ادھر آیا تھا۔“ اس نے سٹارٹر کی طرف اشارہ کیا۔

”ابھی کوئی میرا والٹ لے کر چلا گیا۔ بائیک اسٹارٹ کی تو پیٹرول بھی نہیں ہے۔ فون بھی وہ لے گیا۔ اب میں کیا کروں۔“ نوجوان مرجھائے ہوئے انداز میں بولا۔

نوجوان کے چہرے پر دھول مٹی چپکی تھی۔ احمد سمجھ گیا تھا کہ وہ گھنٹوں سے یہاں بیٹھا تھا۔

احمد مدھم سا مسکرایا۔ اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اپنا والٹ نکالا۔

”نام کیا ہے؟“ والٹ سے چند نوٹ نکالے۔

”عثمان۔“ عثمان نامی نوجوان نے جواب دیا۔

احمد نے ہزار کے دو نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔ عثمان دم بخود سا نوٹوں کو دیکھتا رہ گیا۔ اس کے چہرے پر خوش گوار حیرانی پھیلی۔

”نہیں بھائی اتنے کی ضرورت نہیں۔ بس پیٹرول ڈل جائے اتنے ہی چلیں گے۔ اور میں واپس کر دوں گی۔“ عثمان کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ خوشی چھپائے نہیں چھپی۔

احمد زیرلب ہنس دیا۔

”نہیں نہیں۔ رکھ لو۔ کوئی بات نہیں۔ اور تھوڑا پیٹرول مجھ سے لے لو تاکہ پیٹرل پمپ تک بائیک چلی جائے۔“

عثمان کی آنکھیں مشکور ہوئیں۔

”بھائی، آپ کا بہت شکریہ۔“ عثمان نے پرخلوص سے انداز میں احمد کا شکریہ ادا کیا۔

”میرا نام احمد ہے۔ احمد یوسف۔ اور میں ادھر۔“ احمد نے اپنے آفس کی بلڈنگ کی طرف اشارہ کیا۔ ”کام کرتا ہوں۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو مجھ سے مل لینا۔“ احمد نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سر کو خم دیا۔

”احمد بھائی آپ کا بہت بہت شکریہ۔“

”ویسے کیا کرنے آئے تھے ادھر؟“ احمد نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

”باس، یہ ایجنسی ہے۔ پاکستان سے باہر سیٹل کروانے میں مدد کرے گی۔ کب سے ادھر ادھر بھٹک رہا ہوں۔ ایم بی اے کی ڈگری ضائع جا رہی ہے اور کام ملتا نہیں۔ یہ کہہ رہے ہیں کہ مجھے باہر کام مل جائے گا۔“ احمد نے سر اوپر نیچے ہلایا۔

کیا عثمان کو ادھر جانے سے روکنا چاہیے تھا؟

”چھان بین کر لی ویسے؟ کوئی فراڈ تو نہیں؟“ احمد نے تھوڑا متذبذب انداز میں پوچھا۔

اسے پہلی ملاقات میں کوئی مشورہ دینا غیر مناسب لگا۔

”نہیں بھائی۔ مجھے تو صحیح لگے۔ کیوں، آپ کو بھی باہر سیٹل ہونا ہے؟“ عثمان نے معصومیت سے پوچھا۔

احمد کو اس کی باتوں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ بائیس سال کا ہو گا۔

”نہیں نہیں۔ ویسے کہاں جا رہے ہو تم؟“ احمد نے پوچھا۔

"ترکی انشاءاللہ۔ یہ لوگ کہہ رہے استنبول بھیج دیں گے۔ میں نے جگہ جگہ پتا کیا، لیکن ان کے ریٹس کافی کم ہیں۔ میں افورڈ کر سکتا ہوں۔" عثمان نے کہا۔

"پھر کب جا رہے ہو؟" احمد کی دلچسپی میں اضافہ ہونے لگا۔

"دو ماہ بعد کا کہہ رہے ہیں۔" عثمان نے سرسری سا کہا۔ احمد نے سر اثبات میں ہلایا۔

"ٹھیک ہے۔ پھر ہوتی رہے گی ملاقات۔"

احمد نے اپنی بائیک سے تھوڑا سا پیٹرول نکالا اور عثمان کی بائیک میں ڈالا۔ ہاتھ ملا کر دونوں اپنی راہ چل دیے۔

☆☆☆

ایک ہفتے بعد۔۔۔

احمد کا بریک چل رہا تھا۔ وہ حسبِ معمول کھڑکی سے سٹار ترکی کا منظر تکنے لگا۔ اس کی نظر پیومنٹ پر بیٹھے عثمان پر پڑی۔ وہ آج بھی اداس اور پریشان لگ رہا تھا۔ بھوری آنکھوں میں تشویش سمائے اس نے عثمان کے پاس جانے کا ارادہ کیا۔

"عثمان؟ سب ٹھیک تو ہے۔" احمد بولا، عثمان اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ مسکرا کر احمد کو دیکھنے لگا۔

"کیا حال ہے احمد بھائی؟ بڑے دنوں بعد نظر آئے؟ نہیں، نہیں، سب ٹھیک ہے۔" عثمان نے وقفہ لیا، سوالیہ نگاہ احمد پر ڈالی۔ "ایک مشورہ چاہیے تھا ویسے۔" عثمان کے انداز میں جھجک نمایاں تھی۔

”ہاں ضرور۔“ احمد نے دلچسپی لیتے کہا۔

”میں گیا تھا ایجنسی والوں کے پاس۔ کہہ رہے ہیں، لیگل جانا ممکن نہیں۔“ عثمان بولا۔

احمد، جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ دماغ میں گھنٹی بجنے لگی۔ خون منجمد ہو گیا۔ آنکھیں پھیلنے لگیں۔ عثمان کا بس اتنا کہنا اس کے بہت سے سوالوں کا جواب دے گیا تھا۔

”یہ کہہ رہے تھے کہ اِل لیگل جانا بہتر ہے۔ اور پھر وہاں پر کام دلوادیں گے۔ لیکن پتا نہیں کیوں ’دل بے چین ہو رہا ہے۔“

احمد بس عثمان کو دیکھتا رہ گیا۔ وہ کچھ بول نہ سکا۔

”کاش کہ میں تم لوگوں کو بتا سکتا میں کتنا مجبور ہوں۔ مگر فکر نہ کرو میں تم دونوں کے ساتھ ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔ میں تم دونوں سے بہت محبت کرتا ہوں اور سب کچھ صرف تم دونوں کے لیے کر رہا ہوں۔ قسمت نے چاہا تو ہم جلد ملیں گے۔“ فیروز کا خط احمد کے دماغ میں لہرانے لگا۔

پزل کے ٹکرے یکے بعد دیگرے آپس میں جڑنے لگے تھے۔

دفعتاً احمد حال کے منظر سے منقطع ہونے لگا۔ عثمان اس کے سامنے سے غائب ہو گیا۔ اس کے پیچھے سے اس کے آفس کی عمارت فنا ہوئی۔ سڑک کی پیومنٹ قدموں تلے سرکی۔

وہ ایک مہینے پہلے کے منظر میں تھا۔ اس کے سامنے پولیس والا بیٹھا ہوا تھا جو کہ مشکوک نگاہیں اس پر گاڑے ہوئے تھا۔

”آپ کو کیا یقین ہے کہ وہ استنبول جانا چاہتے تھے؟“ پولیس والا شکی سے انداز میں بولا۔

”جی۔“ احمد نے کہا۔ پولیس والے نے برا سا منہ بنایا۔

”میں نے ایئرپورٹ کا ریکارڈ نکلوایا ہے۔ فیروز یوسف، آپ کے بھائی کی کوئی بھی سیٹ بک نہیں ہوئی۔ کہیں کی بھی۔ یعنی وہ استنبول نہیں گیا۔“

احمد کے لب کھلے کے کھلے رہ گئے۔ وہ دنگ تھا، اور گنگ بھی۔ زندگی کی پہلیوں میں ایک نئی پہیلی کا اضافہ ہوا۔

پولیس اسٹیشن کا منظر آنکھوں کے سامنے سے تحلیل ہوا۔

عثمان اسے متعجب نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

کیا فیروز بھی اِل لیگل طریقے سے استنبول گیا تھا؟

کیا اس کا زندہ ہونا ممکن تھا؟ احمد کے دماغ میں مزید سوالات ابھرے۔

”بھائی آپ ٹھیک تو ہیں نا۔“ عثمان کے کہتے ہی احمد نے جھٹکا لیا۔

خیالات کی دھند چھٹ گئی۔

”کیا مجھے جانا چاہیے؟“ عثمان نے سوال دہرایا۔

احمد اپنے آپ کو نارمل کر چکا تھا۔

”یہ غلطی کبھی مت کرنا۔ سمجھ رہے ہو؟“ احمد حتمی انداز میں بولا۔

وہ عثمان کو قطعاً اس کھائی میں چھلانگ لگانے نہیں دے سکتا تھا جس کھائی میں اس کے بھائی نے چھلانگ لگائی تھی۔ عثمان کے چہرے پر مایوسی در آئی۔

”مگر پھر میں کیسے جاؤں؟“ عثمان نے دل برداشتہ سے انداز میں کہا۔

”کچھ عرصے کہیں بھی کام کر کے سیونگز جمع کرو۔ جلدبازی کے چکر میں کچھ الٹا سیدھا نہیں کر بیٹھنا۔“ احمد ڈسٹرب ہو چکا تھا۔

عثمان دل سے مطمئن نہ ہوا۔ ایک بظاہر آسان راستہ تھا، جو ایجنسی والوں نے اسے دکھایا تھا، اور ایک وہ راستہ تھا جس کی تلقین احمد کر رہا تھا۔ وقت کا مارا لڑکا کس راستے کا انتخاب کرتا؟

”شکریہ۔ میں چلتا ہوں۔“ وہ بوجھل انداز میں بولا۔

احمد کا دل مزید بے چین ہو گیا۔

”آپ کا نمبر مل سکتا ہے بھائی؟“

احمد نے سر اثبات میں ہلایا اور اپنا نمبر اسے دے دیا۔

☆☆☆

ایک مہینے بعد:

صبح کا وقت تھا۔ احمد کے کمرے کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں، کھڑکیوں کے ذریعے ٹھنڈی ہوائیں کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔ وہ پینٹ شرٹ میں ملبوس آفس جانے کے لیے تیار تھا۔

فی الحال وہ عثمان سے فون پر بات کر رہا تھا۔ احمد کے ماتھے پہ نہ جانے کتنی شکنیں تھیں۔ وہ بے چین سا نظر آ رہا تھا۔

”میں نے کہا تھا کہ یہ غلطی مت کرنا۔“ وہ بے دلی سے بولا۔

”بھائی، گھر والوں کو بہت امیدیں ہیں مجھ سے۔ میں ان امیدوں پر پورا اترنا چاہتا ہوں۔ اپنے چھوٹے بھائی کو پڑھانا ہے۔ اسے بڑے ہو کر ڈاکٹر بننا ہے۔ اور اگر ہمارے یہی حالات رہے تو شاید وہ ایک جماعت بھی آگے نہ پڑھ سکے۔“

احمد کے چہرے پہ غمگین سا تاثر ابھرا۔ دل مزید بے چین ہوا۔ خواب پورے کرنے کا حق ہر انسان کو حاصل ہے۔

مگر عثمان جس راستے کو چن رہا تھا اس راستے میں فریب کی دھول، اور جھوٹ کے کانٹے بچھے تھے۔ وہ اسے کیسے روکتا؟

عثمان دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ لیکن اس نے اپنے خوابوں کو چنا۔

”اچھا۔“ احمد کو لگا کہ آگے کچھ کہنا بے فیض تھا۔ اس کے الفاظ ضائع ہو جانے تھے۔

”آپ کا شکریہ مجھے سننے کا بھائی۔ میرے اوپر پچھلے مہینے سے اتنا دباؤ تھا کہ اگر آپ مجھے نہ سنتے تو میں مر ہی جاتا۔“

احمد اداس سا مسکرا دیا۔ آج جب پہلی دفعہ احمد نے چاہا تھا کہ وہ اس کی سن لے، تب ہی اس نے اس کی نہ سنی۔

"میں کہہ رہا ہوں۔۔۔" اس نے وقفہ لیا۔ "یہ غلطی نہیں کرو۔" احمد کا دل بوجھل ہوا۔ وہ عثمان کا جواب جانتا تھا۔

"نہیں بھائی۔ بس ابھی نکل رہا ہوں۔ اب میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا۔ اللہ حافظ۔ امید ہے جب آپ سے دوبارہ ملاقات ہو گی تو میں اس وقت ایک بڑا انسان بن جاؤں گا۔" عثمان نے خوشدلی سے کہہ کر کال کاٹ دی۔

احمد اپنا بوجھل سا وجود لے کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔

عثمان کھائی میں چھلانگ لگا چکا تھا۔ واپسی ممکن نہ تھی۔



اگلہ دن شدید بے چینی کے عالم میں کٹا۔ عثمان کی فکر کسی آسیب کی طرح اس سے چمٹی رہی۔ وہ رات گئے موبائل میں لگا ہوا تھا جب اسے ایک انجان نمبر سے کال موصول ہوئی۔ اس نے کال اٹھائی اور فون کانوں سے لگایا۔

"احمد بھائی! میں ہوں۔ عثمان۔" عثمان کی ہلکان آواز فون کے اس پار سے گونجی۔ اس کی آواز میں خوف تھا۔

احمد کا دل تیزی سے دھڑکا۔ اس نے بات جاری رکھنے سے پہلے کال ریکارڈر کھولا اور فون کان سے لگایا۔ کہیں نہ کہیں وہ انہونی کی آمد کو بھانپ چکا تھا۔

"ہیلو۔ سب ٹھیک تو ہے؟"

جوں ہی زور دار آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ دل جھنجوڑ دیا گیا تھا اور سر پر دہشت سوار ہوئی۔ وہ جانتا تھا یہ آواز گولی چلنے کی تھی۔

''ہیلو، ہیلو؟'' احمد اٹھ کھڑا ہوا۔ ہر سو ہر دم انتشار پھیلا۔

''بھائی میں پھنس گیا ہوں۔''

کرب، رنج، پچھتاوا، زندگی چھن جانے کا خوف، لاچارگی، وحشت۔ کیا کچھ نہ تھا اس کی آواز میں؟

''کیا ہوا سب ٹھیک ہے؟'' وہ گھبراہٹ کے عالم میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔

''گھر کال کرنے کی کوشش کی کوئی کال نہیں اٹھا رہا۔ یہ موبائل مجھے ادھر ملا تھا۔ میرے ذہن میں اس وقت صرف آپ کا نمبر آیا۔ مجھے نہیں پتا میں کہاں ہوں۔'' عثمان رو رہا تھا۔

دل کو چیر دینے والی آواز پھر گونجی۔ احمد کے قدم ڈگمگائے۔

فون کے اس پار، عثمان ایک پتھر کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ کان سے فون لگائے۔ آنکھوں میں خوف لیے۔ پسینے سے تر چہرے پر دھول مٹی کے ذرات چپکے تھے۔ بال گرد آلود تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی صحرا میں ہو۔ اس کے سامنے خون آلود لاش تھی۔

''بات کیا ہے؟'' احمد نے اپنے آپ کو پر سکون کرنے کی کوشش کی۔

''مجھے نہیں آنا چاہیے تھا۔ یہ لوگ دھوکے باز نکلے۔ ہمیں بیچ میں چھوڑ کر چلے گئے۔ یہاں پر ہر کسی کو مار دیا جا رہا ہے۔ سب ہلاک ہو گئے ہیں۔ ہم کچھ ہی بچے تھے اور اب مجھے لگ رہا ہے صرف میں ہی بچ گیا

ہوں۔ مجھے نہیں پتا میں زندہ بچوں گا بھی یا نہیں۔" وہ سسکیاں لے رہا تھا۔ بائیس سالہ عثمان نے اتنی سی عمر میں ہی کیا کچھ دیکھ لیا تھا۔ ایک باریک لکیر پر اس کی زندگی کرتب کھیل رہی تھی۔

"پرسکون ہو جاؤ۔" ایک اور گولی کی آواز احمد کے کان میں گونجی۔ اس نے بے اختیار اپنی آنکھیں میچ لیں۔

"بھائی میں نے جلد بازی کر کے سب برباد کر دیا۔ میرے گھر والوں کا اب کیا ہو گا۔ مجھے یقین ہے مجھے مار دیا جائے گا۔ ہم سب کو مار دیا جائے گا۔ زندگی کی مہلت ختم ہو رہی ہے بھائی۔ سب برباد ہو رہا ہے۔"

احمد کے ہاتھ کپکپانے لگے۔ بڑھتے تناؤ کے باوجود وہ اعصاب پر قابو پانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

"بھائی کیا میں آپ سے ایک بات کہہ سکتا ہوں؟"

"ہاں بولو۔" احمد نے کہا۔

"مجھے نہیں پتا میں آپ سے یہ کیوں کہہ رہا ہوں۔ مگر کیا آپ میرے گھر والوں کا خیال رکھ سکتے ہیں؟"

احمد کا دل مزید ڈوبنے لگا۔ آنکھیں غمگین ہو گئیں۔

"کچھ نہیں ہو گا تمہیں۔ کوئی راستہ نکل آئے گا۔"

"نہیں اب۔۔۔"

ایک زور دار آواز فون کے پار گونجی۔ احمد کی روح کانپ اٹھی۔ عثمان کی تکلیف دہ سسک اسے سنائی دی۔ جیسے وہ درد سے کراہ رہا ہو۔ احمد کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

”ہیلو؟ ہیلو؟ ہیلو؟“ احمد کہتا رہ گیا۔ مگر کوئی جواب نہ آیا۔ جواب آتا بھی کیسے۔

اس نے کال کاٹ دی اور اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔ ماتھے کی رگ پھڑ پھڑانے لگی تھی۔ اسے ان سب پر بہت غصہ آیا۔ وہ سب جو فیروز کے بھی مجرم تھے۔ اب اس کے پاس ان سے نفرت کرنے کی وجوہات بڑھ گئی تھیں۔ وہ اپنا سر ہاتھ میں پکڑے بیٹھا رہا۔ چہرے پہ تناؤ پھیلا ہوا تھا۔ آنکھوں میں انگارے برس رہے تھے۔

ایک اور انسان مار دیا گیا۔ کیا ان طاقتوں کے لیے انسانی جان بس ایک کھلونا تھی؟

رات کے اس پہر، بستر پہ بیٹھے احمد یوسف نے فیصلہ کر لیا تھا، چاہے کچھ بھی ہو جائے، چاہے اسے اپنی جان ہی کیوں نہ دینی پڑ جائے، وہ ان اندھیر طاقتوں کو مات دے کر ہی دم لے گا۔

☆☆☆

عثمان کی موت کا احمد پہ گہرا اثر ہوا تھا۔ اس کی اندھیر طاقتوں کے لیے نفرت دن بدن شدید ہوتی چلی گئی۔ وہ اٹھتے بیٹھتے اس مافیا کے بارے میں سوچا کرتا۔ ہر وقت اس کے دل میں آگ بھڑکتی رہتی تھی۔

وہ سوچتا رہتا تھا کہ ان سب کو روکنے کے لیے آخر کیا کیا جا سکتا تھا؟

اسی کشمکش اور عدم یقینی میں احمد نے ایک تیر چلانے کا سوچا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس سب کا فائدہ ہونا بھی تھا یا نہیں، لیکن وہ بس ہاتھ پہ ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

رات کے بارہ بج رہے تھے۔ احمد اپنے بستر کے کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنا موبائل اٹھایا اور کسی کو کال ملائی۔ یہ نمبر پاکستانی نہیں لگتا تھا۔ کچھ دیر بعد دوسری جانب سے فون اٹھالیا گیا۔

"اوہ احمد! السلام وعلیکم۔" یہ احمد کا دوست علی تھا۔

"وعلیکم اسلام۔" علی کے برعکس احمد کے انداز میں خوشگواری نہ تھی۔ انداز سرد سا تھا۔

"کیا حال ہے؟ اتنے وقت کے بعد کال کی۔" علی چہکا۔

"ہاں بس۔ کچھ مصروفیات تھیں۔ خیر تم ایک ایجنسی میں کام کرتے تھے۔ ہے نا؟" احمد نے پوچھا۔ نگاہیں جواب طلب تھیں۔

"ہاں۔ ہیومن رائیٹس پراٹیکشن ہب۔" علی سادگی سے بولا۔ اس نے اس بات کا بالکل برا نہ منایا کہ اتنے مہینوں بعد احمد نے بات بھی کام کے غرض سے کی۔

"ٹھیک۔ تو کیا یہ ایجنسی میری ایک چیز میں مدد کر سکتی ہے؟ کیا تم آگے کچھ چیزیں پہنچا سکتے ہو جو میں تمہیں ای میل کروں؟" احمد نے اپنا سر ہاتھ سے مسلا۔

"ہاں، میں کر سکتا ہوں، مگر ہوا کیا ہے؟" علی تھوڑا بہت فکر مند ہوا۔

"میں تمہیں ای میل پر سب بھیج رہا ہوں۔ تم آگے خود سمجھ جانا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔" احمد نے کال کاٹ دی اور علی کی ای میل پر وائیس ریکارڈنگ بھیج دی۔ معاً اسٹار ترکی کے انسٹاگرام اکاؤنٹ کے کچھ اسکرین شارٹس بھی۔

احمد موبائل سائڈ پر رکھ کر انتظار کرنے لگا۔ انتظار کرنا اس کے لیے بہت دشوار تھا۔

کچھ دیر میں موبائل تھرتھرایا۔ احمد نے تیزی سے میسج کھولا۔

"اوہ گاڈ۔ یہ معاملہ تو بہت سنجیدہ ہے۔ میں اپنے باس کو کل ہی دکھاؤں گا۔ ہم دیکھیں گے کہ تمہاری کس طرح سے مدد کی جاسکتی ہے۔ اپڈیٹ کا انتظار کرنا۔"

احمد نے ایک گہری سانس لی اور موبائل پرے رکھا۔

وہ اس سب کے نتائج سے لاعلم تھا۔

لیکن وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اگر اس سب کے نتیجہ مثبت نہیں نکلتا، وہ کوئی دوسرا راستہ تلاش کرے گا۔ مگر کسی صورت رکنے والا نہ تھا۔

☆☆☆

پانچ دن بعد:

احمد آفس میں کچھ کام کر رہا تھا، جب علی کی کال موصول ہوئی۔ ہر مصروفیت کو دھکیل کر اس نے کال اٹھالی۔ رسمی علیک سلیک کے بعد وہ مدعے پر آیا۔

"احمد جو ریکارڈنگ تم نے بھیجی تھیں وہ میں نے اپنے باس کو دکھائی ہیں۔"

احمد کی آنکھوں میں امید کی کرن چمکی۔

"اچھا۔ پھر۔" نگاہیں جواب طلب تھیں۔

''یہ جو تم نے دکھایا۔ یہ بہت خطرناک لگ رہا ہے۔یعنی بہت زیادہ ہائی پروفائل۔ اور ہماری ایجنسی صرف ہیومن رائٹس پروٹیکشن ایجنسی ہے، ہم عموماً اتنے ہائی پروفائل کرمنلز کا مقابلہ نہیں کرتے ہیں۔''

احمد کا چہرہ بجھ گیا۔ خیر، کوئی بات نہیں۔ اگر اس طرح نہیں تو کسی اور طرح ہی سہی۔

''ٹھیک ہے۔ تمہارے وقت کا شکریہ۔'' احمد روکھے سے انداز میں کہہ کر کال رکھنے لگا۔

''سنو تو بھائی۔'' احمد لمحے کے لیے تھما۔

''تو اس لیے ہماری ایجنسی نے ایک انٹرنیشنل کرائم ایجنسی سے رابطہ قائم کیا ہے۔ اور انہیں تمہارا کیس بھیجا۔''

احمد چونکا۔ آنکھوں کی چمک لوٹی۔ دل میں امید جاگنے لگی۔

''اور وہ لوگ اس کیس کو لے کر بہت سنجیدہ ہیں۔ ان کا ایک ایجنٹ پاکستان بھی آئے گا، احمد۔'' علی کا انداز ایسا تھا جیسے وہ آگے ''لیکن'' بولنے والا تھا۔

احمد نے آنکھیں سکیڑیں۔

''لیکن احمد میں نے تم سے پوچھے بغیر کچھ کر دیا ہے۔''

احمد نے اپنا ہاتھ مٹھی میں بھینچ لیا۔

''میں نے اپنے باس کو یہ بتایا تھا کہ مجھے یہ ریکارڈنگ پاکستان کے کسی پرائیویٹ انویسٹی گیٹر نے بھیجی ہے۔''

احمد نے کے چہرے پر بے یقینی پھیل گئی۔ چہرے غصے کے رنگ اوڑھنے لگا۔

”تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہے؟ یہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“ احمد دنگ رہ گیا تھا۔

”سوری یار، مگر ضروری تھا۔ صرف اس ہی لیے، انہوں نے یہ کیس سنجیدگی سے لیا تھا۔ اگر میں کہتا کہ یہ سب کسی عام بندے نے بھیجا تھا تو میری بات کی اتنی اہمیت نہ ہوتی۔ میں اپنی جگہ مجبور تھا۔“

”یار کیا ضرورت۔۔۔“ احمد کہتے کہتے تھم گیا۔ چہرے پہ پھیلا غصہ زائل ہوا۔ دماغ میں کچھ بن چکا تھا۔

”چلو ٹھیک۔ پھر آگے کیا کرنے کا ارادہ ہے؟“ احمد کی دلچسپی انتہاء کو پہنچ گئی تھی۔ حالات ایک نیا موڑ لے رہے تھے۔

”تمہیں اس کے ساتھ مل کر کام کرنا ہو گا۔ ائیر پورٹ پر بھی تم اسے ریسیو کرو گے۔ ٹھیک؟“ علی بولا۔

تو یہ کھیل اس طرح سے شروع ہونا تھا۔ دلچسپ! احمد کی آنکھوں میں خوشیاں بھریں۔

”ٹھیک ہے۔ کون ہے یہ ایجنٹ ویسے؟“ احمد نے پوچھا۔

”اس کے بارے میں مجھے جیسے ہی پتا چلتا ہے میں تمہیں بتا دوں گا۔ فی الحال کے لیے بس اتنا ہی جانتا ہوں کہ وہ پاکستان سے ہی تعلق رکھتا ہے۔“

☆☆☆

احمد ایئرپورٹ کے ویٹنگ ایریا میں ہاتھ میں پوسٹ کارڈ لیے کھڑا تھا۔ جس ایجنٹ کا اسے انتظار تھا اس کی فلائیٹ اتر گئی تھی اور کچھ ہی دیر میں آنے والا تھا۔

احمد نے سیاہ کرسپ کوٹ پہنا ہوا تھا۔ ہاتھ میں مہنگی واچ اور پیروں میں پالشڈ جوتے' جو کہ چمک رہے تھے۔ چہرے پر اس نے سیاہ ماسک لگایا ہوا تھا اور سر پہ کالی ہیٹ نے اس کے بالوں کو ڈھکا ہوا تھا۔ آنکھوں پر کالا چشمہ لگایا ہوا تھا۔ وہ اپنی شناخت مخفی رکھنے میں کامیاب تھا۔

دفعتاً بھیڑ انتہا کو پہنچی۔ جو جہاز زمین پر اترا تھا، اس کے پیسنجر اپنے گھر والوں سے گلے مل رہے تھے۔ ہر سو ہر دم بھنبھناہٹ بکھر گئی۔

احمد وہاں کسی بت کی طرح کھڑا رہا۔

اسی بھیڑ میں، وہ نظر آئی۔ شخصیت اتنی کمال تھی کہ وہ الگ سے پہچانی جاتی تھی۔

خوبصورت اور مغرور سے نقوش، کھڑی ہوئی ناک، اٹھے ہوئے کندھے۔ وہ پر اعتماد انداز میں چل رہی تھی۔ اس نے لیدر جیکٹ پہنی ہوئی تھی اور جینز کی ڈھیلی ڈھالی پینٹ۔ بالوں پر نیا نویلا بوائے کٹ کروایا تھا۔ گلے میں تانبے کی چین لٹک رہی تھی اور کان میں چاندی کی بالیاں تھیں۔ اس کے چہرے پر رعب جھلکتا تھا۔

اس کی نظر اوپر سے نیچے کالے لباس میں ملبوس احمد پہ پڑی۔

"ویلکم زینت۔" اس پوسٹ کارڈ پر لکھا ہوا تھا۔

اوہ۔۔۔ تو یہ ہے وہ ڈیٹیکٹو؟ زینت نے لاپرواہی سے شانے اچکائے۔

”عبدالحمید؟“ زینت اس کے مقابل پہنچ کر بولی۔

احمد نے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکالا اور زینت کو تھمایا۔ زینت کچھ الجھ کر اس کارڈ کو پڑھنے لگی۔

”اسلام آباد میں آپ کو خوش آمدید۔ میں آپ کا میزبان، عبدالحمید۔“

زینت نے تھکی ہوئی سانس خارج کی۔ چہرہ نہ دکھانا تو بنتا تھا، لیکن آواز؟ اتنی پرائیوسی۔

خیر دیکھتے ہیں یہ کس کھیت کی مولی ہے۔ جتنا یہ بن رہا ہے اتنا دم ہے بھی کہ نہیں؟ زینت نے دل ہی دل میں سوچا۔

”ٹھیک ہے۔ کہاں جانا ہے؟“ زینت بولی۔

احمد نے جیب سے ایک اور کارڈ نکالا۔

اوہ تو وہ ہر سوال کی تیاری کر کے آیا تھا۔

”میرے پیچھے چلیں، میری گاڑی تک۔“

زینت نے منہ اٹھا کر دیکھا۔ احمد اس سے دور جا رہا تھا۔ اف بدتمیز۔ کم از کم اس کا انتظار تو کر لیتا۔

زینت اس کا تعاقب کرتی کلٹس تک پہنچی۔

”بڑا کلاسی بنتا پھر رہا ہے، مگر چلاتی تو اسے کلٹس ہی ہے۔ ہنہہ۔“ زینت نے سوچا۔

وہ کلٹس کی پچھلی نشست پر سوار ہوئی۔ احمد نے گاڑی کی ڈیش بورڈ سے نیا کارڈ نکالا اور زینت کے حوالے کیے۔

”امید ہے آپ نے ایک محفوظ فون کا انتظام کر لیا ہو گا جسے ٹریس کرنا ناممکن ہو۔“ اور ساتھ احمد کا نمبر درج تھا۔

زینت کو کچھ بہت برا لگا۔ یہ مغرور ایجنٹ اپنے آپ کو سمجھتا کیا تھا؟ اس نے خفگی سے نظر اٹھائی۔

”جی کر چکی ہوں۔“ اس کی آواز بھاری تھی، زیادہ نسوانی نہیں۔

احمد نے ایک نیا کارڈ ڈیش بورڈ سے نکالا اور زینت کو تھما دیا۔

”رات کے گیارہ بجے کال کرنا۔ نہ ایک منٹ آگے نہ ایک منٹ پیچھے۔ دیکھتے ہیں تم کتنی قابل ہو۔
“

زینت اس آدمی سے چڑھنے لگی۔ کوئی اس کی قابلیت پر شک کرے اسے گوارہ نہ تھا۔

”بے فکر رہو جاؤ، عبدالحمید۔“ زینت نے روکھے سے انداز میں کہا۔

فرنٹ مرر میں نظریں احمد کی آنکھوں میں گاڑیں۔ احمد بھی اس کی شعلہ باز آنکھیں دیکھ رہا تھا۔

زینت نے کارڈ اپنی انگلیوں کے بیچ دبایا اور اسے پرزے پرزے کیا۔

جتاتی نگاہیں احمد کی آنکھوں میں گاڑیں۔

احمد نے سب کچھ جھڑک کر گاڑی اسٹارٹ کی اور اسے ہوٹل میں چھوڑ دیا۔

☆☆☆

گیارہ بجنے والے تھے۔ احمد ساری تیاریاں مکمل کر چکا تھا۔ سٹڈی ٹیبل پر اس کا لیپ ٹاپ کھلا تھا۔ ایک چھوٹا موبائل لیپ ٹاپ سے کنیکٹڈ تھا۔ وہ آواز پر ڈھیروں فلٹرز لگا چکا تھا، تاکہ اس کی اصل آواز پہچان میں نہ آسکے۔

ٹھیک گیارہ بجے زینت کی کال موصول ہوئی۔ احمد نے چہرے پہ شاطر مسکراہٹ سجائی، اور کال اٹھا لی۔

''کیا حال ہے زینت۔ امید کرتا ہوں پاکستان کی آب و ہوا تمہیں خوش بختی میں پائے گی۔'' احمد کی عجیب و غریب سی آواز زینت تک پہنچی۔

آواز زینت کے کانوں میں چبھتی تھی۔ زینت کچھ کوفت زدہ سی ہوگئی۔

''بہت خوب۔ تم نے بھی پکا کام کیا تھا۔ پلیٹ نمبر تمہاری گاڑی کی نکلی تھی۔ دلچسپ۔ مگر یہ کوئی تمہاری قابلیت کا ثبوت نہیں ہے۔ تمہیں ثابت کرنا ہوگا کہ تم میرے ساتھ کام کرنے کے قابل ہو۔ میرا اپنا معیار ہے۔ میں ہر راہ چلتے ڈیٹیکٹو کے ساتھ کام نہیں کرتی۔'' زینت نے ساری بھڑاس نکالنا چاہی۔ انداز جلانے والا تھا۔

احمد نے قہقہہ لگایا۔ زینت کو مزید تپ چڑھی۔

''چلو پھر، ایسا کرو مسٹر عبدالحمید، مجھے بتاؤ' کے تفتیش کا سانچہ کیسے بنایا جاتا ہے؟'' زینت کا انداز انتقام لینے والا تھا۔

احمد کے چہرے کا رنگ اُڑ سا گیا۔

”ٹیسٹ لے رہی ہو میرا؟“ احمد بولا۔

زینت زور سے ہنس دی۔ احمد کی مسکراہٹ سمٹی۔

”تفتیش کا سانچہ اندازوں سے بنایا جاتا ہے مسٹر عبد الحمید۔ صورتحال کو پرکھ کے، ان کا جائزہ لے کر، دور دور کے اندازے لگائے جاتے ہیں۔ اور پھر ان اندازوں کی تصدیق کرنے کے لیے ثبوت اکٹھے کیے جاتے ہیں۔ اگر تمہیں تفتیش کرنے کے بارے میں اتنی بنیادی باتیں نہیں پتا تو تم میرے ساتھ کے قابل نہیں۔ مجھے شک ہے کہ تم ایک اصلی انویسٹی گیٹر نہیں۔“ زینت سختی سے بولی تھی۔

احمد ششدر سا رہ گیا۔ وہ زینت سے یوں دبنے والا نہیں تھا۔ اس کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔

”صرف ایک بچگانہ سے سوال سے تم میری قابلیت کا اندازہ نہیں لگا سکتی، زینت۔ مجھے صرف ایک لمحہ لگے گا تمہارے اوپر اپنی قابلیت عیاں کرنے میں۔ لیکن شاید اس کے بعد تم مجھ سے بہت نفرت کرو۔‘ ‘احمد کا لہجہ بے تاثر تھا۔

زینت ٹھٹک گئی۔ یہ دو ٹکے کا، سڑک چھاپ انویسٹی گیٹر اپنے آپ کو سمجھتا کیا تھا؟

”چلو ٹھیک ہے۔ ثابت کرو!“ زینت چیلنج دینے والے انداز میں گویا ہوئی۔

”تمہارا اصل نام مریم ہے۔“

زینت کی آنکھیں بے یقینی کے مارے پھیلنے لگیں۔ یہ کیسے ممکن تھا؟

زینت نے اپنی بے ربط سانسوں کو ترتیب دی۔ ہو سکتا تھا اس نے بس ہوا میں تیر چلایا ہو۔

”تمہیں کیا لگتا ہے کہ صرف اتنا ہی کافی ہے؟“ زینت عرف مریم (ہم اپنی کہانی میں اس کردار کو زینت سے مخاطب کریں گے) بولی تو احمد ایک بار پھر سے ہنسا۔

”تمہارا پورا نام مریم جنید ہے۔“ زینت پتھر کی بن گئی۔

”تم کراچی سے اسلام آباد آئی تھی۔ نسٹ میں پڑھنے۔ تمہیں اسکالر شپ ملی تھی۔ تم بی ایس سی ایس کر رہی تھی۔ تمہارے والدین وکیل تھے اور ایک ہائی پروفائل کیس کو پراسیکیوٹ کر رہے تھے، اسی سلسلے میں دونوں کو مار دیا گیا تھا۔“ زینت کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

یہ کیسا انویسٹی گیٹر تھا جس نے بس اس کی شکل دیکھ کر، کچھ ہی گھنٹے میں اس کی اتنی ساری معلومات نکال لی تھیں؟ زینت کو ایجنٹ عبدالحمید کی قابلیت پہ سو فیصد یقین آگیا تھا۔

”مجھے یقین ہو چکا ہے۔ اور میں ایک اچھے موڈ کے ساتھ تمہارے ساتھ کام کروں گی۔“ زینت نے اچھے اسپورٹ مین کی طرح ہار تسلیم کی۔

احمد مسکرایا۔

”ویری گڈ۔ اب میں تمہیں اپنا پلان بتاتا ہوں۔“

احمد اپنے کمرے میں بیٹھا، اسے اپنا پلان بتانے کے لیے تیار تھا۔ زینت بھی سننے کے لیے تیار تھی۔

اب کی بار جوش نیا تھا۔

مگر عزم وہی پرانا تھا۔

انصاف قائم کرنا، اور باطل کو صفحۂ ہستی سے مٹانا۔

☆☆☆

(”زینت، تم اپنی نئی پروفائل بناؤ گی۔ تمہاری پروفائل میں ہم تمہاری اصلی کہانی استعمال کریں گے، لیکن ایک ٹویسٹ کے ساتھ۔“ احمد کہہ کر شاطر سا مسکرایا۔

زینت کی دلچسپی میں اضافہ ہوا۔

”تمہاری کہانی کچھ اس طرح ہو گی کہ، تمہارے ماں باپ کا قتل کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد تم معاشرے کے ہاتھوں سالوں پسی۔ تم ایک چھوٹے سے علاقے میں کرائے کے گھر میں رہنے لگی۔ تمہارا انسان ذات سے اعتبار اٹھ گیا۔ تم انسان ذات سے نفرت کرتی ہو۔ ایک چیز جو ہم نے گول کر جانی ہے وہ ہے تمہاری نسٹ کی ڈگری۔ تم ایم بی بی ایس کر رہی تھی لیکن معاشی حالات کی وجہ سے تم نے ایم بی بی ایس بیچ میں چھوڑ دیا۔ تم اپنی پروفائل بنانے کا کام کر لو گی نا؟ یا اس میں میں مدد کروں؟“

”ڈونٹ یو وری۔ سب ہو جائے گا۔“ زینت خوشدلی سے بولی۔)

زینت ایک بلڈنگ میں داخل ہوئی جس کا آوے کا آوا بگڑا ہوا تھا۔ جگہ جگہ سیلن تھی، بدبو کے بھبکے نتھنوں سے ٹکرائے۔ مگر اسے کوئی شکایت نہ تھی۔ انٹرنیشنل ایجنسی میں کام کر کے وہ عام لوگوں سے قدرے مختلف بن گئی تھی۔ اسے کم کھانے میں، اور مشکل حالات میں جینے کی عادت تھی۔

وہ اپنے کرائے کے گھر میں داخل ہوئی۔ گھر کا حال تو بلڈنگ کے حال سے بھی بدتر تھا۔ کیڑے مکوڑے ہر جگہ تھے۔ پینٹ اکھڑا ہوا تھا۔ مٹی کی موٹی تہہ زمین پہ موجود تھی۔ زینت نے بس ایک تھکی

ہوئی سانس خارج کی۔ اسے کیڑے مکوڑوں کا ڈر تھا نہ وہ صفائی کرنے سے کتراتی تھی۔ وہ آسائشوں کے بغیر جی سکتی تھی۔

(”اگلہ مرحلہ ہے عافیتِ زندگی ہسپتال میں داخل ہونا۔“

”لیکن عبدالحمید، جو کیس تم نے بھیجا تھا وہ تو ہیومن اسمگلنگ کا تھا۔ یہ ہسپتال کہاں سے بیچ میں آگیا؟“

”اس سے پہلے میں اس مافیا کے ایک آدمی کی تفتیش کر چکا ہوں۔ وہ اس ہسپتال میں روز جاتا تھا۔ اس ہسپتال میں کچھ پر اسرار ہے۔ تمہیں کچھ بھی کر کے یہاں جاب حاصل کرنی ہے۔ اداکاری کر لو گی؟“

”فکر ہی نہ کرو۔“)

زینت نیلوفر کے آفس میں کھڑی تھی۔

اس کا حلیہ، ایئرپوٹ والی زینت سے قدرے مختلف تھا۔ آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے تھے۔ کندھے نیچے کی طرف ڈھلکے ہوئے تھے۔ کپڑے بالکل سادہ سے تھے۔ زینت کے چہرے پہ کڑواہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

”ہم ابھی کسی کو ہائر نہیں کر رہے۔ آپ جا سکتی ہیں۔“ نیلوفر روکھے سے انداز میں بولی۔

زینت کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹے۔

”اگر تمہیں لگتا ہے کہ تمہارے آنسو دیکھ کر میرا دل نرم پڑ جائے گا، تو تم غلط ہو۔“ نیلوفر بے رخی سے بولی۔

زینت کے چہرے پر تلخ مسکراہٹ بکھری۔

”مجھے انسان ذات سے کوئی امید نہیں ہے مادام۔ اور آپ سے تو بالکل نہیں۔ یہ جو اونچے عہدوں پر فائز ہوتے ہیں، سب کے سب ایک جیسے ہوتے ہیں!“

نیلوفر نے اپنا قلم ٹیبل پر رکھا اور زینت کو غور سے دیکھنے لگی۔ اچانک سے زینت میں دلچسپی بڑھ گئی تھی۔

”تمہیں انسان ذات سے اتنی نفرت کیوں ہے، لڑکی؟“ نیلوفر نے آنکھیں گھما کر پوچھا۔

”کیونکہ ان انسانوں نے میرا جینا حرام کیا ہوا ہے۔ میں اپنے ماں باپ کے قتل کے بعد انصاف کے لیے تڑپ رہی ہوں۔ لیکن آج تک مجھے مایوسی کے علاوہ کچھ نہیں ملا۔“ زینت سختی سے کہہ کے مڑ گئی۔ وہ کمرے سے جانے لگی۔

دوسری طرف نیلوفر کی آنکھیں نرم پڑیں۔ اسے زینت سے اپنائیت کا احساس ہوا۔ ایک زمانے میں وہ بھی انصاف کے لیے تڑپی تھی۔ نہ جانے کہاں کہاں بھٹکی تھی۔ آخر میں خالی ہاتھ رہ گئی تھی۔ وہ زینت کو مایوس نہیں لوٹانا چاہتی تھی۔

”رکو!“ نیلوفر نے پیچھے سے اسے پکارا۔

زینت مسکرائی۔ اگلے لمحے اس نے اپنی مسکراہٹ سمیٹی، چہرے پہ وہی سختی طاری کی۔ وہ نیلوفر کی طرف پھر سے مڑ گئی۔

”اپنا نمبر دے جاؤ۔ میں کچھ دن تک شاید تمہیں کال کر لوں۔“ نیلوفر نے سرسری سا کہا۔

زینت نمبر دے کر چلی گئی۔ باہر ٹیکسی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے پہلی فرصت میں عبد الحمید کو کال ملائی اور اسے سب کچھ بتایا۔

(”تمہیں پتا لگانا ہو گا کہ اس ہسپتال میں ہو کیا رہا ہے۔ اس کے لیے کسی نرس یا ڈاکٹر کو دوست بنانا۔ اور مجھے پل پل کی خبر دینا۔“)

”آپ کل سے جوائن کر لیں۔“ یہ کال عافیت زندگی کی طرف سے تھی۔ زینت مسکرا رہی تھی۔ کال نیلوفر سے ملاقات کے چار دن بعد موصول ہوئی تھی۔ یقیناً ان لوگوں نے چار دن اس کی چھان بین کی ہو گی۔ اور انہیں وہی ملا ہو گا جو اس نے ان سب کے لیے چھوڑا تھا۔ وہ سکون کی سانسیں بھرنے لگی۔

زینت نے ہسپتال جوائن کیا۔ اس کا سب سے پہلا کام کسی بے وقوف نرس سے دوستی کرنا تھا۔ یہ کام اس کے لیے مشکل نہ تھا، اس کے پاس زندگی کا تجربہ حاصل تھا، وہ انسانوں کو پرکھنے میں ماہر تھی۔

اس نے ایک ہفتے تک ہسپتال کی تمام نرس کا جائزہ لیا۔ اسی سلسلے میں اسے عائشہ ملی، جو کہ تقریباً پچاس سال کی تھی۔ اس کا دس سال کا بیٹا تھا۔ شوہر مر چکا تھا اور کوئی مددگار نہ تھا۔

ایک تو عائشہ بڑھی عمر کی تھی اور پھر حد سے زیادہ جذباتی تھی۔ وہ چھوٹی چھوٹی تفصیلات بھول جایا کرتی تھی۔ زینت نے اپنے دوست کے طور پر عائشہ کو چنا۔ اب اس کا کام تھا عائشہ کے دل میں اپنی جگہ بنانا۔

ایک دن عائشہ زینت کے ساتھ پیشنٹ کے وارڈ میں موجود تھی۔ عائشہ مریض کے سرہانے کھڑی، رپورٹس بنا رہی تھی جب کہ زینت کاؤچ پہ بیٹھی تھی۔ چہرے پر رندھا ہوا سا تاثر طاری کیا ہوا تھا۔

دفعتاً زینت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ روتی ہوئی زینت کو دیکھتے ہی عائشہ کا دل پھڑ پھڑ ایا۔ وہ تیزی سے زینت کی طرف لپکی۔

"ارے کیا ہوا، زینت؟" عائشہ پنجابی لب و لہجے میں بات کرتی تھی۔

"کچھ نہیں بس، اماں یاد آرہی تھیں۔"

عائشہ غمگین ہوئی۔

"ارے ارے۔ کیا ہو گیا؟ ایسے نہ رو بچی۔" عائشہ نے اس کے گال تھپتھپائے۔ نرمی سے اس کے آنسو پونچھے۔

"میں کیا کروں، میں دنیا میں اکیلی ہوں۔ میرا کوئی بھی نہیں۔" زینت سسکیاں لے رہی تھی۔

عائشہ کو زینت پر بے انتہاء ترس آیا۔

"آئندہ میں تمہیں روتے ہوئے نہ دیکھوں۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ تمہیں کسی بھی چیز کی ضرورت ہو مجھ سے مانگ لینا۔" عائشہ شفقت سے اس کے بوائے کٹ بالوں پر ہاتھ پھیرتے بولی۔

زینت اداس سا مسکرا دی۔

"کیا واقعی؟ کیا آپ مجھے باقی سب کی طرح چھوڑ کر نہیں جائیں گی؟" زینت نے آنسو بہانا روکے۔

عائشہ سر نفی میں ہلانے لگی۔

”چلو بس، اب چپ ہو جاؤ۔ آج میں اپنی پکی سہیلی کے ساتھ کھانا کھانے جاؤں گی۔“ عائشہ خوش دلی سے بولی۔ وہ ایک نرم دل کی مالک تھی۔ زمانے کی سختیوں سے عاجز آخر اس نے اس راستے کا انتخاب کیا۔

زینت دل میں ہنس رہی تھی۔ تیر نشانے پہ لگا تھا۔

زینت نے سب کچھ سست رکھا۔ وہ ایک دم سے سب کچھ جاننے کی کوشش کرتی تو با آسانی پکڑی جاتی۔ سب سے پہلے تو اس نے اپنے اوپر تنگی کا رونا رویا۔ اس کے بعد عائشہ کے اوپر یہ تاثر دیا جیسے وہ تنگ دستی کی وجہ سے خودکشی کرنے کا سوچ رہی ہے۔ اس سب کے بعد عائشہ کے دل پر خنجر چل گئے۔ اور پھر، جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے زینت کو بتایا کہ وہ اس کے مسائل کا حل ضرور لائے گی۔ اس رات عائشہ نیلوفر کے آفس میں گئی۔

”جی عائشہ، کیا ہوا ہے۔“ نیلوفر کی آواز میں تھکاوٹ جھلکی۔

”میم میں آپ سے کچھ پوچھنے آئی ہوں۔ اگر برا لگتا ہے تو لگے، مگر بات کہے بغیر میں جاؤں گی نہیں ۔“ عائشہ گردن جھکائے، جذباتی انداز میں بولی۔

نیلوفر نے کوفت کے عالم میں تھکی ہوئی سانس خارج کی۔

”ٹھیک ہے۔ بات کرو۔“ نیلوفر چڑ کر بولی تھی۔ اسے ملازمین کا کام کے وقت جذباتی ہونا پسند نہ تھا۔

”میری دوست ہے، زینت۔ اس کے سر پر بہت مسائل ہیں، میم۔“ عائشہ کی آنکھ سے ایک آنسو نکلا۔

”وہ تنگی کی وجہ سے خودکشی کرنے والی تھی۔ کیا آپ لوگ اسے بھی اس کاروبار کا حصہ نہیں بنا سکتے؟ اس کی ہر پریشانی دور ہو جائے گی۔“

نیلوفر کے چہرے کا تناؤ بڑھتا گیا۔ جبڑوں کو پاس لرزش پیدا ہوئی۔ ہاتھ مٹھی میں بند ہوئے۔

”تم دوست نہیں، دشمن ہو اس کی۔ سمجھی!“ نیلوفر ایک دم سے آگ بگولا ہو گئی۔

عائشہ بوکھلا کر دو قدم پیچھے ہوئی۔ اسے نیلوفر سے اس طرح کے رد عمل کی توقع نہ تھی۔

”اگر تم اس کے ساتھ مخلص ہوتی تو کیا تم اسے جہنم کا ٹکٹ یوں دیتی؟ عائشہ بتاؤ؟ یہ جہنم ہے، جہنم۔ تم سمجھتی کیوں نہیں۔“ نیلوفر کی سانسیں پھولنے لگی تھیں۔ اسے بے اختیار وہ وقت یاد آیا جب اس نے اس دوزخ میں قدم جمائے تھے۔ اس دنیا میں خوش باش رہنے کا ناٹک کرنا، اپنے آپ کو اس دنیا کے رنگوں میں رنگا ہوا ظاہر کرنا کتنا مشکل تھا، یہ صرف وہی جانتی تھی۔

”میم۔ باہر کی دنیا میں کچھ نہیں رکھا ہے۔ میں بس اس کی مشکلات کا حل چاہتی تھی۔“ عائشہ کو اپنے اوپر اٹھایا گیا انکشاف اچھا نہ لگا۔

نیلوفر نے گہرے سانس لیتے اپنے آپ کو پر سکون کیا۔

”اس زینت سے بولو اگر وہ اس سب میں شامل ہونا چاہتی ہے تو خود میرے پاس آئے۔ میں یوں سفارشیں تسلیم نہیں کرتی۔“ نیلوفر نے نہایت ناگواری سے کہا۔

عائشہ مسکرا دی۔

”اس نے سفارش تو نہیں۔۔“ نیلوفر نے ہاتھ کھڑا کیا تو عائشہ چپ ہو گئی۔

نیلوفر کا موڈ بری طرح بگڑ چکا تھا۔ عائشہ بھی جان گئی تھی۔

"جتنا کہا جائے اتنا کیا کرو۔ اب جاؤ۔" عائشہ سر کو خم دے کر رخصت ہو گئی۔

☆☆☆

زینت اپنے کرائے کے اپارٹمنٹ میں موجود احمد سے فون پر بات کر رہی تھی۔

"ہاں عبد الحمید۔ مجھے کل نیلوفر نے بلایا ہے۔ عائشہ کہہ رہی تھی کہ وہ مجھے میرے مسائل کا حل بتائے گی۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ نیلوفر مجھے اس کاروبار میں شامل ہونے کا کہے گی۔" اپنے بوائے کٹ بالوں پر ہاتھ پھیرتے بولی۔

"زبردست۔ یہ سب تم نے بہت جلدی کر لیا ویسے۔" احمد کی کمپیوٹرائیزڈ آواز میں کوئی تاثر نہ تھا۔

زینت زور سے ہنس دی۔

"متاثر ہوئے نا، عبد الحمید؟" زینت نے نچلا ہونٹ دبایا۔

"ابھی اور امتحانات باقی ہیں، زینت۔" احمد سرد سے لہجے میں بولا۔

زینت پھر ہنس دی۔ اس کھڑوس آدمی نے کھلے دل سے اس کی تعریف کر دی تو کہیں اسے ہارٹ اٹیک ہی نہ آجائے۔

"شیور شیور۔ ویسے قابل تو میں ہوں۔ یہ ماننا پڑے گا۔ خوش قسمت ہو کہ اس کیس کے لیے تمھیں میں ملی۔" زینت کا انداز جتانے والا تھا۔

احمد مسکرایا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ بھی زینت کی کارکردگی سے متاثر تھا۔ اس نے دل ہی میں اعتراف کیا کہ زینت سے بہتر ساتھی مل ہی نہیں سکتا تھا۔

"خیر۔ اب اگلا مرحلہ ہے اس کاروبار کے رازوں کو جاننے کا۔ سمجھی نا؟" احمد مدعے پر آیا۔

کچھ دیر معمول کی باتوں کے بعد احمد نے کال کاٹ دی۔

☆☆☆

اگلے دن زینت بہت ہی اچھے موڈ کے ساتھ ہسپتال گئی تھی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کاروبار کا حصہ بننا کس قدر آسان تھا۔

وہ سیدھا نیلوفر کے کمرے میں حاضری دینے گئی۔ نیلوفر بھی اسی کے منتظر تھی۔ نیلوفر نے چہرے پر اداسی طاری کی اور آنکھوں میں معصومیت سجائی۔

"بیٹھو۔" نیلوفر نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی آنکھوں میں سرد مہری سوار تھی۔

زینت چپ چاپ کرسی پہ بیٹھ گئی۔

نیلوفر کھڑی ہوئی۔ اس نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور پیچھے سے لاک بھی لگایا۔ وہ آفس کی کھڑکی تک آئی جہاں سے سورج کی روشنی چھن چھن کے اندر آتی تھی۔ نیلوفر نے آفس کی بلائینڈز گرائیں ۔سورج کی کرنوں کا راستہ بند ہوا۔ کمرے کا ماحول پر اسرار ہو گیا تھا۔

وہ کرسی پر واپس آئی۔ نظر، بظاہر اداس سی زینت پہ گاڑ کے اس نے بات کا آغاز کیا۔

"زینت۔ عائشہ سے دوستی ختم کر دو، ورنہ میں تمہیں ہسپتال سے فارغ کر دوں گی۔"

زینت بری طرح چونک گئی۔ اس نے بمشکل اپنی حیرت چھپائی۔ اس کے گمان میں نہ تھا کہ نیلوفر ایسا کچھ کہے گی۔

''میں سمجھی نہیں، میم۔'' زینت کو الجھنے کی اداکاری کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی کیونکہ وہ حقیقتاً الجھی ہوئی تھی۔

''میں اسی لیے تمہیں نوکری دینے سے ہچکچا رہی تھی۔ میں جانتی تھی کہ اس ہسپتال میں بسا شیطان تمہیں اپنی طرف راغب کرے گا۔ مجھے ترس آتا ہے تمہارے اوپر زینت۔ مجھے تمہارے اندر نیلوفر نظر آتی ہے۔ تمہاری کہانی، میری کہانی کا عکس ہے زینت۔ میں نے غلط فیصلے لیے، مگر تم نہیں لو گی۔'' نیلوفر آنکھوں میں اپنائیت لیے بولی تھی۔ اس کے لہجے میں کچھ بہت غمگین کر دینے والا تھا۔

یہ سب زینت کی سوچ سے بالاتر تھا۔ اسے لگا تھا نیلوفر ایک مغرور سی عورت تھی مگر یہاں اس کا اندازہ غلط ثابت ہو رہا تھا۔ وہ تو اپنی زندگی سے غیر مطمئن لگتی تھی۔

''میں کچھ نہیں سمجھ پا رہی ہوں، میم۔'' زینت بولی۔

''دیکھو۔'' نیلوفر نے اپنی دراز سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور ٹیبل پر رکھی۔

زینت کی آنکھ کھلی کی کھلی رہ گئی۔

''یہ تم رکھ لو۔ مگر میں تمہیں اس سب میں شامل نہیں کروں گی۔ تم دوسری نیلوفر نہیں بننے والی۔ تمہیں آئندہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھ سے لے لینا۔'' زینت دنگ سی ہو کر نیلوفر کو دیکھتی رہ گئی۔ یہاں تو سب کچھ اس کی سوچ کے برعکس ہو رہا تھا۔

”میم۔ آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں؟“ زینت کی آنکھ میں آنسو جھلکا۔ وہ کردار میں لوٹ آئی۔

”عائشہ سے دوستی ختم کرکے۔ اور تم اب جاؤ۔“ نیلوفر کے انداز میں کرختگی لوٹ آئی۔

زینت نے چپ چاپ نوٹوں کی گڈی اپنے پرس میں ڈالی اور وہاں سے اٹھ گئی۔ اس کے پاس عبدالحمید کو بتانے کے لیے ایک بڑی خبر تھی۔

☆☆☆

رات کے وقت، حسب معمول زینت احمد کو پورے دن کا احوال سنا رہی تھی۔

”تو عبدالحمید اس سب سے تمہیں کیا سمجھ آرہا ہے؟“ زینت نے نیلوفر والا واقعہ بتانے کے بعد پوچھا۔

”یہی کہ وہاں کچھ غلط ہو رہا ہے۔ اور یہ نیلوفر اس میں شریک ہے‘ لیکن دل سے نہیں۔ ہم اس نیلوفر کو بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ لیکن، فی الحال اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم عائشہ سے ہی سب کچھ دریافت کرنے کی کوشش کرو۔ چونکہ نیلوفر نے اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ وہاں کچھ ہو رہا ہے، تمہارے لیے عائشہ سے سب کچھ اگلوانا مشکل نہیں۔“ احمد سوچتے ہوئے بولا۔

”عبدالحمید۔“ زینت کی آنکھوں میں غمگین سا تاثر ابھرا۔

”مجھے آج دل سے برا لگا۔ مجھے مجرموں سے نفرت ہے۔ میں قسم کھا چکی ہوں کہ جو بھی مجرم سامنے آئے گا، اسے اپنے ہاتھوں سے سزا دوں گی۔ لیکن پہلی مرتبہ مجھے ایک مجرم پہ ترس آیا۔ میں نے

اس مجرم کے لیے دعا کی کہ ایک دن وہ جرائم کی دنیا چھوڑ سکے۔ وہ مجرم نیلوفر ہے، عبدالحمید۔" زینت نے سوچتے ہوئے کہا۔

"دیکھو زینت۔ جذباتیت پرے رکھو۔ ہم جو کام کر رہے ہیں اس میں جذباتیت کسی کام نہیں آئے گی۔ ہمیں کسی سے ہمدردی نہیں ہونی چاہیے۔ جس طرح سے ہم عائشہ کو استعمال کر رہے ہیں، اگر ضرورت پڑی تو نیلوفر کو بھی کریں گے۔ سمجھی؟" احمد تائید والے انداز میں بولا۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر اس سب نے میرے زاویے بدل دیے ہیں۔ ضروری نہیں ہر مجرم سزا کا حقدار ہو۔ شاید کچھ ایسے مجرم ہوں جو کہ دل سے اچھا بننا چاہتے ہوں۔ تو کیا انہیں دوسرا موقع نہیں دینا چاہیے؟" زینت بولی۔

"ان سوالات کے جواب بعد میں تلاش کرتی رہنا۔ ابھی کام پر فوکس کرو۔" احمد نے کال کاٹ دی۔

زینت کے آبرو اٹھ گئی۔ ایجنٹ عبدالحمید، اس کے مطابق دنیا کا سب سے کھڑوس ترین انسان تھا۔ مجال ہے کہ کبھی اس نے کام کے علاوہ اس سے کوئی بات کی ہو۔ زینت منہ چڑاتے غسل خانے کی جانب بڑھ گئی۔

☆☆☆

اگلے دن۔

زینت عائشہ کے ساتھ پیشنٹ کے وارڈ میں ڈیوٹی دے رہی تھی۔

"کیا ہوا۔ کچھ بات کی نیلو فر میڈم نے؟" عائشہ نے پیشنٹ کی ایکس رے رپورٹس دیکھتے پوچھا۔

"ہاں، انہوں نے کہا تھا کہ یہاں کچھ غلط ہو رہا ہے، لیکن مجھے صاف صاف جواب دے دیا کہ تم اس کام میں حصے دار نہیں بنو گی۔ اس کے علاوہ کچھ پیسے دے دیے تھے۔" زینت کھوئے ہوئے انداز میں بولی۔

"اچھا ہی کیا۔ ہماری تو آخرت خراب ہو گئی ہے۔ اب تمہاری کیوں کریں؟" عائشہ زینت سے نظریں چرا رہی تھی۔

"عائشہ کیا تم مجھے نہیں بتا سکتی۔ کہ ایسا کیا ہوتا ہے ادھر؟" زینت ایک دم سے چونکا سی ہو کر بولی۔

عائشہ نے زینت کو سختی سے دیکھا۔

"کبھی نہیں۔" اس نے اٹل انداز میں جواب دیا۔

"عائشہ پلیز مجھے بتا دو۔ اگر مجھے معلوم ہو گا تو میں تجسس کو مار دوں گی۔ ورنہ یہ سوالات مجھے کچھ غلط کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ تمہیں میری حفاظت کے لیے سب بتانا ہو گا۔" زینت نے عائشہ کی دکھتی رگ پر وار کیا تھا۔

عائشہ سوچ میں پڑ گئی۔

"سچ میں؟ تم یہ سب صرف اسی لیے جاننا چاہتی ہو نا؟" عائشہ سوالیہ نگاہیں زینت پہ ڈالتے بولی۔

زینت نے سر اثبات میں ہلایا۔ عائشہ کو بیوقوف بنانا ہمیشہ کی طرح بہت آسان تھا۔

"ٹھیک ہے۔ پھر سنو۔" عائشہ ٹھہری۔ "ہم لوگ اعضاء کا غیر قانونی کاروبار کرتے ہیں۔"

زینت کی آنکھوں میں شاک ابھرا۔ وہ جانتی تھی کہ پاکستان میں یہ بہت عام تھا، لیکن قسمت تو دیکھو، وہ سیدھا اسی ہسپتال میں داخل ہوئی۔

"کہا تھا۔ یہ سب بہت بھیانک ہے۔" عائشہ نے افسوس سے کہتے ہوئے گہری سانس خارج کی۔

"اس سب کو کون چلاتا ہے؟" زینت متجسس ہوئی۔

"لیڈی اقتدار۔ بہت خطرناک عورت ہیں وہ۔ کبھی نظر آئے تو قریب بھی نہ جانا ان کے۔ نظروں سے کھا جاتی ہیں۔" عائشہ نے سرگوشی کرنے والے انداز میں کہا۔

"اور یہ لیڈی اقتدار کب کب آتی ہے یہاں؟" زینت نے پوچھا۔

"اف تم کیا کسی تفتیشی افسر کی طرح سب پوچھے جارہی ہو۔"

زینت کی آنکھوں میں سایہ گزرا۔

"آتی ہیں روز ہی۔ تمہیں نظر نہیں آتی۔ سیدھا نیچے چلی جاتی ہیں. بیسمنٹ میں۔"

بیسمنٹ کا سن کے زینت مزید چونکی۔

"بیسمنٹ؟" زینت جانتی تھی کہ اسے مزید سوال نہیں کرنے چاہیے تھے لیکن یہ والا بم پھٹنے کے بعد وہ ایک اور سوال پوچھے بغیر رہ نہیں سکی۔

"ہاں۔ بیسمنٹ۔ وہاں پر ملاقاتی کمرہ بھی ہے۔ جہاں پر اس کاروبار کو چلانے والے ملتے ہیں۔ دیگر معاملات وہیں پر ڈسکس کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی ہم سب کو بھی کسی ضروری کام کے لیے بیسمنٹ میں مطلوب کیا جاتا ہے۔"

زینت کے دماغ میں پوری تصویر بن چکی تھی۔ تمام رُخ واضح ہوئے۔ ہر پہلی کا جواب اسے مل گیا تھا۔ وہ ٹیک لگا کر بیٹھی۔ آنکھیں بند کیے کچھ سوچتی رہ گئی۔

آج عبد الحمید کو دینے کے لیے، اس کے پاس سب سے اہم خبر تھی۔

☆☆☆

"تو کیا کہنا چاہو گے عبد الحمید؟"

ہمیشہ کی طرح اسے ساری تفصیلات سے آگاہ کر کے وہ اس کی رائے مطلوب کرنے لگی۔ احمد دوسری طرف کسی گہری سوچ میں تھا۔

"ملاقاتی کمرہ۔ انٹرسٹنگ۔ زینت ہمیں اس ملاقاتی کمرے میں جانا ہو گا۔" احمد نے کہا۔ زینت اٹھ بیٹھی۔ "بھلا یہ کیسے ہو گا؟" زینت نے پوچھا۔

"تم عائشہ سے اس ملاقاتی کمرے کا راستہ نکلواؤ۔ بس کسی بھی طرح سے، اس سے سیدھا سیدھا ہی پوچھ لینا، ضد کر کے۔ مجھے نہیں لگتا اسے شک ہو گا۔ وہ ہماری سوچ سے بھی زیادہ بیوقوف ہے۔ لیکن اس سے بس اگلوا لینا۔ ٹھیک؟"

"ٹھیک ہے۔ میں کوشش کروں گی۔" زینت نے کال رکھ دی۔

☆☆☆

عائشہ سے کچھ بھی اگلوانا' زینت کے لیے مشکل نہ تھا۔ اس نے باتوں باتوں میں اس سے ہر تفصیل لے کر دماغ میں محفوظ کی۔ وہ رات کے وقت، بیڈ پہ پیٹ کے بل لیٹی احمد کو فون پر سب کچھ بتا رہی تھی۔

”تو یعنی۔ ایک زینا نیچے اترنا ہے۔ سٹور روم میں داخل ہونا ہے۔ ادھر ایک لفٹ ہے۔ ایک پاسورڈ ہے 1986 اور یہ لفٹ ہمیں بیسمنٹ تک لے جائے گی۔“ احمد زینت کی ساری باتیں دہرانے لگا۔

”اس کے علاوہ میں نے عائشہ سے کہا تھا کہ مجھے وہاں لے کر جاؤ تو اس نے بتایا کہ ممکن نہیں کیونکہ اس راستے پر کیمرا ز لگے ہوئے ہیں، جو کہ نیلوفر کے کمپیوٹرز سے کنیکٹڈ ہیں۔“ زینت فخریہ سے انداز میں سب بتا رہی تھی۔ اس کی مغرور ناک مزید اٹھ گئی تھی۔

”یہ عائشہ تو میری سوچ سے بھی زیادہ بیوقوف نکلی۔ اف۔۔!“ احمد سے ہنسے بغیر رہا نہ گیا۔

”اس کا مطلب ہے، ہم جلد ملنے والے ہیں۔“ احمد ہنسی روکتے ہوئے بولا۔ زینت بھرپور مسکرا دی۔

”عبدالحمید۔ کیا میں تم سے ایک درخواست کر سکتی ہوں؟“ زینت التجائیہ سے انداز میں بولی۔

”ضرور۔“ احمد کا انداز ہمیشہ کی طرح برفیلا تھا۔

”کیا تم اس ملاقات میں اپنا چہرہ مجھے دکھا سکتے ہو؟ میں اس آپریشن کو ختم کرنے سے پہلے تمہارا چہرہ دیکھنا چاہتی ہوں۔“ زینت آواز میں آس لیے بولی۔

”تمہیں میرا چہرہ دیکھ کر بھلا کیا ملے گا؟“ احمد نے اپنا لہجہ بے تاثر رکھا۔ مسکراہٹ دبالی تھی۔

کھڑوس عبدالحمید۔ ہنہہ۔ زینت نے سوچ کر سر جھٹکا۔

”تم سے شناسائی کا احساس ہوتا ہے، عبدالحمید۔ تمہارے ہر انداز سے کوئی یاد آتا ہے۔ میں بس تصدیق کرنا چاہتی ہوں۔“

احمد کے چہرے پر نرم مسکراہٹ بکھری۔

''ٹھیک ہے۔ دکھادوں گا۔ اب خوشی کے مارے بہہ نہ جانا۔ میرا پورا پلان سنو اب تم!'' وہ ایک دفعہ پھر سے اپنے عبدالحمید موڈ میں آگیا تھا۔ زینت زیرلب ہنس دی۔ وہ ہمیشہ کی طرح پلان سننے کے لیے تیار تھی۔

☆☆☆

(''تمہاری طرف میں ایک یو ایس بی بھیجوں گا۔ تمہیں اس یو ایس بی کو کسی بھی طرح سے نیلو فر کے کمپیوٹر میں لگانا ہے۔ اور اس میں ایک سافٹ ویئر کو ڈاؤن لوڈ کر دینا جو کہ میں نے بنایا ہے۔ اس کے ذریعے میں نیلو فر کے کمپیوٹر کو دور سے کنٹرول کر سکوں گا۔'')

زینت نیلو فر کے آفس کے پاس منڈلا رہی تھی۔ نیلو فر بریک کے لیے گئی ہوئی تھی اور کمرے کی صفائی ہو رہی تھی۔ جیسے ہی صفائی والی کمرے سے باہر آئی زینت کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا اس لیے وہ تیز تیز ہاتھ چلا رہی تھی۔ زینت نے یو ایس بی کمپیوٹر میں لگائی اور سافٹ ویئر انسٹال کرنا شروع کیا۔ سافٹ ویئر انسٹال ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ وہ فوراً کام ختم کر کے کمرے سے باہر بھی آگئی تھی۔

ایک مرحلہ تو کم سے کم پورا ہوا تھا۔ آگے کئی مرحلے باقی تھے، جو اس مرحلے سے کئی گنا مشکل تھے۔

(''اب تم مجھے بتاؤ یہ نیلو فر کب تک ہسپتال میں رکتی ہے؟'' احمد نے زینت سے پوچھا۔

''دس بجے کے بعد وہ اکثر چلی جاتی ہے۔'' زینت نے حساب لگاتے ہوئے بتایا۔

”تو میں دس بجے کے بعد آؤں گا۔ مگر مجھے ڈر ہے کہ یوں آنے سے ہم پکڑے جائیں گے۔“ احمد فکر مند تھا۔

”نہیں عبد الحمید۔ آج گیارہ بجے کے قریب کسی کا بائی پاس ہونا ہے۔ تم اس ہی وقت آ جانا۔ تمہیں بس یونی فارم پہننا ہو گا۔ ٹھیک؟“ احمد کو یہ آئیڈیا اچھا لگا۔

”ٹھیک ہے۔ ہم گیارہ بجے کے قریب ملیں گے۔“)

احمد، سر پر کالی پی کیپ پہنے عافیت زندگی کی عمارت میں داخل ہوا۔ اس نے چہرے پہ فیس ماسک لگایا ہوا تھا۔ ایک کمرے سے زینت نکلی۔ احمد نے اس پر سرسری نظر ڈالی اور ترنت ہٹالی۔

زینت ہاتھ میں ایک شاپر لیے تیزی سے احمد کی طرف بڑھی۔ احمد ساکن، اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ زینت احمد کے سامنے سے گزری، اتنی تیزی میں اس نے شاپر احمد کے ہاتھ میں تھمایا اور دور چلی گئی۔

احمد ہاتھ میں شاپر تھامے واشروم تک گیا۔ اس نے یونی فارم پہنا۔ سر پر ٹوپی لگائی، چہرے پہ سر جیکل ماسک۔ ہاتھوں میں گلوز اور ایپرن بھی پہن لیا۔

وہ واش روم سے باہر نکلا۔ زینت باہر تھی۔ اس نے بھی آپریشن تھیٹر کی مناسبت سے لباس پہن لیا تھا۔

”صاف بات ہے عبد الحمید، ڈاکٹر بن کے برے نہیں لگو گے۔“ زینت شوخ سے انداز میں اسے دیکھتے تبصرہ کرنے لگی۔ وہ واقعی پر کشش لگ رہا تھا۔ احمد ماسک کے پیچھے سے مسکرایا۔ آنکھیں البتہ سرد ہی رکھیں۔

"کام پر دھیان دو۔" ہمیشہ کی طرح، جواب بدلحاظی سے دیا۔

زینت کو جیسے کچھ برا نہ لگا۔ اسے عبدالحمید کے کھڑوس سے انداز کی عادت ہونے لگی تھی۔

وہ دونوں اب زینے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مگر تب ہی پیچھے سے انہیں کسی نے پکارا۔

"ارے۔ کہاں جارہے ہو؟" احمد کا دل تیزی سے دھڑکا۔ چہرے پر گھبراہٹ پھیلنے لگی۔

"پرسکون رہو۔" زینت احمد کے کان میں بولی اور پیچھے مڑ کر نرس کو دیکھنے لگی۔ احمد نے بہر حال حرکت نہ کی۔

"سٹور سے کچھ چیزیں لینے۔ بائی پاس ہونا ہے۔" وہ عام سے انداز میں بولی۔

"سب لے لیا ہے۔ سیدھا آپریشن تھیٹر چلو۔" نرس حکم دینے والے انداز میں بولی۔

احمد کی سانسیں بے ربط ہوئیں۔

"ڈیم اٹ!" احمد زیر لب بڑبڑایا۔

"کچھ نہیں ہو گا۔ میرے ساتھ چلو۔" اس نے احمد کو تسلی دی

احمد اس کا پیچھا کرنے لگا۔ وہ دونوں آپریشن تھیٹر میں داخل ہوئے جہاں پر ڈاکٹرز اور نرس موجود تھے۔ اینس تھیزیا لگا کر پیشنٹ کو بے ہوش کیا گیا تھا۔ کمرے میں عجیب و غریب بڑی بڑی سی مشینیں موجود تھیں جن کی احمد کو الف بے تک نہ معلوم تھی۔ وہ اس سب کے لیے بالکل بھی تیار نہ تھا۔

اچھے سے سینیٹائیز کرنے کے بعد آپریشن شروع ہوا۔ احمد زینت کے پیچھے کھڑا، سب منظر دیکھ رہا تھا۔ اسے سمجھ ہی نہیں آرہا تھا کہ یہ سب ہو کیا رہا تھا۔ دوسری طرف زینت آپریشن میں نرسز کو ہدایات دے رہی تھی، اور ہدایات لے بھی رہی تھی۔ وہ اپنا ہوم ورک کر کے آئی تھی۔

"پیڈلز (paddles) دو۔" ڈاکٹر نے پیشنٹ کے سینے پہ کٹ لگاتے کہا۔ احمد ایک دم سے بوکھلا گیا ۔ تمام نرسز اور ڈاکٹرز کی نظریں اسی کی طرف تھیں جیسے وہ اس سے ہی یہ کام کرتے دیکھنا چاہتے تھے۔ احمد بری طرح گڑبڑایا۔

احمد طبی آلات کی ٹیبل تک گیا، اس کا ہاتھ جس چیز پہ گیا اسے اٹھا لایا۔ دل ہی دل میں خود کو ملامت کرنے لگا۔ اسے بائی پاس کے بارے میں معلومات اکٹھی کر لینی چاہیے تھی۔

"یہ پیڈل ہے؟" ڈاکٹر نے برہمی سے کہا۔ ذلت آمیز قہقہہ بلند ہوا۔

زینت اسی وقت تیزی سے ٹیبل تک گئی اور پیڈل اٹھا کر لائی۔

"یہ لیجیے۔ یہ نیا ہے، اس لیے کنفوژ ہو گیا۔"

وہ احمد کو سختی سے دیکھتے بولی۔ ڈاکٹر پیڈلز تھام کر باقی کا آپریشن کرنے لگے۔

آخر کار آپریشن مکمل ہو گیا تھا۔ احمد کی سانسیں جیسے بحال ہوئیں۔ وہ عجیب و غریب مناظر آخر کار اختتام پذیر ہوئے۔

زینت اور احمد بیسمنٹ کے راستے پہ گامزن تھے۔ ان دونوں نے زینہ اترا۔ سٹور روم کا دروازہ لاکڈ تھا۔ زینت نے پینٹ کی جیب سے پن نکالی اور دو منٹ کے اندر لاک کھول دیا۔

”یہ سب ہمیں سکھایا جاتا ہے عبدالحمید۔ تم خوش قسمت ہو کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ وہ احمد پر اپنی قابلیت جتانا نہ بھولی۔

”ایک سیکنڈ رکو۔ مجھے ایک کام ہے۔“ احمد اندر جانے ہی والا تھا کہ زینت بولی۔

وہ سٹور روم کے اندر گئی۔ اس نے دروازہ پیچھے سے لاک کیا۔ ڈھیلی ڈھالی کرتی اوپر کی۔ اس نے اپنے جسم پہ ایک فوم لگایا ہوا تھا جس پر ڈکٹ ٹیپ سے دو پستول چپکائی ہوئی تھیں۔ اس نے ڈکٹ ٹیپ کھینچ کر اتارا اور پستول آزاد کیں۔ دروازہ کھول کر سر نکالا، اور احمد کو دیکھا۔

”اندر آؤ۔“

احمد کے اندر آتے ہی اس نے پستول احمد کو تھما دی۔ وہ جانتی تھی یہ چیز تو عبدالحمید کو متاثر کر کے ہی دم لے گی۔

احمد بھی قدرے حیران ہوا۔ آنکھیں حیرت چھپانے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

”یہ کہاں سے ملیں؟“ احمد نے پوچھا۔ زینت ہنس دی۔

”جادوگر اپنی ٹرکس کبھی نہیں بتاتا، عبدالحمید۔“ زینت مسکراتے ہوئے گویا ہوئی۔

وہ دونوں اسٹور روم میں سیدھ میں چلتے گئے۔ دائیں اور بائیں طرف بڑے بڑے شیلوز تھے۔ دیوار پر لیڈی اقتدار کی تصویر تھی جو احمد نے کھسکائی۔

”بڑی ہی کوئی سیلف آبسیسڈ عورت ہے یہ۔“ احمد منہ چڑاتے بولا۔

زینت زیرلب ہنس دی۔

دیوار گیر پینل پر پاسورڈ لگایا۔ لفٹ مخصوص آواز کے ساتھ اوپر آنے لگی۔

”تم نے کہا تھا اپنا چہرہ دکھاؤ گے۔“ زینت نے لفٹ میں سوار ہو کر کہا۔

”ٹھیک ہے۔ نیچے چل کر۔“ لفٹ رک گئی۔ دروازہ کھلنے پر ہال نمایاں ہوا۔ وہی، تین دروازوں والا حال۔

چھت پر لگی بتیوں کی وجہ سے وہ چمک رہا تھا۔ وہ دونوں ہال میں چل رہے تھے۔

”میں تمہیں دیکھنے کے لیے بے تاب ہوں، عبدالحمید۔“ زینت سے اب صبر نہیں ہو رہا تھا۔

احمد خوش دلی سے ہنس دیا۔

وہ رک گیا۔ زینت بھی رک گئی۔ وہ اب زینت کی طرف مڑا۔ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔

”تم نے کہا تھا تمہیں مجھ سے شناسائی کا احساس ہوتا ہے۔“ احمد ماسک کے پیچھے مسکرایا۔

”میں وہیں ہوں جو تم سمجھ رہی ہو۔“ احمد نے اپنا ماسک اتارا۔

زینت کی آنکھیں وارہ گئیں۔ وہ خوشگواری حیرانی کے ساتھ اسے تکتی گئی۔

”احمد!“ وہ بے اختیار بولی۔ ”یہ تم تھے؟“

”ہاں مریم۔ ہمیشہ سے ہی، یہ میں تھا۔“ احمد اسے مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔

”یونیورسٹی کے بعد تم یہ کیسے بن گئے؟ مطلب تم انویسٹی گیٹر کیسے بنے؟“ زینت کو تجسس ہوا۔

”میں کوئی انویسٹی گیٹر نہیں ہوں۔ اس سب کی لمبی کہانی ہے۔ ابھی میں کچھ نہیں بتا سکتا۔“ احمد نے بس سرسری سا کہا۔ زینت کی بانچھے کھل اٹھی تھیں۔

احمد، نسٹ میں اس کے ساتھ پڑھتا تھا۔ اتنے سالوں بعد دونوں یوں مل رہے تھے۔ وہ دل سے خوش ہوئی تھی۔

”ملاقاتی کمرہ۔“ اس نے دائیں دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ والا ہے۔“

احمد نے سر اثبات میں ہلایا۔ دونوں اب اس دروازے کی طرف چل دیے۔ دروازہ کھولنے کے لیے زینت کو اپنی صلاحیتوں کا استعمال کرنا پڑا۔

وہ دونوں اب کمرے میں داخل ہوئے جو کہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ زینت نے سوئچ پر بٹن دبا کر بتیاں جلائیں۔ وہاں چار کرسیاں گول دائرے کی صورت لگی ہوئی تھیں۔

”چار کرسیاں۔ یہاں چار لوگ ملتے ہیں۔“ احمد نے اپنی تھیوری پیش کی۔

زینت نے سر اثبات میں ہلایا۔

”اب کیا کرنا ہے؟“ زینت نے پوچھا۔ احمد کمرے میں آنکھیں گھماتے پورے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

اس کی نگاہ اے سی پر ٹھہری۔ وہ بیگ سے کچھ نکالنے لگا۔ وہ چکور سا آلہ تھا۔

”یہ ایک ٹیپ ریکارڈر ہے۔ میں ان لوگوں کی گفتگو سننا چاہتا ہوں۔“

زینت ریکارڈر کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

''یہ میں اے سی میں فٹ کر دوں گا۔'' احمد نے زینت کو بتایا۔

''اور اس کی چارجنگ؟'' زینت کو عجب ہوا۔

''اس کا انتظام ہے۔ میں اس کو اس طرح سے سیٹ کرتا ہوں کہ اے سی کے ساتھ ساتھ اس ڈیوائز کو بھی کنیکشن مل جائے گا۔ یوں یہ ہر وقت ہی اپنا کام کرتا رہے گی۔'' احمد سوچتے ہوئے بولا۔

وہ کرسی پر چڑھا۔ آدھے گھنٹے رک کاروائی جاری رکھی، اور آخر کار وہ آلہ اپنی جگہ پر لگ چکا تھا۔

☆☆☆

کام ختم کر کے دونوں چپ چاپ سب چیزیں جگہ پر لگا کے عافیت زندگی کی عمارت سے چلے گئے۔

دونوں احمد کی گاڑی پہ سوار تھے۔ احمد اسے اپنے حصے کی کہانی سنا رہا تھا۔

''ویسے احمد۔ علی نے بھی کچھ غلط نہیں کیا۔ تم ایک بہترین پرائیویٹ انویسٹی گیٹر بن سکتے ہو۔'' کہانی سننے کے بعد زینت بولی۔ احمد کے چہرے پر ستائش ابھری۔

''کیا واقعی؟'' احمد کا انداز عام سا تھا۔

''بالکل! یہ سب تمہارے پلانز تھے۔ تم باریکی سے ہر چیز کا جائزہ لیتے ہو۔ بس اپنی گھبراہٹ پر تھوڑا کام کر لو۔ تم آج جلدی گھبرا گئے تھے۔ اپنے اسٹریس پر کام کرو تو تم سے بہتر کوئی نہیں۔'' زینت پرجوشی سے اسے بتا رہی تھی اور وہ مسکرا کر اسے سن رہا تھا۔

سالوں بعد کسی پرانے دوست سے بات کرنا کتنا خوشگوار معلوم ہوتا ہے نا؟

''اب اس کیس میں میری دلچسپی اور بھی بڑھ گئی ہے احمد۔ ہم ضرور تمہارے بھائی اور عثمان کو انصاف دلوائیں گے۔'' زینت آواز میں عزم لیے بولی۔ چہرہ اب سنجیدہ تھا۔ احمد کے تاثرات بھی نرم پڑے۔

''تم اپنے بارے میں بھی بتاؤ۔ کیسے ہو گیا یہ یعنی؟'' احمد نے اوپر سے نیچے زینت کو دیکھا۔ ''تم تو نازک سی پری بنی پھرتی تھی۔ پھر یہ، اتنی سخت جان، بندوقیں استعمال کرنے والی کیسے بن گئی؟''

زینت کے ذہن میں کئی یادوں نے وار کیا۔ روح کے زخم کھرچ گئے۔

''حالات نے مجھے یہ بنا دیا احمد۔'' وہ اداس سا مسکرائی۔ ''تم جانتے ہو میری اماں اور میرے بابا کو کتنی بے دردی سے مارا گیا تھا۔ میں انصاف کے لیے دربدر بھٹکی تھی، احمد۔ مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ میں اس وقت ہی ٹھان چکی تھی کہ مجھے انصاف نہیں ملا تو کیا ہوا، میرے جیسے جتنے بھی لوگ ہوں گے میں انہیں انصاف دلواؤں گی۔ میں ان کی جنگیں لڑوں گی۔ اس کے بعد یہ فورس جوائن کرنے کا موقع ملا۔ خدا مجھ پہ مہربان ہوا۔ شروع میں بہت مشکل ہوئی۔ بہت سخت حالات میں رہنا پڑتا تھا اور بہت ہی سخت ٹریننگ تھی۔ مگر اس سب کے بعد میں اپنا سب سے مضبوط ورجن بن گئی، احمد۔'' زینت مختصر سے الفاظ اور جملوں کا استعمال کر کے اسے سب بتاتی گئی۔ یہ چیز اس میں اور احمد میں مشترکہ تھی۔ وہ زیادہ بڑی بڑی باتیں نہیں کرتی تھی۔ وہ خیالی دنیا میں جینے والی لڑکی نہیں تھی۔ اسے اس دنیا میں، اصلی دنیا میں جہاں ہر انسان کے کئی چہرے ہوتے ہیں، اسے اس ظالم دنیا میں رہنے کے طور طریقے آتے تھے۔

''تو عبدالحمید۔'' زینت نے ماحول کا تناؤ گھٹانے کے لئے انداز مزاحیہ بنایا۔ ''آگے کیا کرنا ہے؟''

”میں کچھ وقت ان سب کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ لوگ کیا کیا کرتے ہیں۔ تم بس چپ چاپ ہسپتال میں کام کرتی رہو۔ اگر کوئی ضروری بات پتا چلے تو مجھے اپڈیٹ کرنا۔“

☆☆☆

دو ماہ بعد:

احمد کو ان سب کی گفتگو سنتے دو ماہ بیت چکے تھے۔ ریکارڈر میں کچھ مسئلہ تھا جس کی وجہ سے آواز پھٹ پھٹ کے آتی تھی۔ وہ آوازوں میں تفریق نہیں کر پاتا تھا۔

ان دو ماہ میں بہت کچھ پتا چلا۔ سب سے پہلے تو اسے عبد اللہ سلطان کے ہیروں والے معاملے کا علم ہوا۔ اس کے بعد اسے ایک گودام کا ایڈریس بھی مل گیا تھا جہاں انسان قید تھے۔ احمد اب اگلا قدم اٹھانے کے لیے تیار تھا۔

اس نے ایک دن زینت کو بھی اپنے لائحہ عمل کے بارے میں بتانے کا فیصلہ کیا اور اسے کال ملائی۔ کچھ ہی دیر میں زینت نے کال اٹھالی تھی۔

”کیسے ہو، عبد الحمید۔“ زینت دوسری طرف سے چہکی۔

”اب ہم اگلا قدم لینے کے لیے تیار ہیں زینت۔“ اس نے حال چال بتانا ضروری نہ سمجھا۔

”اپنی ایجنسی والوں سے کہو کے وہ سب تیاری پکڑ لیں۔ مجھے ان کے ایک گودام کا ایڈریس مل گیا ہے‘ جہاں انسان قید ہیں۔“ احمد کا انداز مصروف سا تھا۔

”یہ تو بہترین ہو گیا، احمد۔“ زینت کی آواز ہلکی ہو گئی مگر آواز میں دبا دبا جوش برقرار تھا۔

”یہ ان منحوسوں کے لیے کتنا ہی بڑا دھچکا ہو گا؟“ وہ دبا دبا سا ہنسنے لگی۔

”بس تم اپنی ایجنسی والوں کو کہہ دینا۔ ٹھیک؟“ احمد بولا۔

”ہاں۔ لیکن اس طرح کے آپریشن کی تیاریاں کرنے میں وقت لگتا ہے، احمد۔ ہمیں اس وقت تک ان لوگوں کو بھٹکانا ہو گا تاکہ ان کی توجہ ہماری طرف نہ جائے۔ عموماً یہ مافیاز بہت طاقتور ہوتے ہیں، اور اس طرح کے آپریشنز کے لیے تیار رہتے ہیں۔ تمہیں اپنی طرف سے کوشش کرنی پڑے گی، احمد۔“

احمد کے چہرے پر سوچ کا تاثر ابھرا۔ وہ اپنے دماغ پہ زور دیتے ہوئے کوئی ترکیب سوچنے لگا۔ اور اسی وقت اس کی دماغ میں کچھ سوجھا۔

”ہو جائے گا۔ تم چپ چاپ اپنا کام کرو۔ ان کو بھٹکانے کا کام میرا ہے!“ احمد پر اطمینان انداز میں بولا اور اس نے فون رکھ دیا۔

اب نئے انداز میں کھیل کو ترتیب دینے کا وقت تھا۔

☆☆☆

احمد راحیلہ صدیقی کے دفتر میں موجود تھا۔ راحیلہ کنپٹی پر ہاتھ رکھے، کچھ بوجھل سی نظر آ رہی تھی۔ ڈیسک پہ ایک ریکارڈر رکھا ہوا تھا جس پر عثمان کی احمد سے آخری گفتگو چل رہی تھی۔

”مجھے نہیں آنا چاہئے تھا۔ یہ لوگ دھوکے باز نکلے۔ ہمیں بیچ میں چھوڑ کر چلے گئے۔ یہاں پر ہر کسی کو مار دیا جا رہا ہے۔ سب ہلاک ہو گئے ہیں۔ ہم کچھ ہی بچے تھے اور اب مجھے لگ رہا ہے صرف میں ہی بچ گیا ہوں۔ مجھے نہیں پتا میں زندہ بچوں گا بھی یا نہیں۔“

دفتر میں سوگواریت کا راج قائم تھا۔

راحیلہ کی برداشت ختم ہوگئی۔ اس نے ٹیپ ریکارڈر اگلے لمحے بند کردیا۔ وہ ایسے معاملات کو لے کر بہت حساس تھی۔ اس نے کرب کے مارے آنکھیں میچیں۔ ہاتھ کھڑے کیے اور ان کی مٹھی بنائی۔ اس کے چہرے پہ شدید نفرت جھلک رہی تھی۔

گہری سانسیں لینے کے بعد اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور نظر احمد پہ ڈالی جو کہ پرسکون سا بیٹھا تھا۔

''میرے پاس آنے سے پہلے آپ کہاں کہاں گئے ہیں؟'' راحیلہ برے موڈ کے ساتھ بولی۔

''بہت نیوز چینلز کے پاس۔ مگر کسی نے نہ سنی۔'' احمد نے شانے اچکائے۔

''سب بکے ہوئے ہیں۔'' راحیلہ کے لہجے میں کڑواہٹ بھری پڑی تھی۔

''مجھے اندازہ ہوگیا تھا۔ یہ لوگ یقیناً بہت طاقتور ہیں اور ان کے ہاتھ میڈیا تک پھیلے ہیں۔''

''اس کے گھر والے کیسے ہیں؟'' راحیلہ نے دراز سے نوٹ بک اور قلم نکالا اور کچھ لکھنا شروع کیا۔

''بس گزارا کر رہے ہیں۔'' احمد کا لہجہ نیم اداس ہوا۔

''تو آپ ان کے اخراجات دیکھ رہے ہیں؟''

احمد نے مختصر سا سر اثبات میں ہلایا۔

”ٹھیک ہے۔ میں کچھ این جی اوز کو جانتی ہوں جو کہ ان کی مدد کرلیں گی۔ باقی اگر کوئی اونچ نیچ ہو جائے تو آپ دیکھ لیجیے گا۔ اور وہ آفس وغیرہ۔ وہ اب تک موجود ہیں؟“

احمد نے سر نفی میں ہلایا۔

”نہ وہ آفس موجود ہے نہ ہی وہ انسٹاگرام اکاؤنٹ۔ مگر میں اس آفس کی تصویریں کھینچ چکا تھا۔ انسٹاگرام اکاؤنٹ کے سکرین شاٹس موجود ہیں میرے پاس۔“ احمد نے تصاویر کھول کر راحیلہ کو دکھائیں۔

”ٹھیک ہے۔ چونکہ میں کسی چینل میں کام نہیں کرتی‘ اس لیے یہ سب ہمیں سوشل میڈیا کے ذریعے کرنا ہوگا۔ حالانکہ ہماری آواز زیادہ دور نہیں پھیلے گی، مگر کم از کم تھوڑا بہت شعور تو پھیلے گا۔ آپ عثمان کے گھر والوں کو تیار کریں۔ میں کچھ این جی اوز کی مدد لے کر سوشل میڈیا کیمپین لانچ کروں گی۔“

راحیلہ کا لائحہ عمل، احمد کو بھایا۔

☆☆☆

راحیلہ صدیقی نے این جی اوز کے ساتھ مل کے سوشل میڈیا پر ایک کیمپین لانچ کی۔ کیمپین کو شہرت ملی تھی مگر اتنی زیادہ نہیں۔ اس کے باوجود یہ شہرت اس مافیا کو کچھ عرصے کے لیے اپاہج کرنے میں کامیاب ہوئی۔ سوشل میڈیا کیمپین کے بعد ان سب نے دیگر دفتر بند کر دیے۔ اپنے تمام سوشل میڈیاز اکاؤنٹ بھی ڈلیٹ کر دیے۔ اور یہی ان سب کی کامیابی تھی۔ جو نقصان ان طاقتوں تک پہنچانا تھا، وہ پہنچ گیا تھا۔

یہ راحیلہ سے احمد کی ملاقات کے ایک ہفتے بعد کا واقعہ ہے۔

احمد آفس میں اپنے کیبن میں بیٹھا کام کر رہا تھا جب اس کا ایک کالیگ اس کے پاس آیا۔ کالیگ نے احمد کو بتایا کہ باس اسے مطلوب کر رہے ہیں۔

احمد نے اپنا کام سمیٹا اور باس کے کمرے تک گیا۔

کنٹرول چیئر پر احمد کے باس براجمان تھے۔ ان کے سامنے، احمد سے پشت کیے شمس کھڑا تھا۔ احمد کھڑکی پر اس کا عکس دیکھ چکا تھا۔

دفعتاً احمد کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھری۔ مبہم سی معنی خیز مسکراہٹ۔

"بہت شکریہ اکرام صاحب۔ اب آپ مجھے اس کے ساتھ اکیلا چھوڑ دیں۔"

احمد کے باس اپنی کرسی سے اٹھے۔ ان کے چہرے پہ برہمی پھیلی ہوئی تھی۔ انہوں نے احمد کے اوپر "یہ سب تمہاری وجہ سے ہو رہا ہے" والی نظر ڈالی، اور کمرے سے رخصت ہو گئے۔ دروازہ ٹھپ کی زوردار آواز کے ساتھ بند ہوا۔

شمس اور احمد کمرے میں تنہا تھے۔

کمرے کی فضا تناؤ سے دوچار تھی۔

احمد چہرے پر اطمینان لیے کھڑا تھا۔ اس کا ہر انداز پرسکون تھا۔ وہ شمس کی آنکھوں میں سرد سی نگاہ ڈالے ہوئے تھا۔

تناؤ شدید ہوتا گیا۔ خاموشی کا بسیرا اس کمرے میں وحشت گھول رہا تھا۔

''میں نے تمہیں کہا تھا کہ تم اس سب سے دور ہو جاؤ! مگر تم اپنی جان کے دشمن کیوں بنے ہوئے ہو، لڑکے؟'' شمس چبا چبا کر بولا۔

مگر احمد نہیں ڈرا۔ وہ اب بھی پر سکون سا کھڑا رہا۔ آنکھوں کی سرد مہری شدید ہوئی۔

''میرا نام۔'' احمد نے قدم شمس کی جانب بڑھائے۔ شمس تعجب سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ ''احمد یوسف ہے!'' وہ ہر لفظ پہ زور دے دے کے بولا۔ شمس لاجواب سا رہ گیا۔ وہ مرد اس سے ڈرتا، اس سے دبتا دکھائی نہیں دے رہا۔ شمس کا حلق تو کیا معدہ بھی کڑوا ہو گیا تھا۔

''دیکھو میں تمہیں۔۔'' شمس کہنے ہی والا تھا کہ احمد زور سے ہنس دیا۔ شمس تذبذب کا شکار ہوا۔ الفاظ حلق میں دم توڑ گئے۔

''تم چپ ہو جاؤ۔ تم اپنے وہی گھسی پٹی باتیں کہہ کر ڈرانے کی کوشش کرو گے۔ میں تمہارا اور اپنا وقت بچاتا ہوں۔ میں نہیں ڈرنے والا۔ نہ ہی تم یہاں پر اپنی مرضی سے آئے ہو، تم مجھ سے اس لیے مل رہے ہو کیونکہ میں تم سے ملنا چاہتا تھا۔ میں تمہارا بہت دنوں سے انتظار کر رہا تھا شمس۔'' احمد کا انداز تمسخرانہ تھا۔

شمس کی آنکھیں بے یقینی سے پھیلیں۔ چہرے کا ہر زاویہ بگڑتا چلا گیا۔ گال سرخ ہو گئے۔

''کیا بکواس ہے یہ؟'' شمس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ احمد کے اوپر تھپڑ برسا دے۔

''میں چاہتا تھا کہ تم مجھ سے ملو شمس۔ بلکے میں سوچ رہا تھا کہ کچھ زیادہ ہی دیر ہو گئی۔ اس بات کا اندازہ لگانا تم لوگوں کے لیے مشکل تو نہیں ہو گا کہ راحیلہ صدیقی کو وہ ٹیپ میں نے دی تھی۔ وہ ٹیپ میں

نے کیوں لیک کی، شمس؟ کیونکہ میں تمہارے مالکوں سے بات کرنا چاہتا تھا۔ میں اپنا پیغام ان تک پہچانا چاہتا تھا۔" احمد کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اطمینان سے کہے جا رہا تھا۔

شمس کے ماتھے پر نا جانے کتنی سلوٹیں در آئیں۔ اس نے بے ساختہ سے انداز میں دو قدم پیچھے بڑھائے۔

"اب تم میری بات چپ چاپ سنو۔ اپنے مالکوں سب بتانا۔ ان سے کہنا کہ۔ احمد سب جانتا ہے! احمد تم لوگوں کے اعضاء کے اس کالے کاروبار کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔"

شمس کے اوپر جیسے پہاڑ آ کے گر گیا۔ اس نے دو قدم مزید پیچھے بڑھائے۔ رنگت سفید پڑی۔

"اور بھی بہت کچھ ہے جس کے بارے میں 'میں واقف ہوں۔" احمد کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

"اپنے مالکوں سے کہنا کہ 'وہ ہیرے بہت ہی خوبصورت تھے۔"

شمس کے ہونٹ کپکپانے لگے۔ خون خشک ہوا۔ ناممکن! شمس کی سانسیں بے ربط ہوئیں۔

"اگر عبداللہ چوری نہ کرتا تو شاید میں ہی انہیں چوری کر لیتا۔ چچ چچ۔" احمد نے مصنوعی افسوس سے سر جھٹکا۔ اوہ خدایا، یہ کیا ہو رہا تھا؟ شمس کے ہاتھ لرزے۔ اس کے سر پر دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ سامنے کھڑا مرد اس کی سوچ سے بھی زیادہ طاقتور تھا۔ وہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

وہ الٹے قدم کمرے سے نکل گیا۔

کچھ دیر بعد احمد کے باس اندر آئے جو چہرے پر برہمی لیے اسے دیکھ رہے تھے۔

"آپ کے کچھ کہنے سے پہلے۔" احمد چہرے پہ تمازت لیے مدھم سی آواز میں بولا۔ "میں یہ جاب چھوڑ رہا ہوں۔ اللہ حافظ۔" وہ کہہ کر آفس سے نکل گیا۔ احمد کے باس پل بھر کے لیے اسے حیرانی سے دیکھتے گئے۔

خس کم جہاں پاک۔۔۔ انہوں نے دل ہی دل میں سوچا۔

☆☆☆

لیڈی اقتدار، شمس کے ساتھ نیلوفر کے آفس میں موجود تھی۔ نیلوفر اپنی سربراہی کرسی پر براجمان تھی جب کہ لیڈی اقتدار اس کی مخالف سمت پوری شان سے بیٹھی ہوئی تھی۔ شمس لیڈی اقتدار کے عقب میں کھڑا ان کو احمد سے ملاقات کی تمام تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا۔

نیلوفر اندر ہی اندر سہم گئی تھی۔ چہرے پہ رتی برابر تناؤ نہ تھا۔

"اوہ گاڈ! اس کو یہ سب کیسے پتا چلا، لیڈی؟" نیلوفر کانپ اٹھی تھی۔

لیڈی اقتدار نے آبرو اچکائے۔

"بہت عرصے بعد ایک طاقتور حریف ملا ہے۔" وہ برفیلے بے، تاثر سے لہجے میں بولی۔

نیلوفر چونک گئی۔ اسے لیڈی اقتدار سے اس طرح کی بات کی امید نہ تھی۔

"وہ صرف اور صرف اپنے بھائی کی وجہ سے ہمارے پیچھے ہے، شمس۔ خیر تم فی الحال جاسکتے ہو۔"

شمس سر کو خم دے کر چلا گیا۔

لیڈی اقتدار اور نیلوفر کمرے میں اکیلے تھے۔ سرد سرمئی آنکھیں نیلوفر کا معائنہ کر رہی تھیں۔

"اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس لڑکے کو یہ سب پتا کیسے چلا، نیلوفر۔" لیڈی اقتدار اپنے دماغ میں ہر زاویے پر نظر دوڑانے لگی۔

"یہ ساری معلومات حساس ہیں۔ ہسپتال میں داخل ہوئے بغیر یہ باتیں کسی کو پتا نہیں چل سکتیں۔" سرد سی نظریں اب تک نیلوفر کا جائزہ لے رہی تھیں۔ نیلوفر ان نظروں کا مطلب نہ سمجھ سکی۔

"میں سمجھی نہیں لیڈی۔"

"بات صاف ہے۔ اب وہ خود تو ہسپتال آنے سے رہا۔ مجھے شک ہے کہ ہسپتال کا کوئی بندہ اس کے ساتھ ملا ہوا ہے۔" لیڈی اقتدار نے اپنا دائیاں ہاتھ نیلوفر کی ڈیسک پر رکھا۔ گردن نیلوفر کی جانب بڑھائی۔

"مگر پھر بھی لیڈی، یہ ہیروں والا معاملہ ہسپتال کے کسی ڈاکٹر یا نرس کو نہیں معلوم۔" نیلوفر متذبذب سے انداز میں بولی۔

"یہی تو دیکھنے والی چیز ہے، نیلوفر۔" لیڈی اقتدار کے چہرے پہ معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

"وہ ماہان شخص کون ہے جو اس تک ہماری خبریں پہنچا رہا ہے۔" نگاہوں میں گھلی سختی میں اضافہ ہوا ۔

نیلوفر بات کو کچھ حد تک سمجھ گئی تھی۔ اور جیسے ہی اسے پوری بات سمجھ آئی وہ گردن نفی میں ہلانے لگی۔

”لیڈی۔ آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ یہ میں نہیں ہوں۔“ نیلوفر نے زور دیتے ہوئے کہا۔ وہ جانتی تھی کہ دغابازوں کا یہاں کیا حال ہوتا ہے، اس لیے قدرے خوفزدہ تھی۔

لیڈی اقتدار کی مسکراہٹ برقرار رہی۔

”نیلوفر، اگر کوئی احمد تک خبریں پہنچا سکتا ہے تو وہ صرف تم ہو۔ میں تمہیں پڑھ چکی ہوں، نیلوفر۔ تم سے ہمیشہ مجھے دھوکے کی بو آتی تھی۔ تم مجھ سے کچھ نہیں چھپا سکتی۔“

نیلوفر کی دھڑکنوں نے اپنی رفتار پکڑلی۔ اس نے حلق سے تھوک نگلا۔

”میں وعدہ کرتی ہوں یہ میں نہیں ہوں، لیڈی۔“ نیلوفر گڑگڑانے والے انداز میں گویا ہوئی ۔لیڈی اقتدار نے سر نفی میں ہلایا اور کھڑی ہوئی۔

”پانچ دن ہیں تمہارے پاس۔ ثابت کرلو کے تم معصوم ہو۔“ بس اتنا ہی کہہ کر وہ کسی ملکہ کی طرح وہاں سے چلی گئی۔

اس نے نیلوفر کو آگے کچھ بھی بولنے کا موقع نہ دیا۔

نیلوفر بالکل دنگ رہ گئی تھی۔ وہ اتنے مختصر وقت میں اپنی معصومیت کیسے ثابت کر سکتی تھی؟ یہ تو طے تھا کہ وہ مرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بے قصور تھی، اسے اپنی بے قصوری ثابت کرنی تھی۔ نیلوفر سوچنے لگی۔ ہر پہلو پر نظر دوڑانے لگی۔

اور پھر ایک ہی چہرہ اس کے دماغ میں ابھرا۔ چہرے کا تناؤ چھٹنے لگا۔ یہ پہیلی اتنی مشکل بھی نہ تھی۔ دل ہی دل میں خود یقین دلاتے فون کان سے لگایا۔



اگلی رات:

زینت سنسان گلی میں چل رہی تھی۔ چہرے پر تھکان تھی اور کندھے بھاری محسوس ہوتے تھے۔ بوائے کٹ بالوں پر جہاں بھر کی گرد تھی۔

اس کی نظر ایک سفید گاڑی پر پڑی جو کہ ایک ہی جگہ پر کھڑی تھی لیکن گاڑی کا انجن کھلا ہوا تھا۔ زینت چوکنا ہوگئی۔ اندر ہی اندر اسے گھبراہٹ نے گھیر لیا، مگر بظاہر وہ عام رہی۔

وہ جیسے ہی اپنے گھر آئی اس نے ساری کھڑکیاں بند کیں اور پردے برابر کیے۔ چہرے پر واضح بے چینی تھی۔ اس نے موبائل پر تیزی سے انگلیاں چلاتے احمد کو کال ملائی۔ کچھ ہی دیر میں احمد نے کال اٹھا لی۔

”ہیلو احمد۔ ضروری بات کرنی ہے۔“

”کیا ہوا۔ خیریت؟“ احمد کی آواز میں تشویش تھی۔

”دیکھو احمد۔ مجھے لگ رہا ہے میرا پیچھا کیا جارہا ہے۔ بلکہ صرف لگ نہیں رہا، یقین ہے۔“ زینت مضطرب سے انداز میں بولی۔ احمد کی تشویش میں اضافہ ہوا۔

”اتنی جلدی؟ مجھے اندازہ تھا کہ وہ لوگ ایک نہ ایک وقت تعاقب کریں گے مگر اتنی جلدی زینت۔ یہ ٹھیک نہیں لگ رہا مجھے۔ کیا تم یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہو کہ تمہارا تعاقب کیا جارہا ہے؟“ احمد کی

آواز میں بوکھلاہٹ تھی۔ شروع سے لے کر اب تک سب کچھ اتنا پرفیکٹ جا رہا تھا کہ اب کچھ غیر متوقع ہونے پر دونوں بالکل دنگ رہ گئے تھے۔

"دیکھو احمد۔ اس سب میں میں تم سے زیادہ تجربہ کار ہوں۔ مجھے یقین ہے میرا تعاقب ہو رہا ہے۔ مجھے پانچویں مرتبہ یہی احساس ہوا ہے۔ یہ صرف اتفاق نہیں ہو سکتا۔" زینت کو احمد کا اس کی بات پر شک کرنا اچھا نہ لگا اس لیے قدرے برہم ہو کر اس پہ برس پڑی۔

"اپنی ایجنسی والوں کو جلد از جلد آنے کا بول دو۔ اب ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"احمد! میں بول دوں گی لیکن ان لوگوں کو وقت ہی لگنا ہے۔ اگر میں یہاں سے چلی جاؤں تو؟"

"دیکھو زینت۔ تمہارا جانا آسان نہیں ہو گا۔ اگر یہ لوگ تم پر شک کر رہے ہیں تو تمہارا جانا مشکل ہے۔ وہ لوگ تمہیں جانے سے پہلے ہی ختم کر دیں گے۔ تم فی الحال بس نارمل رہو اور خود کو نارمل ظاہر کرو۔" زینت بس ٹھنڈی سانسیں لیتی رہ گئی۔ آس پاس واضح خطرہ نظر آ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" زینت نے کال کاٹی اور موبائل بیڈ پر اچھال دیا۔

☆☆☆

اور اسی طرح چار دن گزر گئے۔۔۔

نیلوفر اور لیڈی اقتدار ملاقاتی کمرے میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ نیلوفر کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ دوسری طرف لیڈی اقتدار کی آنکھیں یوں تھیں جیسے برف کی بنی ہوئی ہوں۔

(احمد اپنے کمرے میں بیٹھے کانوں میں ایئر بڈز لگائے، ساری گفتگو سننے میں مصروف تھا۔)

”میں نے کہا تھا نیلو فر کہ تمہارے پاس صرف پانچ دن ہیں۔ کیا تم اپنی معصومیت ثابت کر سکو گی؟“

نیلو فر کے چہرے کا اطمینان اس عورت کو بتا چکا تھا، کہ وہ چور پکڑ چکی ہے۔

”لیڈی اقتدار۔ میں اپنے آپ کو معصوم ثابت کرنے کی پوری کوشش کروں گی۔ مگر اس بات نے مجھے بہت تکلیف دی ہے، کہ آپ مجھ پر بھروسہ نہیں کرتی۔“ نیلو فر کا انداز سپاٹ تھا۔

(احمد غور سے سب سن رہا تھا۔ کیا امکان تھا کہ وہ لوگ زینت تک اتنی جلدی پہنچ سکتے تھے؟ کیا اس نے اپنے دشمنوں کو انڈر ایسٹیمیٹ کرنے کی غلطی کی؟ احمد کے دل میں طرح طرح کے خدشات ابھرنے لگے تھے۔ دل مزید بے چین ہوتا گیا۔)

”اور مجھے افسوس ہے کہ تم مجھے نہیں سمجھ سکی۔ کیونکہ میں نے تمہیں کبھی دھوکہ باز سمجھا ہی نہ تھا۔“ لیڈی اقتدار استہزائیہ انداز میں کہہ کے ہنسنے لگی۔

”میں نے وہ سب صرف دباؤ بڑھانے کے لیے کہا تھا۔ کیونکہ صرف تم ہی ہو جو اس چور کو پکڑ سکتی تھی۔ تم اس ہسپتال کی ناظم ہو، تم سب کی رگ رگ سے واقف ہو۔ اب سمجھ آئی میری حکمتِ عملی؟“

نیلو فر کا دل ہلکا ہونے لگا۔ وہ لیڈی اقتدار کی بات سے مطمئن ہو چکی تھی۔ اس نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلایا۔

”اب بتاؤ۔ اس غدار کا نام کیا ہے؟“

(احمد نے یہ سنتے ہی اپنے آنکھیں بند کیں۔

''زینت نہیں پلیز۔'' وہ زیر لب بڑبڑایا۔ دل زور سے دھڑک رہا تھا۔

''پلیز زینت نہیں کہنا۔'' وہ ایک مرتبہ پھر بڑبڑایا۔

دل جیسے اندر ہی اندر نچڑ رہا تھا۔)

ملاقاتی کمرے میں بیٹھی نیلوفر نے اپنے لب کھولے۔

''زینت۔''

(احمد کے سر پہ سیٹیاں بجیں۔ یہ نام اس کے دل پر کانٹوں کی طرح چبھا۔ ماتھے پر اس کے ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ اتنی جلدی اس کا بھانڈا کیسے پھوٹ گیا؟ اف۔ وہ دل ہی دل میں خود کو ملامت کرنے لگا۔

اس نے اپنا موبائل نکالا اور زینت کو کال ملائی۔ موبائل اسپیکر پہ رکھا۔ زینت کو رنگ گئی۔ لیکن اس نے کال نہیں اٹھائی۔ احمد کے وجود میں انتشار پھیل گیا تھا۔

''اف مریم کال اٹھاؤ۔'' اس کی آواز میں لڑکھڑاہٹ تھی۔)

''صرف نام نہیں۔ مجھے دلیلیں سننی ہیں۔'' لیڈی اقتدار کی سرد آواز گونجی۔

(احمد اپنے بستر سے اٹھا۔ اس نے موبائل جیب میں ڈالا۔ وائرلیس ایئربڈز کی مدد سے، وہ اب بھی دونوں کی گفتگو سن سکتا تھا۔ اس نے دراز سے چابیاں نکالیں اور تیزی سے نیچے اترا۔ وہ زینت کو بچانے ہسپتال جانے کا ارادہ کر کے گھر سے نکلا۔)

''زینت ایک بہت ہی انٹرسٹنگ مہرہ تھی، لیڈی اقتدار۔ مہرہ اس لیے کہہ رہی ہوں کیونکہ 'میرا ماننا ہے کہ احمد نے اسے صرف استعمال کیا ہے۔''

(احمد اپنی گاڑی میں بیٹھا اور زینت کو کال ملانے لگا۔ وہ اب بھی اس کی کال نہیں اٹھا رہی تھی۔)

"وہ ایک دن اچانک سے ہسپتال آئی تھی، مجھ سے کام مانگنے۔ اس کے مطابق اس کے ماں باپ قتل کر دیے گئے تھے۔ جس کے بعد وہ انصاف کے لیے تڑپتی رہی۔ اور پھر جب اسے انصاف نہ ملا تو اسے انسانوں سے نفرت ہونے لگی۔ اس کی ایم بی بی ایس کی ڈگری بھی بیچ میں رہ گئی۔ میں نے اس وقت اس پر چھان بین کروائی تو اس کی ہر بات سچ ثابت ہوئی۔ میں نے اسے کام دے دیا۔" نیلوفر نے ایک وقفہ لیا۔

"میں نے ایک چیز نوٹس کی تھی لیڈی۔ شمس کو پیٹنے کے بعد احمد نے ہم سے کوئی رابطہ نہ رکھا۔ اس نے کچھ بھی کرنے کی کوشش نہ کی۔ حالانکہ کچھ تو کرنا چاہیے تھا اسے۔ میں نے اس کلیو کا استعمال کیا۔ اس واقعے کو چھ ماہ بیت چکے تھے۔ اور تقریباً چار ماہ پہلے زینت آئی۔ یہ ممکن تھا کہ زینت کو احمد نے پلانٹ کیا ہو ۔میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ شاید اس نے کسی پرانے اسٹاف کو خریدا ہو مگر اس کا امکان مجھے کم لگا، پرانے اسٹاف کو خریدنا زیادہ مشکل ہے۔ زینت کچھ مشکوک سی تھی، اپنے آپ کو غریب ظاہر کرنے کے باوجود اس کے بال اتنے پرفیکٹلی بوائے کٹ میں کاٹے گئے تھے۔ یہ کوئی عام بوائے کٹ نہیں تھا، بلکہ کسی مہنگے ہیئر سٹائلسٹ سے کروایا گیا تھا۔ یہ سب دیکھنے کے بعد میں نے زینت پر ایک دفعہ پھر سے تفتیش شروع کروائی۔ مگر اس بار کچھ الگ طریقے سے۔" نیلوفر کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری۔

لیڈی اقتدار کی آنکھوں میں نیلوفر کے لیے متاثر کن سا تاثر ابھرا۔

"اور اس بار تمہیں ایسا کیا ملا نیلوفر؟" لیڈی اقتدار کی دلچسپی بڑھنے لگی تھی۔

"لیڈی، اس نے کچھ غلطیاں کی تھیں۔ وہ جانتی تھی اس کے بارے میں تفتیش کی جائے گی اس لیے وہ جو ہمیں بتانا چاہتی تھی اس نے وہ سب بہت کھلا چھوڑ دیا۔ جیسے اس کے ماں باپ کے قتل کا کیس۔

اس کا میڈیا میں جانا۔ یہ سب اس نے جیسے ہمارے لیے پلیٹ میں سجایا۔ مجھے اس چیز کا اندازہ ہوا اور اب کی بار میں نے گہری چھان بین کروائی۔ اور پھر مجھے کیا پتا چلتا ہے کہ زینت چار ماہ پہلے امریکہ سے پاکستان آئی تھی۔ یہ جاننا بہت مشکل تھا۔ وہ ڈیٹا کلین کر چکی تھی مگر کچھ سی سی ٹی وی فوٹیجز کا شکریہ کہ وہ پکڑی گئی۔" نیلوفر نے خوشدلی سے اپنی پلکیں جھپکائیں۔ لیڈی اقتدار کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

("اوہ خدایا۔" احمد گاڑی کا ایکسلریٹر زور سے دباتے بولا۔ وہ لوگ واقعی بہت آگے پہنچ چکے تھے۔ وہ وقت کے ساتھ جنگ لڑ رہا تھا۔ اور وقت کے ساتھ جنگوں میں جیت جانا عام بشر کے بس میں کہاں؟)

"یہ ایک بڑا ثبوت تھا لیڈی۔ جس نے زینت کا کردار مشکوک کر دیا تھا۔ مگر میں نے وہاں بس نہ کی۔ میں نے اس کے بعد اور بھی چھان بین کی۔ اب کی بار میں نے زینت کے بجائے احمد کی چھان بین کی۔ میں نے دونوں کا تعلق دریافت کرنا چاہا۔ مجھے یہ بھی شک ہونے لگا تھا کہ اس کی ایم بی ایس والی بات بھی جھوٹ تھی۔ مجھے احمد کی یونیورسٹی سے کچھ ڈیٹا ملا، زینت کا اصل نام مریم تھا اور وہ احمد کی یونی ورسٹی میں اس کے ساتھ پڑھتی تھی۔ اس کی پرانی تصویروں سے میں نے اسے پہچان لیا۔ اس وقت بھی اس کے بال ایسے ہی تھے، چھوٹے چھوٹے۔" نیلوفر اب خاموش ہو گئی۔

اس نے ہر دلیل پیش کر دی تھی۔ اس کا کام تمام ہو چکا تھا۔ ساری بات صاف تھی۔ لیڈی اقتدار مسکرا کر سر اثبات میں ہلانے لگی۔

"اور تمہیں کیا لگتا ہے۔ کیا تعلق ہے دونوں کا؟" لیڈی اقتدار کو نیلوفر کی تھیوری سننی تھی۔

"یقیناً دونوں گہرے دوست ہوں گے۔ اس ہی لیے وہ احمد کے لیے اتنا بڑا خطرہ مول لے رہی ہے۔"

لیڈی اقتدار نے گردن نفی میں ہلائی۔

''اہاں! اس سے بھی بڑھ کر ہے نیلوفر۔ مگر فی الوقت یہ اہم نہیں۔ یہ جاننا اہم ہے کہ، اس دھندے کے بارے میں کیسے پتا چلا؟ اور وہ احمد تک یہ خبریں کیسے پہنچا رہی تھی۔''لیڈی اقتدار سوچ میں پڑ گئی۔

''اس کے بارے میں بھی میں نے بہت سوچا تھا۔ اور مجھے اس کا صرف ایک ہی جواب نظر آیا؛ وہ ہے عائشہ۔ وہ زینت کی سب سے پکی دوست تھی۔ مجھے بالکل بھی حیرت نہیں ہو گی اگر عائشہ جیسی بے وقوف عورت نے اسے ہر ایک راز بتا دیا ہو۔ اس سے ایسی امید کی جا سکتی ہے۔''نیلوفر الفاظ میں کڑواہٹ لیے بولی تھی۔

''اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے پتا چل گیا ہو کہ اس ملاقاتی کمرے تک رسائی کیسے حاصل کی جا سکتی ہے۔ اور پھر اس کمرے کو ٹیپ کر دیا ہو۔''لیڈی اقتدار کے دماغ میں تصویر بننے لگی تھی۔''احمد ایک سافٹ ویئر ڈیولپر ہے۔ مجھے حیرت نہیں ہو گی' اگر وہ ٹیکنالوجی کا استعمال کرے۔ اگر ہم سو فیصد درست نہیں تو کچھ حد تک تو ہمارا اندازہ درست ہو گا ہی۔ اور اس زینت کو ہمیں ختم کرنا ہو گا۔''لیڈی اقتدار اٹل سے انداز میں اپنا فیصلہ سنا چکی تھی۔

ایک لمحے کے لیے نیلوفر کے دل میں کچھ ہل چل سی مچی۔ لیکن اس نے ہر ہل چل کو نظر انداز کیا۔

واپسی ناممکن تھی، واپسی ناممکن تھی۔ اس نے خود کو یاد دلایا۔۔

''عائشہ کو بلواؤ نیلوفر۔''حکم جاری کر کے لیڈی اقتدار نیلوفر کو دیکھنے لگی جو کہ فون پر کسی کو ہدایات دے رہی تھی۔

کچھ دیر میں عائشہ ملاقاتی کمرے میں آئی۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ تھی اور وہ اندر سے ڈری ہوئی تھی۔ وہ بغور کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ عائشہ کو دیکھتے ہی لیڈی اقتدار کی نظروں میں حقارت ابھری۔ اس نے اوپر سے نیچے تک پچاس سالہ عائشہ کا سرسری جائزہ لیا۔

''میں اسے دیکھ کر ہی بتا سکتی ہوں کہ اسی نے سب کچھ باہر نکالا ہے۔'' لیڈی اقتدار نے نیلوفر سے تبصرہ کیا۔

عائشہ ناسمجھی سے لیڈی اقتدار کو دیکھتی گئی۔

''تم جانتی ہو زینت کو؟'' لیڈی اقتدار عائشہ کی طرف مڑی۔ اس کے چہرے پہ نمکین سا تاثر تھا۔ عائشہ نے سر اوپر نیچے ہلایا مگر بولی کچھ نہیں۔ ''دوست تھی تمہاری؟'' عائشہ ایک بار پھر سر اثبات میں ہلا گئی۔

لیڈی اقتدار گہری سانس لیتے کھڑی ہوئی۔ وہ ہاتھ باندھ کر سیدھا عائشہ کو دیکھنے لگی۔ آنکھوں میں تپش بھری ہوئی تھی۔ عائشہ کی نظریں بے اختیار جھکتی چلی گئیں۔ وہ ملکہ کا سامنہ نہیں کر سکی۔

''کیا تم نے اسے بتایا تھا کبھی کہ ہمارا کاروبار کس چیز کا ہے؟ کیا تم نے کبھی اسے اس ملاقاتی کمرے کے بارے میں بتایا؟''

عائشہ کے ماتھے پہ لکیریں ابھریں۔ کیا اس نے کچھ غلط کیا تھا؟ اس کا سر مزید جھک گیا۔

''دیکھو اگر تم نے اسے کچھ بتایا بھی ہے تو صاف صاف بتا دو۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی۔'' لیڈی اقتدار نے انداز بالکل نرم کر دیا۔

عائشہ بے چین ہونے لگی۔ اس نے سست روی سے گردن اوپر نیچے ہلائی۔ لیڈی اقتدار کی نرمی فنا ہوئی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ عائشہ کو گردن سے دبوچ لے۔ اس کی روح پر جیسے آگ بھڑک اٹھی تھی۔ وہ عائشہ کو اسی وقت زمین میں گاڑ دینا چاہتی تھی۔

ملکہ نے گہری سانس لیتے اپنے آپ کو نارمل کیا۔ فی الحال جذباتی ہونے کا وقت نہیں تھا۔

''تمہاری دوست تمہیں دھوکہ دیتی رہی ہے، عائشہ۔''

عائشہ کی آنکھیں چھوٹی ہوئیں۔ وہ لیڈی اقتدار کو ناسمجھی سے دیکھتی رہ گئی۔

''اس نے صرف تمہیں استعمال کیا ہے۔'' عائشہ گردن نفی میں ہلانے لگی۔ زینت کبھی ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے دل میں کہا۔

''نہیں لیڈی۔ زینت ایسی نہیں ہے۔'' عائشہ پورے اعتماد سے بولی۔

لیڈی اقتدار کے چہرے پہ حقارت بھری مسکراہٹ پھر سے بکھری۔

''اس نے تمہاری معصومیت کا فائدہ اٹھایا، عائشہ۔''

عائشہ تیزی سے گردن نفی میں ہلانے لگی۔ ناممکن۔ ناممکن!

''نہیں لیڈی۔ آپ کو کچھ غلط فہمی ہوئی ہو گی۔'' وہ گردن اٹھا کر بولی۔

''وہ ہمارا کاروبار برباد کرنے آئی ہے، عائشہ۔ وہ تم سے ساری معلومات لے کر کسی اجنبی کو دیتی رہی ہے۔ اور وہ اجنبی ہمیں برباد کرنا چاہتا ہے۔ تم پچھلے کئی ماہ سے اس کے ہاتھوں بیوقوف بنتی رہی ہو۔''

عائشہ کو اپنا دل بکھرتا محسوس ہو رہا تھا، وہ قطعاً اس سب پہ یقین نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"ہاں عائشہ یہ سچ ہے۔" نیلوفر بول اٹھی۔ "ہمارے پاس ثبوت ہیں۔ وہ کسی اور کے لیے کام کر رہی ہے۔ اس نے آپ کی معصومیت کا صرف فائدہ اٹھایا ہے۔" نیلوفر کے انداز میں تھکان تھی۔

عائشہ کا چہرہ بالکل بجھ گیا۔ اس کا دل اس بات پر یقین کرنے سے قاصر تھا۔ وہ آنکھوں میں کرب لیے اور بھی زور سے سر نفی میں ہلانے لگیں۔ دائیں آنکھ سے ایک اور آنسو نکلا۔

"تم اپنی بیوقوفی کی وجہ سے اس لڑکی کے ہاتھوں استعمال ہوئی۔" لیڈی اقتدار نے تالی پیٹی اور زور سے ہنس پڑی۔

عائشہ کے کانوں میں یہ ہنسی بے طرح چبھی۔ وہ لوگ بھلا کیسے اس کی پکی دوست پہ یہ الزام لگا سکتے تھے؟ زینت اسے استعمال کیوں کرے گی؟ اس کا دل سوچ سوچ کے مرجھائے جا رہا تھا۔

"تم سب چھوڑو عائشہ۔ جا کر زینت کو یہاں لے آؤ۔ اور خود دیکھ لینا کہ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ۔" لیڈی اقتدار دوبارہ سے کرسی پر بیٹھی۔

عائشہ کی توانائی دم توڑ رہی تھی۔

دوست سے دھوکہ کھانے کا کرب بہت گہرا تھا، یہ زخم بھی مہلک تھا۔ لا علاج! اسے اپنا دل ان گنت حصوں میں بکھرتا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے کسی کانچ کی شے پہ ہتھوڑے برسائے ہوں۔

"جاؤ۔" لیڈی اقتدار نے دوبارہ کہا تو عائشہ چونک گئی۔ وہ مڑ کے ملاقاتی کمرے سے باہر نکلی۔

وہ لفٹ کے ذریعے اسٹور روم میں واپس لوٹی۔ اس کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔ وہ بغیر آواز کے روئے جارہی تھی۔ اس نے ایک شیلف کا رخ کیا اور یک ڈبا اپنے ہاتھ میں تھاما۔ ڈبے میں سرجکل سزر تھیں جو کہ نوکیلی تھی۔ وہ کچھ ثانیے سزر کو گھورتی رہی۔ آنکھوں میں گہرا کرب تھا۔

اس نے ایک دوسرے شیلف کا رخ کیا۔ ہاتھ بڑھا کر بوتل نکالی۔ بوتل کا ڈھکن کھول کر قینچی کے نوکیلے حصے کو اس میں ڈبویا۔ بوتل میں موجود مائع زہریلہ تھا۔ عائشہ نے قینچی اپنے کوٹ کی جیب میں ڈالی۔ چہرے پہ پھیلی نمی ہاتھوں سے رگڑی۔ وہ باہر نکلی تو آنکھوں میں الگ طرح کا جنون اترا ہوا تھا۔

”اگر تم نے مجھے سچ میں استعمال کیا ہے تو میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے ماروں گی۔“ وہ زیر لب بڑبڑائی۔

الفاظ نہیں، انگارے تھے وہ، جو پورے ہسپتال کو راکھ کرنے کی طاقت رکھتے تھے۔



”اور اس زینت کو ہمیں ختم کر دینا ہو گا۔“

روح قبض ہو جاتی، تو اسے اتنی تکلیف محسوس نہ ہوتی۔

یہاں خواب ٹوٹ رہے تھے۔ اور بعض خواب ٹوٹنے پر موت سے بڑھ کر تکلیف دیتے ہیں۔

وہ کس کو مدد کے لیے پکارتا؟ وہ موت کے کنویں میں تھی۔ دشمن نے گھیرا تنگ کیا ہوا تھا۔ وہ کس طرح اس کے بچاؤ کے لیے پہنچتا؟ دل ٹوٹا، اور ٹوٹتا ہی چلا گیا۔

وہ گاڑی زن سے بھگاتے ہوئے ایک اور مرتبہ زینت کو کال ملانے لگا۔ خوش قسمتی تھی، یا شاید خدا کو اس پر رحم آگیا تھا، کال اٹھالی گئی تھی۔

”زینت تمہیں وہاں سے بھاگنا ہوگا، اسی وقت!“ اس نے فکرمندی چھپانے کی کوشش نہ کی۔

”آخر کیوں؟“ زینت بری طرح سے الجھ گئی۔

”ان لوگوں کو ہر ایک چیز پتا چل گئی ہے زینت۔ میں کب سے کالز کر رہا تھا۔ میں بس عافیت زندگی پہنچنے ہی والا ہوں، تم بس باہر نکلو۔ میں تمہیں کسی محفوظ مقام پر لے جاؤں گا۔“

اسے احمد کے الفاظ ہضم کرنے میں اچھا خاصا وقت لگا۔ اس نے زندگی سے شکوہ کیا۔ کیوں مہربان ہو کر مہربانیوں کا عادی بنا کر قدموں تلے روند دیتی تھی یہ زندگی؟ اسے دور سے عائشہ نظر آئی۔ اس کے چہرے کے تاثرات پڑھ چکی تھی۔ خطرہ قریب آ رہا تھا۔

”اف احمد۔ میں کہاں بھاگوں؟“

”کہیں بھی۔ بس چھپ جاؤ۔ میں بس پہنچنے ہی والا ہوں۔“ احمد نے کال کاٹ دی۔

عائشہ زینت کے مقابل کھڑی، اسے گھوری سے نواز رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں پنپتا غم، شکایت اسے بہت کچھ بتا رہا تھا۔

”تمہیں لیڈی اقتدار بلا رہی ہیں۔ وہ نیچے تمہارے انتظار میں ہیں۔“ زینت پتھر کی بن گئی۔

ہاتھوں پر زنجیر لگ گئی تھی جیسی۔ وہ بھاگ کر کہاں جاتی؟ اس نے دماغ پر زور ڈالا۔ چہرے پر جبراً مسکراہٹ سجائی۔

”تم چلو میں آ رہی ہوں۔“

عائشہ نے گردن نفی میں ہلائی اور ایک جھٹکے میں زینت کا بازو تھام لیا۔ اس کے چہرے پر تکلیف بھرا تاثر تھا۔ زینت بالکل دنگ رہ گئی۔ عائشہ کی تبدیلی اسے بتلا چکی تھی کہ وہ اس کے خلاف کر دی گئی ہے۔

”تم میرے ساتھ جاؤ گی۔“ عائشہ نے چبا چبا کر زینت کے کان میں سرگوشی کی۔

دروازے یکے بعد دیگرے بند ہو رہے تھے۔ دل میں گرانی محسوس ہوئی۔

”میرے ساتھ باتھروم چلو۔ اور میری بات بس ایک دفعہ سن لو۔ پلیز عائشہ۔“ وہ جیسے منت کر رہی تھی۔

عائشہ نے بازو تھامے رکھا۔

”پلیز عائشہ۔ دوستی کی قسم ہے۔ بس ایک دفعہ میری بات سن لو۔“

عائشہ کے چہرے پر تلخی بھرا احساس ابھرا۔ اس نے گردن ہاں میں ہلائی اور زینت کا بازو تھامے باتھروم چلی آئی۔

زینت نے باتھروم کی کنڈی لگائی اور عائشے کے روبرو کھڑی ہوئی۔ آنکھیں پریشان تھیں، جب کہ آئشہ کے چہرے پر صرف کرب سمایا ہوا تھا۔

”مجھے صرف ایک بات کا سچ سچ جواب دو۔ تم کسی اور کے لیے کام کر رہی ہو؟“ عائشہ کی آواز میں سے وہ اپنائیت فنا ہو چکی تھی۔ اس نے دل سے خواہش کی، کہ کاش زینت انکار کر دے۔

زینت نے کچھ دیر کے لیے گردن جھکائی۔ پھر گردن اٹھا کر عائشہ کو دیکھا۔

"ہاں۔ میں کسی اور کے لیے کام کر رہی ہوں۔"

عائشہ نے دو قدم پیچھے بڑھائے۔ آنکھ سے آنسو نکلا۔

"مگر عائشہ ہم دونوں یہاں سے نکل سکتے ہیں۔ تم چھوڑ دو یہ سب اور میرے ساتھ چلو۔"

وہ کچھ نہیں سن پا رہی تھی۔ وہ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔ بس ایک چیز تھی جو اٹل حقیقت بن چکی تھی۔ وہ لڑکی جسے وہ پکا دوست مانتی تھی، اسے دھوکہ دے چکی تھی۔ اس کا زمین کی گہرائیوں میں دفن ہو جانے کا جی چاہا۔

"میرا یقین کرو عائشہ۔ اس دنیا کی زندگی سے زیادہ بہتر ہے باہر کی زندگی۔"

اس کی کوششوں کا عائشہ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ جیسے کسی غبار میں تھی۔ غصے نے اپنے حصار میں لیا ہوا تھا۔ روح جیسے کانٹے دار دیواروں کے درمیان کچلی گئی ہو۔ اس کا تنفس تیز ہوا۔ جسم کا درجہ حرارت انتہاء کو پہنچا۔ چہرہ سُرخ ہوا۔

اس کی آنکھیں سرخ پڑی۔ چہرے پر جنون اترا۔

زینت اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے گئی۔ جو وہ کرنے والی تھی، وہ اس کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

عائشہ کا ہاتھ اس کی کوٹ کی جیب میں گیا۔

وہ تیزی سے زینت کی طرف بڑھی۔

اس نے مٹھی میں بھینچی قینچی سے زینت کے پیٹ پر پوری قوت سے وار کیا۔

زہر آلود قینچی نے زینت کے کپڑوں کو چیرا پھر اس کی کھال کو۔ پھر اس کے گوشت کو۔

قینچی کی نوکیلی دھار اس کے جسم کی زینت بنی۔

وہ اس کے جسم میں زہر کے ذرات چھوڑ گئی تھی۔ جو عنقریب اس کے لہو سے جا ملے۔

زینت کا سر چکرایا۔ تکلیف کی شدت الگ تھی۔ جسم سے نکلتا ہوا خون اس کی توانائی نچوڑ رہا تھا۔

عائشہ نے قینچی زینت کے جسم سے نکالی۔ تکلیف کی شدت میں اضافہ ہوا۔ دونوں خون میں نہا گئیں۔ عائشہ نے دوبارہ زینت پر وار کرنا چاہا۔ مگر زینب نے ضبط کا مظاہرہ کیا۔ ہر تکلیف کے باوجود اس وار کو روکا۔ عائشہ کا ہاتھ دبوچا اور قینچی ایک جست میں چھین لی۔

دانت پیستے پوری قوت سے عائشہ کی گردن پر وار کیا۔ قینچی عائشہ کی گردن پہ بھڑکتی نسوں کو چیرتی گلے کے اندر داخل ہوئی۔ عائشہ کے حلق سے جانوروں جیسی آوازیں آنے لگیں۔ خون کا فوارہ اس کی گردن سے پھوٹا۔ وہ وار ایسا تھا کہ اگلے لمحے ہی عائشہ کی جان نکل گئی۔ تڑپتا جسم ساکن ہوا اور زمین پر گر پڑا۔

زینت پھولتی سانسوں کے ساتھ سب دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں کے سامنے ہر سو ہر دم دھند چھا رہی تھی مگر وہ اپنے آپ کو گرنے نہیں دے سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی جس وقت وہ گر گئی اس وقت یہ جنگ ہار جائے گی۔ زینت کے کوٹ میں موجود موبائل تھرتھرایا۔ اس نے خون آلود ہاتھوں سے کال اٹھائی۔

”میں باہر انتظار کر رہا ہوں۔“ احمد نے کہا اور کال کاٹ دی۔

زینت کو سمجھ نہیں آیا کہ وہ باہر تک کا سفر کیسے طے کرتی۔ ہمت جمع کرتے وہ واشروم سے باہر نکلی۔ سب کی نظریں اس کی طرف بڑھیں۔ وہ خون میں لت پت تھی۔ زینت جتنا تیز ہو سکتا تھا اتنا تیز جانے لگی۔ اس کی چال بہت کمزور تھی۔ کمر جھک گئی تھی۔ وہ بدقت خود کو گرنے سے روک رہی تھی۔

راہداری کی دوسری طرف سے نیلوفر آئی۔ وہ زینت کی زخمی حالت دیکھ کے فوراً سمجھ گئی تھی کہ یہاں کیا ہوا ہے۔ وہ حواس باختہ سے عالم میں باتھروم کے دروازے تک پہنچی جہاں سارا اسٹاف موجود تھا۔ عائشہ کی خون میں ڈوبی لاش دیکھ کر چہرے پر افسوس نے پر چھائی کی۔

اس نے مڑ کر لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ چلتی ہوئی زینت کو دیکھا۔ سٹاف اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"زینت کو جانے دیا جائے۔ کوئی اسے ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔" نیلوفر نے چلا کر حکم جاری کیا ،اسٹاف اپنی جگہ تھم گیا۔

زینت نے ایک نظر اسے مڑ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں معذرت تھی۔

زینت گردن جھٹک کر مڑ گئی اور باہر جانے لگی۔ اس کی ترجیح اپنی جان بچانا تھی۔

نیلوفر کا موبائل بجا تو اس نے کال اٹھائی۔

"نیلوفر اتنی دیر کیوں ہو گئی۔" فون کے اس پار سے لیڈی اقتدار کی آواز گونجی۔

"آپ فکر نہ کریں لیڈی۔ وہ نہیں بچ سکے گی۔ عائشہ نے اسے ایسے گھاؤ دیے ہیں کہ وہ جلد تمام ہو جائے گی۔" وہ بے تاثر لہجے میں بول کر ایک دفعہ پھر سے عائشہ کی لاش کی طرف متوجہ ہوئی۔

چہرے پر بے پناہ افسوس تھا۔ آنکھیں معذرت خواہ تھیں۔

☆☆☆

وہ خون آلود زینت کو دیکھ کر اندر تک تڑپ اٹھا۔ ایک لمحے کے لیے اسے لگا کہ وہ ہل نہیں سکے گا۔ اسے لگا جیسے زندگی اس سے برا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ تیزی سے زینت کی طرف لپکا۔ اسے سہارا دے کر گاڑی کی پچھلی نشست پر بٹھایا۔

گاڑی میں لیٹی زینت کی بس ہو گئی تھی۔ اس کا وجود نچوڑنے لگا تھا۔ اس کے اندر تکلیف کی لہریں ابھر رہیں تھیں اور اس کی توانائی ختم ہونے کو تھی۔ وہ گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ دل سے ایک آواز آرہی تھی جو اس ساری صورتحال کا الزام اسے ٹھہرا رہی تھی۔

مگر وہ کچھ نہ بول سکا۔ نہ مڑ کر اسے دیکھ سکا۔

دوسری طرف زینت سے تکلیف برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اسے لگا جیسے وہ اندر سے کھوکھلی ہو رہی تھی۔

”مجھے نہیں لگتا میں بچ پاؤں گی، احمد۔“ ایسے لگتا تھا جیسے وہ بہت جدوجہد کر کے بول رہی تھی۔ اس کے ہونٹ بھی سفید پڑنے لگے تھے۔

”تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ ہم تمہیں قریب کے ہسپتال لے جائیں گے۔“ احمد نے انداز عام رکھا۔ مگر اندر اس کا دل اچھل کود کر رہا تھا۔

”میں خوش ہوں، احمد۔ میں اپنے انجام سے مطمئن ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ میں ایک عظیم مقصد حاصل کرتے مروں گی۔“

احمد کا دل اور تیزی سے دھڑکا۔ امیدیں مندمل پڑ رہی تھیں۔

کچھ دیر کے سفر کے بعد گاڑی ہسپتال پہنچ گئی۔ احمد نے بریک پر پاؤں رکھا۔ گاڑی مخصوص آواز کے ساتھ ہسپتال کے باہر رکی۔ وہ تیزی سے اپنی سیٹ سے اترا۔ اس نے پچھلی نشست کا دروازہ کھولا۔ زینت اونچی سانسیں لے رہی تھی، لیکن اس کا چہرہ پر سکون تھا۔

”چلو زینت۔ ہسپتال آگیا ہے۔“ احمد نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ زینت یوں ہی اسے دیکھتی گئی۔ اور اسے دیکھتے دیکھتے مسکرا دی۔ مسکراہٹ میں تکلیف کا عکس تھا۔

”میرا وقت آرہا ہے احمد۔ سب ناسود ہے۔ میں جا رہی ہوں۔“ زینت کی آواز اور بھی کمزور پڑی۔

”سب چھوڑو' اور چلو۔“ احمد زور سے بولا۔

زینت کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ اس کے اندر ٹھہراؤ سا آگیا تھا۔

”مجھے یاد تو کرو گے ناں، عبد الحمید؟“ وہ بولی۔ احمد آنکھوں میں بے یقینی لیے اسے دیکھنے لگا۔

اور پھر زینت کی آنکھیں بڑی ہونے لگیں۔ وہ تکلیف سے سسکنے لگی۔ وہ لمحے بھر کو تڑپی، اس کا جسم لرزا۔ اس کی آواز لڑکھڑائی۔ اور پھر وہ ساکن پڑ گئی۔ وہ ڈھیلی پڑ گئی۔ اس کے جسم نے حرکت کرنا بند کر دی۔ وہ جا چکی تھی۔ بہت دور۔

وہ جو آسمانوں کی بلندیوں کو چھونے کا عزم رکھتی تھی۔

وہ آج آسمانوں سے اونچی اڑان بھر چکی تھی۔

احمد کی آنکھیں خوف سے لبریز تھیں۔اس کا دل کپکپا رہا تھا۔

وہ ایسے نہیں مر سکتی تھی۔وہ یوں اس کے دل پر یہ بوجھ چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی۔وہ سر نفی میں ہلانے لگا۔یہ بوجھ، یہ دباؤ، اسے جیسے کھانے کو دوڑ رہا تھا۔وہ تڑپ اٹھا تھا۔وہ بیٹھے بٹھائے کسی اپنے کو نہیں کھو سکتا تھا۔وہ ٹوٹ رہا تھا۔بکھر رہا تھا۔اسے لگا جیسے اب کچھ بھی اسے جوڑ نہیں سکتا۔

ہار نہ مانو۔۔۔

خوفزدہ نہ ہو۔۔۔

تم اب تک ڈر کو مات دیتے آئے ہو۔۔۔،

تم اب تک اپنے زخموں کا مرہم خود بنتے آئے ہو،

اس عدم یقینی کے باوجود بھی تم ٹوٹے کبھی نہیں،

تم رکے کبھی نہیں۔۔۔

ہاں! تم اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکتے ہو،

امید کی کرنیں مندمل ضرور ہیں۔۔۔،

لیکن سرے سے ختم نہیں ہوئیں۔

ہار نہ مانو۔۔۔،

خوفزدہ نہ ہو۔

☆☆☆

ماضی کی داستان کو 'فی الحال کے لیے ادھورا چھوڑ کے حال کے وقتوں میں واپس آتے ہیں۔۔۔

☆☆☆

احمد کی کہانی اپنے اختتام کو پہنچ گئی تھی۔ وہ سادگی سے اسٹیئرنگ وہیل کو دیکھ رہا تھا۔ چہرے پہ خالی پن تھا اور آنکھیں ویران تھیں۔

سرد فضا میں رنج ہی رنج تھا۔ مہر کے چہرے پر نمی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے دکھ بھری سانس خارج کی۔

"کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔" احمد نے خاموشی کو توڑنا چاہا۔ آواز بے تاثر تھی۔ "میں صرف اس لیے یہ سب بتا رہا ہوں تاکہ تم مجھے سمجھ سکو۔ میں اپنے آپ کو مظلوم نہیں سمجھتا، نہ ہی میں کبھی چاہوں گا کہ تم مجھے مظلوم تصور کرو۔ میں اپنی نظروں میں بہت معتبر ہوں۔" آواز اب تک ویران تھی۔

مہر نے سر اثبات میں ہلایا۔ اسے واقعی کسی کے تسلی بخش الفاظ کی ضرورت نہیں تھی، اور مہر جانتی تھی۔

"اور یہ کیمرا؟ یہ رضا کار والا قصہ کیا ہے؟" مہر نے اپنے نیکلیس کو چھوا۔

اب کی بار احمد مسکرایا۔ وہ کافی دیر بعد مسکرا رہا تھا۔ مہر بھی جواباً مسکرائی۔

"مناج۔ اس نے ہماری مدد کی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

نظر مہر پر ڈالی۔ جو وضاحت طلب نگاہوں سے اسے گھور رہی تھی۔ اس نے بتانا شروع کیا۔



ہم مہر اور احمد کی دبئی میں پہلی رات میں لوٹ آتے ہیں۔

وہ جب پول ایریا سے واپس آیا تو اس کا دماغ تازہ دم ہو چکا تھا۔ وہ آگے کا لائحہ عمل بنانے کے لیے تیار تھا۔ دماغ میں کچھ سوجھنے لگا۔ اس نے سب کچھ جھڑک کر درفشاں کو ایک بار پھر سے کال ملائی۔ وہ جانتا تھا وہ اس سے تمیز سے بات کرنے نہیں والی تھی اور اس کے صبر کو بلاشبہ آزمائے گی لیکن مہر کے لیے' اسے درفشاں کو برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد درفشاں نے کال اٹھالی۔

"مجھ سے بات کرنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔ بڑی بہن ہوں تمہاری۔ بات کرنے کی تمیز سیکھو، احمد۔" درِفشاں نے فون اٹھاتے ساتھ احمد کو سنادی۔

احمد کو تپ چڑھنے لگی تھی۔ مگر فی الحال اس نے خود پر قابو پانے میں عافیت جانی۔

"آپا مجھے اپنی وکیل دوست کا نمبر دو۔ جلدی۔" احمد نے انداز ایسا بنایا جیسے دونوں کا ایک گھنٹے پہلے کوئی جھگڑا ہوا ہی نہ ہو۔ البتہ درے کا غصہ نہ اترا۔

"میں تم سے بات تک نہیں کرنے والی، احمد۔ تمہیں بڑی بہن سے بات کرنے کی تمیز آنی چاہیے۔" درفشاں برہم ہو کے پھر سے برس پڑی۔

احمد ٹھنڈی سانس لیتا رہ گیا۔ اس کے اچھے موڈ کو درفشاں نے اچھی طرح سے غارت کر دیا تھا۔

"پلیز آپا۔ تھوڑا ضروری ہے دے دو۔" احمد نے نرمی اختیار کی۔

درے اب کچھ کڑوا نہیں کہہ سکی۔ اس نے غصے سے تلملا کر کال کاٹ دی۔ اس حرکت پہ احمد کے اعصاب تن گئے۔

"یہ سمجھتی کیا ہے خود کو؟" احمد غصے سے زیر لب بڑبڑایا۔ وہ درے کو لگی لپٹی سنانے کا ارادہ کیے اسے کال کرنے لگا تھا کہ اسے درے کا واٹس ایپ پر میسج موصول ہوا۔ وہ تھم گیا۔ وہ مناج کا نمبر دے چکی تھی۔ احمد مدھم سا مسکرایا اور بے اختیار ہنس دیا۔ اس کی آپا کبھی نہیں سدھر سکتی تھی۔

احمد نے وقت ضائع کیے بنا مناج کو کال ملائی۔ کچھ ہی دیر میں مناج نے کال اٹھالی۔

"السلام و علیکم مناج۔ میں احمد، درفشاں کا بھائی۔"

مناج اپنے بیڈ پر بیٹھی تھی۔ وہ ایک دم سے چوکنا ہو گئی۔

"مجھے نمبر درے آپا سے ملا تھا۔ دراصل بہت ضروری بات کرنی تھی میں نے۔" احمد کا انداز مودب تھا۔

مناج نے سرعت سے سر اثبات میں ہلایا۔

"جی بتائیں۔ میں کیسے مدد کر سکتی ہوں۔" مناج فوراً رضامند ہوئی۔

"اگر کوئی منی لانڈرنگ کرتا ہے۔ تو کن صورت حال میں اسے سزا نہیں ہو گی؟" اس نے سارا دھیان مناج کے جواب پر لگا یا۔

"اگر کورٹ میں ثابت ہو جائے کہ اس نے منی لانڈرنگ نہیں کی۔ یا اگر بلیک میلنگ انوالوڈ ہے تو بھی سزا اسے بچا جاسکتا ہے۔" مناج نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں۔ کوئی دوسری صورت نہیں جس میں بندہ منی لانڈرنگ کرے، مگر قانون اسے کچھ نہ کہے۔" احمد نے لفظوں کا چناؤ سوچ سمجھ کر کیا۔

"ہاں ایک صورت ہے۔ اگر کیریئر (یعنی منی لانڈرنگ کرنے والا) رضاکارانہ طور پر منی لانڈرنگ کرے، وہ بھی پولیس کی نگرانی میں، تاکہ مجرموں کو بے نقاب کیا جاسکے۔" مناج نے حل تجویز کیا۔

احمد کے دماغ میں گھنٹی بج چکی تھی۔ وہ کھڑا ہو گیا۔

"مناج، کیا آپ میرے لیے کچھ کر سکتی ہیں؟ کوئی ہے جو اس وقت مصیبت میں پھنسا ہوا ہے۔" آواز بے اختیار مغموم ہوئی۔ "یہ کام شاید مشکل ہو۔ مگر آپ قانون کو سمجھتی ہیں، اس لیے آپ سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا۔ کیا آپ میری مدد کریں گی؟"

مناج کی طرف خاموشی چھائی رہی۔

"آپ بے جھجک ہو کر مجھے سب کچھ بتائیں۔ میں ضرور مدد کروں گی۔"

احمد نے مناج کو سارا پلان بتایا۔

☆☆☆

پولیس اسٹیشن کی بوسیدہ عمارت پر سورج کی کرنیں وار کر رہی تھیں البتہ کرنوں میں گرمی کی آمیزش کافی کم تھی۔

پولیس اسٹیشن کے اندر کسی واہیات سے گانے کی گونج تھی۔ انسپیکٹر یونس سربراہی کرسی پر بیٹھا تھا۔ ڈیسک کی دوسری طرف ایک بوڑھا مرد بیٹھا تھا جس سے وہ باتوں میں مگن تھا۔

کونے میں یونس کے چیلے، وردی میں ملبوس، چہروں پر معنی خیز مسکراہٹ سجائے بیٹھے تھے۔ ایک کا نام کاشف تھا، دوسرے کا مراد۔

"کیا لگتا ہے، مراد باس کتنے نکلوا لیں گے؟ مجھے لگتا ہے کہ ہزار سے زیادہ نہیں۔" کاشف نے مراد کے کان میں سرگوشی کی۔

"میں بڑی بازی لگاتا ہوں آج۔ باس آج پانچ ہزار نکلوائیں گے۔" دونوں متجسس سے ہو کر کسی تماشائی کی طرح یونس کو بوڑھے مرد سے بات کرتے دیکھنے لگے۔

"بھئی سیٹھ صاحب۔ آپ کے کام بھی تو کتنے ٹیڑھے ہیں۔ اتنی آسانی سے تھوڑی ہوں گے۔" یونس نے مسکا لگانے والا انداز اختیار کیا۔ چہرے پہ میٹھی مسکراہٹ سجائی ہوئی تھی۔ وہ ایک خوش شکل مرد تھا جس کی عمر تیس کے قریب تھی۔ اس کی آنکھیں چاندنی کے رنگ کی تھیں، اور رنگت صاف تھی۔

"یہ تو تم لوگوں نے تماشا لگا دیا ہے۔ ہر ہفتے آؤ کام ہوتا نہیں۔ میری گاڑی اب تک پھنسی ہوئی ہے۔" سیٹھ نے برہمی سے کہا۔

یونس نے چہرے پہ مصنوعی سی اداسی طاری کی جیسے سیٹھ کی بات سن کے دلی افسوس ہوا ہو۔

"آپ تو ناراض ہو گئے، سیٹھ صاحب۔" وہ جیسے دل برداشتہ ہو گیا تھا۔

"اب آپ دیکھیں، سیٹھ۔ کتنا ٹیڑھا معاملہ ہے۔ اب تھوڑا بہت ادھر ادھر ہاتھ تو مارنا ہو گا نا؟"

سیٹھ نے اپنے ہاتھ مٹھی میں بند کیے۔ وہ جیسے بہت کچھ بولتے بولتے رہ گیا۔ اس نے اپنا بٹوا نکالا۔ یونس، مراد اور کاشف۔۔۔ تینوں کی آنکھوں میں چمک در آئی۔

"ہزار۔" کاشف نے سیٹھ کے بٹوے میں ڈلتے ہاتھوں کو دیکھتے تبصرہ کیا۔

"دیکھنا پانچ ہزار دے گا۔" مراد نے سرگوشی کی۔

اور سیٹھ نے اپنے بٹوے میں سے پانچ ہزار کا نیا نوٹ نکالا۔ سب کے چہروں پہ مسکراہٹ بکھری۔

"یہ آخری بار ہے۔" اکھڑ سے انداز میں کہتے سیٹھ کھڑا ہو گیا اور وہاں سے چلا گیا۔ جاتے جاتے پولیس والوں کو اور پاکستان کے نظام کو لعن طعن سے نوازنا نہیں بھولا۔

یونس نے پانچ ہزار کا بے شکن نوٹ لہرایا اور نظر مراد اور کاشف پر ڈالی۔ آنکھوں میں جتاتا تاثر تھا، جیسے وہ کہنا چاہ رہا ہو کہ "دیکھا میرا کمال؟"

"پچیس پچیس فیصد تمہارا اور پچاس میرا۔" یونس نے لاپرواہی سے نوٹ مراد کو تھما دیا۔ وہ ٹیبل پر ٹانگیں لمبی کیے ہاتھ پھیلا کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں بند کر کے کچھ دیر کے لیے جھپکی لینا چاہ رہا تھا۔

دفعتاً موبائل بجا۔ یونس نے نظر اٹھا کر موبائل کو دیکھا۔ میڈم اٹارنی کالنگ۔ یونس چونک کے سیدھا ہو گیا۔ چہرے پہ سنجیدگی طاری کی۔

"بند کر!" اس نے زور دے کے کہا۔ مگر کچھ بند نہیں ہوا۔

"ابے بند کر و یہ گانا۔" وہ چلایا۔ مراد نے بوکھلا کر گانا بند کیا۔

"لو جی آگئی مس مناج کی کال۔ اب ایک اچھے خاصے مرد کو عورت کے پیچھے تباہ و برباد ہوتے دیکھنا ۔" مراد نے مزے لینے والے انداز میں کاشف کے کان میں سرگوشی کی۔

"جی میڈم۔" یونس کا لہجہ اور ساتھ ساتھ ہر انداز بالکل بدل گیا تھا۔ وہ میٹھے سے لہجے میں بات کرتا تھا۔ یہ میٹھا لہجہ سیٹھ والے سے مختلف تھا کیونکہ یہ مصنوعی نہ تھا۔

"یونس کیا ہم مل سکتے ہیں؟ میں نے کچھ ضروری بات کرنی ہے؟ پولیس سٹیشن کے پاس جو ریسٹورانٹ ہے وہیں پر۔" مناج نے اپنی مشینی انداز میں کہا۔

یونس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ آنکھوں میں ایسا تاثر تھا جیسے وہ کوئی خوبصورت خواب دیکھ رہا ہو۔ وہ شرمسار سے انداز میں ہنس دیا۔ گال سرخ ہونے لگے۔

"جی میڈم۔ ابھی پہنچ رہا ہوں۔" کال کٹ گئی۔

یونس نے اپنے موبائل کا فرنٹ کیمرا کھولا اور بال درست کیے۔ گریبان درست کیا۔ اس کا حلیہ اب لاپرواہ سا نہیں تھا۔ وہ اٹھ کر جانے لگا۔

"ارے باس۔ وہ منہ تک نہیں لگاتی اور آپ ان کے حکم پر منہ اٹھا کر جا رہے ہیں۔" مراد نے پیچھے سے مزے لینے والے انداز میں کہا۔

یونس نے اس کو مسکرا کے دیکھا۔ اس کے دماغ میں ایک تگڑا جواب تیار تھا۔

"آج سمجھ آیا کہ اتنی عمر کے باوجود تمہیں کوئی ملی کیوں نہیں۔" یہ حملہ مراد پر بہت ذاتی تھی۔

"ایک بات یاد رکھو۔ شریف آدمی ہی کامیاب زن مرید ہوتا ہے۔" وہ سادگی سے کہتے ہوئے رخصت ہو گیا۔

"ملی تو ویسے آپ کو بھی کوئی نہیں۔" یونس کے جاتے ہی مراد برہمی سے زیر لب بڑبڑایا۔ کاشف اس کے اوپر زور سے ہنس دیا۔

☆☆☆

"میں چاہتی ہوں آپ ایک ایف آئی آر کاٹیں۔ مہر بنت عبد اللہ سلطان کے نام سے۔ اور یہ ظاہر کریں کے ایف آئی آر ایک ماہ پرانی ہے۔" مناج اور یونس اس ریسٹورانٹ میں بیٹھے تھے۔

یونس نے ایسی شکل بنائی ہوئی تھی جیسے اس سے زیادہ شریف انسان اس دنیا میں کوئی تھا ہی نہیں۔

"ہو جائے گا میڈم۔ اور کچھ؟" یونس نے مناج کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ رہا ہو۔

"اور یہ کہ مہر بنتِ عبد اللہ سلطان اس وقت منی لانڈرنگ مافیا کو بے نقاب کرنے کی مہم کی ایک رضاکار ہے۔ آپ نے اس بات کو راز رکھا کیونکہ آپ نہیں چاہتے تھے کے بڑی آتھوروٹیز' جو کہ اس مافیا کے ساتھ ہیں وہ اس مہم کو ہونے سے روکیں۔"

اور یونس ایک دم چونک گیا۔ یہ مہم کہاں سے آ گئی؟

"میں سمجھا نہیں۔" یونس نے کہا۔

مناج کے تاثرات تن گئی۔ اس نے اپنے لب بھینچ کر برہمی سے سانس خارج کی۔

”اس لیے سادہ سو دہ ہاں جی ہاں جی کہنے سے بہتر ہے کہ آپ غور سے میری بات سن لیا کریں۔“

مناج کا لہجہ سخت تھا۔

یونس کے چہرے پر شرمندگی چھاگئی۔ مگر اسے برا نہ لگا۔ میڈم اٹارنی کی ڈانٹیں بھی اس کے لیے اعزاز سے کم نہ تھیں۔

”اب آپ بتائیے۔ میں سن رہا ہوں۔“یونس اب سیدھا ہو کر بیٹھا۔

مناج نے ساری باتیں پھر دہرائیں۔

”اوہ۔ مشکل ہے۔ مگر میں کرلوں گا۔ ایک دفعہ میں سب دہرا رہا ہوں۔ مہر بنت عبد اللہ سلطان نے کمپلین کی۔ ہم نے ان کا ساتھ دیا اور ایک خفیہ مہم تیار کی۔ ہم نے کیمراز پرووائڈ کیے تاکہ ثبوت اکٹھا کیے جاسکیں۔ مہر بنت عبد اللہ سلطان نے یہ سب پولیس کی نگرانی میں کیا۔ ہم نے دبئی پولیس سے بھی مدد لی۔ درست؟“یونس نے دماغ میں تمام نقاط پیش کیے۔

مناج نے پرسکون سانس خارج کی۔

”بالکل۔ اور ہاں کسی کو پتا نہ چلے۔ ہم اسے درست موقع پر استعمال کریں گے۔ ٹھیک ہے، یونس؟ مجھے اس معاملے میں صرف آپ پر بھروسہ کر سکتی تھی۔ آپ میرے کام آئیں۔ میں آپ کے آؤں گی۔“مناج کے چہرے پر تکلفانہ مسکراہٹ تھی۔

یونس اس کے انداز پہ پگھلنے لگا۔ اس کا یہی اکھڑا سا انداز اس کی کمزوری تھا۔

”جو حکم، میڈم۔“یونس نے مسکا لگانے والے انداز میں کہا۔



گاڑی میں بیٹھی مہر، چہرے پر خوشگوار حیرانی لیے سب سن رہی تھی۔ وہ اب تک اپنے دشمنوں کے خلاف ثبوت جمع کر رہی تھی اور اسے خود بھی علم نہ تھا۔ مہر تو اندھیروں میں کبھی جکڑی ہی نہ تھی۔

''مہر، تم جانتی نہیں ہو یہ کتنی بڑی کامیابی ہے۔ دبئی پولیس کو بس ایک اشارہ دینا ہے۔ وہ بینک سیل ہو جائے گا۔ اس لیڈی اقتدار کے خزانے ڈوب جائیں گے۔ اف مہر۔ ان کا پیسہ برباد۔ یہ حملہ ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔'' احمد چہرے پر پرجوش مسکراہٹ لیے مہر کو سب بتا رہا تھا۔

یکبارگی مہر کو ایک خیال نے ستایا۔

''آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ اگر ایسا ہوا تو میں ان کے کسی کام کی نہیں رہوں گی' احمد۔ وہ میری ماں کو مار دیں گے۔'' مہر سر نفی میں ہلاتے بولی۔ احمد کا جوش فنا ہوا۔

''کیا آپ ایسا کرنے کا سوچ تو نہیں رہے؟'' مہر دل میں امید لیے بولی۔

احمد نے اپنی گردن جھکا لی جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔

''وہ خود غرض انسان ہے مہر۔ اسے تمہاری اور تمہاری ماں کی پرواہ نہیں ہے۔ وہ صرف ہمیں برباد کرنا چاہتا ہے اور بس۔ اپنا مقصد پورا کرنے کے لیے وہ کچھ بھی کر کے دم لے گا، یہاں تک وہ تمہیں اور تمہاری ماں کو قربان بھی کر سکتا ہے۔ اور تم دیکھو، اس کے بھروسے کیا کر رہی ہو۔''

لیڈی اقتدار کی باتیں ذہن میں دوڑنے لگیں۔ وہ تشویش لیے احمد کو گھورتی گئی، جو اب تک جواب نہ دے سکا۔

احمد نے اپنا سر اٹھایا اور مہر کو دیکھا۔

"اگر میرے پاس یہ آخری آپشن بھی ہوا، تب بھی نہیں۔" مہر نرمی سے مسکرا دی۔

اگلے لمحے مہر کی مسکراہٹ پھر سے فنا ہوئی۔ اسے وہ معاہدہ یاد آیا۔ وہی معاہدہ جس نے دبئی میں اسے ستائے رکھا، جس نے اب تک اس کے ہاتھ باندھے ہوئے تھے۔

"مگر احمد۔ مجھ سے کچھ ہو گیا ہے۔"

احمد چونکا۔ بھنویں سکڑ گئیں۔

مہر نے احمد کو معاہدے کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ احمد کا چہرہ بجھ گیا تھا۔

"کاش یہ کرنے سے پہلے تم پوچھ لیتی۔" اس کا چہرہ بے تاثر سا تھا۔ وہ کچھ خفا سا نظر آ رہا تھا۔

"کیا آپ کو برا لگا؟" مہر نے پوچھا تو احمد نے سر نفی میں ہلایا۔

"تم نے اس وقت اپنے بارے میں سوچا، مہر۔ اس میں کچھ غلط نہیں۔ مگر اگر تم مجھ پر بھروسہ کرتی تو میں تمہارے سارے مسئلے خود ہی حل کر دیتا۔ مگر خیر۔" احمد نے مایوسی سے سر جھٹکا۔

"اور اب کیا؟" مہر کی آواز روہانسی ہونے لگی۔

"اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہمیں ملنا بند کرنا ہو گا۔" مہر کے دل پہ ضرب آ کر لگی۔ "جب تک میں اپنا انتقام نہ لے لوں، اور ان سب کو اپنے انجام تک نہ پہنچا دوں۔ ہمیں ملنا بند کرنا پڑے گا۔" احمد بالکل سنجیدہ تھا۔

مہر نے مایوسی سے سر اثبات میں ہلایا۔

"اور یہ سب ختم ہونے کے بعد؟ کیا ہمارے راستے ایک بار پھر ملیں گے، احمد؟" مہر کی آواز میں لرزش تھی۔

وہ جانتی تھی اگر جواب ناں میں ہوا' تو وہ ایک بار پھر سے مر جائے گی۔

احمد کی آنکھوں میں کچھ تھا۔ جس نے اس کی ساری عدم یقینیوں کا خون کیا۔ اس کا پور پور پر سکون ہو چکا تھا۔

"ہم ضرور ملیں گے۔"

دل پر لگ پھندا جیسے کھل گیا۔

"لیکن میں اپنا انتقام پیچھے نہیں چھوڑ سکتا۔ کیا تم میرا انتظار کرنے کے لیے تیار ہو؟" احمد کے چہرے پر مدھم مسکراہٹ تھی۔

مہر جواباً مسکرائی۔ اس نے اپنا پرس کندھے پہ ٹانگا اور گاڑی کا دروازہ کھولا۔

"میں خوشی سے انتظار کرنے کے لیے تیار۔ میں آپ کا ساتھ دینے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔ میں اس سارے کھیل کے ختم ہونے کا انتظار کروں گی، احمد۔" کہتے ہوئے مہر گاڑی سے نکلی۔

نظروں کی تکرار ہوئی اور پھر گاڑی کے بند ہوتے دروازے نے دیوار کھڑی کر دی۔

مہر کے دل میں خلش سی تھی۔

اس سب کے باوجود بھی اگر اس کی کہانی نامکمل رہ گئی تو؟ وہ جانتی نہیں تھی۔ بعض اوقات لاعلمی وبالِ جان بن جاتی ہے۔

☆☆☆

رات کے آخری پہر وہ گھر آیا۔ وہ دبئی سے واپس آکر بھی گھر آیا تھا۔ اس کے پاس چابیاں موجود تھیں، اس نے درِفشاں کو اطلاع نہ دیں۔ صبح سویرے اس سے ملے بغیر چلا گیا۔ وہ اس سے اب تک خفا تھا۔ وہ اس کے کندھوں کو وزنی کیے ہوئے تھی، اور وہ چاہ کر بھی اس وزن سے جان نہیں چھڑا پا رہا تھا۔

گاڑی کی ہل چل درفشاں تک پہنچ گئی تو وہ غنودگی کے عالم میں ہی احمد کے لیے دروازہ کھولنے آ گئی۔ اس کے چہرے کا ہر زاویہ مرجھایا ہوا تھا۔ آنکھیں بے جان تھیں۔ عمارہ کی موت کا بوجھ اب تک دل پر حائل تھا۔

احمد نے گاڑی کار پورچ میں پارک کی۔ وہ درے سے کھینچا کھینچا سا تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ اس کی ناراضیاں شدت پسند ہوتی تھیں، مخالف کا سینہ چاک کر دیتیں۔

درے کے چہرے پر شرمندگی پھیلی ہوئی تھی۔ گردن جھکی ہوئی تھی۔ وہ دونوں لاؤنج میں پہنچے۔ احمد نے آخرکار اس سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

"اب مجھے بتاؤ گی تم' کہ کیا گل کھلا رہی ہو میری پیچھے؟"

درے کے اپنے کمرے کی طرف بڑھتے قدم زنجیر ہوئے۔ اس نے مڑ کر احمد کو دیکھا۔ کچھ تھا اس کے چہرے پر جو بالکل بدل گیا تھا۔ آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے احمد کو چلا چلا کے بتا رہے تھے کہ وہ راتوں

سے سوئی نہیں تھی۔ درفشاں کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا اٹکا۔ وہ ویسے تو اپنے آنسوؤں کو ضبط کرنے میں ماہر تھی لیکن آج وہ یہ کر نہ سکی۔

"تم نے جینا عذاب کر رکھا ہے، آپا۔ تم کیا کرتی پھر رہی ہو؟ کیوں ایسی حرکتیں کرتی ہو؟" احمد کی آنکھوں میں غصہ بھرا تھا اور ایک اور بھی جذبہ تھا جسے وہ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور وہ جذبہ خوف کا تھا۔ درفشاں کو کھو دینے خوف۔ اس دنیا میں وہ دونوں ہی ایک دوسرے کا سہارا تھے، اور وہ جیسی بھی تھی، تھی تو اس کی بہن۔ وہ ایک مشکل کھیل کھیل رہا تھا اور اس کا اثر وہ درے پر پڑنے نہیں دے سکتا تھا۔

اسے بے اختیار زینت کی یاد آئی۔ وہ بھی یہی مشکل کھیل کا حصہ بن کر ماری گئی تھی۔ وہ ایک بار پھر سے اکیلا نہیں رہ جانا چاہتا تھا۔ وہ ایک اور انسان کو یوں جاتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

درے کا دل بھاری ہونے لگا۔ آنسو آنکھوں کی سمت سے بہنے کی ضد کر رہے تھے۔ اس سے اپنا دل قابو نہ ہوا اور وہ رونے لگی۔ وہ تیزی سے احمد کی طرف بڑھی اور اس کے سینے پہ سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اپنے اندر کے طوفان کو وہ اپنے بھائی کے علاوہ کسی کے سامنے نہیں نکال سکتی تھی۔ آنکھوں سے آنسو بہہ کر احمد کی شرٹ کو بھگوتے گئے۔

احمد اس لمحے بالکل ٹھنڈا پڑ گیا۔ غصہ پوری طرح سے اتر گیا۔ ہر شکوہ دور ہو گیا۔ دل کو کچھ ہوا تھا۔ ماحول میں گہری رنجش دوڑی۔

"میں برباد ہو گئی ہوں احمد۔ میری وجہ سے کسی کی جان چلی گئی ہے۔۔" درے نے بلکتے ہوئے کہا۔

"کیا کہنا چاہ رہی ہو؟"

درفشان نے اپنا سر اٹھایا۔ اپنے آنسو پونچھے۔

وہ احمد کے ساتھ لاؤنج کے صوفوں پہ بیٹھی۔

اس نے شروع سے لے کر آخر تک اسے سارا احوال سنایا۔

احمد اپنا سر پکڑ تا رہ گیا۔ غصہ پھر لوٹ آیا۔

"تمہارا دماغ خراب ہو چکا ہے، آپا۔ مریضوں کا علاج کرتے کرتے تم بھی ذہنی مریض بن گئی ہو۔" احمد نے غصے میں کہا۔

"خیر جہاں تک اس قتل کی بات ہے۔" احمد نے اپنے آپ کو ٹھنڈا کیا۔ "وہ تمہاری وجہ سے ہی ہوا ہے۔ اس لیے تم اب ان لوگوں کے ساتھ کوئی کھیل نہیں کھیلو گی۔ چپ چاپ اپنی سائکولاجی پر دھیان دو گی۔" اسے درے کو اس سب سے روکنے کے لیے اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ملا۔

"میں گھر نہیں بیٹھ سکتی، احمد۔ میں ان لوگوں کو اب نہیں چھوڑ سکتی۔" درفشاں نے سر نفی میں ہلاتے کہا۔

احمد کے ماتھے پر بل پڑے۔

"کیوں کر رہی ہو ایسی حرکتیں، آپا۔" احمد کی آواز میں بے بسی سی تھی۔

"کیونکہ احمد۔۔۔" درے کی آنکھ سے ایک اور موٹا آنسو نکلا۔ "میں ان سب سے فیروز بھائی کی موت کا حساب لینا چاہتی ہوں۔"

احمد کے سر میں سیٹیاں بجیں۔ درفشاں جانتی تھی؟ اپنے کانوں پر یقین نہ ہوا۔

''میں ان سب کی بربادی دیکھنا چاہتی ہوں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو بھائی کے مجرم ہیں۔ میں یہ سب جاننے کے بعد آرام سے نہیں بیٹھ سکتی۔'' وہ آنکھوں میں تپش لیے بولی۔ احمد ششدر سا اسے دیکھتا رہا۔

''اور تم بھی مجھے نہیں روک سکتے۔'' درفشاں کا انداز اٹل سا تھا

وہ اپنے کمرے میں جانے لگی۔ احمد کا چہرہ بے تاثر ہو گیا۔ گردن بے اختیار جھک گئی۔ اندر اچانک سے ٹھہراؤ آگیا تھا۔

''رکو۔'' احمد نے کہا۔

درے الجھ کر پیچھے مڑی۔ احمد کے اندر کچھ بدلا ہوا نظر آیا۔

''میرے ساتھ چلو۔ میں نے تمہیں کچھ دکھانا ہے۔'' احمد کہہ کر کھڑا ہوا اور گھر سے باہر نکل گیا۔

درِفشاں ناسمجھی سے اس کے پیچھے باہر نکلی۔ دونوں گاڑی میں سوار ہوئے۔ احمد کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں، احمد۔'' درفشاں کو تجسس ہوا۔

''قبرستان۔'' آواز بے تاثر تھی اور وجود ویران۔

درفشاں کے رونگٹے کھڑے ہوئے۔ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اس سے آگے اس سے کچھ نہ پوچھا گیا۔

وہ دونوں مارگلہ کی پہاڑیوں کے پاس پہنچے۔

احمد نے گاڑی سے اتر کے فلیش لائیٹس نکالیں اور درے کے ساتھ پہاڑی پر بنے راستوں کو پھلانگنے لگا۔

انہوں نے سیاہ آسمان تلے، پہاڑی کی اس ناہموار سطح پہ چلنا شروع کیا۔ ٹھنڈی نم ہوائیں ان دونوں کے وجود سے ٹکراتیں جو کہ ہڈیوں تک ٹھنڈ منتقل کرتیں۔ جنگلی جانوروں کی عجیب و غریب آوازیں ماحول میں پھیلی وحشت میں اضافہ کر رہی تھیں۔ ہوا کے جھونکوں کی درخت سے ٹکرار ہوتی، تو پتوں کے لہرانے کی آواز سارے میں گونجتی۔ دل بالکل حلق میں آگیا تھا۔ ماحول میں کچھ پر اسرار سا تھا۔ درفشاں حواس باختہ سے عالم میں بس احمد کے پیچھے چلتی گئی۔

بالآخر منزل آگئی تھی۔ وہی خالی میدان جس میں نہ ہونے کے برابر سبزہ زار تھا، اور چار درخت۔ درختوں کے بیچ و بیچ فیروز کی وہ تنہا قبر۔ درفشاں پھٹی ہوئی آنکھیں لیے اس قبر کو دیکھے گئی۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے احمد کو دیکھا

”فیروز بھائی۔“ احمد قبر سے کافی دور ایک درخت کے سرہانے کھڑا تھا۔ آواز بدستور بے تاثر تھی۔

درفشاں کو اپنے پیروں تلے زمین سرکتی محسوس ہوئی۔ اس کی سانسیں بے ترتیب ہوئیں۔ ہواؤں میں گویا کانٹیں بھر گئے تھے جو اس کے جسم پر چبھتے۔

وہ اس قبر تک سست روی سے قدم بڑھانے لگی۔ ہر ایک قدم اسے اس قبر سے قریب تر قریب کرتا گیا۔ اور آخر کار وہ اس قبر تک پہنچ گئی۔

”میں نے کوشش کی کسی طرح سے بتادوں۔ اور میں جانتا ہوں کہ مجھے بہت پہلے ہی بتادینا چاہیے تھا۔ یہ میری غلطی ہے۔ مجھے معاف کردو۔“

درے قبر کے سرہانے بیٹھ کر اسے محروم نظروں سے دیکھتی گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ ایک آنسو آنکھ سے نکلا اور گال پر دستک دیتے ہوئے بنجر زمین کا مہمان بنا۔

”کاش تم پہلے بتا دیتے، احمد۔“ درے کی آواز میں شکایت نہیں تھی۔ بس غم تھا۔ اوہ اپنے بھائی کو سمجھ سکتی تھی۔

”کاش تم مجھے پہلے بتا دیتے تو اتنے سال میں یوں ہی بے چین راتیں نہ کاٹتی۔ اتنا وقت میں بے قراری کا شکار نہ رہتی، احمد۔“ درے کی آنکھ سے ایک اور آنسو نکلا۔ ہوا کا جھونکا دونوں کے وجود سے ٹکرایا۔ بال اڑنے لگے۔

”اللہ فیروز بھائی کو جنت نصیب کرے۔“ درے نے فاتحہ پڑھنے کے بعد کہا۔ احمد نے آمین کہا۔ اپنے کپڑوں سے دھول جھاڑتی وہ کھڑی ہوئی۔ اس قبر کو اس نے اداس مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔

”مجھے امید ہے کہ فیروز بھائی بہتر حال میں ہوں گے۔ جہاں بھی ہوں گے پر سکون ہوں گے۔ مرنے والے کو صرف دعا کی ضرورت ہوتی ہے، کسی کے آنسو کی نہیں۔ اس لیے میں صرف انہیں دعا دوں گی۔“ درے نے سر اٹھا کر اس کالے آسمان پہ جگمگاتے ہلال کو دیکھا۔ دل دھاڑے مار مار کے رو رہا تھا۔ مگر کم سے کم، غم مکمل تھا۔

”میرے بھائی کو بہترین سے بہترین دینا، اللہ۔ وہ اس کے حقدار ہیں۔“ درے کی آواز گیلی تھی۔

اس نے مڑ کر احمد کو دیکھا جو کہ بے تاثر چہرہ لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں گہرا افسوس قائم تھا۔

”اب میں سکون میں ہوں احمد۔ میرا اطمینان لوٹ آیا ہے۔“ وہ آواز میں محرومی لیے بولی تھی۔

دونوں وہاں سے جانے لگے۔

اندھیری رات میں وہ قبر ایک بار پھر تنہا رہ گئی۔

قبر اس دفعہ بھی خاموش رہی۔

اپنے ساتھ مدفن تاریک رازوں کو،

آج بھی اس نے عیاں نہ ہونے دیا!



باب یازدہم: ''عزم کی پہیلی''

سچ سامنے آتا ہے

سچ کی طاقت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ

سچ انسانوں کو برباد کر سکتا ہے

اور آباد بھی

سچ انسانوں کو جوڑ سکتا ہے

ضرورت پڑنے پر توڑ بھی سکتا ہے

سچ اگر ظالم ہے تو

سچ سے زیادہ رحم بخش کوئی اس دنیا میں نہیں

سچ چہروں پہ مسکراہٹیں بکھیر سکتا ہے تو

سچ آنکھوں کی ویرانی کا سبب بھی بن سکتا ہے

سچ یاد رہ جانے والا ہے تو

سچ کو جھٹلانا بھی آسان ہے

سچ وجود کی ان دیکھی زنجیروں کو کھول بھی سکتا ہے تو

سچ قید میں پابند بھی کر سکتا ہے

سچ سامنے ضرور آتا ہے

یاد رکھنا!

☆☆☆

اور ہماری کہانی کے کرداروں کی زندگیوں میں کچھ وقت کے لیے ٹھہراؤ سا آگیا۔

ٹھہراؤ، جو کہ خود میں ہی خطرے کی علامت ہوتا ہے۔

ٹھہراؤ، جو کہ طوفان کی پیشنگوئی کرتا ہے۔

ٹھہراؤ، جو بربادی کے ظہور سے پہلے ہر سو ہر دم پھیلا ہوتا ہے۔

عافیت زندگی کا ہسپتال دن کے اس پہر سورج کی کرنوں تلے جگمگا رہا تھا۔ جس طرح سے خزاں کا موسم قریب تر ہوتا جارہا تھا ماحول میں بسی ہوئی ویرانگی، اداسی ہر طرف پھیلی، ہر کسی کو محروم خواہشات کی یاد دلاتیں۔

نیلوفر سربراہی کرسی پر براجمان تھی۔ چہرہ بجھا ہوا تھا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کے چہرے کی رونق دم توڑتی جارہی تھی۔ وہ زندگی سے بیزار ہونے لگی تھی۔ دل ہر شے سے اٹھ گیا تھا۔ جو تھوڑی بہت تسکین ان آسائشوں کے درمیان میسر تھی، وہ بھی کہیں مر چکی تھی۔

وہ اسکرین پر کسی نادیدہ نقطے کو تک رہی تھی۔ بس جسم ہسپتال کے آفس میں موجود تھا۔ در حقیقت تو وہ کہیں اور تھی۔

وہ کھو گئی تھی۔۔۔ دو دن پہلے کے منظر میں۔

☆☆☆

لکڑی کی دو منزلہ عمارت نما قید خانا آج بھی شان سے کھڑا ہوا تھا۔ سبزہ زار میں بھورے پتے بکھرے ہوئے تھے۔

نیلوفر کندھے پر بیگ لٹکائے شمائلہ کے کمرے میں گئی۔ اسے دیکھتے ہی شمائلہ کے چہرے پر رنگ بکھر گئے۔

نیلوفر نے مصروف سے انداز میں بیگ میز پر پٹخا اور دوائیاں نکال کر دراز میں بھریں۔

''شکر ہے آپ دوا وقت پر لے رہی ہیں۔ اگلے دو ہفتوں کی دوائیاں ایک ساتھ لے آئی ہوں۔'' وہ بجھے ہوئے انداز میں کلام کر رہی تھی۔

''نیلوفر، آپ کا دوسرا ساتھی اب تو نہیں آئے گا؟'' شمائلہ نے معصومیت سے پوچھا۔ نیلوفر زیر لب ہنس دی۔

''کیوں؟ کیا وہ آپ کو اتنا برا لگتا ہے؟'' نیلوفر نے شریر مسکراہٹ دباتے پوچھا۔

''میں آپ کے ساتھ زیادہ محفوظ رہتی ہوں۔'' شمائلہ نے طمانیت بھرے انداز میں کہا۔ نیلوفر کی مسکراہٹ قدرے پھیکی پڑ گئی۔

''کیا آپ ہماری مہر سے بات کروا سکتی ہیں؟ انہوں نے ایک ہفتے سے کوئی بات نہیں کی۔'' شمائلہ غمگین سے لہجے میں نیلوفر سے درخواست کرنے لگیں۔

"آپ کی بیٹی آپ کو بھول گئی ہے، شمائلہ۔ وہ دوسرے مسائل میں الجھ گئی ہے۔" چہرے پر افسوس تھا اور لہجہ ہمدرد۔ نیلوفر کو لگا تھا کہ شمائلہ کے چہرے پر مایوسی پھیلے گی۔ مگر وہ جوں کی توں اسے دیکھتی رہیں۔

"مسائل میں الجھ جانا اور بھول جانا دو الگ نوعیت کی چیزیں ہیں۔ مہر ہمیں نہیں بھول سکتیں۔ بس وہ مسائل میں الجھ گئی ہیں۔ ہم ان کے مسائل ختم ہونے کی دعا کریں گے۔ تو وہ ہم سے بات کر لیں گی۔" شمائلہ آسودہ سے انداز میں کہہ اٹھیں۔ نیلوفر کے چہرے پہ کڑواہٹ پھیلی۔ وہ متعجب نگاہیں شمائلہ پہ مرکوز کیے ہوئے تھی۔ کوئی انسان اتنا مثبت کیسے ہو سکتا تھا؟ وہ عورت قید تھی، مر سکتی تھی، بیٹی کو کھو سکتی تھی۔ پھر بھی کس قدر پر امید تھی؟

"آپ کیسے اتنی مطمئن ہو سکتی ہیں؟ کیوں مطلب کیسے؟" نیلوفر کی آواز میں برہمی تھی۔ جس الجھن نے دماغ پر عرصے سے ڈیرہ ڈالا ہوا تھا وہ آخر زبان کے ذریعے باہر آ گئی۔

"یہاں میرے پاس دولت کے خزانے ہیں۔" وہ ہاتھ اٹھا کر جذباتی انداز میں بولی۔

"لیکن پھر بھی میں مطمئن نہیں ہوں؟" اس کی آواز میں جہاں بھر کی تکلیف تھی۔

شمائلہ ہر بار کی طرح اس کی الجھن سن کر آسودگی سے مسکرا دیں۔

"کیونکہ آپ جن چیزوں میں سکون تلاش کر رہی تھیں، جن چیزوں کے ذریعے اطمینان حاصل کرنا چاہ رہی تھیں وہ چیزیں ہمیں سکون اور اطمینان دینے کے لیے تخلیق ہوئی ہی نہیں ہیں، نیلوفر۔" ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"مطلب؟"

”ہم سب کی روحوں کو خدا کے سامنے حاضر کیا گیا تھا۔ حضرت آدمؑ، ہمارے والد کے سامنے۔ اس وقت خدا نے حضرت آدم کو وہ روحیں دکھائیں جو جنت میں جائیں گی۔ وہ خوشی سے چہک اٹھے۔ پھر ان روحوں کا دیدار کروایا جو دوزخ میں جلیں گے، وہ رو پڑے۔ بتانے کا مقصد یہ ہے کہ ہم سب کی روح خدا زوالجلالِ وَالاکرام کے سامنے حاضر ہو چکی ہیں۔ وہ اپنے خالق سے قرب کا مزہ چکھ چکی ہیں، انہیں اسی قرب کی طلب ہوتی ہے۔ وہ خالق سے قرب کے لیے تڑپتی ہیں۔ جب ہم اللہ سے قریب ہوتے ہیں، خلوص کے ساتھ اس کی عبادت کرتے ہیں، قرآن پڑھتے ہیں۔ ہماری روح اللہ سے قریب ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم میں سے بہت سے لوگوں کو عبادت کرتے ہوئے سکون ملتا ہے۔ دنیا خوبصورت ہے۔ بے شک یہ دولت، یہ خوبصورتی، سب بہت اچھا ہے۔ لیکن انسان جب اپنے اصل سے پیچھے ہٹتا ہے۔ اپنے مقصد حیات سے لاتعلق ہو جاتا ہے، وہ اسی طرح بے چین و بے قرار پھرتا رہتا ہے۔ اس کا دل مرجھا جاتا ہے۔ وہ جیتے جیتے مر جاتا ہے۔“ شمائلہ کہے جا رہی تھیں۔ نیلوفر کے آنسو رک ہی نہیں رہے تھے۔

”مقصد حیات کیا ہے ہمارا؟“ نیلوفر کے اندر ٹھہراؤ سا حائل تھا۔

”اپنے اللہ کی عبادت کرنا۔ اس کی تعریف کرنا۔ اس کی بنائی گئی دنیا میں خوشحالی پھیلانا۔ دین کی پیروی کرنا۔ حضور ﷺ کی نصیحتوں پر چلنا۔ یہ انسان کی زندگی کا مقصد ہے۔“

نیلوفر کا دل اتنا وزنی ہو گیا تھا کہ اسے لگا کہ وہ اسی وقت زمین میں دھنس جائے گی۔

”اگر میں یہ کروں، تو مجھے کیا سب کچھ مل جائے گا؟“ نیلوفر نے استفسار کیا۔ شمائلہ نے سر نفی میں ہلا دیا۔

”یہ سب آپ کو دنیا میں کوئی سامان لا کر نہیں دے سکتا۔ وہ تو اللہ، ہمارے رب پر منحصر ہے۔ جس کو دولت ملنی ہوتی ہے اسے مل جاتی ہے۔ چاہے حرام طرزِ اختیار کرے یا نہیں۔ یہ چیزیں ہمارے اختیار میں نہیں ہوتیں۔ وہ رازق ہے، نیلوفر۔ وہ تنگی دیتا ہے اور خوشحالی بھی۔ وہ صحت دیتا ہے اور بیماری بھی۔ ہم اس کے فیصلوں پر سوال نہیں اٹھا سکتے۔ کیونکہ خدا ذوالجلال کی حکمت تک پہنچنا، ہم حقیر انسانوں کے بس کی بات نہیں۔ مگر ہم اس کی مرضی پر کھلے دل سے سر جھکا سکتے ہیں۔ اور پھر دیکھیے گا آپ کو تنگی بھی سکون بخشے گی؛ کیونکہ آپ جانتی ہوں گی یہ تنگی آپ کے رب کی دین ہے۔ آپ بیماری میں بھی خوشی محسوس کریں گی؛ کیونکہ آپ کو علم ہو گا کہ یہ بیماری آپ کے رب کی طرف سے ہے۔ زندگی بہت آسان ہو جاتی ہے جب ہم اللہ کی ذات میں پناہ لیتے ہیں، اور اپنی تمام خواہشات اس کے سپرد کر دیتے ہیں۔“

”کیا واقعی میرے لیے واپسی کا کوئی راستہ باقی ہے؟ کیا میں جنت میں جا سکتی ہوں شمائلہ؟ کیا وہ رب مجھے معاف کر سکتا ہے؟“ نیلوفر سسک کر بولی۔

”وہ تو آپ کا رب بہتر جانتا ہے، نیلوفر۔ لیکن کوشش کرنے میں کیا حرج ہے؟“

نیلوفر کسی گہری سوچ میں کھو گئی۔



”وہ تو آپ کا رب بہتر جانتا ہے، نیلوفر۔ لیکن کوشش کرنے میں کیا حرج ہے؟“

وہ نم آنکھیں لیے اب بھی سکرین کو گھور رہی تھی۔ وہ ایک دفعہ کوشش کرنا چاہتی تھی۔ ماضی میں کی گئی غلطیوں کو درست کرنا چاہتی تھی۔ لیکن کیسے؟ اسے کوئی راستہ دکھ کیوں نہیں رہا تھا؟

ٹھیک اسی وقت دروازے پہ کھٹکھٹاہٹ ہوئی۔ نیلوفر جیسے گہرے خواب سے جاگی۔ اس نے ہاتھوں کی پشت سے نمی رگڑی۔ چہرے پر ازلی سختی اور کرختگی طاری کی۔

"کم ان۔" وہ روکھے سے انداز میں بولی۔ آنکھوں کی بے نیازی لوٹ آئی تھی۔

شمس اندر آیا۔ چہرے کا ہر زاویہ مرجھایا ہوا تھا، کندھے شل تھے۔ چال کافی سست تھی۔ نیلوفر اسے دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی کہ وہ کوئی بری خبر ساتھ لایا تھا۔ آج کل، ہر بری خبر احمد کے ارد گرد گھومتی تھی، نیلوفر کے لیے اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ یہ بری خبر بھی احمد کے متعلق تھی۔

شمس کرسی پر بیٹھا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے۔

"نیلوفر۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے۔" شمس اداس سے لہجے میں بولا۔ نیلوفر نے اپنی آنکھیں سکیڑیں۔

"ہاں بتاؤ؟"

"میں نے کچھ بہت غلط کر دیا ہے نیلوفر۔ لیکن میرا یقین کریں میں دغاباز نہیں ہوں۔ میں بے وفا نہیں ہوں۔ وہ بس ایک کمزور لمحہ تھا، میں نے اس کے بعد ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔"

نیلوفر کی دلچسپی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔

"میں سن رہی ہوں۔" وہ بظاہر عام انداز میں بولی۔

"میں نے آپ سب سے چھپایا تھا کہ احمد دبئی گیا تھا۔" شمس نے آنکھیں میچ لیں۔

نیلوفر کو جھٹکا لگا۔ اس نے میز پر زور سے ہاتھ دے مارا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو؟'' وہ نیم برہمی سے چلائی۔

''نیلوفر، میں مجبور تھا۔ اس نے میرے ہاتھ پاؤں باندھ لیے تھے۔ وہ مجھے بلیک میل کر رہا تھا۔'' وہ اب تک نیلوفر کو دیکھ نہیں پا رہا تھا۔

نیلوفر نے شمس کے اوپر جانچتی نگاہ ڈالی۔ یہ موٹی ناک والا 'لمبا چوڑا مرد بھی کسی کے ہاتھوں بلیک میل ہو سکتا تھا؟

''کیا کہہ رہے ہو شمس۔ کیسے بلیک میل کیا اس نے تمہیں؟'' وہ بری طرح تنک چکی تھی۔

کچھ لمحے کے لیے نیلوفر کو لگا کہ شمس رو ہی جائے گا۔

''نیلوفر۔۔'' وہ کہتے کہتے رکا۔ آنکھیں کھولیں۔ وہاں بے بسی بھری ہوئی تھی۔

''بتاؤ شمس۔ جب تک بتاؤ گے نہیں مسئلہ حل کیسے ہو گا؟''

شمس نے آزردگی سے سانس خارج کی۔

''نیلوفر، جب میں نے وہ چار ہیرے دیکھے تھے میرے دل میں لالچ بھر آیا تھا۔''

نیلوفر کے ماتھے کی سلوٹیں صاف ہوئیں۔

''میں انہیں ہتھیانا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے پارٹی پلیس میں جا کر عبداللہ سے رابطہ کیا۔ میں نے چابیاں فراہم کرنی کی آفر دی۔ میرا ارادہ تھا کہ میں اسے دھوکہ دے کر سارے ہیرے خود ہتھیا لوں گا۔ اس احمد کے پاس پارٹی پلیس کی فوٹیج موجود تھی۔ میں ڈر گیا تھا، نیلوفر۔ یہاں غداری کا بہت برا حال ہوتا ہے۔'' وہ باقاعدہ طور پر کانپ رہا تھا۔

نیلوفر بالکل ٹھنڈی پڑ گئی۔ برہمی، شاک، حیرانی سب کچھ زائل ہو چکا تھا۔ آنکھیں پر سوچ تھیں۔

”یاد رکھنا نیلوفر۔ جب تک ہماری درمیان اتحاد ہے دنیا کی کوئی طاقت ہمیں روک نہیں سکتی۔ اور جس دن ہمارے درمیان دڑاڑ پیدا ہو گئی اس دن سے ہماری تباہی یقینی ہے۔“

دماغ میں لیڈی اقتدار کی بات گردش کر رہی تھی۔ آنکھوں میں اطمینان تھا، جیسے کسی برسوں پرانے سوال کا جواب ملا ہو، جیسے برسوں پرانی کوئی تلاش آج ختم ہوئی ہو۔

”پلیز نیلوفر، مجھے بچا لیں۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔“ لہجہ ملتجی تھا۔ چہرہ آبدیدہ، اور آواز گیلی۔

نیلوفر نے چہرے کے تاثرات نرم کیے۔

”تم فکر نہ کرو۔“ وہ گلا صاف کرتے بولی۔

”تم وفادار ہو، اس لیے تم نے وقت سے پہلے سب بتا دیا۔ میں تمہیں بچا لوں گی۔“

نیلوفر کے مسکراتے چہرے نے اس کا چین بحال کیا۔ ڈر اور خوف پسِ پشت چلا گیا۔

”میں جانتا تھا نیلوفر، آپ مجھے مایوس نہیں کریں گی۔“ وہ مشکور لہجے میں بولا۔

نیلوفر نے آنکھوں میں عاجزی سجائی۔

”تم آج تک میرے اوپر کتنے احسانات کرتے آئے ہو۔ ان کے سامنے یہ کچھ بھی نہیں۔“

شمس آنکھوں کی نمی رگڑتے کھڑا ہوا۔ وہ سر کو خم دیتے چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی نیلوفر کے چہرے کی نرمی زائل ہوئی۔ خوشگوار مسکراہٹ دم توڑ گئی۔ نگاہیں شعلہ باز ہوئیں۔

”میرا اجرائم کی اس دنیا سے الوداع کہنے کے وقت ہوا چاہتا ہے۔“ وہ آواز میں لگن لیے بولی۔

دماغ میں منصوبہ تیار تھا۔

لیکن کیا صرف منصوبے کا بن جانا کافی تھا؟

منصوبے ہمیشہ کامیاب نہیں ہوا کرتے۔

☆☆☆

رات کے وقت ہوا کے تیز تھپیڑوں نے اسلام آباد پر وار کیا۔ گھروں کی کھڑکیاں بند ہو گئیں۔ چہل قدمیاں ختم ہوئیں۔ جوں ہی بادلوں کی گرج کے ساتھ طوفان برس پڑا۔

وہ بستر کے کنارے بیٹھا تھا۔ بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ آسمان پر بجلی چمکتی تو کچھ لمحوں کے لیے کمرہ چمک اٹھتا۔ فضا ثقیل محسوس ہو رہی تھی۔ آج جسم نہیں، روح تھکاوٹ کا شکار تھی۔ کوئی خیال تھا جو اسے اندر سے کاٹ رہا تھا۔ ماحول میں بسی ہوئیں، بارش، جھلملاتے ہوئے پتوں اور ہوا کے جھونکوں کی آوازیں اس کی بے چینی میں اضافہ کر رہی تھیں۔

”کیا ہو اگر میں اب بھی نہ جیت سکا؟“ اس کے دل سے ایک آواز آئی۔

”اتنی اموات دیکھنے کے بعد۔ اتنے جتن کرنے کے بعد۔ اتنی چوٹیں کھانے کے بعد۔ اگر میں ہار گیا، تو؟“ اس نے گردن جھکالی۔

”اگر وہ ساری جانیں رائگاں چلی گئیں۔ اگر مجھے انصاف نہ ملا۔ تو میں کیا کرلوں گا؟“ ہاتھ چہرے کے اوپر حائل کیا۔

دفعتاً برابر میں پڑا موبائل تھرتھرایا۔ خیالات کا تسلسل ٹوٹا۔ اس نے جگمگاتی سکرین کو دیکھا۔ کسی انجان نمبر سے میسج موصول ہوا تھا۔ وہ آنکھوں میں تفتیشی تاثر سجائے اس میسج کو پڑھنے لگا۔

”میں نیلوفر بات کر رہی ہوں۔ کیا ہم مل سکتے ہیں؟“

احمد کی پیشانی تنگ ہوئی۔

”میں تم لوگوں کے اوپر بھروسہ کیوں کروں؟“

”میرا تم سے ملنا بہت ضروری ہے۔ اپنی تسلی کے لیے، جگہ اور وقت تم مقرر کرو۔ میں وہاں پہنچ جاؤں گی۔ مگر یہ ملاقات ہوگی۔“

اگر یہ کوئی جال ہوا تو؟ مگر دل کہتا تھا، کہ اسے ملاقات کے لیے جانا چاہیے۔ اس نے کچھ سوچتے سمجھتے نیلوفر کو آفس کے پاس ایک ریستوران کا پتا دے دیا۔

موبائل بند ہو چکا تھا۔ اندھیرے لوٹ آئے تھے۔ اسی کے ساتھ بے چینی اور خوف کی واپسی ہوئی۔ دماغ میں طرح طرح کے خدشات بھٹک رہے تھے۔ بارش کی رفتار میں تیزی آ رہی تھی۔ جوں ہی بجلی چمکی۔ کمرے کا منظر واضح ہوا۔ وہ بستر سے اٹھا۔ کمرے کی بتیاں جلائیں۔ روشنیوں نے آنکھوں کو چندھیا دیا۔ وہ آنکھیں مسلتے غسل خانے میں بند ہوا۔

واپس لوٹا تو پیشانی میں پانی کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ آستینوں سے پانی ٹپک رہا تھا، ہلکی بڑھی داڑھی بھیگی ہوئی تھی۔

اس نے اس حکیم کتاب سے رجوع کرنے کا ارادہ کیا۔ اس نے کتاب کو وہاں سے کھولا، جہاں سے آخری مرتبہ چھوڑا تھا۔ آنکھوں کے سامنے سورہ احقاف کی آیات کھلی ہوئی تھیں۔

تلاوت کے بعد اس نے ترجمہ پڑھا۔

”دونوں گروہوں میں سے ہر ایک کے درجے ان کے اعمال کے لحاظ سے ہیں تاکہ اللہ ان کے کیے کا پورا پورا بدلہ ان کو دے۔ ان پر ظلم ہرگز نہ کیا جائے گا“

ترجمہ پڑھنے کے بعد وہ چہرہ سیدھا کر کے سامنے دیوار کو دیکھنے لگا۔ یہ آیت جیسے اس کے ہر ڈر، اور ہر خوف کا جواب دے چکی تھی۔ دل میں بسی بے چینی دم توڑتی گئی۔ وجود میں سکوت بڑھتا گیا۔

”اور میں سمجھتا تھا کہ مجھے دنیا میں انصاف مل جائے گا۔ جب کہ انصاف تو بنا ہی دوسری دنیا کے لیے ہے۔ اگر میں ہار بھی جاؤں، تو اس ہار کی کیا وقعت ہے؟ اس آیت میں خدا نے زبردست توازن قائم کیا ہے۔ پہلے تو ہمارے رب نے اعمال کے حساب کی بات کی۔ ہر کسی کو اس کے درجے کے حساب سے انعام دیا جائے گا۔ بدکاروں کو برا انجام اور نیکوکاروں کو بہتر انجام۔ پھر کہا گیا کہ کسی کے ساتھ ظلم نہیں ہو گا۔

یعنی جو انسان خدا کی راہ میں جو بھی نیکی کرتا رہا ہے، جو بھی قربانی دیتا رہا ہے، کچھ بھی ضائع نہیں جائے گا۔ اور جن کے اوپر گناہوں کا بوجھ ہے، انہیں ان ہی گناہوں کے مطابق سزا دی جائے گی۔ اس آیت میں ہماری یاددھیانی کروائی گئی ہے، کہ انصاف اس دنیا میں نہیں ملنا ہے۔ خدا بے انصاف نہیں۔

ہمارے حال کے دور میں کتنی نسل کشیاں ہو رہی ہیں۔ کتنے لوگ خاموش ہیں، اور اسے روکنے کے لیے کچھ نہیں کرتے۔ اللہ اس سب کا حساب اس دن لے گا۔"

وہ دنیا سے پوری طرح سے لاتعلق ہو چکا تھا۔ کیا بارش، کیا ہوائیں اسے ہوش نہ رہا تھا۔

"پھر جب یہ کافر آگ کے سامنے لا کھڑے کیے جائیں گے تو ان سے کہا جائے گا: تم اپنے حصے کی نعمتیں اپنی دنیا کی زندگی میں ختم کر چکے اور ان کا لطف تم نے اٹھالیا، اب جو تکبر تم زمین میں کسی حق کے بغیر کرتے رہے اور جو نافرمانیاں تم نے کیں اُن کی پاداش میں آج تم کو ذلت کا عذاب دیا جائے گا"

"اس آیت میں ان مشرکین کی بات کی جارہی ہے جو کہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ رسول ﷺ میں ایمان لائیں گے، اسلام پر عمل کرتے ہوئے، صدقہ خیرات کریں گے تو ان کی عزت پہ بٹہ لگ جائے گا۔ ان کو خدا کے احکامات ماننا اپنی شان گھٹاتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ جو اس دنیا میں فساد پھیلاتا ہے، وہ خدا کی اجازت سے پھیلاتا ہے۔ اللہ ظالمین کی رسی ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے۔ وہ اپنی ڈھیل سے اپنے شان بڑھا دیتے ہیں۔ اور خدا کیا کہتا ہے؟ کہ انہیں صرف عذاب نہیں دیا جائے گا، بلکہ ذلت کا عذاب دیا جائے گا۔ جس عزت پر وہ ناز کرتے تھے اسے کچلا جائے گا۔ ہم حال میں ہونے والی کتنی نسل کشیاں، کتنے مظالم دیکھتے ہیں۔ ہم طاقتور انسانوں کو ظلم کی حدیں عبور کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اور اس سب کے بعد جب وہ شان سے کھڑے ہوتے ہیں ہمیں درد ہوتا ہے۔ جب کہ ہمیں ان پر ترس کھانا چاہیے۔ روزِ آخرت یہی چہرے رسوا ہو رہے ہوں گے۔"

رات گہری ہوتی گئی۔ بارش کی رفتار میں کمی آ گئی، وقتاً فوقتاً بجلی کا زمین پہ وار ہوتا تو پورا شہر چمک اٹھتا۔ اس لمحے احمد یوسف کے لیے صرف وہ تھا اور اس کا مصحف۔ باقی ساری چیزیں وجود کھو چکی تھیں۔



وہ ٹرٹل نیک شرٹ اور جینز کی پینٹ پہنے اس ریستوران میں داخل ہوا۔ کچھ دیر گردن گھمانے پر اسے موبائل میں مگن نیلوفر نظر آئی۔ وہ اس کی طرف چل دیا۔

اس کی آمد پر نیلوفر نے موبائل پرس میں ٹھونسا۔ چہرے پر سنجیدگی طاری کی۔ احمد کچھ لاپرواہی سے اس کے سامنے بیٹھا۔

"کچھ کھانا پسند کرو گے؟" نیلوفر نے آنکھوں سے سن گلاسز اتارے۔

اس کی آنکھیں ویران تھی۔ احمد اسے دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ وہ پریشان تھی۔

"بس ڈرنکس منگوا لیتے ہیں۔" احمد نے انداز مصروف رکھا۔

نیلوفر نے ویٹر سے کہہ کر دو سمودیز منگوائیں، پھر احمد کی طرف مخاطب ہوئی۔

"میں تم سے بہت ضروری باتیں کرنے آئی ہوں، احمد۔" اس نے گردن جھکائی۔ وہ درست الفاظ تلاش کر رہی تھی۔

گردن اٹھائی تو چہرے پر اداس مسکراہٹ رقصاں تھی۔

"تم حافظ ہو احمد۔ کیا میں تم سے ایک سوال کر سکتی ہوں؟" نیلوفر کی آواز لڑکھڑائی تھی۔

احمد اس کی معلومات پر چونکا۔

"میرے حفظ کے بارے میں تمہیں کیسے پتا چلا؟" وہ حیران ہو کر بولا۔

نیلو فر استہزائیہ انداز میں ہنس دی۔

''ہم تمہارے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں، احمد۔ بہت کچھ جس سے شاید تم خود بھی واقف نہیں۔'' وہ نرمی سے مسکرائی۔

احمد کے چہرے پر تلخ مسکراہٹ بکھری۔

''ایسا کیا ہے؟ وہ کون سا راز ہے جس سے میں آشنا نہیں ہوں؟ وہ راز جس کی وجہ سے تم لوگ مجھے نہیں مارتے؟ میرا تم سب سے آخر کیا تعلق ہے؟'' احمد نے سوالیہ نگاہ نیلو فر پر ڈالی۔ یہ وہی سوال تھا جو سالوں سے اس کا تعاقب کر رہا تھا۔

''میں تمہیں۔'' اس نے حلق میں تھوک نگلا۔ ''تمہیں نہیں بتا سکتی۔'' آواز ایک بار پھر لڑکھڑائی تھی۔

احمد نے بے یقینی سے نیلو فر کو دیکھا۔ اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس خارج کی۔

''تم کیا پوچھنا چاہ رہی تھی؟'' اس نے موضوع تبدیل کرنا چاہا۔

نیلو فر نے سر اوپر نیچے ہلایا۔

''احمد۔'' اس نے گلہ کھنکھارا۔ ''میں نے بہت غلط کام کیے ہیں۔ قتل کیے ہیں۔ لوگوں کے کاروبار جلائے ہیں۔ انسانوں پر ظلم ڈھائے ہیں۔ میں نے درندگی کی ہر حد پار کی ہے۔'' آنکھوں میں پچھتاوا تھا۔

''تم جس گناہ کا نام لو گے وہ میں نے کیا ہو گا۔ اس سب کے باوجود اگر میں معافی مانگوں؟ تو کیا رب مجھے معاف کرے گا؟ کیا میرے لیے امید باقی ہے؟'' وہ آواز میں ڈھیروں آس لیے بولی تھی۔

احمد کچھ دیر خاموش رہا۔ آنکھیں جھکا لیں۔ وہ کون تھا اس کے حق میں فیصلہ سنانے والا؟

''بالکل ہے۔ ہر گنہگار کے لیے امید ہوتی ہے، نیلوفر۔ میرے لیے بھی ہے، آپ کے لیے بھی ہے، ہم سب کے لیے ہے۔'' وہ نرمی سے بولا تھا۔

نیلوفر کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''اس سب کے باوجود بھی؟ میں نے کوئی عام سے گناہ تو نہیں کیے، احمد؟'' نیلوفر حیران ہوئی۔

''یہی فرق ہے بندے اور خدا میں، نیلوفر۔ وہ کسی خاص وجہ کی بنا پر خدا کہلایا جاتا ہے، ہم سب کا رب کہلاتا ہے۔ آپ خدا کو انسان کے اسکیل پہ رکھ کے جج کر رہی ہیں جب کہ خدا تو خدا ہے۔ وہ ہم سب سے بڑا ہے۔ یہ بڑائی یہ بزرگی اسے خدا بناتی ہے، نیلوفر۔ وہ رحمٰن ہے نیلوفر، وہ رحیم بھی ہے۔ وہ غفور ہے۔ وہ کیوں معاف نہیں کرے گا؟۔'' وہ تحمل سے بولا تھا۔

نیلوفر کی آنکھ سے آنسو پھوٹا۔ اور وہ اسی رب سے بدظن تھی جو احمد کا رب تھا، جو شمائلہ کا رب تھا۔ وہ دونوں اس کے سامنے تھے۔ ان کی زندگیوں میں ہر مصیبت کے باوجود اطمینان تھا۔ اور وہ، وہ کہاں کھڑی تھی؟

''سورۃ زمر میں خدا نے فرمایا ہے، نیلوفر:

(اے نبی ﷺ) کہہ دو کہ 'اے میرے بندو، جنہوں نے اپنی جانوں پہ زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، یقیناً سارے گناہ اللہ معاف کر دیتا ہے، وہ تو غفور رحیم ہے۔

نیلوفر یہ ہے ہمارا رب۔ اس کی رحمت کے در کبھی بند نہیں ہوتے ہیں۔ آپ انہیں کھٹکھٹا کر تو دیکھیں؟" احمد کے چہرے پر آسودہ سی مسکراہٹ بکھری۔

نیلوفر کے آنسو تواتر کے ساتھ بہے۔ اسے جیسے ہی اندازا ہوا، اس نے شرم کے مارے آنسو رگڑے۔ گیلی سانس اندر کھینچی۔

"کیا مجھے گرفتاری دینی چاہیے، احمد؟" آواز ہنوز گیلی تھی۔

"اگر آپ کو لگتا ہے کہ گرفتاری دینے سے آپ کے اعمال درست ہو سکتے ہیں تو آپ کو دے دینی چاہیے۔ آپ کو اپنے اعمال درست کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

نیلوفر نے سوچتے سمجھتے سر اثبات میں ہلایا۔ دل میں امید کے چراغ جل چکے تھے۔ وہ کچھ بھی کر کے ان کے شعلوں کو قائم و دائم رکھنا چاہتی تھی۔

"میں وہی کرنے یہاں آئی ہوں۔ یہ سمجھ لو کہ اپنی غلطی کا مداوا کرنا چاہتی ہوں۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں، احمد۔"

اس نے اچنبھے سے نیلوفر کو دیکھا۔

"کس طرح؟" اس کی دلچسپی بڑھنے لگی۔

”تمہارے پاس شمس کی ایک ویڈیو ہے، احمد۔ اس نے مجھے سب بتایا ہے۔ تم وہ ویڈیو مجھے دے دو۔ اس کے بدلے میں تمہیں کچھ بہت خاص دوں گی۔“ آخری فقرہ کہتے ہوئے نیلوفر معنی خیز سا مسکرائی۔

احمد کو تعجب نے گھیر لیا۔

”کیا ہے وہ خاص چیز؟“ اس نے سرگوشیانہ انداز میں پوچھا۔

نیلوفر کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ اس نے اپنے پرس میں ہاتھ ڈالا اور ایک بھورا لفافہ نکالا۔ لفافے کے اوپر چند لفظ کندہ تھے۔ لفافہ نیلوفر نے احمد کی طرف بڑھایا۔

لفافے پر لکھی تحریر پڑھ کر پہلے اس کی آنکھوں میں بے یقینی دوڑی۔ پھر ایک خوشگوار مسکراہٹ اس کے چہرے پر بکھری۔ اس کا زور و شور سے ہنسنے کا جی چاہا۔

”کیا یہ وہی ہے جو میں سوچ رہا ہوں؟“

نیلوفر اور احمد کی معنی خیز نظروں کا تبادلہ ہوا۔

نیلوفر نے ایک ادا سے سر کو خم دے کر احمد کے اندازے کی تصدیق کی۔

☆☆☆

سُرخ قالین اور سیاہ دیواروں والے بنکر میں خوشیوں کا سماں تھا۔ سامنے لیپ ٹاپ کھلا ہوا تھا۔ تینوں کرسیوں پر بیٹھے لیپ ٹاپ کی سکرین تک رہے تھے۔

”اس کا خیال پہلے آجانا چاہیے تھا۔ کتنی ہی بیوقوف عورت تھی وہ جو کیمرے کے سامنے قتل کر بیٹھی۔“ درفشاں چہک کر بولی۔

”ہم اس ویڈیو کو وائرل کر دیں گے اور پھر لیڈی اقتدار کا اقتدار ختم۔“ حسام جوش میں آکر بولا۔

مناج پھیکا سا مسکرائی۔ کچھ تھا جو اسے اندر سے کھٹک رہا تھا۔ مگر وہ کچھ کہہ کر اپنے ساتھیوں کو مایوس نہیں کرنا چاہتی تھی۔

حسام نے لیپ ٹاپ پر عمارہ کی ریکارڈنگ تلاش کی۔ کچھ دیر بعد وہ مل گئی تھی۔

”اتنی آسانی سے۔ نہیں۔“ مناج نے دل ہی دل میں سوچا۔

حسام نے وہ ریکارڈنگ کھولی۔ کچھ دیر لوڈنگ ہوئی۔ اور پھر ایرر میسج اسکرین پر آیا۔ ریکارڈنگ کی فائل کرپٹ تھی۔ پوری ریکارڈنگ بے کار ہو گئی تھی۔ سب کے چہروں کی خوشگوار مسکراہٹیں فنا ہوئیں۔ مناج دوسری طرف پر سکون تھی۔ بعض اوقات چھوٹی توقعات بڑی مایوسیوں سے بچا لیتی ہیں۔

”حسام۔“ مناج مشینی انداز میں بولی۔ ”یو ایس بی چیک کرو‘ اس میں سارا بیک اپ تھا۔“ مناج نے بات مکمل کی تو حسام کھڑا ہوا۔

بنکر میں ایک کمپارٹمنٹ تھا جو کہ بظاہر دیوار کا حصہ لگتا تھا۔ حسام نے ڈیسک سے ایک میگنیٹ کا ٹکڑا اٹھایا۔ درفشاں مضطرب سی ہو کر حسام کو دیکھ رہی تھی۔

”اف مناج۔ بس اب یو ایس بی میں وہ ریکارڈنگ موجود ہو۔“ درفشاں ہارے ہوئے انداز میں بولی۔

مناج نے کوئی جواب نہ دیا۔

حسام اس کمپارٹمنٹ تک پہنچا۔ اس نے میگنٹ کمپارٹمنٹ کے قریب کیا تو وہ خود بخود باہر آنے لگا۔ اس کمپارٹمنٹ میں کچھ فائلز تھیں اور ایک نیلی یو ایس بی بھی۔ اس نے یو ایس نکالی اور واپس اپنی کرسی پر آیا۔

یو ایس کمپیوٹر کے اندر داخل ہو چکی تھی۔ دعاؤں کا وقت شروع ہو چکا تھا۔

یو ایس بی کھل چکی تھی۔ مناج نے اندازہ لگایا کہ وہ خالی ہو گی، مگر وہ خالی نہ تھی۔ خوشگواری لوٹ آئی تھی۔ امیدیں آسمانوں کو سر کر گئیں۔

''یقیناً انہوں نے یہ کمپیوٹر ریکارڈنگ کرپٹ کر دی ہو گی لیکن انہیں بیک اپ کا علم نہیں تھا۔'' درفشاں خوشی سے چہکی۔

مناج اب تک مطمئن نہ تھی۔ وہ جس لیڈی اقتدار سے ملی تھی، وہ اتنی بیوقوف نہیں تھی جو اتنا بڑا قدم بغیر کسی حفاظتی تدابیر کے اٹھائے۔

''اس ویڈیو کو پلے کرو۔'' مناج ازلی انداز میں بولی۔

حسام حکم بجالایا۔

ویڈیو لوڈ ہوئی۔ اور پھر وہ کھل گئی۔ عمارہ کی ٹیکسی والا منظر سب کی آنکھوں کے سامنے نمایاں ہوا۔ مناج کے چہرے پر حیرت در آئی۔ درفشاں خوشی کے مارے تالیاں پیٹنے لگی۔

عمارہ کی ٹیکسی عافیت زندگی کے ہسپتال کے باہر رکی تھی۔ سکرین میں بلند و بالہ عمارت کا منظر ابھرا۔ یکبارگی سکرین سیاہ ہوئی اور پھر رنگ تبدیل ہوئے۔

ایک ڈاکیومینٹری نہ جانے کہاں سے چلنا شروع ہو گئی تھی۔

”لیڈی اقتدار، قدرت کا ایک شاہکار، جنہوں نے پاکستان کے لیے نہ جانے کیا کچھ نہیں کیا۔ ہم ذرا اس عظیم ہستی کے کارناموں پر نظر ڈالتے ہیں۔“

چہرے کے زاویے بگڑتے چلے گئے۔ امیدوں کے پہاڑ پاش پاش ہوئے۔

”اس ہستی نے پاکستان کا سب سے جدید ہسپتال بنایا ہے۔“

ڈاکیومینٹری ان سب کے بدلتے جذبات سے بے نیاز چلتی گئی۔ وہ بت بنے اس ناکامی کو ہضم کر رہے تھے۔

”جی ہاں! عافیت زندگی کا یہ ہسپتال جو کہ پاکستان کا سب سے بہترین ہسپتال ہے۔ انہوں نے اپنے مرحوم والد کی لیگسی کو قائم و دائم رکھا۔ ایک آئڈیل ڈاکٹر تو ہیں ہی لیکن ایک آئڈیل بیٹی۔۔۔“

مناج نے تنگ آکر لیپ ٹاپ کی اسکرین بند کی۔ حلق تو کیا' اس کے تو معدے تک میں کڑواہٹ گھل گئی تھی۔ سب کے چہروں پر ہارا ہوا تاثر تھا۔

”مجھے پہلے ہی شک تھا۔“ مناج نے خاموشی کو توڑا۔

”وہ منجھی ہوئی مجرم ہے۔ بغیر تیاری کے کچھ نہیں کرتی۔ مگر سوچنے والی بات یہ ہے، وہ اس بنکر تک پہنچی کیسے؟“

ایک نئی پہیلی نے دماغ میں گھر کیا۔

☆☆☆

مہر بنت عبد اللہ سلطان عنایا کو سکول سے لے کر باہر آ رہی تھی۔ ماں بیٹی کے مابین بڑی گفتگو چل رہی تھی۔ مہر گاڑی کا دروازہ کھول رہی تھی، ٹھیک اسی وقت، اس کی نظر ایک بچے پر پڑی جو فوٹ پاتھ پر بیٹھا تھا۔ اس کے عقب میں کتابیں تھیں، مگر وہ سکول کے یونی فارم میں ملبوس نہ تھا۔

عنایا گاڑی میں سوار ہو چکی تھی۔ مہر نے جھک کر اگنیشن میں چابی گھمائی اور اے سی چلایا۔

"عنایا، میں بس ابھی آئی۔" وہ گاڑی کا دروازہ ٹھپ سے بند کرتی اس بچے تک پہنچی

اس کے چہرے پر دھول مٹی کے نشانات تھے۔ مہر کی آنکھیں ترحم ہوئیں۔

"کیا چل رہا ہے؟" وہ نرمی سے بولی۔

لڑکے نے لمبی عورت کو مڑ کو دیکھا۔

"کیا آپ یہ کتابیں خریدنا چاہیں گی؟" وہ لڑکا فوراً سے بولا۔

مہر چونکی؟ کیا ضرورت پیش آئی ہو گی جو وہ استعمال شدہ کتابیں بیچ رہا تھا؟

"لے لوں گی۔ مگر مجھے بتاؤ یہ کتابیں کیوں بیچ رہے ہو؟"

لڑکے نے اپنی گردن جھکا لی۔ گردن اٹھائی تو اس کی آنکھیں غمگین تھیں، چہرے پر رنج بھرا ہوا تھا۔

"میرے بابا کا چار ماہ پہلے انتقال ہوا تھا۔ اسکول کب کا چھوڑ دیا ہے، اب خرچہ پورا کرنے کے لیے یہ کتابیں بیچنی پڑ رہی ہیں۔" وہ اداس سا مسکرایا۔

محلوں میں پرورش حاصل کرنے والی مہر کی آنکھوں سے آسائشات کی پٹی سرکی۔ دل کانپ اٹھا تھا۔ باپ اس کا بھی مرا تھا۔ دیوالیہ وہ بھی ہوئی تھی۔ مگر پھر بھی، اچھا کھا رہی تھی، اچھا پی رہی تھی۔ زندگی کی سختیاں ہر کسی کے لیے یکساں نہیں ہوتیں۔

وہ جھک کر اس کے برابر میں بیٹھی۔ وہ ہچکچایا۔

”کیا آپ اسکول نہیں جانا چاہتے؟“

”جانا چاہتا ہوں۔“ وہ اداسی سے بولا۔

اس نے نرمی سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

”نام کیا ہے آپ کا؟“

وہ پرسکون ہونے لگا تھا۔ اجنبی عورت مہربان معلوم ہوئی۔

”ارسلان۔“ اس کی ہچکچاہٹ دم توڑ چکی تھی۔

”ارسلان؟“ مہر مسکرائی۔ ”بہت پیارا نام ہے۔“ مہر نے اپنے پرس میں ہاتھ ڈالا اور ایک کارڈ نکالا اور ارسلان کے حوالے کیا۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے اسے گھور رہا تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے معصومیت سے پوچھا۔

”یہ آپ اپنی ماما کو دے دینا۔ کہنا کہ اس نمبر پہ کال کرلیں، میں آپ کی مدد کرنے کو تیار ہوں۔“ مہر نے ایک دفعہ پھر سے اپنے پرس میں ہاتھ ڈالا اور ہزار کے دو نوٹ نکالے۔ تھوڑی دیر اصرار کرنے کے بعد ارسلان نے وہ نوٹ لے لیے تھے۔

مشکلات کے باوجود وہ کس قدر خود مختار تھا؟ مہر کو اس پر رشک آیا۔

”آپ بہت مہربان ہیں، باجی۔“

مہر زیر لب ہنس دی۔ سر نفی میں ہلایا۔

”میں مہر ہوں، اور میں تخلیق ہوں اس رب کی، جو مہربان ہے۔“ آخری مرتبہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”یاد سے آپ دے دینا۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔

ارسلان نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلایا۔

مہر دل میں ایک عجیب سا احساس لیے گاڑی میں واپس لوٹی۔ عنایا بچا ہوا لنچ کھانے میں مگن تھی۔ اس نے عنایا پر نظر ڈالی، وہ خوش تھی۔ اپنا کھانا پینا کر سکتی تھی۔

لیکن اسی دنیا میں ایک دوسری دنیا تھی جہاں ایسے بچے ہوں گے، جو پڑھنا چاہتے ہوں گے لیکن پڑھنے لکھنے کے وسائل نہیں ہوں گے۔ ارسلان سے مختصر ملاقات نے اسے بہت کچھ سوچنے پہ مجبور کر دیا تھا۔

یکبارگی ایک خیال نے مہر کے دماغ میں جنم لیا۔

ایک انوکھا خیال۔

ایک عزم نے مہر کے دل میں مُہر ثبت کی۔

اس کی کاروبار میں کبھی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کو اپنے ڈیڈ کی کمپنی سے آج تک لگاؤ نہ تھا۔ شاید وہ کاروبار سنبھالنے کے لیے بنی ہی نہیں تھی۔

ہاں! وہ کبھی اپنے کام سے خوش نہیں تھی کیونکہ وہ یہ کام کرنے کے لیے بنی ہی نہیں تھی۔ اس نے تو کچھ اور کرنا تھا۔ وہ جو اس کے حالیہ کام سے لاکھ درجہ بہتر تھا۔

''مام' آپ گاڑی کیوں نہیں چلا رہیں؟'' چھوٹی عنایا رول کا لقمہ بھرتے بولی۔ مہر کے خیالات کا تسلسل ٹوٹا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ اس نے اپنا سر جھٹکا اور عنایا کو دیکھا۔

''بس' چلتے ہیں۔'' مہر نے گاڑی چلانا شروع کی۔



اس کے ہاتھ رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ چہرے کو موٹے بھاری کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔ چہرہ پسینے سے تر تھا۔ جسم کا حال خراب تھا۔ اس کی ہڈیوں کے اندر تک درد کی پاداش تھی۔

اس کے جسم پر شرٹ نہیں تھی۔ جسم جگہ جگہ سے خون آلود تھا۔ لمبی لمبی خراشیں جسم پہ لگی ہوئی تھیں۔ ان خراشوں پر مرچیں لگ رہی تھیں۔ وہ درد سے کراہ رہا تھا۔ وہ اس کمرے میں کتنے دنوں سے چلا رہا تھا۔ مگر اس کی چیخ و پکار سننے والا کوئی نہ تھا۔

وہ رو رہا تھا۔ اسے گھٹن زدہ ماحول سے خوف آ رہا تھا۔ وہ کپکپا رہا تھا۔ شدید اے سی کے باعث اسے بہت ٹھنڈ لگ رہی تھی۔ وہ دو دن سے اس ٹھنڈ کو جھیل رہا تھا۔ کھانے پینے کی تو اس نے شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ اس کا گلا بالکل خشک ہو گیا تھا۔ جسم سے ساری توانائی ختم ہو گئی تھی۔ بس ایک غلطی کی وجہ سے اس کی پوری زندگی ایک باریک دھاگے پر آ کھڑی ہوئی تھی۔

وہ بھول گیا تھا کہ باہر کی دنیا کیسی ہوتی ہے۔ رنگ کیسے ہوتے ہیں۔ کھلی فضا میں سانس لینا کیسا ہوتا ہے۔ جب سورج کی کرنیں جسم کو جھلساتی ہیں تب کیسا محسوس ہوتا ہے۔

وہ انجان تھا اپنے انجام سے۔ وہ انجان تھا کہ یہ تکلیف اسے کب تک جھیلنی پڑے گی۔ وہ چاہتا تھا کہ موت اسے جلد از جلد اپنی لپیٹ میں لے۔ لیکن وہ مرنے سے کتراتا تھا۔

اسے ایسا لگتا تھا جیسے جسم کا سارا خون جمنے لگا تھا۔ اور اسی وقت کمرے میں آہٹ ہوئی۔ وہ چوکنا ہو گیا۔

"پلیز مجھے چھوڑ دو۔" وہ گڑگڑایا۔

دو دن سے وہ یہی گردان کر رہا تھا۔

"چہرہ کھول دو اس کا۔" بھاری بھرکم، نسوانی آواز اس کمرے میں گونجی۔

شمس اس آواز کو لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ یہ اس کی لیڈی تھی۔ اس کی مالکن۔ لیڈی اقتدار۔ وہ جس کے حکم بجالاتے لاتے پوری زندگی گزار دی اور وہ ایک غلطی پر اسے یوں تڑپا رہی تھی۔

شمس ایک دفعہ پھر سے رونے لگا۔ اسے ماضی میں کیا ہر ظلم یاد آنے لگا۔ کتنے انسانوں کو وہ یوں ہی باندھا کرتا تھا، انہیں تشدد کا نشانہ بنایا کرتا تھا۔ کتنے قتل اس نے اپنی پینتیس سالہ زندگی میں کیے تھے، کتنے لوگوں کو اپنی درندگی کا نشانہ بنایا تھا۔ اسے سب یاد تھا۔ مجرم اپنا جرم کبھی نہیں بھولتا۔

جس عورت کی خاطر اس نے اپنے نفس کو بیچا، اپنی پاکی پامال کی، وہ عورت ہی آج اس کی جان کی دشمن بنی تھی۔ وہ عورت اس کی ایک غلطی بھی بھلانے کو تیار نہ تھی۔ کیا اتنی بے معنی تھی اس کی جان؟ کیا کمایا اس نے ان پینتیس سالوں میں؟ کچھ بھی نہیں۔ سب پیچھے رہ گیا تھا۔

اس کے منہ سے وہ بھاری کپڑا اٹھایا۔ وہ گہری سانسیں لینے لگا۔ اس کمرے میں لال بتی جلی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے ہاتھ پشت کی طرف باندھے لیڈی اقتدار کھڑی تھی۔ آنکھوں میں آگ تھی۔ وہ آنکھیں ہی شمس کو سب کچھ بتلا رہی تھیں۔ شمس نے ایک اداس نگاہ لیڈی اقتدار پر ڈالی۔ اداسی کے ساتھ ساتھ ان نظروں میں شکایت بھی تھی۔

"آپ کی خاطر میں نے کیا کچھ نہیں کیا لیڈی؟ آپ میری ایک غلطی بھی معاف نہیں کر سکتیں؟" وہ شکوہ کناں انداز میں گویا ہوا۔ غذائیت کی کمی کی وجہ سے اس کی آواز قدرے کمزور تھی۔ اس کے لیے بولنا محال تھا۔

"تم دھوکے باز ہو! دھوکے باز فطرتاً دھوکے باز ہوتا ہے۔ دغاباز کو فوری ختم کر دینا چاہیے۔ تم ایک دفعہ پیٹ میں چھرا گھونپنے کی جرات کر سکتے ہو تو دوبارہ بھی کر سکتے ہو۔" وہ غرائی تھی۔ اس کا سانس پھولنے لگا تھا۔ شمس اس بھاری بھرکم برائی کی ملکہ کو دیکھتا رہ گیا۔

"میں مجبور تھا لیڈی۔ مجھے احمد کا دبئی میں جانا آپ سے چھپانا نہیں چاہیے تھا۔"

لیڈی اقتدار بری طرح چونک گئی۔ ایسا لگا جیسے چھت اس پر گر پڑی ہو۔

"اس نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔ میں کیا کرتا؟" شمس گڑگڑایا۔

لیڈی اقتدار سکتے میں آگئی۔ دل میں زلزلہ آچکا تھا۔

لیڈی اقتدار شمس کی طرف بڑھی اور اس کے زخمی چہرے پہ زناٹے دار تھپڑ لگایا۔ شمس کی روح کانپ اٹھی تھی۔ وہ بھی ایسے ہی لوگوں کو بے بس کر کے پیٹا کرتا تھا۔ اسے وہ سب یاد آیا۔

تھپڑ اتنا زور دار تھا کہ شمس کا چہرہ ترچھا ہو گیا۔

لیڈی اقتدار نے شمس کے بال جکڑے اور انہیں زور سے کھینچا۔ شمس نے درد بھری سسک جاری کی۔

"کیا بکواس ہے؟ احمد دبئی گیا تھا؟ تم مجھے اب بتا رہے ہو؟" وہ دھاڑی۔

چونکنے کی باری شمس کی تھی۔ نیلوفر نے لیڈی اقتدار کو اس بارے میں نہیں بتایا؟ شمس کا سر چکرانے لگا تھا۔

وہ آخر کیوں صرف لیڈی اقتدار کو ہیروں والی بات بتائے گی؟ سر اور بھی شدت سے چکرایا۔ دماغ کے کونے میں ایک خیال ابھرا۔ نیلوفر اسے دھوکہ دے چکی تھی۔ نیلوفر صرف اسے ہی نہیں لیڈی اقتدار کو بھی دھوکہ دے رہی تھی۔ نیلوفر نے ہی اس حال میں پہنچایا تھا۔ اس نے اسے بچانے کے لیے کوئی بھی کوشش نہ کی تھی۔ دماغ گواہی دے رہا تھا۔ اسے اپنا آپ بکھرتا ہوا محسوس ہوا۔

وہی نیلوفر جس کے لیے اس نے نہ جانے کتنے خطرے مول لیے۔ وہ اس کے ساتھ ایسا کیسے کر سکتی تھی؟ وہ نیلوفر جس کے آگے پیچھے پھرتا تھا، اس کا ہر چھوٹا بڑا کام پورے دل سے کرتا تھا۔ شمس کو اپنا آپ بیوقوف لگا۔ جسمانی تکلیف الگ تھی، کہ روح پر بھی مہلک زخم آن وارد ہوئے تھے۔

وہ کچھ نہ بولا۔ وہ آگے سے نہ بولا کہ نیلوفر بھی دبئی والی بات جانتی تھی۔ وہ بولنا چاہتا ضرور تھا ۔لیکن، وہ نیلوفر کے لیے کچھ نہ بولا۔ وہ جانتا تھا یہ بات نیلوفر کو مشکوک بنا دے گی اور اس کا بھی یہی انجام

ہونا تھا۔ وہ اسے دھوکا دے چکی تھی تو کیا ہوا، وہ تو اس سے سچی محبت کرتا تھا ناں۔ ایک آخری قربانی اور سہی۔

"میرا کام تمام کر دیں لیڈی۔" وہ بے تاثر سے لہجے میں بولا۔

اس کی اندر سے جینے کی جست ختم ہو گئی تھی۔

"میں موت کا حقدار ہوں۔" اس کا دل بھاری ہونے لگا تھا۔ جاتے جاتے وہ نہ جانے کتنے روگ اپنے ساتھ لے کر جا رہا تھا۔

"وہی کرنے میں آج آئی ہوں! تم ایک دردناک موت کے حقدار ہو۔" لیڈی اقتدار نے شمس کے بالوں سے گرفت ڈھیلی کی۔

اس نے اپنا پورا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ یہ آخری زخم اس کی ہمت چٹ کر چکا تھا۔ یہ آخری زخم اسے معذور کر چکا تھا۔ دل ٹوٹ چکا تھا۔ کرچی کرچی ہو گیا تھا۔ وہ مرنے والا تھا لیکن مرتے دم تک وہ اپنی محبت سے وفا کرنا نہیں بھولا تھا۔ وہ نیلوفر کو کھائی میں جھونک کر نہیں جا رہا تھا۔

"اندر آؤ۔"

دو مرد اس لال روشنی میں نہائے کمرے میں داخل ہوئے۔ دونوں کے ہاتھ میں ایک چکور ڈیوائس اور کروکوڈائل کلپز تھے۔ لیڈی اقتدار اسے دیکھ کر مسکرائی۔ مسکراہٹ میں انتقام کی آگ جھلکتی تھی۔

"کام تمام کرو اس کا۔"

ایک مرد نے کروکوڈائل کلپ کو اس ڈیوائس سے لگایا۔ وہ ایک کرنٹ جنریٹر تھا۔ پھر شمس کی انگلی پر ایک لگایا، شمس کے پاؤں کی انگلیوں پر بھی لگائے۔

"آہستہ آہستہ کرنٹ کو بڑھاؤ، تب تک جب تک یہ تکلیف سہہ نہ سکے۔" وہ دانت پیستے بولی تھی۔

شمس ڈھیلا جسم لیے بس سب سنتا گیا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ وہ پورے دل سے مرنے کے لیے تیار تھا۔

ڈیوائس آن ہوئی۔ ہلکا سا کرنٹ کروکوڈائل کلپس سے شمس کے جسم میں داخل ہوا۔ اس کی گردن بے اختیار کھڑی ہوئی۔ وہ جھٹکے لینے لگا۔ جسم کے اندر مڑوڑ اٹھ رہے تھے۔ دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ کرنٹ آہستہ آہستہ بڑھتا چلا گیا۔ جسم میں پیدا ہوتی مڑوڑیں بڑھتی چلی گئیں۔ وہ تکلیف سے تڑپ اٹھا۔ یہ تکلیف الگ سی تھی۔ دنیا سے الگ۔ اس کی آنکھیں جیسے پھٹ کر باہر آنے کو تھیں۔ بال کھڑے ہو گئے تھے۔ اس کا چہرہ سیاہ ہونے لگا۔ جسم کے لرزش میں اضافہ ہوا۔

وہ ایک لمحے کے لیے کہنا چاہتا تھا کہ اس سب کو روک دیا جائے۔ یہ آسان نہ تھا۔ لیکن اس سے بولا بھی نہ گیا۔ تکلیف اپنی انتہا کو پہنچی۔ اس کے بالوں سے دھواں نکلنے لگا۔ اور پھر جسم نے ایک زور کا جھٹکا لیا۔ گردن ڈھیلی ہوئی۔ مردہ جسم کرنٹ کے جھٹکوں پر اچھل رہا تھا۔

"بند کر دو۔" اس کی سرد آواز اس کمرے میں گونجی۔

وہ جانتی تھی شمس کا کام تمام ہو گیا تھا۔ ایک اور بے وفا اپنے ٹھکانے پہنچا دیا گیا تھا۔ وہ ہاتھ جھاڑتے کمرے سے باہر نکلی۔ چہرے پر اطمینان تھا۔

☆☆☆

آفت ٹوٹ چکی تھی۔

بس اس کی خبر ان تک نہ پہنچی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی، ان کی طرف جا رہی تھی۔ اپنے سینے میں ایک نئی مصیبت کا پیغام چھپائے۔ سر پر چادر اوڑھی ہوئی تھی۔ آنکھیں سوجھی تھیں۔ اسے دیکھ کر اندھا بھی سمجھ جائے کہ وہ عورت دکھوں کی ماری تھی۔

دِرفشاں نے اس حواس باختہ عورت کو حرر کے دروازے پر پایا۔ وہ اس کی طرف لپکی۔

"سب خیریت ہے؟ ہم آپ کی کیسے مدد کر سکتے ہیں؟"

حرر کے کارکنان چونک گئے۔ سب کی توجہ اس انہونی کی ماری عورت پر ٹھہری۔ کون جانتا تھا کہ اس کے لبوں سے نکلنے والے الفاظ سکون غارت کرنے والے تھے۔

"ادریس، کھو گیا ہے۔"

تین الفاظ۔ تین الفاظ اور سب کو گویا سانپ سونگھ گیا۔ سفید پڑتے چہرے، حیرت ظاہر کرتی آنکھیں۔

"مجھے مس مناج سے ملنا ہو گا۔" وہ عورت ہاتھ آپس میں مسل رہی تھی۔

دِرفشاں نے اسے صوفے پر بٹھایا۔ مناج اس عورت کے پاس بیٹھی۔ حسام پانی کا گلاس لے کر آیا۔ متحررین ہجوم کی صورت اس عورت کے ارد گرد جمع ہو گئے تھے۔

"وہ کھو چکا ہے۔ وہ دو دن سے نہیں ملا۔ نہ اس کا فون لگ رہا ہے۔" آنسو بے اختیار پھوٹے۔

”مس مناج، پلیز کچھ کریں۔ ہماری دو سالہ بیٹی ہے۔ وہ بہت اٹیچ ہے اپنے باپ سے۔“

”آپ نے پولیس کو خبر کی؟“ مناج نے عورت کا کندھا سہلایا۔

”کی تھی۔ مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔“ وہ گردن جھکائے آنسو ضبط کرنے میں کوشاں تھی۔

”آپ بے فکر رہیں۔“ مناج نے اس کے ہاتھ تھامے۔ ”میں وعدہ کرتی ہوں۔ ادریس کو ڈھونڈ نکالوں گی۔“ مناج نے درِفشاں کو آنکھ سے اشارہ کیا۔

باتوں کے فن میں ماہر عورت نے اس عورت کو دلاسے دیے۔ پھر وہ امیدوں کے پلندے کندھوں پر لاد کر چلی گئی۔

اس کے جاتے ہی وحشت ناک خاموشی حائل ہوئی۔ سب منتظر نگاہوں سے مناج کو دیکھ رہے تھے، جو گردن جھکائے بیٹھی تھی۔

”دو دن سے شکیل بھی نہیں آیا۔“ حسام نے اطلاع دی۔

”لائبہ، شکیل کے گھر والوں کو فون کر کے پتا کرو۔“ مناج نے ریسیپشنسٹ کو مخاطب کیا۔

سب کی نظروں نے اس کا تعاقب کیا۔ وہ فون پر بات کر کے لوٹی۔

”اچھی خبر نہیں ہے۔ وہ پچھلے دو دنوں سے لاپتا ہے۔“

چند آہیں نکلیں۔ کچھ کے ہاتھ سروں تک گئے۔ کچھ خوف کے مارے ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔

”اس کا تو ایک ہی مطلب ہے۔۔۔“ درِفشاں کہتے کہتے رک گئی۔

"ہم سب کو ایک ایک کر کے غائب کیا جا رہا ہے۔" مناج آرام سے بولی۔ سرسری نگاہ ہجوم پر ڈالی۔

یکبار گی انتشار پھیلتا گیا۔ کئی چہرے پریشان ہوئے۔ بعض کی آنکھیں ڈر سے پھڑ پھڑائیں۔

"آپ یہ سب اتنے آرام سے کیسے کہہ سکتی ہیں؟"

ایک کارکن آگے بڑھ کر بولا۔ چہرے پر واضح گھبراہٹ تھی۔

مناج نے اسے سرد گھوری سے نوازا۔ کچھ تھا اس کی نگاہوں میں کہ وہ خود بہ خود دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"ہم جس مقصد کے لیے کام کر رہے ہیں، اس میں جانیں جا سکتی ہیں۔ ہم زخمی ہو سکتے ہیں۔ مجھے لگا تھا، آپ سب ان صورتحال کے لیے تیار ہوں گے۔" وہ سختی سے بولی۔

"مس مناج، ہمیں کچھ دنوں تک حرر بند کر دینا چاہیے۔" دوسرا کارکن آگے بڑھ کر بولا۔

مناج نے گردن نفی میں ہلائی۔ اب کی بار بعض چہرے غصیلے ہوئے۔

"حرر بند نہیں ہو گا۔ ہم ڈر کر، خوفزدہ ہو کر اپنے دروازے بند نہیں کر سکتے۔ اس خواب کو تعمیر کرنے کے لیے میں نے ایک ایک اینٹ اپنے ہاتھوں سے لگائی ہے۔ یہ کھلا رہے گا، ان سب کے لیے جو حقیقی طور پر قید ہیں۔" سرد آواز میں ڈھکی چھپی دھمکی تھی۔

”آپ سب کے لیے یہ باتیں کرنا آسان ہوں گی۔“ جواب آیا۔ ”ہماری فیملیز ہیں۔ ہمارے گھر والے روز ہمارا انتظار کرتے ہیں۔ ہم اس طرح سے اپنی جانوں کو خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔“ آواز اونچی نہ ہو سکی۔ اس عورت کا سراپا ہی کچھ ایسا تھا۔

”کیا آپ کو آج پتا چلا ہے کہ جرائم کو بے نقاب کرنے میں خطرے کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟ کیا میں کچھ مس کر رہی ہوں؟“ آواز میں دبا دبا طنز تھا۔

وہ کچھ دیر کے لیے لاجواب ہوا۔

تناؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ سب جانتے تھے کہ یہ گفتگو کس سمت جا رہی تھی۔

”مگر یہ خطرہ اتنا بڑا ہو گا، مجھے اندازہ نہ تھا۔“

”میں غلط اندازے لگانے والوں کو بیوقوف سمجھتی ہوں۔ حرر کے دروازے کھلے ہیں۔ اپنی جان اس مقصد سے زیادہ عزیز ہے تو ابھی کہ ابھی جا سکتے ہو۔“ اس نے چبا چبا کر کہتے چوٹ کی۔

نگاہوں کے تبادلے ہوئے۔ کچھ سرگوشیاں ہوئیں۔

”ٹھیک ہے۔ آئی کویٹ!“ وہ دھاڑا۔ اور تیز قدم بڑھاتا نکل گیا۔

مناج نے سر د گھوری ہجوم میں ڈالی، جیسے کچھ باور کروانا چاہ رہی ہو۔ اس کی آنکھوں میں رعب و دبدبا قائم تھا۔

''جس کو جانا ہے۔ ابھی چلا جائے۔ حرر آزاد لوگوں کی جگہ ہے۔ جو جان کے چھن جانے کے خوف سے آزاد ہیں۔ جو عزیزوں کو کھو دینے کے خوف سے آزاد ہیں۔ خود پر روشنی ڈالیں، اگر آپ آزاد ہیں تو ٹھہر جائیں۔'' گردن جھکا دی۔

چند لمحے کے لیے خاموشی حائل رہی۔ حسام اور درے کی نگاہوں کا تبادلہ ہوا۔

''مجھے جانا ہو گا۔'' ایک اور کارکن بولا۔ اور اس کے ساتھ دو لوگ مزید چلے گئے۔

''جس کو جانا ہے جائے۔ خس کم جہاں پاک۔ میں تو یہیں ہوں۔'' لائبہ لاپرواہی سے بولی اور ریسیپشن کی طرف بڑھ گئی۔ مناج کے چہرے پر مبہم مسکراہٹ بکھری۔

''میں بھی یہی ہوں۔'' ایک اور کارکن بولا۔

اس کے بعد دو کارکن مزید چھوڑ کر چلے گئے۔

حرر میں حسام مناج اور درِفشاں کے علاوہ صرف چار لوگ بچے تھے۔ درِفشاں کا دل بجھ چکا تھا۔

''ہم اتنے سارے تھے۔ اور ہم کتنے کم رہ گئے۔'' وہ مناج کے کان میں بولی۔

حق اور انصاف کی راہ پر چلنے والے اکثر و بیشتر تنہا رہ جاتے ہیں۔

''ہمیں ایسے لوگوں کی ضرورت نہیں۔ اور اچھا ہی ہوا، ہمیں وقت پر پتا لگ گیا کون مخلص ہے اور کون نہیں۔ خدا نے حرر کو بچایا ہے۔''

''مس مناج، ادریس اور شکیل کا کیا ہو گا؟ ہم انہیں کیسے چھڑائیں گے؟'' حسام کو فکر ستانے لگی۔

”میں نے وعدہ لیا ہے۔ وعدہ نبھا کر رہوں گی۔ انہیں ڈھونڈنا مجھ پر فرض ہوا۔“ بے جان آنکھوں میں آگ کے شعلے بھڑکے تھے۔

دل ہر خوف سے آزاد تھا۔ حرر نے واقعتاان سب کو آزاد کر دیا تھا۔

☆☆☆

نیلوفر اور لیڈی اقتدار ہسپتال کی چمکتی دمکتی راہداری میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ آس پاس سے نرسز اور ڈاکٹرز گزر رہے تھے۔

”شمس کا کام تمام ہو گیا۔“ لیڈی اقتدار کچھ بوجھل تھی۔

”سالوں پہلے آیا تھا وہ۔ ہسپتال کا جمعدار تھا۔ بیوی بھاگ گئی تھی۔ باپ اپاہج تھا۔“ لبوں پر اداس مسکراہٹ تھی۔

”مگر غصے کا بہت تیز تھا۔ آئے دن جھگڑے کرتا۔ سر پھاڑ دیا کرتا۔ مگر فطرتاً ایک سادہ سا انسان تھا۔“ سرمئی آنکھوں کے سامنے ماضی کے منظر دوڑ رہے تھے۔

”کوئی احسان کرے، تو اس کا گرویدہ بن جاتا تھا۔ شاید محبت، عزت، اعتبار کو ترسا ہوا تھا۔ اس لیے ہر کسی کے لیے اس کا دل موہ لینا آسان تھا۔ یہی دیکھ کر میں نے اسے اپنے ہسپتال میں شامل کیا۔ انسان ذات سے پہلے ہی بے زار تھا۔ اور باقی کا کام میری باتوں نے کیا۔ وہ مجھ سے اتنا وفادار ہو گیا کہ میرے دشمنوں سے نفرت کرنے لگا۔“

وہ ٹھہری۔ مغموم چہرے کے سنگ نیلوفر کو مڑ کر دیکھا۔

"افسوس۔ بے حد افسوس۔ اس نے دبئی والا معاملہ چھپایا۔ اس نے ہیرے چرانا چاہے۔ جو مجھ سے وفادار ہو نیلوفر، میں اس سے وفادار ہو جاتی ہوں۔ وہ ایک دفعہ کہتا کہ اسے کچھ قیمتی چاہیے۔ میں اسے ایک سے ایک شے اس کی جھولی میں رکھ دیتی۔" وہ رک گئی۔ نیلوفر بھی رکی۔

"احمد دبئی بھی گیا تھا؟" نیلوفر نے حیران ہونے کا ناٹک کیا۔

لیڈی اقتدار نے مایوسی سے گردن جھٹکی۔

"ہاں۔ اور یہی بات تو مجھے کھل رہی ہے۔ اس نے دبئی میں کیا کیا ہو گا؟"

لیڈی اقتدار نے گردن جھکائی۔

"آپ کیا سوچ رہی ہیں؟"

"مجھے کبھی کبھار لگتا ہے کہ، تین سال پہلے تمہارا مشورہ مان کر اسے ختم کر دینا چاہیے تھا۔" وہ آنکھوں میں سفاکی لیے بولی۔

نیلوفر کے دل پر پھندا سا لگا۔ ایک وقت تھا کہ اس شخص کے قتل کا خیال دل کی کشیدگی اچک لیتا تھا، آج احمد کے چلے جانا کا خیال اسے گراں گزرا۔

"لیکن پھر وفاداری بیچ میں آجاتی ہے۔ میرے بابا کہتے تھے کہ تم جیسی بنو گی، تمہیں دنیا میں ویسے لوگ ملیں گے۔ اس لیے تم اپنے لوگوں سے وفادار بن جاؤ، تمہیں آپ ہی وفاداری ساتھی مل جائیں گے۔" وہ زخمی سا مسکرائی۔

"آپ نے جو کیا، ٹھیک کیا۔ مجھے فخر ہے آپ پر۔" نیلوفر کی آنکھیں مضطرب ہوئیں۔

لیڈی اقتدار نے گردن جھٹکی۔

''مگر مجھے ڈر لگتا ہے۔'' وہ آگے بڑھی۔ راہداری ختم ہو چکی تھی۔ وہ کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھی۔ دھوپ میں نہائی سڑک پر گاڑیاں رواں تھیں۔

''کہ کہیں ایک دن مجھے اسے ختم نہ کرنا پڑے۔'' مڑ کر نیلوفر کو دیکھا۔

''میرا دل دکھے گا۔ مگر اپنی وفاداری سے زیادہ مجھے ایک دوسری چیز عزیز ہے۔'' وہ آگے بڑھی۔ نیلوفر کی آنکھ میں آنکھ ڈالی۔

''اپنا کاروبار!'' چبا کر کہتے ہوئے، وہ دور جانے لگی۔

نیلوفر نے مڑ کر اس عورت کا سراپا دیکھا۔ دل میں اندر کہیں گرانی محسوس ہوئی۔



گہری رات میں اداس ہوائیں ہجر کا پیغام لیے رقص کر رہی تھیں۔

اس کے وجود سے ہوا کا جھونکا ٹکرایا تھا۔ کچھ محسوس کر پا رہا تھا وہ۔ شاید اداسی، انہونی۔ یا کچھ اور۔ سر جھٹکتا وہ چہل قدمی کرتا رہا۔ ماتھے پر ہلکے پسینے تھے۔ یکبارگی پجاموں میں پڑا موبائل تھرتھرایا۔ اس نے کال اٹھائی۔ فون کان سے لگایا۔

فون کے اس پار کسی نے کچھ کہا۔ وہ پھر ٹھہر گیا۔

ہوائیں اس کی نم پیشانی کو چھو رہی تھیں۔ جسم میں سنسناہٹ پیدا ہوئی۔

"کیا مطلب؟" وہ ناسمجھی سے بولا۔

جواب میں کچھ ایسا کہا گیا، کہ وہ جہاں تھا وہیں پر جم گیا۔ گویا آبشار سے بہتے ہوئے پانی کو سرد ہوا کے جھونکے نے برف کر دیا ہو۔

بے خبری سی بے خبری تھی۔ لاعلمی سی لاعلمی۔ سیاہ لباس میں ملبوس مرد اس کی طرف قدم بڑھا رہا تھا۔ اسے موجودگی کا احساس ہوا۔ خطرے کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ وہ مڑا۔ مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ دفاع کی مہلت تمام ہو چکی تھی۔

نامعلوم شخص نے حسام پر زور سے وار کیا۔ چہرے پر کستی سے ہاتھ رکھا۔ زن سے بھاگتی سیاہ وین ان کی طرف بڑھی۔ وہ آدمی طاقتور تھا، حسام کو دبوچ کر وین میں کود گیا۔

حسام پوری قوت سے چلانے لگا، مگر لبوں پر حائل ہاتھ اس کی چیخ و پکار کو دبائے دے رہا تھا۔

دروازہ بند ہوا۔

وہ جانوروں کی طرح اوندھا پڑا ہوا تھا۔ اس کے پشت پر نقاب پوش مرد بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں انجیکشن تھا۔ حسام کسی مچھلی کی طرف پھڑ پھڑایا۔ انجیکشن اس کے بازو میں داخل ہوا۔ ایک جھٹکے میں سارا مائع اس کے جسم میں منتقل ہوا۔

چند منٹ کی مزاحمت کے بعد اس کے حواس شل ہوئے۔ بصیرت دھندلائی۔ ہاتھوں نے حرکت کرنے سے انکار کیا۔ پلکیں بھاری ہوئیں، اور ایک وقت آیا کہ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

سیاہ وین اس آدمی سمیت اندھیروں میں گم ہوئی۔



درِفشاں علی الصبح پودوں کو پانی دے رہی تھی۔ گھر کے اندر سے موبائل بجنے کی آواز آئی۔ اس نے کین فرش پر رکھ کر دوڑ لگائی۔ راحیلہ کی کال آ رہی تھی۔ اسے تشویش ہوئی، آخر راحیلہ صبح سویرے کال کیوں کرنے لگی؟ اس نے فون کان سے لگایا۔

"درِفشاں، اس وقت تم کہاں ہو؟" راحیلہ کی آواز میں پریشانی گھلی ہوئی تھی۔

"گھر میں ہوں۔ سب خیریت ہے؟" درِفشاں کی تشویش میں اضافہ ہوا۔

"درِفشاں ابھی اسی وقت گھر کے دروازے بند کرو۔ اور گھر سے نہ نکلنا۔ بات سمجھ رہی ہو؟"

درِفشاں نے سینے کے اوپر ہاتھ رکھا۔ یا خدا، اب کون سی نئی افتاد ٹوٹ پڑی تھی؟

"مجھے بتاؤ تو، راحیلہ۔ ہوا کیا ہے؟"

خاموشی کا راج قائم ہوا۔ اس خاموشی نے جیسے درے کے سینے میں سوراخ کیے۔

"درِفشاں، وہ لوگ حسام کو اغواء کر چکے ہیں۔"

ایک لمحہ تھا۔ آیا اور گزرا۔ مگر درے کے دل میں نہ ختم ہونے والی چبھن چھوڑ گیا۔ راحیلہ فون کے اس پار کچھ بول رہی تھی۔ وہ کچھ بھی سننے سے قاصر تھی۔ انگلیاں کپکپائیں۔ ہاتھ سے موبائل چھوٹ کر زمین پر جا گرا۔

اسے لگا جیسے اسے کسی اونچی عمارت سے دھکا دے دیا گیا ہوا۔ سر چکرا رہا تھا۔ قدم ڈگمگا رہے تھے۔ وہ پیچھے بڑھی۔ ٹانگیں صوفے سے ٹکرائی اور وہ ڈھے گئی۔

دماغ میں اس مرد کا خاکہ ابھرا۔

کہنے کو تو کھوئے ہوئے اپنے مل جاتے ہیں۔ مگر درے کے معاملے میں کھوئے ہوئے لوگ ہمیشہ کے لیے کھو جاتے ہیں۔ فیروز بھی کھویا تھا۔ اور کبھی نہ ملا۔ حسام بھی کھو چکا تھا۔

اسے لگا وہ بھی کھو چکی تھی۔ کسی تاریک گلی میں۔ جہاں مایوسی کی دیواریں کھڑی تھیں۔ جہاں غم کی سڑانڈ تھی۔ جہاں ہواؤں میں حبس کے نام پر کرب تھا۔ اور بارش کی صورت صرف بے بسی برستی تھی۔

اس نے آنکھیں بند کیں۔

بار بار اس مرد کا چہرہ ابھرتا۔ کبھی بلی کو تھماتا ہوا خاکہ ذہن میں اترتا۔ کبھی اس کی آواز کانوں میں داخل ہوتی۔

اور اس لمحے دُرِفشاں پر ایک اور حقیقت آشکار ہوئی۔

مناج نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ وقتی کشش نہیں تھا۔

وہ دُرِفشاں کی محبت بن چکا تھا۔

☆☆☆

ڈرائنگ روم میں خاموشی کا راج تھا۔

نگاہوں کے تبادلے ہو رہے تھے۔ ایک پر سکون۔ اور دوسری، ہر احساس سے عاری۔

"تم ہو، تحریکِ حرر کی بانی۔" لیڈی اقتدار نے چائے کا کپ لبوں سے لگایا۔ کپ نزاکت سے شیشے کی میز پر دھرا۔ گردن پر پڑی ہیرے کی مالا پر انگلیاں پھیریں۔

"تمہاری ہمت قابلِ داد ہے۔ مگر تم بطور ایک انسان قابلِ داد نہیں۔" تمسخرانہ انداز میں چوٹ کرنے کی کوشش کی۔

مناج کی نگاہیں بلا تاثر رہیں۔

"میں نے تمہیں ججمنٹ پاس کرنے کا نہیں کہا۔"

لیڈی اقدار کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری۔

"پھر جو کہنا ہے، جلدی کہو۔" کلائی میں بندھی گھڑی دیکھی۔ "مجھے ضروری کام سے جانا ہے۔ اور تمہیں تو میں غیر ضروری کہنا بھی پسند نہیں کرتی۔"

ٹھہر کر لحظے بھر اس اٹھائیس سالہ عورت کو گھورا۔ اس کے چہرے میں کسی شناسا شخص کی جھلک تھی۔ مگر کون؟ اسے یاد نہیں آیا۔

"میرے بندے واپس کرو، لویزا۔"

لیڈی اقتدار کی بھنویں ستائش سے اٹھیں۔

"تمہیں میرا نام کیسے معلوم؟"

مناج پھیکا سا مسکرائی۔ اس عورت کو دیکھ کر سینے میں کڑواہٹ بھر جاتی تھی۔

”اس وقت یہ ضروری نہیں۔ مجھے بتاؤ، میرے بندے کہاں ہیں؟“ مناج نے زور دیا۔

”میرے پاس تمہارا کوئی بندہ نہیں۔ تم حرروالے میرے لیے بے ضرر سی چیونٹی جیسے ہو۔ میں تم لوگوں پر وقت برباد کرنا اپنی توہین سمجھتی ہوں۔“ طنزاً قہقہہ بلند کیا۔

”تمہارے علاوہ کون ہو سکتا ہے؟ مجھے بھڑکاؤ مت۔ میرے بندے مجھے واپس کرو۔ یہ جنگ کرنے کا طریقہ نہیں۔“

لیڈی اقتدار ایسے ہنسی جیسے مناج نے کوئی لطفیہ عرض کر دیا ہو۔

”جنگ؟ جنگ؟ مائی گاڈ! جنگ؟“ وہ سینے پر ہاتھ رکھے ہنستی گئی۔

مناج کو گھٹن محسوس ہوئی۔ اس گھر میں اسے بار بار پرویز کی یاد آ رہی تھی۔ ایک لمحے کے آنکھوں کے سامنے سالوں پرانا خون آلود منظر دوڑا۔

”اتنی خوش فہمی؟ تم تو۔۔۔ اوہ خدایا۔ میں تم جیسوں سے جنگ کروں گی؟ میری توہین ہو گی تم جیسوں سے جنگ کرنا۔“ اس نے بمشکل اپنی ہنسی قابو کی۔

”میں اپنے ٹکر کے حریفوں سے جنگ کرتی ہوں۔ اور تم حرروالے، میرے سامنے کچھ بھی نہیں۔“ نگاہیں سنجیدہ کیں۔

”مجھے میرے بندے واپس چاہییں۔ ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔“ مناج کا لہجہ سخت ہوا۔

لیڈی اقتدار نے بھنویں سکیڑیں۔

”تم میرے گھر میں، میرے لاؤنج میں بیٹھ کر مجھے ہی دھمکا رہی ہو؟“ وہ برہم ہوئی۔

”ہاں۔“ مناج کھڑی ہوئی۔ ”کیونکہ اب جنگ ہو گی۔ خود کو تیار کر لو، لویزا۔ جب تک مجھے میرے بندے نہیں مل جاتے، میں نے تمہارا پیچھا نہیں چھوڑنا۔“

لیڈی اقتدار بھی کھڑی ہوئی۔ نگاہیں درشت ہوئیں۔

”میں ایرے غیروں کی بدتمیزیاں معاف نہیں کرتی۔“ وہ آنکھیں پھاڑ کر غرائی۔

”کیا کرو گی؟ بتاؤ؟“ مناج نے ہاتھ باندھے۔ جیسے اسے چیلنج دے رہی ہو۔

”مار سکتی ہوں میں تمہیں۔“

”تمہیں لگتا ہے ہمیں موت سے ڈر لگتا ہے؟ لویزا! تم مجھے مارو گی۔ تم میرے ساتھیوں کو مارو گی۔ مگر کب تک؟ اور کتنوں کو مارو گی؟ ایک نہ ایک دن تمہارا زوال ہو گا۔ تم تہس نہس ہو جاؤ گی۔“

لیڈی اقتدار کی تکبر آمیز مسکراہٹ برقرار رہی۔

”کتے کے بھونکنے کی تمہاری باتوں سے زیادہ حیثیت ہے میرے لیے۔“ وہ چبا چبا کر کہا۔

”دیکھتے ہیں پھر۔ میری باتیں کہاں تک جاتی ہیں۔“ وہ انگلی اٹھا کر تنبیہ کرتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

لیڈی اقتدار صوفے پر بیٹھی۔ چہرے پر سکون ابھرا ہوا تھا۔ میز پر پڑا موبائل اٹھایا اور کسی کا نمبر ملایا۔

”ان چیونٹوں کو پیروں تلے وقت سے پہلے کچلنا ضروری ہے۔“

اس نے زیر لب بڑبڑاتے فون کان سے لگایا۔

☆☆☆

تحریک حرر کے ان دلیر سپاہیوں کے پاس اب کھونے کو بچا ہی کیا تھا؟

انہوں نے کھلم کھلا جنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ بے خوف، نڈر ہو کر۔

وہ ظالم ملکہ سے نہیں ڈرتے تھے۔

زیادہ سے زیادہ جان ہی تو جانی تھی؟

اور جان تو جانی ہی ہے؟

تو ایک عظیم مقصد کے لیے جان گنوانے سے بہتر کیا ہو سکتا تھا؟

وہ نڈر ہو کر لڑ رہے تھے۔

اپنی آواز بلند کر رہے تھے۔

نعرہ حق بلند کر رہے تھے۔

اور یہ کرتے ہوئے پانچ دن مزید گزر گئے۔

☆☆☆

”ہماری ٹیم نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر لیڈی اقتدار کے خلاف ٹھوس ثبوت جمع کیے تھے، لیکن اس نے بہت ہوشیاری سے وہ ثبوت بھی مٹا دیے۔“

لیڈی اقتدار کے لاؤنج میں ٹی وی کھلا ہوا تھا، جہاں پر ایک بڑے نیوز چینل میں مناج کا انٹرویو چل رہا تھا۔ وہ بے نیازی سے اپنا ناشتہ کرنے میں مگن تھی۔ لیکن کان انٹرویو کی طرف متوجہ تھے۔

"اور کیا رائے ہیں آپ کی ان کے بارے میں؟" نیوز اینکر بولا۔

لیڈی اقتدار ٹوسٹ کا لقمہ حلق میں اتارتے ہوئے وہ ہنس پڑی۔

"وہ ایک فریبی، سازشی، خطرناک اور ظالم عورت ہے۔ وہ ہر کام صفائی سے کرتی ہے۔"

"مس مناج، پچھلے پانچ دنوں میں تحریکِ حرر نے لیڈی اقتدار کے اوپر صرف الزامات لگائے۔ جب بات ثبوت کی آتی ہے تو آپ کی بولتی بند ہو جاتی ہے۔ ایسا کیوں؟"

مناج کی ہوائیاں اڑیں۔

"جیسے کہ ہم نے بتایا کہ وہ ثبوت مٹا چکی تھی۔"

"اور ہم آپ کی بات کا یقین کیوں کرے؟ حرر نے اب تک کیا ہی کیا ہے؟ اپنی کوئی ایک کامیابی گنوانا چاہیں گی؟"

مناج کے چہرے پر واضح تضحیک تھی۔ لیڈی اقتدار نے مڑ کر اس عورت کے زاویے دیکھے۔ پھر سر جھٹکتی قہقہہ بلند کیا۔ کچھ دن پہلے تک کیسے رعب کے ساتھ اسے خبر دار کر کے گئی تھی اور اب چہرہ دیکھنے قابل نہیں بچا تھا۔

"کام اچھا کیا ہے اینکر نے۔ انعام تو بنتا ہے۔" وہ اپنے آپ میں بولی اور پھر سے مدھم سا ہنس دی۔ شانے اچکا کر ٹوسٹ کا ایک اور لقمہ اپنے منہ میں ڈالا۔

"کتنے بے وقوف تھے یہ لوگ، بھول گئے کہ یہ میڈیا میرا ہے۔ یہ انٹرویو میری اجازت سے ہو رہے تھے۔ پانچ دنوں سے ہر چینل میں رسوا ہو رہے ہیں۔ اس سب نے تو حرر کی ساکھ تباہ کر دی ہے۔ اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے؟"

وہ دل ہی دل میں سوچتی گئی۔ فتح نے اس کے قدم ایک بار پھر چھو لیے تھے۔

"اگر ان کی جگہ احمد ہوتا تو ہر قدم پھونک پھونک کر رکھتا۔ اور میڈیا میں جانے کی حماقت تو کبھی نہ کرتا۔" وہ پھر ہنس پڑی۔

"احمد!" یکبارگی سکون غارت ہوا۔ نوالہ حلق میں رہ گیا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ریموٹ سے ٹی وی بند کیا۔

"وہ کہاں ہے؟ اتنے لمبے عرصے سے اس کی خبر کیوں نہیں ملی؟ ان حرر والوں نے تو مجھے بری طرح الجھا دیا تھا۔ اوہ خدایا۔" وہ بے چینی کے مارے یہاں وہاں ٹہلنے لگی۔ احمد کی خاموشی مشکوک کن تھی۔

"اف لویزا! اف۔ تم کیوں بھٹک گئی؟ ان پانچ دنوں میں وہ کیا کرتا رہا ہو گا اور تمہیں خبر بھی نہیں ہو گی۔"

یکبارگی اس نے دیوار پر ٹنگی گھڑی کو دیکھا۔ ہسپتال جانے کا وقت ہو رہا تھا۔ اس نے تمام خیالات جھڑکے۔ میز سے اپنا بیگ اٹھا کر کہنی پر لٹکایا۔ وہ سنہری ہیلز پر ملکاؤں جیسی چال چلنے لگی۔

گرد ونواح ملازمین اس کی بھنک پڑتے ہی راستے سے ہٹ جاتے اور اس کے سامنے گردنیں جھکاتے۔ ان کی آنکھوں میں اپنی دہشت دیکھ کر انا کو تسکین ملتی۔ ہر ملکہ تاج نہیں پہنتی۔ وہ کسی بے تاج ملکہ سے کم نہ تھی۔ بے تاج ملکائیں زیادہ طاقتور ہوتی ہیں۔

اس نے سبزہ زار پار کیا اور صدر دروازے تک پہنچی۔

یکدم اس کی نظر اس پر پڑی۔ وہ جو کچھ دیر پہلے تک ہواؤں میں اڑ رہی تھی اتنی زور سے زمین پر گری کہ سنبھل نہ سکی۔

احمد اپنی کلٹس کی چھت پر کہنی ٹکائے، اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ آج اس نے سیاہ چشمہ نہیں پہن رکھا تھا۔

دماغ میں خطرے کی گھنٹی زور و شور سے بجی۔ مگر اس نے چہرے کے تناؤ کو ڈھیلا کیا۔ حریف چاہے قتل کیوں نہ کر رہا ہو، موت مسکراہٹ کے ساتھ قبول کی جاتی ہے۔ وہ بھی مسکرا دی۔

احمد کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس کے عین سامنے پہنچا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے گیا۔ چہرے پر جتاتی مسکراہٹ دیکھ کر، لیڈی اقتدار کا بھاگ جانے کا جی چاہا۔ مگر اس نے قدم مضبوطی سے جمائے رکھے۔

احمد نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ کچھ ثانیے اس کے ہاتھ کو گھورا۔ پھر گردن جھٹک کر جھری زدہ ہاتھ آگے بڑھایا۔ دونوں ہاتھ کچھ دیر ملے رہے۔

”کیا حال ہے، ملکہ عالیہ؟“ احمد ادب سے بولا۔

لیڈی اقتدار کی گردن تن سی گئی۔

”تم سے تو بہتر ہی ہوں۔“ وہ جلانے والے انداز میں بولی۔ احمد زیر لب ہنس دیا۔

”کیا آپ مجھے اندر آنے کا نہیں کہیں گی؟ یا مجھے اپنی بات کھڑے کھڑے کرنی ہو گی؟“

لیڈی اقتدار کا مسکرانا محال ہوا۔ حلق میں ڈھیر ساری کڑواہٹ اتاری۔

”کیوں نہیں؟ آؤ۔ اسی بہانے میں تمہیں اپنا محل دکھاتی ہوں۔“ لیڈی اقتدار نے شانے اچکائے اور مڑ گئی۔

چال شاہانہ تھی۔

احمد اس کے پیچھے چلنے لگا۔ وہ کسی خصوصی مہمان کی طرح گرد و نواح کا جائزہ لے رہا تھا۔

”سبزہ زار کافی خوبصورت ہے۔“ احمد نے زیر لب تبصرہ کیا۔

لیڈی اقتدار مسکرا دی۔ انہیں دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے برسوں پرانے دوست مل رہے ہوں۔

”یہ گھر آپ کا ہے، ملکہ؟ میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس گھر میں کتنا کچھ آپ کا ہے اور کتنا آپ کے مرحوم والد کا؟“ احمد عام سے انداز میں بولا۔ لیڈی اقتدار نے ایک سرسری سی نظر احمد پر ڈالی۔

”اس گھر کی ہر اینٹ میں میری محنت شامل ہے، احمد۔“ وہ گردن اکڑاتے جتانے والے انداز میں بولی۔ احمد نے سرعت سے سر اثبات میں ہلایا۔ دونوں کندھے سے کندھا ملا کر ٹہل رہے تھے۔

”یعنی سیلف میڈ کرمنل ہیں آپ۔“ احمد بے نیازی سے بولا۔ لیڈی اقتدار نزاکت سے ہنس دی۔

"کہہ سکتے ہو۔" اسے جیسے احمد کا یہ کہنا بالکل برا نہ لگا۔

دونوں اب گھر کے اندر داخل ہوئے۔ مین ہال نہایت خوبصورت تھا۔ زمین پہ سفید ٹائلز لگے تھے جو کہ بھرپور چمک رہے تھے۔ خوبصورت اور دلفریب ستون جگہ جگہ کھڑے کیے تھے۔ احمد کے چہرے پہ متاثر کن سا تاثر ابھرا۔

"واہ! حسین!" اس سے بولے بغیر رہا نہیں گیا۔ لیڈی اقتدار فخریہ سا مسکرا دی۔

"دیکھ لو۔ تم جن سے لڑ رہے ہو وہ تم سے بہتر زندگی گزار رہے ہیں۔"

احمد اور لیڈی اقتدار کی نظریں ملیں۔ آنکھوں کی گہرائیوں میں آگ ابھری۔ پرانے شکوے شکایتوں نے ابال لیا۔

"وہ تو کچھ دیر میں پتا لگ جائے گا، ملکہ، کون کتنی بہتر زندگی گزار رہا ہے۔" نگاہوں کی ڈور برقرار رکھی۔

لیڈی اقتدار کے دل میں طوفان مچا۔ وہ جان گئی تھی، یہ شخص بھلائی کے ساتھ حاضر نہیں ہوا۔

"چلیں۔ اب بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"

بظاہر وہ مسکراتی رہی۔

دونوں صوفوں پر آمنے سامنے بیٹھے۔ دیواروں نے کان کھڑے کیے برسوں پرانے دشمنوں کو سننا چاہا۔ ہوا بالکل تھم گئی تھی جیسے۔ ہر شے پر سکوت قائم ہو چکی تھی۔ وہ کسی ملکہ کی طرح گردن اور کمر اکڑا کر بیٹھی تھی۔ اور وہ صوفے پر ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔

”کتنی ہی عجیب بات ہے ناں، ملکہ عالیہ۔“ احمد نے سوچ کر ہونٹ دبائے۔ ”ہماری دشمنی پچھلے تین سال سے چل رہی ہے اور ملاقات ہماری آج پہلی مرتبہ ہو رہی ہے۔ اس کے باوجود بھی ایسا لگ رہا ہے جیسے ہم ایک دوسرے کو صدیوں سے جانتے ہیں۔“

لیڈی اقتدار مدھم سا مسکرائی اور سر اثبات میں ہلایا۔

”دشمنوں کو کورس کی کتاب کی طرح حفظ کر لینا چاہیے۔ ہم دونوں ہی بہترین حریف ہیں۔ میں حرر کے ان بچوں سے لڑ رہی ہوں، اور یہی سوچتی ہوں کہ یہ بھی کوئی جنگ ہے بھلا؟ تمہارے جیسے دشمن سے لڑنے کے بعد ان بچوں سے لڑنے میں مزہ نہیں آیا۔“

احمد نے سر اثبات میں ہلایا۔

”تعریف کا شکریہ۔ آپ میں غیرت ہے کہ آپ دشمن کے سامنے اس کی تعریف کر رہی ہیں۔ ہر کسی میں آپ جتنا ظرف نہیں۔“ احمد نے شانے اچکائے۔

”بالکل! اسی لیے تو میں آج اتنی بڑی ایمپائر کی ملکہ ہوں۔ تم کیا سمجھتے ہو، تم پہلے انسان ہو جس نے میرے ساتھ یہ

سب کیا ہے؟“

احمد معنی خیز سا مسکرایا۔ اس نے سر نفی میں ہلایا۔

”بالکل نہیں۔ ظاہر ہے آپ نے اس سے پہلے اور بھی خطرناک دشمنوں کا سامنا کیا ہو گا۔“ وہ رکا، گردن آگے

جھکائی۔ ”لیکن میں وہ پہلا دشمن ضرور ہوں جسے آپ نے آج تک مارا نہیں ہے۔ پتا نہیں کیا مجبوری ہے آپ کی؟“ احمد طنزیہ

سا ہنس دیا۔ لیڈی اقتدار کی مسکراہٹ پھیکی پڑی۔

”فکر نہ کریں۔ میں آپ سے اس بارے میں کچھ نہیں پوچھوں گا۔ میں بہر حال ایک سوال ضرور پوچھوں گا۔“ احمد مسکرایا۔ لیڈی اقتدار کا دل ڈوبنے لگا۔

”آپ کو اپنی دولت سے کتنی محبت ہے؟“

سوال لیڈی اقتدار کے لیے غیر متوقع تھا۔

”اتنی کے میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی۔ یہ دولت' یہ طاقت میری روح کا حصہ ہے، احمد۔“ لیڈی اقتدار سرد سے لہجے میں بولی۔

احمد مسکرایا اور سر کو جنبش دے گیا۔

”بہت خوب۔“ وہ بولا۔ ”ٹی وی کھولیں، ملکہ۔“ احمد نے ٹانگ کے اوپر ٹانگ جمائی۔

کچھ تھا احمد کے انداز میں، کچھ ٹھنڈا سا، کچھ برفیلا سا، جو وہ اچانک سے خوفزدہ ہو گئی تھی۔ اس نے ٹیبل سے ریموٹ اٹھایا اور ٹی وی چلایا۔ ٹی وی پر نیوز چینل پہلے سے ہی کھلا ہوا تھا۔

”آج دبئی کا معروف بینک، منی لانڈرنگ' فراڈ اور کرپشن کے کیس میں سیل کر دیا گیا ہے۔“ نیوز اینکر خبر نامہ پڑھ کر سنا رہا تھا۔

لیڈی اقتدار کی دنیا جہاں تھی وہیں تھم گئی۔ اسے جیسے اپنی آنکھوں پر، اپنے کانوں پہ یقین نہ آیا۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ تو احمد نے دبئی میں یہ کیا تھا؟ لیڈی اقتدار ہکا بکا سی ہو کر احمد کو دیکھنے لگی جو کہ زور سے ہنس رہا تھا۔

"دبئی پولیس کی انتظامیہ نے اہم ثبوت و شہادتوں کی پیش نظر بینک کو سیل کر دیا ہے۔ بینک کا تمام پیسہ دبئی پولیس نے ضبط کر لیا ہے۔"

اور یہ وقت تھا جب لیڈی اقتدار کو دنیا گول گھومتی نظر آئی۔ سر کی پشت پہ ہتھوڑے برسنے لگے۔ اس کا سارا پیسہ، بے شمار دولت سب کچھ ایک جھٹکے میں مٹی مٹی ہو گیا تھا۔ سب کچھ چکنا چور ہو چکا تھا۔ احمد صوفے سے کھڑا ہوا۔ وہ میز تک پہنچا اور ریموٹ اٹھایا۔ اس نے تحکم سے ٹی وی بند کیا۔ لیڈی اقتدار حواس باختہ عالم میں احمد کو دیکھتی رہ گئی۔ وہ اب تک اس دھچکے کو ہضم نہیں کر پا رہی تھی۔

احمد نے اپنے دونوں ہاتھ میز پہ رکھے اور آگے کو جھکا۔

"ملکہ، ہار مبارک ہو۔" وہ کہہ کر سیدھا کھڑا ہوا۔

"تم یہ نہ سمجھ بیٹھنا۔" وہ کھڑی ہوئی۔ آواز کسی زخمی شیر کی غراہٹ جیسی معلوم ہوئی۔ "کہ تم جیت گئے۔ اقتدار کا زوال اس صدی میں نہیں لکھا۔" آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکلا۔

"اس آنسو کی قسم جو میری آنکھ سے بہا ہے، احمد۔ تمہیں برباد کرنا مجھ پر فرض ہوا۔" وہ انگلی اٹھا کر بولی۔

احمد اسے دیکھتے ہوئے ہنس پڑا۔

”انگھور کھٹے ہیں۔“ مسکراہٹ نے لیڈی اقتدار کی روح کا کونا کونا جلا دیا۔

کوٹ جھاڑ کر وہ لاؤنج سے چلا گیا۔ لیڈی اقتدار کسی بت کی طرح وہاں بیٹھی۔ اس کا خون منجمد ہو گیا تھا۔ وہ ہل بھی نہیں پا رہی تھی۔ سالوں کی کمائی دولت۔ سالوں کا کمایا پیسہ۔ سب دھول ہو گیا تھا۔ وہ بھی اتنی آسانی سے۔

اسے لگ رہا تھا جیسے اس کا دل پھٹ جائے گا۔ جیسے اس کا دماغ اسی وقت ختم ہو جائے گا۔ اس کی آنکھ سے گرم گرم موٹے موٹے آنسو روانہ ہوئے۔

”تم گئے، احمد!“ وہ کپکپاتی آواز لیے بولی۔ اس کا وجود غصے سے ابل رہا تھا۔ رنگت سرخ ہو گئی تھی ۔ آنکھیں پھٹنے لگی تھیں۔

”اب تم نہیں بچو گے!“ وہ اٹل سے انداز میں بولی تھی۔

”جو کام مجھے تین سال پہلے کر دینا چاہیے تھا، وہ میں اب کروں گی!“ اس نے گردن دائیں بائیں ہلائی۔

وہ کھڑی ہوئی۔ اس نے میز پر ہاتھ مار کے ساری چیزیں گرا دیں۔ پورے لاؤنج میں شور کی گونج ہوئی۔

لیڈی اقتدار زور سے چلانے لگی۔ وہ اس وقت جلادی کیفیت میں لگتی تھی۔ اس کا جبڑا نظر آ رہا تھا۔ نسیں پھڑک اٹھی تھیں۔ کوئی اسے یوں چلاتے دیکھ لیتا تو یقیناً بری طرح سے ڈر جاتا۔

اس نے موبائل اٹھایا، وہ کپکپاتی انگلیوں سے کسی کو کال ملانے لگی۔ فون کان سے لگایا۔ کچھ دیر میں کال اٹھالی گئی۔

”احمد کے قتل کی تیاری کرو۔ کل وہ ختم ہو جانا چاہیے۔“ کپکپاتی، غصے سے لبریز آواز میں حکم جاری کیا۔

کوئی طاقت نہیں تھی جو اب اسے یہ کرنے سے روک سکتی تھی۔ وہ اب اپنے دل کی نہیں سننے والی تھی۔ اپنے کاروبار کو مزید کسی نقصان سے بچانے کے لیے، یہ کرنا ضروری تھا۔

اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کھڑے رہنے میں دقت پیش آ رہی ہو۔

”تم اقتدار کو مات نہیں دے سکتے!“ وہ دھاڑی۔

گردن تننے لگی۔ کندھے اکڑنے لگے۔ نم آنکھوں میں تکبر کی آمیزش ہوئی۔

ملکہ کا انتقام کا عزم ہر دوسرے عزم پر غالب آیا۔

☆☆☆

اگلی صبح۔۔۔

(سچ کی طاقت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ 'سچ انسانوں کو برباد بھی کر سکتا ہے اور آباد بھی)

وہ کسی انگریز سے مسکرا کر بات کر رہا تھا۔ کمرہ بھرپور چمک رہا تھا اور بہت نفاست سے سیٹ کیا گیا تھا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر تھی۔ اس کی ورک ڈیسک پر ایک تصویر تھی، احمد اور درے کی تصویر۔ دونوں اس تصویر میں دس سے بارہ سال کے لگتے تھے۔

(سچ انسانوں کو جوڑ سکتا ہے، ضرورت پڑنے پہ توڑ بھی سکتا ہے)

"تو پھر آپریشن کب تک ہو جائے گا؟" اس انگریز شخص نے انگریزی میں کہا۔ اس نے جواباً اپنے لب بھینچ لیے اور ایسا تاثر دیا جیسے وہ کچھ سوچ رہا ہو۔

"جیسے ہی ہمیں ڈونر ملتا ہے، ہم کر دیں گے۔" اس نے انگریزی میں جواب دیا۔

ٹھیک اسی وقت دھڑلے سے کسی نے دروازہ کھولا۔ اس نے بدمزہ ہو کر دروازے کو گھورا۔ یہ کون جاہل تھا جو بغیر ناک کیے چلا آیا تھا؟ ماتھے پر تیوری چڑھی۔

دروازے کی چوکھٹ پر نیلوفر کھڑی تھی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

اس نے غصیلی نگاہ نیلوفر پر ڈالی۔

(سچ اگر ظالم ہے تو، سچ رحم بخش بھی ہے۔)

"مسٹر درانی، اسے یہاں سے بھگائیں۔" نیلوفر نے چڑھتی سانسوں کے ساتھ کہا۔ درانی کو تپ چڑھنے لگی۔

"کیا کہہ رہی ہو نیلوفر؟ کلائنٹ ہے؟" درانی چبا چبا کر بولا۔ معاً مسکرا کر انگریز کلائنٹ کو دیکھتا رہا جو کہ نیلوفر کی مداخلت کی وجہ سے خائف لگ رہا تھا۔

"جو بات میں کہنے آئی ہوں وہ آپ کے ہر کلائنٹ سے زیادہ ضروری ہے۔ اب اسے بھگائیں۔"

نیلوفر نے کلائنٹ کے اوپر غصیلی نگاہ ڈالی۔ کلائنٹ کی انا کو جیسے چوٹ لگی۔

(سچ چہروں پہ مسکراہٹیں بکھیر سکتا ہے، تو سچ آنکھوں کی ویرانی کا بھی سبب بن سکتا ہے۔)

''گیٹ اپ۔۔ گیٹ اپ!'' وہ انگلی سے اشارہ کرتی سختی سے بولی۔

''بے عزت کرنے کے لیے ہی بلاتے ہو تم لوگ۔'' وہ انگریزی میں بولا۔ ساتھ ساتھ ایک عدد انگریزی گالی سے نوازنا نہ بھولا۔ درانی نے نیلوفر کے اوپر کھا جانے والی نظر ڈالی۔

کچھ دیر کے لیے ماحول میں خاموشی چھا گئی۔

درانی خاموشی سے نیلوفر کو دیکھنے لگا جیسے وہ اس کی وضاحت سننا چاہ رہا ہو۔ وہ نیلوفر کی بھرپور کلاس لینے کا دماغ بنا چکا تھا۔

(سچ یاد رہ جانے والا ہے تو سچ کو جھٹلانا بھی آسان ہے۔)

نیلوفر نے ایک گہری سانس۔

''آپ کے بھائی کی جان خطرے میں ہے۔ مسٹر فیروز یوسف درانی۔'' وقت جہاں تھا اس کے لیے وہیں تھم گیا۔

اس کی آنکھوں میں پھیلا غصہ 'زائل ہوا اور اس کی جگہ خوف در آیا۔ لب کھلے کے کھلے رہ گئے۔

''ایسا نہیں ہو سکتا، نیلوفر۔'' فیروز عرف مسٹر درانی سر نفی میں ہلا کر بولا۔ ''لیڈی میرے ساتھ ایسا کر ہی نہیں سکتیں۔

''ایسا ہی ہے مسٹر درانی۔ لیڈی اقتدار کا پلان تیار ہے۔ انہوں نے سنائپر احمد کے آفس کے احاطے میں بیٹھایا ہوا ہے۔ وہ اپنے ہسپتال میں ہیں اور براہ راست سارے منظر کی اپ ڈیٹس لے رہی ہیں۔ جلدی

کریں اور میرے ساتھ چلیں، انہیں یہ سب کرنے سے روکنا ہو گا۔"نیلوفر تیزی سے کہتے کمرے سے نکل گئی۔

فیروز سب کچھ وہیں چھوڑ کر اس کا پیچھا کرنے لگا۔اس کی دائیں ٹانگ نہیں تھی۔اس کی جگہ پر استھیٹک(prosthetic)ٹانگ جڑی ہوئی تھی جس کی مدد سے وہ چلتا تھا۔اس کی چال تھوڑی سست تھی۔وہ نیلوفر کے ساتھ اس کی گاڑی پر سوار ہو گیا۔

"جلدی چلاؤ۔"فیروز کا صبر ختم ہونے لگا تھا۔اس کی آواز ہلکان تھی۔سب کچھ اس کے سامنے بے معنی ہونے لگا تھا۔نیلوفر نے زور سے ایکسیلیٹر دبایا اور گاڑی چلانا شروع کی۔عافیت زندگی سنابل سے زیادہ دور نہ تھا' اور کچھ دیر کی مسافت کے بعد وہ پہنچ گئے۔

(سچ وجود کی ان دیکھی زنجیروں کو کھول بھی سکتا ہے تو سچ قید میں پابند بھی کر سکتا ہے۔)

وہ ہسپتال میں داخل ہوئے۔

گول زینہ عبور کیا۔۔

سٹور روم پہنچے۔

لفٹ میں سوار ہوئے۔

ہال میں داخل ہوئے۔

ملاقاتی کمرے میں گھسے۔

وہ چہرے پر شیطانی مسکراہٹ سجائے بیٹھی تھی۔

فون سپیکر پہ رکھا ہوا تھا۔

ان دونوں کو دیکھ کر، مسکراہٹ پھیکی پڑی۔

”آپ ایسا نہیں کر سکتیں، لیڈی۔۔۔“اس کا انداز التجائیہ تھا۔

(سچ سامنے ضرور آتا ہے، یاد رکھنا!)



”آپ ایسا نہیں کر سکتیں، لیڈی اقتدار۔ میں آپ سے وفادار تھا۔ آپ سب کے لیے میں نے ان دونوں کو چھوڑا تھا۔ آپ انہیں نہیں مار سکتی۔ ابھی اسی وقت سب روک دیں۔“فیروز کی آواز میں لرزش تھی۔

لیڈی اقتدار پر کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ پیچھے ہٹ جانے کا وقت گزر چکا تھا۔

”یاد کریں لیڈی۔ اسے روکنے کے لیے میں نے اپنی ٹانگ تک قربان کی۔“وہ بھول گیا تھا کہ لیڈی اقتدار کا خون سفید پڑ گیا تھا، وہ چند باتوں سے خون کا رنگ نہیں بدل سکتا تھا۔

”تو نیلوفر تم نے بھی مجھے دھوکہ دے ہی دیا۔“لیڈی اقتدار جیسے فیروز کی ہر بات نظر انداز کر گئی۔

فیروز کو اپنا آپ بے معنی لگا۔ سالوں کی وفا کا آخر یہ انجام ہونا تھا۔ اسے کسی خاطر میں نہ لایا گیا۔

”یہ غلط تھا لیڈی۔ ہم مسٹر درانی کو یوں ہرٹ نہیں کر سکتے تھے۔“نیلوفر نے جواب دیا۔

”میرا فیصلہ اٹل ہے۔ اپنے بھائی کی موت میرے ساتھ دیکھ لو یا یہاں سے چلے جاؤ۔ لیکن اس نے جو کیا اس کے بعد یہ سب ہو کر رہے گا۔“ لیڈی اقتدار نے غصے سے کہا۔

”آپ پلیز آرڈرز واپس لے لیں۔ پلیز۔ وہ میرا بھائی ہے۔ میں جیتے جی مر جاؤں گا۔“

فیروز کی آنکھ سے ایک آنسو نکلا۔ جوان بھائی کو کھونے کے خوف نے اسے بھیک مانگنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”میرا فیصلہ اٹل ہے۔ جو کرنا ہے کر لو۔“ لیڈی اقتدار ٹس سے مس نہ ہوئی۔ فیروز شکست خوردہ ہوا۔

وقت گزرنے لگا تھا اور وہ نہیں جانتا تھا کہ اس وقت کو گزرنے سے کیسے روکا جائے۔

دفعتاً موبائل سے زوردار آواز آئی۔ فیروز کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ بے یقینی کے عالم میں لیڈی اقتدار کو دیکھنے لگا جو کہ فاتحانہ سا مسکرائی۔ اس کا انتقام پورا ہوا تھا۔ اس کی سب سے بڑی رکاوٹ اس دنیا سے سرک گئی تھی۔

فائر کی ایک اور دل خراش آواز گونجی۔

ایک اور۔

اور پھر ایک اور!

دل کو کرچی کرچی کر دینے والی خاموشی اس ملاقاتی کمرے میں حائل تھی۔

☆☆☆

اپنی کہانی کو کچھ وقت کے لیے روک کے ڈھائی سال پہلے کے وقتوں میں واپس جاتے ہیں۔ زینت کی موت کے ٹھیک آٹھ دن بعد۔۔۔

☆☆☆

سنابل ہسپتال کے مینجر کا یہ وہی کمرہ تھا۔

فیروز رو رہا تھا۔ بلک رہا تھا۔

لیڈی اقتدار اس کے سامنے کھڑی تھی۔ سانسیں پھول رہی تھیں۔ ماتھے اور گردن پہ موجود نسیں پھڑک رہی تھیں۔

نگاہیں طیش تھیں۔ آنکھوں کے گرد سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ لیڈی اقتدار نے ڈیسک پر پڑا مگ اٹھایا اور زمین پر دے مارا۔ اس نے پورے ڈیسک پہ جنگلیوں کی طرح ہاتھ مارا۔ دھڑم دھاڑ آوازیں اس کمرے میں گونج رہی تھیں۔ یکے بعد دیگرے ڈیسک سے چیزیں گریں۔ کچھ نازک چیزیں ٹوٹ کر کرچی کرچی بھی ہو جاتیں۔

"وہ مرے گا!" وہ چلائی۔

فیروز نے سر نفی میں ہلایا۔

"یہ ظلم نہ کریں!" فیروز روتے ہوئے بولا۔

چھوٹی بھائی کی محبت جاگ اٹھی۔

"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو، درانی؟ اس نے ہمارا پورا گودام خالی کروادیا! اتنے سارے ڈونر ہمارے ہاتھ سے نکل گئے۔ وہ زینت صرف ایک ایجنٹ تھی۔ وہ ایسا کیسے کر سکتا ہے۔ تم جانتے بھی ہو یہ نقصان کتنا بڑا ہے؟ وہ مردود میری ناک کے نیچے یہ کھیل کھیل رہا تھا۔ میرا کاروبار تباہ کر دیا ہے اس نے۔" وہ بلند آواز میں بولی۔ غصہ ابل کر دماغ پر حاوی ہونے لگا۔

"میرا بھائی ہے وہ لیڈی! پلیز اسے نہ ماریں۔ پلیز قتل کے احکامات واپس لے لیں۔ پلیز لیڈی۔ میں نے آپ کی خاطر ان سب کو چھوڑا تھا۔ میں نے آپ کی خاطر ہر قربانی دی، آپ یہ نہیں کر سکتیں!" وہ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑایا۔

لیڈی اقتدار کا غصہ کچھ حد تک کم ہوا۔ دل نرم پڑنے لگا۔ وہ جیسا بھی تھا، اس کا دائیاں ہاتھ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اسے ہر کوئی چھوڑ سکتا تھا، لیکن فیروز نہیں۔

فیروز گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔ گردن جھکائے ہاتھ آپس میں جوڑے۔

"میں آپ کے پیر پڑتا ہوں لیڈی! اس کے قتل کا حکم واپس لے لیں۔ میں جیتے جی مر جاؤں گا۔ درے اکیلی رہ جائے گی۔ سب برباد ہو جائے گا۔" فیروز ایک بار پھر سے گڑگڑایا۔

لیڈی اقتدا نرم پڑی۔ ماتھے پہ پھیلے بل ڈھیلے ہوئے۔

"بہت دیر ہو گئی ہے، درانی۔ اس نے حدیں پار کی ہیں۔ وہ آگے اس سے بھی زیادہ نقصان پہنچا سکتا ہے۔" اب کی بار وہ قدرے نرمی سے بولی۔

"بس ایک کوشش مجھے کرنے دیں۔ بس ایک کوشش۔ میں جانتا ہوں اس کے بعد وہ پیچھے نہیں آئے گا۔" وہ کھڑا ہوا۔ دل میں امید بھر گئی تھی۔ لیڈی اقتدار کا نرم پڑنا ایک اچھی علامت تھی۔

"کیا کرو گے تم؟" لیڈی اقتدار دل برداشتہ ہو کر بولی۔ وہ تقریباً مان چکی تھی۔

"اسے ایک غم پہلے لاحق ہو گا، لیڈی۔ اس لڑکی کی موت کا غم۔ اسے ایک اور روگ دیں گے۔ اس روگ کو وہ کبھی برداشت نہیں کر سکے گا اور وہ رک جائے گا۔ میں جانتا ہوں۔ وہ جیسا بھی ہے، میرا بھائی ہے۔ اور وہ نہایت حساس ہے۔" لیڈی اقتدار نے ہاری ہوئی سانس خارج کی۔

"صرف تمہارے لیے۔ صرف تمہاری وفا کے لیے یہ کڑوا گھونٹ پی لوں گی۔ اب بتاؤ، کیا کرو گے؟" وہ گہری سانسیں لیتے کرسی پر بیٹھی۔

فیروز کا دل زور سے دھڑکا۔ وہ جو کرنے کا سوچ رہا تھا اس میں سب سے زیادہ تکلیف اسے ہی اٹھانی پڑ رہی تھی۔

"وہ اپنے بھائی، یعنی میری تلاش میں ہے۔ کیا ہو گا اگر اس کا بھائی اس کے لیے مر جائے گا؟" فیروز بول اٹھا۔ چہرے پہ وحشت سی تھی۔ احمد کے لیے یہ کڑوا گھونٹ اسے پینا پڑ رہا تھا۔

"کیا مطلب؟" لیڈی اقتدار ناسمجھی سے بولی۔

فیروز نے ایک نظر اپنی دائیں ٹانگ پر ڈالی، اور دوسری نظر لیڈی اقتدار پر۔ حلق کے اندر ڈھیر سارا تھوک نگلا۔

☆☆☆

یہ فیروز اور لیڈی اقتدار کی ملاقات کے تین دن بعد کا واقعہ ہے۔ درفشاں اس وقت اپنے کالیگز کے ساتھ پاک ٹوئر پر گئی تھی۔ احمد گھر میں اکیلا تھا۔

احمد شل سا وجود لیے صوفے پر بیٹھا تھا۔ آنکھیں ویران تھیں اور دل کسی غیر آباد زمین کی مانند خالی تھا۔ اس کے سامنے ٹی وی چل رہا تھا۔

''وہ آپریشن بین الاقوامی ایجنسی نے تین دن پہلے کیا تھا اس میں ملنے والے پچاس لوگوں کو اپنے گھروں تک پہنچا دیا گیا ہے۔ باقی ایک سو پچاس لوگوں کو آتھورٹیز اپنے گھروں تک پہنچانے کی پوری کوشش کر رہی ہیں۔'' احمد نے بیزار ہو کر ٹی وی بند کر دیا۔

یہ تو اس کی فتح کا وقت تھا۔ پھر وہ اتنا اداس کیوں تھا؟ وہ جیت گیا تھا۔ لیکن پھر یہ تکلیف کس بات کی تھی؟ دل کو یہ خلش کیوں گھیرے ہوئے تھی؟ سچ تو یہ تھا کا زینت کی موت نے احمد کو تھکا دیا تھا۔ وہ ہلکان ہونے لگا تھا۔ اندر کہیں نہ کہیں وہ اس کی موت کا الزام خود کو دے رہا تھا۔

ٹھیک اسی وقت احمد کے گھر کی گھنٹی بجی۔ احمد نے دروازہ کھولا۔ باہر ایک چار فٹ کا لمبا سا باکس رکھا تھا جو کہ زیادہ

چوڑا نہیں تھا۔ احمد آس پاس دیکھنے لگا تا کہ پتا لگا سکے کہ باکس کو کون چھوڑ کر گیا تھا۔ لیکن اسے کوئی نظر نہ آیا۔ باکس پر پرپل ریپ تھا اور پنک ربن۔ احمد اسے اندر لے آیا۔

اس باکس میں جو تھا وہ دور تک اس کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ اس باکس میں ایک کٹی ہوئی ٹانگ تھی۔ ٹانگ جو کہ جگہ جگہ سے خون آلود تھی۔ احمد آنکھوں میں خوف و وحشت لیے کٹی ہوئی ٹانگ کو دیکھتا رہ گیا۔ اس کا دل جیسے ابلنے لگا تھا۔ اس نے جھر جھری لے کر باکس چھوڑا۔ باکس زمین پر جا گرا۔ اسے ابکائی آنے لگی۔

ٹھیک اسی وقت احمد کے موبائل پر رنگ ہوئی۔ احمد نے وہ کال اٹھائی۔ دل اب تک حلق میں تھا۔

”تمہاری بہن تم تک پہنچ گئی؟“ احمد شل سا رہ گیا۔ آنکھیں بے یقینی کے باعث پھیلنے لگیں۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟

فون کے اس پار سے ایک قہقہہ گونجا جو کہ احمد کے کان میں چبھا تھا۔ احمد کو لگا جیسے اس کا وجود زمین میں دھنسنے لگا تھا۔ وہ اب اتنا بڑا دکھ نہیں جھیل سکتا تھا۔

”فکر نہ کرو۔ تمہاری بہن ٹھیک ہے۔ مگر یہ تمہاری بہن بھی ہو سکتی تھی۔ میں نے کہا تھا نا' خبر دار ہو جاؤ۔ تمہارا بھائی اب تک زندہ تھا۔ چونکہ تم باز نہیں آئے' ہمیں اسے مارنا پڑا۔ اس کے گردے دل پھیپڑے جگر' نکالنے پڑے۔ اور ایک ٹانگ ہم نے اپنی ٹرافی کے طور پر رکھی اور ایک تمہیں بھیج دی۔ تمہارا بھائی مر چکا ہے۔ تمہاری وجہ سے ہمیں اسے مارنا پڑا۔ اپنے بھائی کی موت مبارک ہو، مسٹر احمد یوسف درانی۔“ شمس نے مزے لیتے ہوئے کہا۔

احمد کے وجود میں کانٹے سے چبھنے لگا۔ اس نے بے اختیار سینے پر ہاتھ رکھا۔ ساری دنیا تہس نہس ہو گئی تھی۔ پہلے عثمان، پھر زینت اور اب فیروز۔ اور کس کو کھونا باقی رہ گیا تھا؟

اس کی آنکھیں نم ہوئیں۔ وہ روتا نہیں تھا، نہ ہی وہ رونا جانتا تھا، لیکن آج ایک الگ سی کیفیت اس کے دل میں سوار تھی۔ اس کیفیت کو وہ خود بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔

”میں واپس ضرور آؤں گا۔“ احمد کی آواز غصے کی شدت سے کپکپائی۔ ”تم سب کو برباد کرنے۔ اپنے بھائی کا انتقام لینے۔ زینت کا انتقام لینے۔ عثمان کا انتقام لینے۔“ وجود پورا کا پورا لرز رہا تھا۔ اس نے کال کاٹی اور ڈھیلا ہو کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ گہری سانسیں لینے لگا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کا سر پھٹ جائے گا اور وہ جیتے جی مر جائے گا۔

کچھ وقت وہ آنکھیں بند کیے یوں ہی بیٹھا رہا۔ دل تھا کہ قابو ہی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اندر تک ہلا دیا گیا تھا، اندر تک تڑپا دیا گیا تھا۔

کچھ وقت لگا اسے اپنے آپ کو قابو کرنے میں۔ اس نے اپنا موبائل اٹھایا اور ایک دوست کو کال ملائی۔ کچھ ہی دیر بعد کال اٹھالی گئی تھی۔

"فرحان کیا آسکتے ہو میرے گھر؟ فوراً۔" اس نے اپنا انداز سرسری رکھا۔

"اوہ۔" فرحان بولا۔ وہ احمد کا ایک قریبی دوست تھا جو کہ فارنزک میں کام کرتا تھا۔ وہ احمد کے انداز سے ہی سمجھ گیا تھا کہ معاملہ سنگین نوعیت کا ہے۔ "ہاں، میں آجاتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے میں انتظار کر رہا ہوں۔" احمد نے جواب دیا اور کال کاٹ دی۔

بے چینی اور قلبی اضطراب کی واپسی ہوئی۔ وہ اس کے پیش نظر لاؤنج میں ٹہلنے لگا۔

☆☆☆

"یہ سب تو بہت ہی ٹیڑھا ہے 'احمد۔" فرحان اس ٹانگ والے باکس کو دیکھ رہا تھا جو کہ فرش میں ویسے ہی پڑا تھا۔ "اس سب میں، میں تمہاری کیسے مدد کر سکتا ہوں؟" فرحان نے ٹھوڑی کھجاتے پوچھا۔ وہ احمد کی پوری بات سن چکا تھا۔

"کیا تم اس کی فارنزک رپورٹ نکال سکتے ہو؟ چیک کر سکتے ہو کہ یہ فیروز بھائی کی ہی ہے؟ مگر راز داری میں؟ پلیز؟" احمد کا لہجہ بے تاثر تھا۔ اس نے گردن جھکائے التجا کی۔

فرحان نے ایک گہری سانس لی۔ وہ بلا تاثر آواز کی اوٹ میں چھپا کرب محسوس کر چکا تھا۔

"مشکل ہو گا۔ مگر کر لوں گا۔ فکر نہ کرو' سب ٹھیک ہو جائے گا۔" یہ کہنے کے بعد فرحان کھڑا ہوا۔

وہ احمد کے عقب میں گیا۔ اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر نرمی سے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ احمد نے محض سر اوپر نیچے ہلایا، بولا کچھ نہیں۔ فرحان وہ باکس ہاتھ میں تھامے چلا گیا۔

دو دن بعد احمد کو فرحان کی کال آئی۔

"احمد۔ میں نے فارنزک کر لی ہے۔ یہ فیروز بھائی کی ہے۔" لاؤنج میں بیٹھے احمد نے کرب کے مارے آنکھیں میچ لیں۔ اگر فیروز بھائی کے لیے کوئی امید باقی تھی تو وہ اسی وقت ختم ہو گئی تھی۔ فیروز کو واقعی اس تکلیف سے گزارا گیا تھا۔ موت کی تکلیف سے۔ اعضاء نکل جانے کی تکلیف سے۔ اسے عثمان اور زینت سے بھی بدترین انجام دیا گیا تھا۔ صرف اس لیے کیونکہ وہ احمد کا بھائی تھا۔

"ٹھیک ہے۔ مارگلہ پر لے کر پہنچو اسے۔" احمد نے شدت بھرے جذبات کا مقابلہ کیا۔

اور اس وقت احمد یوسف جان گیا تھا۔

کہ اس راہ پر چلنے والے۔

حق اور انصاف کی کٹھن راہ پہ چلنے والے۔

ان گنت قربانیوں دیتے ہیں۔

کانٹے دار راستوں پر سے ننگے پیر گزرتے ہیں۔

خود کو آگ میں جھونک دیتے ہیں۔

باب دوازدہم: ”زندگی......ایک افسانہ“

لیکن، اس سب کے بعد بھی کیا منزل یقینی تھی؟

☆☆☆

زندگی عجیب بے تُکی کہانی ہے

اتنی جھولدار

اور اتنی عجیب

کہ سنانے بیٹھوں تو ہانپ جاؤں

سننے والا یقین ہی نہ کرے

اس کہانی کے آخر میں سب

ہنسی خوشی نہیں رہتے

ہنستے بھی ہیں

روتے بھی ہیں

کامیاب بھی ہوتے ہیں

ناکامی بھی دیکھتے ہیں۔

(دل ناامید تو نہیں کی اللہ رکھی)

☆☆☆

وَاللّٰہُ اَعۡلَمُ بِاَعۡدَآئِکُمۡ وَکَفٰی بِاللّٰہِ وَلِیًّا وَّکَفٰی بِاللّٰہِ نَصِیۡرًا

اللہ تمہارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے اور تمہاری حمایت و مددگاری کے لیے اللہ ہی کافی ہے

(سورہ نساء آیت ۴۵)

☆☆☆

گولیوں کی دل خراش آوازیں تھم تو گئی تھیں۔

مگر فیروز کے سینے پر لکیریں تراش گئی تھیں۔ وہ سن دماغ کے ساتھ اس عورت کو دیکھ رہا تھا، جو مسکرا کر اپنی فتح کا جشن منا رہی تھی۔

"گولیاں اس کے بھیجے میں اتاری ہیں، لیڈی۔ وہ موقع پر ہلاک ہو گیا۔"

ملکہ ہنس پڑی۔ ہر شے کو فراموش کیے۔ اپنے خاص بندے کے احساسات کو فراموش کیے۔ وہ اس عورت کو دیکھے گیا۔ کیا اس کا دل نہیں کانپ رہا تھا؟ وہ اس قدر بے حس کیسے ہو سکتی تھی؟ وہ اسے اتنی بڑی چوٹ پہنچا کر خوشیاں کیسے منا سکتی تھی؟

پردے اٹھ رہے تھے۔ حقیقتیں عیاں ہو رہی تھیں۔ فیروز پر اپنی مالکن کی حقیقت عیاں ہوئی تھی۔ سینا چاک ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ دل اب دھڑک نہیں پائے گا۔

"یہ آپ نے کیا کر دیا، لیڈی؟ میں نے آپ سے وفاداری نبھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اور آپ نے ایک جھٹکے میں میرے بھائی کی زندگی چھین لی؟" وہ تڑپ کر بولا۔ آنکھوں سے ہنوز اشک بے رہے تھے۔

لیڈی اقتدار نے چہرے پر سنجیدگی حائل کی۔ اس نے ڈھٹائی سے فیروز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ ڈھائی سال پہلے اس نے اس شخص پر رحم کھا کر اپنے کاروبار کو اتنا بڑا نقصان پہنچایا تھا۔ اور وہ غلطیاں دہرایا نہیں کرتی تھی۔

"یہ ضرورت تھی۔ وہ میرا دشمن تھا۔ وہ اس کاروبار کا دشمن تھا۔ وہ ہم سب کا دشمن تھا۔ میں چاہتی تو اس کے لیے بدترین موت کا انتخاب کرتی۔ مگر تمہارے خیال نے مجھے روکا۔" وہ شان سے بولی۔

فیروز کے قدم ڈگمگائے۔ گردن نفی میں ہلائی۔ بھیگی ہوئی آنکھوں نے بصیرت دھندلا دی تھیں۔

"آپ نے میرا کہاں سوچا؟ میں نے آج تک کیا کچھ نہیں کیا۔ سب آپ کے سامنے تھا۔" آنسو تواتر کے ساتھ بہہ رہے تھے۔

لیڈی اقتدار نے مڑ کر نیلوفر کو دیکھا، جو فیروز کو آنکھوں میں ہمدردی لیے دیکھ رہی تھی۔

"تو چلے جاؤ۔ اگر تمہیں لگتا ہے اتنی ہی ناانصافی کی ہے میں نے تمہارے ساتھ تو ابھی اسی وقت یہ کاروبار چھوڑ کر چلے جاؤ۔" وہ دھاڑی اور پھر کھڑی ہوئی۔ ہیلز پر شاہانہ چال چلتی فیروز کے سامنے پہنچی۔

"مگر بھولنا نہیں، موت کے علاوہ کوئی شے تمہیں اس کاروبار سے جدا نہیں کر سکتی۔" کہا فیروز کو، مگر نظروں نے نیلوفر پر حصار قائم رکھا۔

نیلوفر کی گردن بے اختیار جھکی۔

"میں نے آپ کے لیے ان سب کو چھوڑا۔ میں نے آپ کے لیے اپنی ٹانگ کاٹی۔"

وہ عورت بے حسی کی حد عبور کر چکی تھی۔ اس عورت کے پیچھے اس نے کتنی زندگیاں چھینیں۔ کتنے خاندانوں کے اپنوں کو زندگی سے محروم کیا۔ اور آج اسی عورت نے اس کا بھائی چھین لیا تھا۔ اسے سارے جرائم یاد آئے۔ مجرم اپنا جرم کبھی نہیں بھولتا۔

''ایک قربانی اور سہی۔'' وہ گردن ترچھی کیے بولی۔

''اور ویسے بھی، تم نے سب اپنے لیے کیا تھا۔ تم نے انہیں چھوڑا تھا کیونکہ وہ زندگیوں میں آگے بڑھ رہے تھے، اور تمہیں اپنا آپ گھناؤنا لگتا تھا۔ تم نے اپنے لیے اپنی ٹانگ کاٹی کیونکہ تم اپنے بھائی کو کھو دینے کی تکلیف برداشت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ میرے لیے کچھ نہیں تھا۔ بلکہ مجھے تمہاری موجودگی نے صرف نقصان پہنچایا ہے۔''

فیروز کے قدم مزید پیچھے بڑھے۔ وہ بے یقینی سے گردن نفی میں ہلاتا گیا۔ سب کچھ دھرا کا دھرا رہ گیا تھا۔ سب کچھ پاش پاش ہو چکا تھا۔ جس عورت پر کبھی ناز ہوتا تھا آج اس نے اسے گردن اٹھانے لائق نہیں چھوڑا تھا۔ اس سے وہ چھینا تھا، جو اسے دولت کے ڈھیر، طاقت اور آسائشات سے زیادہ عزیز تھا۔

''میں آپ کو معاف نہیں کروں گا، لیڈی۔'' وہ کرب آلود آواز سے کہتا مڑ گیا۔

نیلوفر نے تنبیہی نگاہ لیڈی اقتدار پر ڈالی۔

''آپ کو اپنی وفاداریوں پر ناز ہوا کرتا تھا۔ آپ کی وفاداری ڈھونگ کے سوا کچھ نہیں۔ جن سے وفادار ہوتے ہیں، ان کی غلطیوں کو درگزر کیا جاتا ہے۔ آپ شمس کی نہ ہوئیں، مسٹر درانی کی نہ ہو سکیں، نہ ہی آپ میری ہیں۔'' وہ چبا چبا کر بولی۔ پھر مڑ گئی۔ آدھا ہال عبور کرنے کے بعد وہ کچھ سوچ کر رکی۔

لیڈی اقتدار آنکھوں میں درشتی لیے اس عورت کی پشت کو تک رہی تھی۔

نیلوفر نے گردن موڑی۔ آنکھوں میں سخت تنبیہ تھی۔

''آپ جیت تو گئیں، مگر آپ اکیلی رہ گئیں۔ آپ کو تنہائی مبارک ہو۔'' اونچی آواز میں بول کر وہ بالآخر چلی گئی۔

لیڈی اقتدار گردن جھکائے فرش کو دیکھتی رہی۔ دل خالی ہوا۔ شمس، درانی، نیلوفر، اس کی خاص ٹیم بکھر چکی تھی۔ وہ تنہا تھی۔

''وہ چاروں چلے گئے تو کیا ہوا؟ ان کی جگہ کوئی اور لے گا۔'' اس نے خود کو یقین دلایا۔

مسکراہٹ لوٹ آئی۔ گردن پھر اکڑی۔ کندھے اٹھ گئے۔

آج فتح کا دن تھا۔ آج جشن کا دن تھا۔ اس کا سب سے بڑا دشمن مار کھا چکا تھا۔ اس کی طاقت کو نیا مول ملا تھا۔

لیڈی اقتدار ملاقاتی کمرے کی تلخی کو پیچھے چھوڑ کر جانے لگی۔ اسے فتح کے بعد کی نیند پوری کرنی تھی۔

لمبی، پر سکون نیند۔

☆☆☆

وہ کسی کو کھونے سے کب ڈری تھی، جو اب ڈر جائے گی؟

گاڑی میں سوار لیڈی اقتدار کے چہرے سے خوشمگین مسکراہٹ جدا ہونے کا نام نہ لے رہی تھی۔ ہر طرف خوشیاں بکھری تھیں۔ کانوں میں جیسے سہانا ساز بج رہا تھا۔ روح سرشار تھی، دل سے بوجھ سرک گئے تھے۔

جب دشمن میدان سے مارا جائے تو انسان یوں ہی چہکتا ہے۔

وہ بھی چہک رہی تھی۔ اس کا چہکنا بنتا تھا۔

(یہی تو دشمن کو ہرانے کا بہترین طریقہ ہے۔)

گاڑی رُک گئی۔ اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹا۔ مسکراہٹ برقرار کیے، اپنا پرس کھنگالا اور نوٹوں کی گڈی نکال کر ڈرائیور کی طرف بڑھائی۔

ڈرائیور لیڈی اقتدار کی اچانک کی مہربانی پر چونک اٹھا۔

"رکھ لو۔ آج تمہاری مالکن بہت خوش ہے۔" آواز شیریں تھیں، گویا وہ آسمانوں میں اڑ رہی ہو اور ہلکے پھلکے بادلوں میں سیر کر رہی ہو۔

ڈرائیور نے جھجک کے ساتھ گڈی تھام لی۔ وہ گاڑی سے اتر گئی۔

(اسے یہ تاثر دو کہ وہ جیت رہا ہے۔)

وہ سبزہ زار میں نوابوں سی چال چل رہی تھی۔ آج اقتدار کا دن جو تھا۔ وہ اس دن کا پل پل جینا چاہتی تھی۔ ہوا اس کے بدن سے ٹکرائی۔ وہ آنکھیں بند کیے اسے محسوس کرنے لگی۔ روح کا کونا کونا سرشار تھا۔ وہ کھل کھلا رہی تھی۔

یکبارگی وہ رک گئی۔ مسکراہٹ فنا ہوئی اور چہرے کے زاویے بگڑے۔ اس نے آس پاس نظر دوڑائی۔

گارڈز کہاں تھے؟ مالی کہاں تھا؟ ملازم کہاں تھے؟

وہ سبزہ زار کے وسط میں کھڑی اپنی جگہ پر گھومی۔ اسے کوئی نہ دکھا۔ دل کو دھڑکا لگا۔ خدشوں نے دماغ میں ڈیرہ ڈالا۔ وہ جو عرش پر راج کر رہی تھی، زمین پر لوٹ آئی۔

اپنے بے چین دل کو قابو کیے وہ عمارت میں گئی۔

(اور پھر پوری کی پوری بساط ہی الٹ دو!)

گھر میں ایک ملازم بھی نہ تھا۔ اس کی سانسیں تیز ہونے لگی۔ آنکھیں پوری کی پوری پھیلیں۔ وہ چوکنا ہو کر گھر کا جائزہ لے رہی تھی، کہ کسی کونے میں اسے اپنا ملازم مل جائے۔ مگر وہ تنہا تھی۔ کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔

"نوشین! صائمہ! ماریہ!"

اس نے چلا کر ملازماؤں کے نام پکارے۔ بار بار پکارے۔ وہ اس کی ایک پکار پر اس کے قدموں میں سلام ٹھوکنے والے لوگ تھے۔ مگر کوئی نہ آیا۔ ڈگمگاتے قدم لاؤنج کو پہنچے۔

لاؤنج میں جو منظر اس کے اوپر کھلا، اس نے جسم میں جیسے بجلیاں گرا دیں۔ کوئی بھونچال تھا جو اندر برپا ہو گیا تھا۔ آنکھیں کھلیں اور اس طرح کھلیں کہ بند نہیں ہو سکتی تھیں۔ سکون غارت ہوا اور اس طرح غارت ہوا کہ لوٹنے کا کوئی امکان باقی نہ رہا تھا۔ لیڈی اقتدار کی ساری دنیا تہس نہس ہو رہی تھی۔

سارا پلٹن لاؤنج کے صوفے کے پاس جمع تھا۔ مہر شمائلہ کے ساتھ صوفے پر بیٹھی تھی۔ شمائلہ کی مسکراہٹ چہرے سے جدا نہ ہو رہی تھی۔ نیلوفران کے برابر میں تھی۔ صوفے کے پیچھے دُرِفشاں، حسام اور باقی متحررین جمع تھے۔ صوفے سے ذرا آگے مناج کھڑی تھی، مناج کے برابر میں احمد تھا۔ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے۔ اس کی گھوری کافی تھی لیڈی اقتدار کو بھسم کرنے کے لیے۔

اقتدار یقینی نہیں ہے۔

زوال یقینی ہے۔ ہر ابھرتی شے ایک نہ ایک دن ضرور ڈھلتی ہے۔ موت سے حالات سے یا جیسے بھی۔ مگر ڈھلنا یقینی ہے۔ جو کوئی بھی اس حقیقت کو بھلا کر تکبر کی بھینٹ چڑھتا ہے وہ اپنے زوال پر ٹھیک اسی طرح سے ششدر رہ جاتا ہے۔

"کیا ہوا، لویزا؟" مناج ہاتھ باندھ کر بولی تھی۔

وہ ہل نہ سکی۔ وہ بھاگ نہ سکی۔ وہ تو جیت گئی تھی۔ اس کا سب سے بڑا دشمن مار کھا گیا تھا۔ پھر کیا ہوا؟

"تم نے پوچھا تھا میں تمہارا نام کیسے جانتی ہوں؟ آج تمہیں بتا دیتی ہوں۔" وہ آگے بڑھی۔ آنکھوں میں کاٹ تھی۔

"تم نے the boy who lived کے بارے میں سنا ہی ہو گا۔ ملو مجھ سے، میں ہوں، the girl who lived"

"مجھے معلوم ہے تم نے مجھے اب تک نہیں پہچانا۔ اگر تم مجھے جانتی، تو شاید آج اپنا سیاہ تخت سنبھالی ہوئی ہوتی۔"

الفاظ نوکدار کنکروں کی طرح اس کے جسم پر پڑے۔ اس عورت سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی بلا تاثر آنکھوں میں عجیب فسوں قائم تھا جس نے اسے اندر تک ہلا دیا تھا۔

”یاد کرو فرزانہ کو۔ جو تمہارے اس بگڑے ہوئے بھائی کی بیوی تھی۔ میں اسی کی بیٹی ہوں۔ میں مناج ہوں، فرزانہ کی بیٹی۔ جو کہ تمہارے گھر میں تین سال تک تڑپی تھی۔ میں مناج ہوں' وہ چودہ سالہ لڑکی جس کی مجبوریوں کا فائدہ اٹھاتے تم نے اس کی کڈنی چھین لی تھی۔ میں ہوں وہ لڑکی' جس کی ماں نے تمہارے اکلوتے بھائی کو مار دیا تھا اور تمہارے ظلم سے مجھے بچانے کے لیے اپنی جان بھی قربان کر دی۔ میں ہوں وہ لڑکی اور میں واپس آگئی ہوں۔“ اس کے انداز میں پر تپش سے نادیدہ شعلے بھڑک رہے تھے۔ وہ شعلہ لیڈی اقتدار کے جسم کے درجہ حرارت بڑھانے لگے۔ اس کا ماتھا پسینے سے تر ہو گیا۔

لیڈی اقتدار نے دو قدم پیچھے بڑھائے۔ اسے سب یاد تھا۔ سب کچھ۔ مجرم اپنا جرم نہیں بھولتا۔ وہ بھی نہیں بھولی تھی۔

مناج اب دو قدم پیچھے گئی۔ اس کے بولنے کا وقت ختم ہوا تھا۔ اب باری احمد کی تھی۔

”مجھے کسی تعارف کی ضرورت نہیں، ملکہ عالیہ۔“ احمد نے آنکھوں میں معصومیت لیے اپنے لب دبائے۔

”بلکہ ملکہ عالیہ کہاں؟ تم ملکہِ خاک بن کر رہ گئی ہو۔ تمہارا غرور تمہیں آج یہاں لے آیا۔“ وہ تپانے والے انداز میں بولا۔

لیڈی اقتدار کے دل پر ضرب لگا۔ دماغ اب تک اس غلطی کی کھوج لگا رہا تھا جو اس سے سرزد ہوئی تھی۔ وہ غلطی جو آج اس کی تباہی کی صورت اس پر نازل ہوئی تھی۔

"تم اب خاک ہو۔ خاک کی طرح دھتکاری ہوئی۔ تمہاری جگہ ہم سب کے پیروں کے نیچے ہے۔ تمہاراا اقتدار ختم ہو چکا ہے۔" وہ شعلہ باز انداز میں بولا۔ لیڈی اقتدار کی آنکھیں نم ہوئیں۔

وہ کیسے ٹوٹ سکتی تھی؟ سالوں کی ایمپائر یہ دو ٹکے کے نوجوان کیسے گرا سکتے تھے؟ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا۔ اس کے لیے یہ سب غیر یقینی تھا۔ کاش کے بس یہ ایک ڈراؤنا خواب ہو۔ اس کی آنکھ کھلے اور سب واپس آجائے۔ اس کے سرہانے شمس ہو، درانی ہو اور نیلوفر ہو۔ کاش!

"ٹی وی چلاؤ!" احمد بولا۔

درفشاں نے حکم کی تکمیل کرتے ہوئے ٹی وی چلایا۔ لیڈی اقتدار نے اپنی نظریں ٹی وی کی طرف مرکوز کیں۔ اصل دھچکا تو اسے اب لگنا تھا۔

"لیڈی اقتدار جو کہ پاکستان کی مشہور و معروف ڈاکٹر، فیلین تھیروپسٹ اور ہیومین ٹیرین ہیں ان کی ایک ویڈیو سامنے آئی ہے۔ ویڈیو کے ذرائع خفیہ ہیں۔ آپ سب اس ویڈیو کا ملاحظہ فرمائیں۔" لیڈی اقتدار کے کندھے شل ہوئے۔ یہ ویڈیو۔ یہ وہ ویڈیو نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ بے اختیار گردن نفی میں ہلانے لگی۔

ٹی وی پر عمارہ کے قتل کی ویڈیو چل رہی تھی۔ سب نے اس عورت کا بے رحم چہرہ دیکھا تھا۔ اس کے رعب، اعلیٰ وضع قطع کے پسِ پشت بدبودار باسی اصل سامنے آچکا تھا۔ لیڈی اقتدار کے عزائم کے پردے چاک ہو گئے تھے۔

”لیڈی اقتدار کے ہسپتال عافیت زندگی میں چھاپا مارا ہے۔ سارے ورکرز پولیس کی گرفت میں ہیں اور جلد ہی تفتیش شروع کی جائے گی۔ عافیت زندگی کے ہسپتال کے اوپر اِل لیگل آرگن ٹرانس پلانٹ کے الزامات بھی لگائے گئے ہیں۔ پاکستان بھر میں لیڈی اقتدار کے تمام ہسپتالوں کو سیل کیا جا رہا ہے۔“

لیڈی اقتدار کے ہاتھ کپکپانے لگے۔ ناممکن! ناممکن! وہ گردن نفی میں ہلانے لگی۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟

اس کا پورا جسم پسینے میں بھیگنے لگا تھا۔

”زوال مبارک ہو لویزا۔“ احمد بولا۔

لیڈی اقتدار نے کپکپاتے ہاتھوں سے اپنے پرس میں ہاتھ ڈال کر اپنا موبائل نکالا۔ وہ کسی کو کال ملانے لگی تھی۔ کچھ دیر بعد کال اٹھالی گئی۔ لیڈی اقتدار کی رنگت بالکل سفید ہو چکی تھی۔ وہ کسی بد کے ہوئے جنگلی جانور سا نظارہ پیش کر رہی تھی۔ چہرے پر پھیلی جھریوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔

”یہ کیا ہے؟ تمہارے چینلز پر یہ ویڈیو کیسے چل سکتی ہے؟“ وہ جنونی کیفیت میں چلائی تھی۔

”معذرت لیڈی، اوپر کی طرف سے آرڈر تھا۔“ فون کے اس پار سے صاف گوئی سے جواب موصول ہوا۔ لیڈی اقتدار کے چہرے پر بے یقینی پھیلی۔

”یہ اوپر کی آتھوریٹیز، میرے ٹکڑوں پر پلتی ہیں!“ وہ انگلی اٹھا کر دھاڑی تھی۔ ”میں تم سب کو دیکھ لوں گی۔ تم سب کو برباد کر دوں گی۔“ چلا کر کہتے کال کاٹ دی۔

اس نے کسی اور کو کال ملائی۔ فون کان سے لگایا۔ کچھ ہی دیر میں کال اٹھالی گئی۔

"یہ کیا ہے؟ اس سب کو رو کو ابھی! نہ بھولو تم نے مجھ سے کتنی فیورز نکالی ہیں۔ میرے ہسپتال کو سیل نہیں ہونا چاہیے۔ بات ختم!" وہ حکم جاری کرنے والے انداز میں بولی تھی۔

لاؤنج میں موجود ہر فرد کسی تماشائی کی طرح لیڈی اقتدار کا بگڑتا حال دیکھ رہا تھا۔

"تمہیں اتنا کچا کام کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔ یہ ویڈیو سامنے آنے کے بعد مجھے تم سے کوئی سروکار نہیں۔ میں اتنی غیر پیشہ ورانہ عورت کے ساتھ کام نہیں کر سکتا۔ آئندہ مجھ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔"

لیڈی اقتدار کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ جن لوگوں کے ساتھ وہ کام کرتی تھی، وہی اسے یوں رسوا کر رہے تھے۔ وہی اسے اس مصیبت سے بچانا نہیں چاہ رہے تھے۔ سب اس کی پیٹھ پر چھرا گھونپ چکے تھے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح اس نے اپنے خاص بندوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپا تھا۔

اسے اپنا ہر جرم یاد تھا۔۔۔ مجرم اپنے جرم بھولا نہیں کرتے۔۔۔۔

اس نے ہاری ہوئی نظر اس ہجوم پہ ڈالی۔ کچھ مسکرا رہے تھے، کچھ قہقہے بلند کر رہے تھے۔۔ جو کسی زمانے میں ملکہ کی طرح چلتی تھی آج وہ کھڑی تک نہیں ہو پا رہی تھی۔ وہ راکھ کی طرح بے معنی ہو گئی تھی ۔ایک جھٹکے میں اس کا سارا تکبر چکنا چور ہو گیا تھا۔ سب ختم ہو گیا تھا۔ اس کا اقتدار ختم ہو گیا تھا۔

"کیسے؟" وہ پہلی مرتبہ اس ہجوم سے مخاطب ہوئی۔ "کیسے کیا تم نے یہ سب؟"

احمد نے دو قدم آگے بڑھائے۔ ہاتھ باندھ کر اپنی بات کا آغاز کیا۔

"بہت آسان تھا۔ ہم تمہیں شروع سے سب کچھ سمجھاتے ہیں۔" وہ بولا۔

باقی سب بھی اپنے حصے کی کہانی سنانے کے لیے تیار تھے۔

☆☆☆

(ہم ذرا حالیہ منظر کو کچھ وقت کے لیے روک کے اس پہیلی کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔)

☆☆☆

یہ عمارہ کے قتل کے کچھ دیر بعد کا منظر ہے۔۔۔

لیڈی اقتدار نیلوفر کے ساتھ اس کے آفس میں موجود تھی۔ دونوں کے مابین گفتگو جاری تھی۔

”لیڈی، مجھے سمجھ نہیں آرہا۔ آپ کیمرا زپر قتل کیوں کریں گی؟“نیلوفر آواز میں تشویش لیے۔

”تمہیں میں اتنی بیوقوف لگتی ہوں؟“ تحقیر آمیز نگاہ نیلوفر پر ڈالی۔ ”حرر کا آفس حسام نامی معمار نے بنوایا ہے۔ میں نے اس کے ایک بندے کو رشوت دے کر نقشہ نکلوالیا تھا۔ اندر ایک بنکر ہے جہاں ہر چیز کا بیک اپ موجود ہوتا ہے۔ میں آج اپنے بندے کو بھیج کر سب چرالوں گی اور ان چیونٹیوں کے لیے ایک سرپرائز چھوڑوں گی۔“

یکبارگی نیلوفر کے دماغ میں ایک منصوبے نے زور جمایا۔

(احمد: عمارہ کے قتل کے بعد تم نے جس بندے کو حرر کے آفس بھیجا تھا اس بندے سے نیلوفر پہلے ہی بات کر چکی تھی۔ نیلوفر نے اسے معاوضہ دے کر اس یو ایس بی کا بیک اپ بنوا کر اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا۔)

احمد اور نیلوفر کی ملاقات۔۔۔

''عمارہ کا قتل!''

بھورے لفافے پر سیاہ روشنائی سے یہ لفظ لکھے گئے تھے۔پل بھر میں احمد کو سارا ماجرا سمجھ آگیا۔

''میں اس کا استعمال کرنا چاہتی تھی۔ مگر مجھے لگتا ہے کہ تم اس کا مجھ سے بہتر استعمال کر سکو گے۔''نیلوفر نے خاموشی کو توڑا۔

احمد کی آنکھیں پر سوچ ہوئیں۔ پھر اس نے گردن اثبات میں ہلائی۔

''بہت خوب۔'' اس نے داڑھی کھجائی، پھر سلسلہ کلام جوڑا۔

''میرے پاس اس کی دولت کی کنجی موجود ہے۔میری ایک کال پر وہ کنجی جل جائے گی۔ مگر اس میں وقت لگ سکتا ہے۔مجھے اس مدت تک اسے بھٹکانا ہو گا۔'' احمد سوچتے سمجھتے بولا۔

''ٹھیک ہے۔اور تم اسے بھٹکاؤ گے کیسے؟''نیلوفر بولی۔

''وہ تم مجھے پر چھوڑ دو۔'' وہ ایک جھٹکا کھا کر بولا۔ دماغ میں لائحہ عمل تیار تھا۔

''بس میں چاہتا ہوں کہ جب بھی یہ گرے اسے کھڑا کرنے والا کوئی نہ ہو۔یہ جس کو بھی مدد کے لیے پکارے' وہ جواب میں اسے رسوائی کے علاوہ کچھ نہ دے۔'' احمد چہرے پر سوچ کا تاثر لیے بولا۔نیلوفر مسکرائی۔

''اس کی تم فکر نہ کرو۔ میں لیڈی اقتدار کی سب سے بڑی سپورٹ کو ان سے دور کر دوں گی۔ انہیں کوئی بچا نہیں پائے گا۔''

(احمد: وہ ویڈیو میرے پاس تھی، مگر میں نے فوری طور پر اس کا استعمال نہیں کیا۔ میں پہلے تمہیں دولت چھن جانے کی تکلیف دینا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے دبئی پولیس سے رابطہ کیا۔ انہیں تیاریوں میں کچھ وقت درکار تھا۔ اور مجھے خدشہ تھا کہ تم جلد جان جاؤ گی کہ میں دبئی گیا تھا اور اپنی دولت کہیں اور منتقل کرو گی۔ اس لیے میں نے مناج سے رابطہ کیا اور وہ اغواء ہم نے نیلوفر کی مدد سے کروائے تاکہ تم حرر والوں سے جنگ کرنے میں اتنا الجھ جاؤ کہ مجھے کچھ وقت کے لیے بھول جاؤ۔ مگر اس سے بھی پہلے، مجھے مہر کی والدہ کی حفاظت یقینی بنانی تھی۔ اس صورت میں ہماری انسپیکٹر یونس نے مدد کی۔ نیلوفر سے قید خانے کا پتا دیا اور ہم نے ریڈ کی تیاری کی۔)

انسپیکٹر یونس پولیس وین میں سوار لکڑی کے اس قید خانے کے راستے پر گامزن تھا۔ راستہ کافی ناہموار تھا اس لی رفتار سست تھی۔ اسے کال آنے لگی۔ چہرے پر تھکان ابھری۔

"جی سر!" آواز اونچی تھی اور انداز خوشگوار۔

"تم بنا پوچھے کون کون سے گل کھلا رہے ہو، یونس؟ ابھی اسی وقت واپس آؤ۔ یہ مہم والا کیا معاملہ ہے؟ اس کی وضاحت دو۔" باس نے بارعب انداز میں حکم جھاڑا۔

یونس بالکل بھی مرعوب نہ ہوا۔ اس نے آنکھیں گھماتے تھکی ہوئی سانس خارج کی۔ اسے بس مناج نے یہ کام کرنے کا کہا تھا' اس کے باس کے آرڈرز اس کے لیے بے معنی تھے۔ مناج کی ایک درخواست اس کے لیے ہر چیز پر فوقیت رکھتی تھی۔

"آپ مجھے روک نہیں سکتے۔" یونس نے صاف گوئی سے کہا۔

"اگر تم وہاں پہنچے تو میں نے تمہیں فارغ کر دینا ہے۔"

''آپ ایسا بھی نہیں کریں گے۔ نہ ہی آپ اپنے مالکوں کو بتائیں گے کہ میرے کچھ بگڑے ہوئے افسر اس قید خانے تک پہنچنے ہی والے ہیں۔'' یونس کے کہتے ہی اس کا باس بالکل خاموش ہو گیا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو۔ کونسے مالک؟'' وہ بوکھلایا۔

''سر، اب ایسے بات نہ کریں جیسے آپ جانتے نہیں ہیں، یا میں نہیں جانتا۔ آپ جانتے ہیں وہاں کیا ہو رہا ہے۔ اور آپ اپنے مالکوں کو نہیں بتائیں گے کہ میں وہاں جا رہا ہوں۔ ویسے بھی میں بس پہنچنے ہی والا ہوں۔ ان کو بتانے کے بجائے، اور مجھے نکالنے کے بجائے آپ اس سب کا کریڈیٹ اپنے سر لیں۔ کیونکہ میں پکا انتظام کر کے آیا ہوں۔ یہ سارے لوگ بہت جلد ہی منظر عام پر آنے والے ہیں سر۔ ان سے جتنا جلدی ہو سکے، قطع تعلق ہو جائیں ورنہ آپ کی ساکھ برباد ہونے کا خطرہ ہے۔ جب یہ لوگ اپنے انجام کو پہنچ جائیں تو آپ سینہ تان کر کہیے گا:۔'' یونس نے اپنا گلا کھنکھارا۔ ''میرے اوپر بہت دباؤ تھا، لیکن میں نے اپنے جوانون کو حکم دیا، کہ چاہے جو بھی ہو جائے ہم حق اور انصاف کے کارندوں کا ساتھ دیں گے!'' اس نے باس کی آواز کی نقل اتارنے کی کوشش کرتے کہا۔ ''سب آپ کی واہ واہ کریں گے۔ آپ کو پروموشن مل جائے گی۔ زیادہ بڑی گاڑی۔ زیادہ بڑا گھر۔ زیادہ واہ واہ۔ زیادہ شہرت۔ زندگی بھر کے لیے یہ کام یاد رکھا جائے گا، سر۔ اب سوچ لیجیے۔ مجھے نکال کر اپنے آپ کو اس کام سے ڈسکریڈٹ کریں گے؟'' یونس کی آنکھوں میں معنی خیز سا تاثر ابھرا۔ وہ جانتا تھا کہ کام بن چکا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ جو کرنا چاہتے ہو کر لو۔'' یونس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ بکھری۔ اس نے کال کاٹ کر موبائل سائڈ میں رکھا۔ وہ کھڑکی سے چہرہ ٹکائے، آنکھوں میں خواب والا تاثر لیے باہر جھانک رہا تھا۔

اس سب کے بعد تو اس کی بھی واہ واہ ہونی تھی، وہ بھی میڈم اٹارنی سے۔ وہ سوچ سوچ کر ہی خوش ہوئے جا رہا تھا۔

(یونس: وہاں پر ہم نے ایک ریڈ کی، لیکن اس ریڈ کو بالکل خفیہ رکھا۔ تمہارے سارے بندوں کو چھتر ول لگائیں۔ ہمارے سارے سپاہی پچھلے ہفتے سے ان ہی کے ساتھ اس قید خانے میں پہرا دے رہے تھے۔ ان کے سارے موبائل ضبط کر لیے تھے۔ جب بھی تمہارے لوگ خبر لینے کے لیے کال کرتے ہم ان کے سر پہ بندوقیں تان کر بات کروایا کرتے تھے۔)

یہ وہی رات تھی جب حسام اغواء ہوا تھا۔

حسام کو مناج کی کال آئی تھی۔ اس نے فون کان سے لگایا۔

"حسام، مجھے پہلے بتا دینا چاہیے تھا، لیکن راز داری بھی ضروری تھی۔" مناج سرگوشی والے انداز میں بولی۔ حسام بری طرح سے الجھ گیا۔ اس کے قدم سست ہوئے۔

"کیا مطلب؟" وہ الجھ کر بولا۔

"یہ سارے اغواء یہ میری اجازت سے ہو رہے ہیں۔" حسام کے قدم زنجیر ہوئے۔ اس کا سر اچانک سے گھومنے لگا تھا۔ اسے لگا اس کے ساتھ کوئی مذاق ہو رہا ہے۔ ٹھیک اسی وقت اس کے اوپر پیچھے سے وار ہوا۔

(مناج: ہم نے حرر کے سارے اسٹاف کو لکڑی کے اس قید خانے میں رکھا۔ سب محفوظ تھے۔ اور ہم نے تمہیں چیلنج دیا۔ تمہاری انا پر چوٹ لگائی، تاکہ تم ہماری جنگ سنجیدگی سے لو۔ تم نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ مجھے کہاں کہاں رسوا کروایا۔ اور اس سلسلے میں تمہارا دھیان احمد کے اوپر سے ہٹ گیا۔ تم سمجھتی تھی ہم

بیوقوف ہیں، مگر بیوقوف تو تم تھی۔ تمہاری لاعلمی کے دوران دبئی پولیس نے تیاریاں مکمل کیں اور بینک میں چھاپا مارا۔)

احمد اور لیڈی اقتدار کی ملاقات کے بعد۔

لیڈی اقتدار نے نیلوفر کو کال کی تھی جو کہ اپنے آفس میں بیٹھی تھی۔ نیلوفر نے فوراً کال اٹھالی۔

'احمد کے قتل کی تیاری کرو۔ کل وہ ختم ہو جانا چاہیے۔'' کپکپاتی، غصے سے لبریز آواز نیلوفر کو سنائی دی تھی۔

کال کٹ چکی تھی۔ نیلوفر بالکل پر سکون تھی۔ چہرے پر اطمینان تھا۔

اس نے احمد کو کال ملائی۔ کال کچھ دیر میں اٹھالی گئی تھی۔

''ہاں احمد۔ قتل کا حکم جاری ہو گیا ہے۔'' آنکھیں سوچ کے باعث چھوٹی کرتے ہوئے وہ بولی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ وہی پلان فالو ہو گا۔ لیڈی اقتدار کا کام کل کے کل ہی تمام ہو جانا چاہیے۔'' سرسری سے انداز میں کہہ کے احمد نے کال کاٹ دی۔

(نیلوفر: وہ سنائپر جو میں نے آپ کے کہنے پہ لگایا تھا وہ در حقیقت مجھ سے وفادار تھا۔ اس نے احمد کو گولیاں نہیں ماری تھیں۔ وہ بس ہوائی فائرنگ تھیں۔ آپ کو جیت کا سراب دینے کے لیے ہمیں یہ کرنا پڑا۔)

☆☆☆

''تو دیکھا تم نے، لویزا۔ اتنی محنت کے بعد ہم تمہیں یہاں تک لا سکے تھے۔'' احمد بولا تھا۔

"یہ ہم سب کی محنت ہے۔ مہر کی، جس پر تم لوگوں نے کتنا ظلم کیا، اسے ذہنی اذیت دی۔

آپا کی، جس نے اپنی جان پر کھیل کر تمہارا اعتماد جیتنے کی کوشش کی۔

مناج کی، جس نے تمہیں نیچے گرانے کے لیے اپنے آپ کو اتنے دن تک ٹیلی ویژن پر بدنام کیا۔

حرر کے اسٹاف کی جو کہ آخری وقت تک مناج کے ساتھ ٹکے رہے اور اپنے مخلص ہونے کا ثبوت دیتے رہے۔

نیلوفر کی، جس نے اپنی جان پر کھیل کر تمہاری ناک کے نیچے ہم سب سے رابطہ قائم کیا۔ صرف اور صرف اپنے گناہوں کو سدھارنے کے لیے۔

تمہیں صرف ایک انسان نے نہیں گرایا۔ تمہیں ہم سب نے مل کر گرایا ہے۔ تمہارا تخت ہم سب نے مل کر پلٹا ہے، لویزا!" اس نے ہاتھ پھیلا کر سب کی طرف اشارہ کیا۔

لیڈی اقتدار سب کچھ سن چکی تھی۔ اس کا دماغ بالکل سن ہو گیا تھا۔ وجود جیسے شل ہو گیا ہو۔ سب کچھ اس کی ناک کے نیچے ہوتا گیا اور اسے پتا تک نہ چلا؟ اس کا سر بری طرح سے چکرایا۔

"نہیں!" وہ گردن نفی میں ہلانے لگی۔

"یہ نہیں ہو سکتا!" وہ بولی۔

اس کا زوال۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ غیر یقینی۔ ناممکن! آنکھوں میں پنپتا خوف شدت اختیار کر چکا تھا۔ اس کے چہرے پر دہشت تھی۔

ٹھیک اسی وقت پیچھے سے وردی پوش عورتیں اور مرد داخل ہوئے۔لیڈی اقتدار حواس باختہ سے عالم میں پیچھے مڑی۔

"لویز امراد ابراہیم۔ ہم آپ کا اریسٹ وارنٹ ساتھ لائیں ہیں۔ آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہو گا۔" مرد پولیس افسر مودب انداز میں بولا۔

لیڈی اقتدار جنگلیوں کی طرح گردن نفی میں ہلانے لگی۔وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے پولیس افسران کو تنبیہ کررہی تھی۔

"نہیں !تم لوگوں کی اتنی اوقات نہیں کہ مجھے گرفتار کرو۔" وہ چلائی تھی۔اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں خون اترنے لگا۔

"ہمارے پاس وارنٹ ہے، میم۔ ہمیں زبردستی کرنے پر مجبور نہ کریں۔" پولیس افسر پھر سے بولا۔لیڈی اقتدار نے کھا جانے والی نظر اس پولیس افسر پہ ڈالی۔

"تم سب کتے میرے ٹکڑوں پر پلتے تھے؟ تم لوگوں کی اتنی مجال کیسے ہو گئی کہ مجھے گرفتار کرنے چلے آؤ۔ نمک حرامی تو تم سب کی فطرت میں تھی۔" وہ شانے اٹھا کر سینے پہ انگلی سے دستک دیتے بولی۔ آنکھوں میں طیش بھرا ہوا تھا۔

"ہمیں مجبور نہ کریں، میم۔" وہ پھر سے بولا۔

لیڈی اقتدار سن سی وہیں کھڑی رہی۔

وقت نے بھی کیسا پلٹا کھایا تھا۔ جو لوگ اس کے نیچے ہوا کرتے تھے، اس کی پائی پائی کے محتاج تھے' آج وہ ہی اسے آنکھیں دکھا رہے تھے۔ وہ اپنی طاقت کھو چکی تھی۔ وہ سب کچھ کھو چکی تھی۔

''انہیں ہتھکڑی لگائیں۔'' پولیس افسر نے حکم جاری کیا۔ لیڈی اقتدار طیش میں آ گئی۔ وہ تیزی سے میز کی جانب بڑھی اور میز پہ پڑا گلدان اٹھا کر زمین پہ پھینک دیا۔

''تم لوگ مجھے کچھ نہیں کر سکتے!'' وہ جلادی کیفیت میں چلائی تھی۔ سب لوگ دو قدم پیچھے ہوئے۔ چہرے پر سرخی' گردن اور ماتھے پہ بھڑکتی نسیں اسے مزید خوفناک بنا رہی تھیں۔

''تم لوگ!'' وہ اونچی سانسیں لیتے بولی تھی۔ آواز مزید بلند ہوئی۔ ''تم لوگ مجھے مات نہیں دے سکتے! میری طاقت لازوال ہے!'' وہ اتنی ذلت کے باوجود بھی اپنی گردن اکڑا کر بولی تھی۔ لیکن چاہ کر بھی یہ گردن پہلے کی طرح اکڑ نہ سکی۔

وردی پوش عورتیں اس کی طرف بڑھیں۔ اسے ہاتھوں سے پکڑا اور ان میں ہتھکڑی لگائی۔ لیڈی اقتدار مزاحمت کرتی گئی' لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ اب پولیس کی گرفت میں تھی۔

''نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں نہیں ہار سکتی!'' وہ دیوانوں کی طرح چلائی۔ آنکھ سے آنسو متواتر بہنے لگے تھے۔ طاقت کا نشہ ٹوٹ جانے پر اس کا حال ویسے ہی نشئی کی مانند ہی تھا جو کہ کئی دنوں سے نشہ ترک چکا ہو۔ پولیس کی عورتیں اسے ہاتھوں سے پکڑتے ان سب سے دور لے جا رہی تھیں۔

''میں تم سب کو کھا جاؤں گی۔'' اس کی چیخ و پکار اس لاؤنج میں مندمل ہونے لگیں۔

''میں واپس آؤں گی!'' وہ اپنی روح کی طرح کھوکلی دھمکیوں سے ان سب کو نواز رہی تھی۔ وہ اب لاؤنج سے جا چکی تھی۔ آگے بہت مشکل حالات کا سامنا کرنا تھا۔ پہلے میڈیا ٹرائل میں رسوا ہونا تھا، پھر

کورٹ میں اسے ذلالت برداشت کرنی تھی۔ سارا تکبر چکنا چور ہو گیا تھا، ساری شان ایک لمحے میں خاک ہو گئی تھی، طاقت کا زور اس زلزلے میں برباد ہو گیا تھا۔ لویزا عرف لیڈی اقتدار پوری طرح سے برباد ہو چکی تھی۔

اس کمرے میں خاموشی سی چھائی ہوئی تھی۔ ان میں سے کچھ کی آنکھیں نم ہونے لگی تھیں۔ جیت اور فتح کی خوشبو ساری فضا میں بکھری۔

سب ایک دوسرے کو چہروں پر فاتحانہ مسکراہٹ لیے دیکھ رہے تھے۔ جیت کا وقت تو ان کا تھا۔ فتح تو ان کی تھی۔ ایک طویل جنگ اپنے اختتام کو پہنچ گئی تھی۔ ایک نئ صبح ان پہ طلوع ہونے لگی تھی۔ ایک نئ فجر ان سب کی زندگیوں کو چمکانے لگی تھی۔

وہ ایک دوسرے کو مبارکباد دینے لگے۔ انصاف آخر کار ان کو مل گیا تھا۔ اندھیر طاقت روندھی گئ تھی۔

لیکن اس طاقت کے گر جانے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ برائی کی جنگ ختم ہو گئی تھی۔

ابھی بہت سی جنگیں باقی تھیں۔

☆☆☆

حسام کی گاڑی درِفشاں کے علاقے میں داخل ہوئی تھی۔ دونوں کے چہرے خوشیوں سے تمتما رہے تھے۔

''یقین نہیں آرہا، کہ سب ختم ہو گیا۔ حرر کا پہلا مشن اس طرح سے مکمل ہوا۔'' وہ سامنے دیکھتے ہوئے چہکی۔

حسام وقفے وقفے سے اسے مڑ کر دیکھتا۔

''مجھے ایک بات پتا چلی ہے، درِفشاں۔'' حسام کے انداز میں نیم شرارت گھلی۔

درِفشاں نے بھنویں سکیڑیں۔

''کیا؟''

حسام نے مسکراہٹ دبائی۔

''مناج نے بتایا تھا، کہ میری گمشدگی کا سن کر آپ بہت پریشان تھیں۔ بہت رو رہی تھیں۔ قابو میں ہی نہیں آرہی تھیں۔''

درِفشاں گڑبڑائی۔ وہ لاتعلق سے انداز میں یہاں وہاں دیکھنے لگی۔

''ہاں تو کیا ہوا۔ انسانیت کا ناطہ تھا۔ تو رو دی۔'' وہ نظریں چرا رہی تھی۔

حسام بمشکل ہنسی قابو کر سکا۔

''ادریس اور شکیل انسان نہیں تھے کیا؟'' اس نے لب بھینچے۔

درِفشاں نے چہرے پر تپش سجائے اسے دیکھا۔ اسی اثناء گاڑی گھر کے سامنے رکی۔

''نہیں آپ کیا چاہتے ہیں۔ کیا جواب دوں میں؟'' وہ نیم برہم تھی۔

حسام کو بے اختیار کھل کھلی آئی۔ وہ واحد عورت بن گئی تھی جس کا غصہ بھی سہانا لگتا تھا۔

''سوال تو ابھی پوچھنا ہے۔ اور اس کا جواب ناں نہیں ہونا چاہیے۔'' حسام نے مڑ کر اسے دیکھا۔

درِفشاں کے گالوں میں سُرخی دوڑی۔ اس مرد کی آنکھوں میں جس جذبے نے زور لیا تھا وہ اسے پڑھ چکی تھی۔ مگر پچھلی بار کی طرح اس جذبے نے اسے ڈرایا نہ سہمایا۔ بلکہ دل کے ایک گوشے کو پرسکون کر دیا تھا۔

''درِفشاں یوسف۔ کیا آپ مجھ سے شادی کرنا چاہیں گی؟''

درے کے کانوں سے دھواں نکلنے لگا۔ مگر وہ اس مرد کی آنکھوں سے نظریں نہ پھیر سکی۔ اسے دیکھتے رہ جانے کا جی چاہتا تھا۔ اس دفعہ وہ گاڑی سے نکل کر بھاگنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی تھی۔

''میں بہت ڈرامے باز ہوں۔'' وہ اسے محویت سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''اور میں جہاندیدہ اور صابر۔'' اس نے فر فر جواب دیا۔

''میں رو جاؤں تو جلد چپ نہیں ہوتی۔''

''میرے ہاتھ سلامت ہیں، آنسو پونچھ دوں گا۔''

''میں ہنستی بھی بہت ہوں۔''

''میرے کان بھی سلامت ہیں۔ آپ کی ہنسی فرصت سے سنوں گا۔''

”میں باتونی بھی بہت ہوں۔“

”اور میں آپ کی باتوں کا مرید۔“

ایک لمحہ تھا۔ محبت کا لمحہ۔ عقیدت کا لمحہ۔ وہ اسے جی بھر کر دیکھے گئی۔ وہ مسکرائے بغیر رہ نہ سکی۔

مڑ کر گاڑی کا دروازہ کھولا۔

”میں ایک شریف عورت ہوں۔ اپنی امی کو لے کر میرے گھر آ جایئے گا میرے بھائی سے ملوانے۔“ وہ بے نیازی سے کہتے گاڑی سے اتر گئی۔

حسام نے شیشے کے پار اس کے چہرے کو دیکھا۔ وہاں مسکراہٹ تھی۔ آنکھوں میں بے پناہ محبت رقم تھی۔ اس کی روح میں لطیف سا تاثر سما گیا۔ جس تکلیف نے عرصے سے روح پر قبضہ جمایا تھا وہ بالآخر بوریا بستر باندھ کر جا چکی تھی۔

☆☆☆

شام کا وقت تھا، احمد اپنے آفس سے باہر نکلا۔ مہر کی سپورٹس کار احمد کے آفس کے باہر کھڑی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر ٹھٹکا تھا۔ چہرے پر نیم سی شرمندگی اتری۔ وہ تیز قدم بڑھاتے اس تک پہنچا۔ گاڑی کی چھت کھلی ہوئی تھی۔

”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ وہ آس پاس دیکھتے ہوئے بولا۔

”تین دن ہو گئے ہیں اقتدار کے زوال کو۔ ملنے آئی ہوں۔“ وہ اعتماد سے بولی۔

احمد نے سر جھٹکا اور آس پاس کا جائزہ لیتے گاڑی میں بیٹھا۔

"آپ شرما رہے ہیں۔" اس نے گاڑی چلاتے ہوئے طنز کسا۔

احمد نے لاتعلق سے انداز میں یہاں وہاں دیکھا۔

"میں کیوں شرمانے لگا۔" بے نیاز سا انداز۔ مہر نے مسکراہٹ دبائی۔

مہر نے مڑ کر اسے دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی الجھن تھی جیسے۔ کوئی چیز جو اسے کھل رہی تھی۔

"کیا ہوا، احمد۔ سب خیریت ہے؟"

ٹھنڈی ہوائیں دونوں کے بال اڑا رہی تھیں۔ احمد نے کچھ دیر کے لیے چپ سادھ لی۔ وہ عورت اگر یہ سوال کچھ وقت پہلے پوچھتی تو وہ گول کر دیتا۔ مگر اب وہ عورت سب کچھ بن چکی تھی۔ وہ بلا جھجک اپنے راز اس کے سپرد کر سکتا تھا۔

"مجھے اب تک سمجھ نہیں آ رہا۔ کہ تین سالوں سے مجھے مارا کیوں نہیں گیا؟ وہ کون سا راز ہے، جس کی نیلوفر بات کر رہی تھی۔ جس سے شمس مجھے ڈراتا تھا؟" وہ گردن جھکائے بے تاثر لہجے میں بولا۔

مہر نے اسے سنجیدگی سے دیکھا۔

"کہتے ہیں، کچھ رازوں کا پردے میں رہنا بہتر ہوتا ہے۔ تعاقب چھوڑ دیں۔" اس نے مسکرا کر پیش کش کی۔

وہ بظاہر مسکرا دیا۔ بھلے سے اس عورت کی بات نے اس کی بے چینی ختم نہیں کی تھی، پر وہ پھر بھی مسکراتا گیا۔ اپنوں کی کوششیں نتائج سے زیادہ اہم ہوتی ہیں۔

”تم سب چھوڑو۔ ایک بات بتاؤں؟“ احمد نے ماحول بہتر کرنا چاہا۔

”آپا نے مجھے پتا نہیں کتنی لڑکیوں کی تصویریں دکھائیں۔ کہہ رہی ہیں کہ مجھے ان میں سے کسی سے شادی کر لینی چاہیے۔“

مہر کے چہرے پر تناؤ حائل ہوا۔ سڑک خالی تھی۔ اس نے ریس پر اور زور سے پیر رکھا۔ گاڑی کی رفتار تیز ہوئی۔ احمد اس کا بدلاؤ دیکھ کر محظوظ ہوا۔

”خوبصورت تھیں؟“ وہ کڑوے لہجے میں بولی۔

”بے تحاشہ۔“ اس نے مہر کو تپانا چاہا۔

اور وہ کامیاب بھی ہوا۔ مہر کا پورا بدن جل چکا تھا۔ وہ احمد کو دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔

”مگر میں نے تو صاف صاف کہہ دیا، مجھے کوئی اور پسند ہے۔“

کڑواہٹ زائل ہوئی۔ دل نے رفتار پکڑی۔ مہر نے مسکراہٹ بمشکل چھپائی۔

”کون ہے وہ خوش نصیب؟“ اس نے لاتعلق سے انداز میں پوچھا۔

”ایک پیشہ ورانہ چورنی۔“ احمد نے قہقہہ بلند کیا۔

مہر نے تپ کر بریک پر پاؤں رکھا۔ گاڑی جھٹکا کھا کر بیچ سڑک رکی۔ احمد کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

”کیا ہوا ہے، محترمہ؟“ اس نے لاعلم بننے کی اداکاری کی۔

”میں چورنی کب سے ہوئی؟“ وہ پھٹ پڑی۔

احمد کے گال ہنس ہنس کر سُرخ ہوئے۔

”چور تو تم ہو۔ مگر تم دنیا کی واحد چورنی نہیں۔ اور بھی چورنیاں ہو سکتی ہیں۔ تمہیں کیا پتا میں کس کی بات کر رہا؟“ آج وہ فل موڈ میں تھا۔

مہر نے بے بسی سر جھٹکتے گاڑی چلائی۔ ایک دفعہ پھر ہواؤں کے باعث بال اڑنے لگے۔

”کیسی دکھتی ہے؟“ مہر نے بات پھر شروع کیا۔

”اس کے بال گھنے، خوبصورت اور سیاہ ہیں۔“ وہ اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

مہر نے سائیڈ ویوی مرر سے اپنے ہوا میں جھولتے سیاہ بال دیکھے۔

”اس کی آنکھیں بھی گہری، دلکش اور سیاہ ہیں۔“ اس نے سر نکال کر سائیڈ ویو مرر میں اپنی آنکھیں دیکھیں۔

دل کی رفتار پھر تیز ہوئی۔

”اور وہ بھگوڑی ہے۔“

یکبارگی اس نے بریک پر پاؤں رکھا۔ غصیلی سانس خارج کیے احمد کو دیکھا، جو ہنس نہیں رہا تھا، بس مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک دم سے غصے کا جھونکا سر سے سرا۔

وہ بالکل تھم گئی۔ ساکن۔ احمد کی آنکھوں میں البیلی چمک رقم تھی۔ وہ سانس نہ لے سکی۔ وہ ان آنکھوں میں تاعمر ڈوب جانا چاہتی تھی۔

"ہمیں شادی کر لینی چاہیے، مہر۔"

گھمبیر آواز نے مہر کے جسم میں تمازت پیدا کی۔ لمحے بھر کو اسے لگا کہ وہ انگاروں پر دہک رہی ہے۔ چہرہ سُرخ ہو چکا تھا۔ کیا احمد نے واقعی یہ کہا تھا یا اس کے کان بج رہے تھے؟"

"اور آپ مجھ سے شادی کیوں کرنا چاہیں گے؟" وہ بدقت بولی۔

احمد کے چہرے پر شریر مسکراہٹ بکھری۔ مہر نے ایک ٹیڑھے جواب کی توقع کی۔

"اگر تم چاہتی ہو کہ میں اظہارِ محبت کروں، تو معذرت کے ساتھ یہ اس صدی میں ممکن نہیں۔" وہ کہہ کر منہ پھیر گیا۔

مہر جواباً ہنس دی۔

"سوچ لیں، اس بھگوڑی چورنی کے ساتھ زندگی گزارنی پڑے گی، جو حد سے زیادہ جذباتی ہے۔" آنکھیں بے اختیار نم ہونے لگی۔ اس نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھا۔

"اس جذباتی بھگوڑی چورنی کے ساتھ زندگی گزارنا احمد یوسف کے لیے اعزاز سے کم نہیں ہو گا۔"

وہ بنا پلک جھپکائے اسے دیکھے گیا۔ اور وہ سانس روک کر اسے نظروں کا مرکز بنا چکی تھی۔

دل مل رہے تھے۔ روحیں ایک ہو رہی تھیں۔

فضا میں جیسے محبتیں رچ بس گئی تھیں۔ زندگی مکمل تھی۔

☆☆☆

تین ہفتے بعد۔۔۔

وہ پچھلے تین ہفتوں سے جیل میں قید تھی۔ اس کے پرانے ساتھیوں نے ایک آخری احسان کر دیا تھا کہ اسے اے کلاس جیل میں جگہ دے دی تھی۔

وہ کسی سے بات نہ کرتی۔ سارا دن اپنے کمرے میں بند رہتی۔ کمرے میں ہر وہ آسائش تھی جس کا عام انسان حقدار رہے۔ ایک نرم و ملائم بستر۔ پنکھا۔ اکیس انچ کا ٹی وی۔ ایک میز۔ کتاب۔ اخبار۔ لیکن وہ کسی بھی چیز کو نہیں چھوتی۔ پورا دن بس بستر پر بیٹھی رہتی۔ کھانا کھاتی۔ اور سو جاتی۔ بس یہی تھی اس کی زندگی۔

ایک زمانے میں وہ ملکہ جیسی چال چلتی تھی، وہ ملکہ جیسی بے نیازی رکھتی تھی، وہ ملکہ کی طرح حکم جھاڑا کرتی تھی۔ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ سب مٹی ہو گیا تھا۔ وہ پیر کی دھول کی طرح ہیچ بن گئی تھی۔ زندگی ایک لکیر پر آکر رک گئی تھی۔

وہ جیل کے کمرے میں بیٹھی، ہر وقت اپنی موت کا انتظار کرتی۔ لیکن موت ہم حقیر انسانوں کے ہاتھ میں ہوتی ہی کہاں ہے؟ ہاں اب اسے یہ احساس ضرور ہو رہا تھا کہ وہ حقیر تھی۔ اس کے ہاتھ میں کبھی کچھ تھا ہی نہیں۔

وہ کمرے کی بتیاں نہیں جلاتی تھیں۔ وہ رات کے وقت بھی کمرے میں اندھیرا رکھتی تھی۔ وہ روشنیوں میں سر اٹھانا بھول گئی تھی۔

اس وقت وہ ویسے ہی اپنے بستر کے سرہانے بیٹھی تھی جب وردی میں ملبوس سپاہی اس کی طرف آئی۔

”ملاقات آئی ہے۔ اٹھو۔“ وہ اس طرح سے اس سے مخاطب ہوئی جس طرح سے وہ کبھی اپنے چیلوں سے ہوا کرتی تھی۔ اسے وہ سب یاد تھا۔ سب کچھ۔ ہر ایک چیز۔ کاش اسے کچھ یاد نہ ہوتا۔ اگر یاد نہ ہوتا تو یہاں پر وقت کاٹنا اتنا مشکل نہ ہوتا۔ اسے معمولی سے معمولی اشیاء پرانی زندگی کی یاد دلاتی۔ وہ زندگی جو اب اسے ملنے والی نہیں تھی۔

وہ کھڑی ہوئی۔ آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے تھے۔ چہرہ سوجھا ہوا تھا۔ ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں اور بال لاپرواہی سے بندھے ہوئے تھے۔ کپڑوں کا بھی حال خراب تھا۔ کوئی اسے دیکھ کر نہیں بتا سکتا تھا کہ یہ وہی تھی۔ جسے ایک زمانے میں لیڈی اقتدار کہا جاتا تھا۔ ایک وسیع و عریض ایمپائر کی ملکہ، عافیت زندگی کی مالکن۔

وہ سپاہی کے ساتھ چل رہی تھی۔ کچھ دیر ٹہلنے کے بعد وہ ملاقاتی کمرے میں پہنچ گئی تھی۔ ملاقاتی کمرے میں میز تھی۔ میز کی دوسری طرف احمد بیٹھا ہوا تھا۔ احمد کو دیکھ کر اس نے کوئی رد عمل نہیں دیا۔ چہرہ بے تاثر تھا اور وجود خالی۔ وہ جیسے خود بھی جانتی تھی کہ احمد کے علاوہ اس سے کوئی ملنے نہیں آسکتا تھا۔ کوئی تھا جو نہیں اس کا۔

دوست بھول سکتا ہے۔ دشمن نہیں!

وہ چپ چاپ، اس کے سامنے جا کر بیٹھ گئی۔

”کیسی ہو لویزا؟“ احمد شائستگی سے بولا۔ لیڈی اقتدار طنزیہ سا مسکرائی۔

"آج میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ میں تم سے بہتر ہوں۔" وہ استہزاء کا شکار ہوئی۔ "بھلا کیسی ہو سکتی ہوں میں؟" آواز میں ویرانی تھی۔

وہ جان گئی تھی تھی کہ لڑنا بے فیض تھا۔ چلانا بے فیض تھا۔ وہ ہار گئی تھی۔ وہ تباہ ہو گئی تھی۔ یہی حقیقت تھی۔ حقیقت کو تو وہ کب کا تسلیم کر چکی تھی۔ مگر یہ کہاں لکھا ہے حقیقت کو تسلیم کر لینے سے تکلیف کم ہو جاتی ہے؟

"مجھے لگا تھا تم میں غیرت ہو گی، لویزا۔ تم مر جاؤ گی۔ لیکن تم تو اب تک زندہ ہو۔ اتنی ڈھیٹ کیوں ہو تم آخر؟" احمد جلانے والے انداز میں بولا۔

"تمہیں پتا ہے میں تمہارا انتظار کر رہی تھی، احمد۔"

احمد کے چہرے پہ ستائش ابھری۔

"میں جانتی ہوں تم آج یہاں مجھ سے وہ راز اگلوانے آئے ہو۔ وہ راز جس نے اب تک تمہاری حفاظت کی تھی۔ وہ راز جو کہ تمہیں ہر سوال کا جواب دے گا۔ میں چاہتی تھی کہ تم آؤ اور وہ راز مجھ سے پوچھو۔ وہ راز بتانے کے لیے میں نے اپنے آپ کو اب تک زندہ رکھا تھا۔" اس کی آواز ہلکان سی ہو گئی تھی۔

احمد کے چہرے پر نرمی پھیلی۔ دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔

"اور میں پورے دل سے تمہیں وہ راز بتانا چاہوں گی، کیونکہ یہ راز میرا تم پر آخری وار ہو گا۔ اس وار کے بعد تمہاری روح پہ ایسا زخم لگ جائے گا جس کا مرہم تمہیں اپنی موت تک نہیں ملنے والا۔ اب سنو۔"

احمد کے چہرے پر پریشانی ابھری۔ اس کی پوری توجہ لیڈی اقتدار کی طرف تھی۔ لیڈی اقتدار بے جان سا مسکرائی۔ پل بھر کے لیے آنکھوں کی کمینگی لوٹ آئی۔

"تمہارا بھائی زندہ ہے، احمد!"

اور بس۔ احمد کو اپنی پوری دنیا چکراتے ہوئے محسوس ہوئی۔ وہ دم سادھے اس عورت کو دیکھتا رہ گیا۔ اس کے لیے پلک تک جھپکنا محال ہو گیا تھا۔ دل اچھل اچھل کر حلق تک آنے لگا تھا۔

"وہ میرے ساتھ کام کرتا ہے۔ اس کو میرے ساتھ کام کرتے ہوئے دس سال سے بھی زیادہ ہو چکے ہیں۔ تمہیں شاید ابھی یقین نہ آئے، لیکن جلد یقین آجائے گا۔ تم سمجھدار ہو۔ خود ہی سوچو، میں نے اتنے سال تمہیں زندہ کیوں رکھا؟ صرف تمہارے بھائی کی وجہ سے۔ فیروز مجھے بہت عزیز تھا۔ وہ دس سال تک میری خدمت کرتا رہا۔ اسے یوں تکلیف دینا میرے اصولوں کے خلاف تھا۔ تم تیز ہو، ہوشیار ہو۔ سارے ثبوت تمہارے سامنے ہیں۔ فیروز کو ڈھونڈ نکالو۔" اس نے اپنی بات مکمل کی۔

احمد بس آنکھوں میں اداسی لیے اسے دیکھتا رہا۔

ایک ایک کر کے جیسے سارے پزل پیس جگہ پر آنے لگے تھے۔ اسے اسی لیے نہیں مارا گیا تھا۔ اسی لیے ہی وہ اب تک بچا رہا تھا۔ اپنے بھائی کے کرم پہ۔ فیروز بھی اپنا نفس بیچ چکا تھا۔ احمد کے لیے جیسے سانسیں لینا محال ہو گیا تھا۔ یہ آخری وار واقعی بہت تکلیف دہ تھا۔ اس نے احمد کی روح پر زخم لگایا تھا۔ ایسا زخم جو کہ جلد بھرنے والا نہیں تھا۔ یا شاید بھرنے والا ہی نہ تھا۔

"مجھے اجازت دو۔ میرا کام پورا ہوا۔" وہ کھڑی ہوئی۔ اس سے کھڑا ابھی مشکل سے ہوا جاتا تھا۔

وہ لنگڑاتے ہوئے اس کمرے سے باہر نکلی، ششدر و دم بخود سے احمد کو پیچھے چھوڑ کر۔ چہرہ اب بھی بے تاثر تھا۔

وہ سپاہی عورت کے ساتھ واپس اپنے کمرے تک لوٹی۔

کمرے میں روشنی نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ میز کے برابر میں گئی اور دیوار سے ٹیک لگا کر فرش پر بیٹھ گئی۔ یک دم اس کی آنکھوں کے سامنے بہت کچھ لہرایا۔ بہت کچھ۔ بہت کچھ جو دل کو بے انتہا تکلیف بخشتا تھا۔

وہ گہری سانسیں لینے لگی۔ آنکھ سے آنسو ٹوٹے۔ اس کے سامنے اس کی پوری زندگی کسی فلم کی طرح چلنے لگی تھی۔

وہ کیسے اپنے باپ کے ساتھ انگلینڈ میں کھیلا کودا کرتی تھی۔

انہوں نے اسے لڑکوں کی طرح بڑا کیا۔ گھڑ سواری سکھائی۔ تیر کمان چلانا سکھایا۔ بچپن میں وہ بندوقوں کے سائے تلے کھیلا کرتی تھی۔ اسے اس ایمپائر کو آگے چلانے کے لیے بچپن سے تیار کیا گیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر کوئی اس ایمپائر کو قائم و دائم رکھ سکتا تھا تو وہ لویزا تھی۔ صرف اور صرف لویزا۔۔!

کوئی اس کے والد مراد ابراہیم سے کہتا تھا کہ آپ اسے کیسی تربیت دے رہے ہیں تو وہ فخر سے بتایا کرتے، "میں آنے والے وقتوں کے اقتدار کی پرورش کر رہا ہوں۔"

اقتدار، اس نے اقتدار کو اپنا عزم بنایا۔ اس نے اقتدار کو اپنا نام بنایا۔ اور وہ کہلانے لگی تھی "لیڈی اقتدار!"۔ لازوال طاقت رکھنے والی لیڈی اقتدار۔

اس نے اپنے بابا کے انسانوں کے کاروبار کو آگے بڑھایا۔ عافیت زندگی کا ہسپتال کھولا۔ اسے بھی وسیع و عریض بنایا۔ اپنے اچھے کاموں کے ڈھونگ سے عام عوام کے دلوں میں راج کیا۔ وہ اپنے میدان کی بہترین کھلاڑی تھی۔ اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔

کمرے کی دیواروں میں اب تک سارے منظر رواں تھے۔

وہ عافیت زندگی کے ہسپتال میں کسی ملکہ کی طرح گھوما کرتی تھی۔ اسے وہ چال یاد آئی۔ وہ اب چاہ کر بھی اس طرح نہیں چل سکتی تھی۔ وہ خاموش آنسو بہاتی گئی۔

اسے سب یاد آرہا تھا۔

اس کی خاص ٹیم۔ شمس' درانی' نیلوفر۔ اور ان تینوں سے پہلے بھی بہت لوگ تھے جو آئے اور گئے۔ اسے سب یاد آئے۔ وہ کیسے ان پر حکم صادر کرتی تھی۔ وہ اسے عزت سے نوازتے تھے۔ اسے تسلیم پیش کرتے تھے۔ رسوائی کا اس کی زندگی میں نام و نشان نہ تھا۔ وہ محلوں میں رہتی تھی' وہ اپنے آپ کو عزت افزائی کے قابل سمجھتی تھی۔

اسے سب یاد تھا۔ فقط یاد ہی تو تھا اسے۔

وہ دھاڑے مار مار کر روئی۔ آنسو تھے کہ رک ہی نہیں رہے تھے۔ اسے اپنا اقتدار یاد آیا۔ وہ اقتدار جس کو وہ چاہتی تو بھلائی کی خاطر استعمال کر سکتی تھی۔ طاقت صرف برائی کا زور بحال رکھنے کے لیے نہیں ہوتی۔ اگر وہ دوسری راہ چنتی تو شاید آج اس تکلیف میں مبتلا نہ ہوتی جس میں وہ آج مبتلا تھی۔ شاید واقعی وہ اتنی رسوائی نہ جھیلتی جتنی آج جھیل رہی تھی۔ وہ شاید ایک بہتر مقام پر ہوتی۔ شاید۔۔۔ مگر اب کیا فائدہ تھا؟ وہ تو سب کچھ ضائع کر چکی تھی۔

موت اس کے اختیار میں نہیں تھی۔ اگر ہوتی تو وہ یقیناخود کو ختم کر چکی ہوتی ٗبغیر کچھ سوچے سمجھے۔ کاش موت ہی اس کے اختیار میں ہوتی۔ اب درد اور تکلیف سے بھرپور زندگی گزارنی تھی، نہ جانے کب تک۔

یہ تھالیڈی اقتدار عرف لویزا کا انجام۔

رسوائی۔ ذلت۔ تنہائی۔ اندھیرے۔ تکلیف۔ دکھ۔ درد۔ رنج۔ سب اس کی زندگی میں کسی بلا کی طرح چمٹ گئے تھے۔ اسے اب اس بلا کے ساتھ ہی رہنا تھا۔ کوئی دوسرا راستہ باقی نہ تھا۔

☆☆☆

سنابل کا یہ وہی بوسیدہ سا ٹوٹا پھوٹا ہسپتال تھا اور یہ سنابل کا وہی ہشاش بشاش کمرہ تھا جس میں وہ کام کیا کرتا تھا۔ وہ مصروف سے انداز میں کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔

"وہ دونوں یعنی سیٹ ہیں۔" وہ سرسری سا بولا۔

"ٹھیک ہے۔ تمہارا بہت شکریہ۔" اس نے کہہ کے کال کاٹ دی۔

وہ دور سے ان کی پل پل کی خبر رکھا کرتا تھا۔ اس نے ایک نظر میز پر پڑے فریم کو دیکھا۔ آنکھیں ہر احساس سے عاری تھیں۔ جب انہیں دیکھ کر جی بھر گیا وہ کھڑا ہو گیا۔

وہ آفس سے باہر نکلا۔ ایک نرس اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ نرس کو کچھ ہدایات دینے لگا۔ نرس اس کی تمام ہدایات کو ذہن نشین کرتی گئی۔

☆☆☆

یہ تب کی بات ہے جب فیروز پچیس سال کا تھا۔۔۔

رات کا وقت۔ وہ تنہا، اپنے بستر پہ لیٹا ہوا تھا۔ وہ سونا تو چاہ رہا تھا لیکن نیند دسترس میں نہ تھی۔ سر پر منڈلاتے خوف اس کو گراں گزر رہے تھے۔ اس کی آنکھوں سے لگتا ہے جیسے وہ بہت تھک گیا ہو۔ وہ ہمت ہارنے لگا ہو۔ وہ جیسے اب مزید لڑنا نہیں چاہتا ہو۔

مگر وہ گھر کا بڑا مرد ٹھہرا تھا۔ گھر کے بڑے مرد لڑتے ہیں، تھک بھی جائیں تو کھڑے رہتے ہیں، ٹوٹ بھی جائیں تو رو نہیں سکتے۔ فیروز گھر کا سب سے بڑا مرد ہونے کی قیمت چکا رہا تھا۔

''کوئی راستہ نکال، اللہ۔ میرے دونوں بہن بھائی ابھی اپنے پیروں پر کھڑے نہیں ہوئے۔ بس کسی طرح سے میں ان دونوں کو اس مصیبت سے نکال لوں۔ مما بابا کے ایکسیڈنٹ کے بعد چیزیں بہت مشکل ہو گئی ہیں میرے اللہ۔ میری مدد کر۔'' اس وقت وہ اپنے رب کو نہیں بھولا تھا اس لیے زیر لب بڑبڑا کر اسے پکار رہا تھا۔ اس کی دعاؤں میں اس کا اپنا ذکر نہ ہونے کے برابر ہوتا تھا۔

زندگی کتنی مشکل ہو گئی تھی نا۔ وہ اگر کمزور ہوتا تو اب تک رو رو کر ہلکان ہو چکا ہوتا۔ اتنے شدید دباؤ کے باجود وہ اپنے اعصاب پر کیسے قابو کیے ہوئے تھا' یہ صرف وہی جانتا تھا۔

وہ اس قدر تھکا ہوا تھا، کہ خوف و پریشانی کے باوجود آنکھیں بند کیں تو فوراً سو گیا۔

وہ اتنی گہری نیند سویا کہ پتا بھی نہ چلا اور صبح ہو گئی۔ اس کی آنکھ فون پر رنگ سے کھلی۔ اس کا دماغ بوجھل تھا۔ سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ کافی دنوں سے نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے اس کی آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے تھے۔ اس کا چہرہ سوکھ چکا تھا۔

نظام صاحب کالنگ۔ یہ نام پڑھتے ہی اس کی نیند اڑ گئی۔ چہرے پر خوف و پریشانی در آئی۔ اس نے تھک ہار کر کال اٹھالی۔ خود کو ذلت کے لیے تیار کیا۔ مگر ذلت و رسوائی کے لیے تیار ہونے باوجود، تکلیف میں کمی یقینی نہیں ہوتی۔

"جی نظام صاحب۔" اس کی آواز میں واضح گھبراہٹ تھی۔

"فیروز مجھے انتظار کرتے پانچ مہینے ہوگئے ہیں۔ لیکن، مجھے میرے پیسے اب تک نہیں ملے۔ تم نے کیا سمجھ رکھا ہے اس سب کو؟ تمہارے ماں باپ کو بھی اسی وقت مرنا تھا۔" کڑوے سے انداز میں نظام بولا۔ فیروز کے دل پہ کانٹے چبھے۔ وہ کب تک دنیا کی کڑواہٹ کو یوں ہی اکیلے جھیلتا رہے گا؟ آخر کب تک؟

"نظامی صاحب میں کوشش کر رہا ہوں۔" وہ رندھے ہوئے سے انداز میں بولا۔

"مجھے نہیں پتا۔ میری رقم واپس کرو، ایک ہفتے میں۔ ورنہ میں نے زبردستی کرنے پر آجانا ہے ،فیروز۔" نظام کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔

"ایک ہفتے میں بھلا کیسے نظام صاحب؟ میں کیسے کروں گا یہ سب۔" اس کے سر پر تناؤ بڑھنے لگا۔

"اپنا گھر گروی رکھوا لو یا اپنے آپ کو۔ مگر مجھے میرے پیسے ہر صورت چاہییں۔" بے حس نظام کال کاٹ چکا تھا۔

فیروز نے کرب کے مارے آنکھیں میچیں۔

گھر کا بڑا ہونا آسان نہ تھا۔

فیروز ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ سب کچھ ہر گزرتے وقت کے ساتھ خراب ہوتے جا رہا تھا۔ قرضے پر قرضہ پہلے سے تھا اور اب دھمکیوں کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا۔

اس کے موبائل پر ایک اور رنگ بجی۔ مبشر کالنگ۔ اس نے تنگ آکر موبائل بند کیا۔

وہ اپنے کمرے سے نکل کر کچن تک پہنچا۔ فریج کے اندر صرف دو انڈے تھے۔ اگر وہ ایک انڈا کھا لیتا تو اس کے بہن یا بھائی میں سے کوئی ایک بھوکا رہ جاتا۔ وہ فریج کا دروازہ بند کیے ہسپتال جانے کی تیاری کرنے لگا۔

ہسپتال جاتے ہوئے اسے ایک نیا خوف ستانے لگا؛ کیا اب فاقوں کا وقت بھی آ پہنچا تھا؟



حالیہ فیروز، نرس کو ہدایات دے کر اپنے کمرے میں لوٹا۔ ڈیسک کے سرہانے کھڑے ہو کر، اس نے نوٹ بک سے ایک پیج پھاڑا اور قلم کی مدد سے کچھ لکھا۔ چہرہ پر اطمینان تھا۔

اس کی ڈیسک پر لاکر رکھا تھا جس کے اندر کچھ تصویریں تھیں۔ اس نے وہ پیج اس لاکر میں ڈالا۔ فرش پر تیار شدہ سوٹ کیس دھرا ہوا تھا۔ وہ لاکر پر تالہ لگا رہا تھا، جب نرس داخل ہوئی۔

"تم سمجھ گئی ہو نا، تمہیں کیا کرنا ہے؟" فیروز نے لاکر بند کرتے ہوئے مصروف سے انداز میں پوچھا۔ نرس نے سر اثبات میں ہلایا۔

فیروز نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی اور نرس کو تھما دی۔ نرس نے نوٹوں کی وہ گڈی اپنے دوپٹے میں چھپالی۔ چہرہ یک دم کھل اٹھا تھا۔

"باقی کام کے بعد۔" اپنا سوٹ کیس ہاتھ میں تھامے وہ ہسپتال سے جانے لگا۔

باہر سیویک اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ سیویک پر سوار ہوا اور ہسپتال سے دور جانے لگا۔ اسے اگلی منزل تک پہنچنا تھا۔



پچیس سالہ فیروز عافیت زندگی کے ہسپتال میں اپنے کام میں مصروف تھا۔ یک دم اسے قرضے کی فکر ستانے لگی۔ فیروز نے آخر کار کچھ کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اس زمانے کے عافیت زندگی کے مینجر کے کمرے میں پہنچا۔ کمرے میں لیڈی اقتدار اور ارشد بیٹھے تھے۔

"تم بعد میں آنا، فیروز۔ ابھی ہم مصروف ہیں۔" فیروز کے آتے ہی ارشد صاحب بولے۔

فیروز کے چہرے پر مایوسی چھانے لگی۔ وہ سست سے بجھے انداز میں باہر کی طرف جانے لگا۔ لیڈی اقتدار کو پچیس سالہ فیروز کی آنکھوں میں ایک چمک نظر آئی۔ زندگی کا طویل مشاہدہ کہتا تھا کہ وہ شخص ذہین ہے۔ اور اس کی ذہانت ضائع نہیں جانی چاہیے۔

"ایک منٹ 'رکو۔ تم بتاؤ۔ کیا بات کرنے آئے ہو۔" وہ اس وقت قدرے جوان لگ رہی تھی، لیکن صحبت ویسی ہی تھی' ملکہ جیسی رعبدار۔

فیروز ایک دفعہ پھر سے مڑا۔ گردن جھکی تھی۔ چہرے پر شرمندگی تھی۔

"کچھ لون چاہیے تھا، سر۔" آواز کپکپائی۔ بس ایک تیر تھا جو وہ چلانا چاہ رہا تھا۔ دل ہی دل میں وہ یہی اخذ کر چکا تھا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

''کتنے کا، بتاؤ؟''لیڈی اقتدار بولی۔

فیروز کی گردن مزید جھکی۔ اس کی کسی سے آنکھیں ملانے کی ہمت نہ ہوئی۔

''تیس لاکھ۔'' جہاں ارشد کا منہ کھلا رہ گیا وہاں لیڈی اقتدار کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

''مل جائے گا۔ اپنی گردن اٹھاؤ اور مجھے دیکھو۔''لیڈی اقتدار حکم جاری کرنے والے انداز میں کہا۔ فیروز کی گردن اٹھی۔ اسے یقین نہ آیا یہ سب اتنا آسان تھا۔

''مگر کوئی چیز آسانی سے نہیں ملتی۔ تمہیں میں طاقتور بنا سکتی ہوں۔ تمہارے پاس دولت کا ڈھیر ہو گا۔ طاقت ہو گی۔ کیا میرے لیے کام کرنا پسند کرو گے؟''

بوڑھا ارشد لیڈی اقتدار کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ فیروز کے دل میں اس وقت ایک عجیب سا احساس جاگا۔

''کیسا کام؟'' وہ نا سمجھی سے بولا۔

''کوئی اچھا کام بھلا اتنی بڑی رقم فوراً دے سکتا ہے؟ نہیں! آگے تم خود بھی سمجھدار لگتے ہو۔ خود سمجھ جاؤ۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

فیروز کو گڑبڑ کا احساس ہوا۔

''میں کچھ غلط نہیں کر سکتا۔''اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

''مرضی۔ انسان کو یہی لگتا ہے کہ وہ کچھ غلط نہیں کر سکتا۔ مگر وہ کرتا بھی ہیں، اور اس غلط کو پورے دل سے اپناتا بھی ہیں۔ میری آفر آنے والے وقتوں کے لیے قائم رہے گی۔''

اس نے اس وقت فیصلہ کیا تھا کہ وہ کچھ الٹا سیدھا نہیں کرے گا۔ مگر فاقوں کا خوف اگلے دن اسے لیڈی اقتدار کے قدموں میں لے آیا تھا۔

برائی کو جھٹکنا آسان نہیں ہوتا، یہ مضبوط سے مضبوط انسان کو بھی اپنے گھیرے میں لے سکتی ہے۔ اسی لیے تو اللہ نے قرآن میں شیطان کو انسان کا کھلا دشمن قرار دیا ہے۔



وہ گاڑی سست رفتار سے چلا رہا تھا۔ راستے میں ایک نرسری نظر آئی۔ وہ نرسری کے پاس رک گیا۔

وہاں ڈھیر سارے پھول پودے تھے۔ نرسری سے اس نے دو گلاب کے خوبصورت اور خوشبودار پودے لیے' ایک سرخ گلاب اور ایک سفید گلاب۔ گلاب جو کہ اس کی بہن کا پسندیدہ پھول تھا۔

گلاب کے پودے اس نے اپنی گاڑی میں رکھے۔ وہ پرانے علاقے کی جانب گاڑی بھگا رہا تھا۔ گاڑی سابقہ گھر کے باہر روکی۔ چہرے پر ماسک چڑھایا اور آنکھوں میں سیاہ چشمہ۔ دو گلاب کے پودے اس نے اپنے گھر کے باہر رکھے اور تیزی سے گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے جانے لگا۔

اب وہ اپنی اگلی منزل کی طرف رواں تھا۔۔۔ نیلوفر کا قصر۔

وہ نیلوفر کے قصر میں کچھ دیر میں ہی پہنچ گیا تھا۔ نیلوفر کے قصر کے سبزہ زار پر ڈھیر سارے کارڈ بورڈ باکس رکھے ہوئے تھے۔ فرنیچر سارا کا سارا سبزہ زار میں موجود تھا۔ یہ سب دیکھ کر اس کے چہرے پر ستائش ابھری۔

اس نے گاڑی سے اتر کر نیلوفر کو کال ملائی۔ نیلوفر نے کچھ ہی دیر میں کال اٹھالی۔

”کیوں کال کی، مسٹر درانی؟“

”کہیں جا رہی ہو؟“ وہ شک آمیز سے انداز میں بولا۔

”ہاں مسٹر درانی۔“ نیلوفر نے تھکی ہوئی سانس خارج کی۔”میں اپنا قصر اور اپنا سارا سامان بیچ چکی ہوں۔ میں سب کچھ ختم کر کے خود کو گرفتار کروانے والی ہوں۔“ نیلوفر غمگین سے لہجے میں بولی۔

”میں تمہارے قصر کے باہر ہوں۔ کیا ہم مل سکتے ہیں؟“ فیروز نے پوچھا۔

”ہاں ضرور۔ اندر آجائیں۔“ نیلوفر جواباً بولی۔

فیروز سبزہ زار پار کر کے قصر کی عمارت میں داخل ہوا۔ اس کے انداز سے لگتا تھا جیسے وہ پہلے بھی یہاں آچکا تھا۔ نیلوفر لاؤنج میں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ نیلوفر کو دیکھتے ہی طنزیہ سا مسکرایا۔

”تم اب اچھی بن گئی ہو تو کیا مجھے بھی لیکچر دو گی اچھائی کے؟“ فیروز نے کڑوے سے انداز میں کہا ۔نیلوفر زیرلب ہنس دی۔

”نہیں۔“ وہ دونوں ہم قدم تھے۔”میں آپ کو کوئی لیکچر نہیں دینے والی۔ آپ کی مرضی ہے۔ نہ ہی میں آپ کو پکڑواؤں گی۔ میں جان گئی ہوں کہ طاقت کا زور ایک نہ ایک دن ٹوٹ ہی جاتا ہے۔“

دونوں آمنے سامنے صوفوں پر براجمان ہوئے۔ باقی لاؤنج خالی پڑا تھا۔ چھت سے پنکھے تک اتارے جا چکے تھے۔

”تمہیں یاد نہیں آتیں وہ آسائشیں، نیلوفر؟“ فیروز نے متعجب ہو کر پوچھا۔”میں تو اس سب کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“ اس نے خالی لاؤنج میں نظر دوڑاتے ہوئے شانے اچکائے۔

"سچ بولوں تو۔" نیلوفر کی آنکھوں میں نمی در آئی۔ "آئی مس اِٹ آلاٹ!"

وہ چہرے پر اداس مسکراہٹ سجائے بولی۔ فیروز نے افسوس سے سر جھٹکا۔

"مجھے ابھی سے ہی یہ سب بہت یاد آرہا ہے، مسٹر درانی۔ یہ بیگز، یہ کپڑے، یہ بڑا سا گھر، یہ آسائشیں اور آرام۔ یہ اب میری زندگی کا حصہ نہیں رہنے والا ہے۔" نیلوفر کی آنکھ سے آنسو بے اختیار نکلا۔

"واپس آجاؤ، میں تمہیں یہاں ایک آخری آفر دینے آیا ہوں۔ اپنی پرانی زندگی میں واپس آجاؤ۔ دفع کرو اچھائی کو۔ اس میں کچھ نہیں رکھا ہے۔" فیروز آواز دھیمی کیے بولا۔

نیلوفر تیزی سے گردن نفی میں ہلانے لگی۔

"نہیں۔ آپ نے چھ سال پہلے مجھے قائل کیا تھا۔ اب نہیں کر سکیں گے۔ میں اب اپنے نفس کے اوپر ظلم نہیں کر سکتی۔ ہاں میرا نفس ان سب آسائشوں کی خواہش کرتا ہے، لیکن میری روح پر سکون ہے۔ وہ خوش ہے۔ میں اپنی روح کے لیے، اپنے رب کے لیے، یہ سب نہیں چھوڑوں گی۔" وہ اداس سا مسکرائی۔

درانی نے لب دباتے سر نفی میں ہلایا۔ چہرے پر مایوسی پھیلی۔

"تم ایک ہیرا تھی۔ ایک جیم۔ تمہاری شخصیت میں رعب تھا، تم سے سب ڈرتے تھے۔ تم نے جتنے سال ہسپتال میں گزارے تھے، وہ سال ہمارے لیے بہترین ثابت ہوئے۔ تم میرے لیے بہت منافع بخش ثابت ہو سکتی تھی۔ کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟" فیروز آواز میں افسوس لیے بولا۔

نیلوفر کے دل کو اس وقت کچھ ہوا تھا۔ دل سے ایک آواز ضرور آئی تھی کہ ان آسائشوں کے بغیر تم نہیں رہ سکتی۔ لیکن آج جو اس کے پاس تھا اس سے پہلے وہ اس کے پاس کبھی نہ تھا۔ اس کے پاس اس کا رب تھا۔ وہ اپنے رب کی قربت کا مزہ چکھ چکی تھی۔

اس کے دل میں توانائی سی بھر گئی۔ اس کے اندر انکار کرنے کی ہمت آگئی تھی۔

''ہاں یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔'' وہ اٹل سے انداز میں بولی۔

فیروز مایوسی سی گردن نفی میں ہلاتے کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے کوٹ کا پٹ درست کیا۔

''تمہارے ساتھ وقت بہت اچھا گزرا تھا، نیلوفر۔'' وہ آگے بڑھ کر مسکرایا۔

نیلوفر بھی کھڑی ہوئی۔ فیروز نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ نیلوفر اس سے ہاتھ ملانے لگی۔

اسی وقت فیروز کا بائیاں ہاتھ اس کی جیب میں گیا۔ اس نے ایک باریک اسکریوڈرائیور اپنی جیب سے تیزی سے نکالا اور نیلوفر کی گردن پر وار کیا۔

وار نہایت غیر متوقع تھا۔ نیلوفر ششدر رہ گئی۔

تکلیف کی شدت سے اس کی آنکھیں پھیلیں۔ جسم لرزنے لگا۔ وجود آہستہ آہستہ ڈگمگایا۔ اسے جیسے یقین نہیں آیا تھا۔ فیروز مدھم سا مسکرایا۔ نیلوفر بس اسے دیکھتی رہی۔ اس کا جسم جواب دینے لگا۔ وہ گھٹنوں کے بل زمین پر گر گئی۔ خون اس کی گردن کی سمت سے بہے جا رہا تھا۔

''اگر تم مان جاتی تو تم بچ جاتی۔ لیکن اب صرف تم ہی اس ملک میں وہ واحد انسان ہو جو کہ میرے راز سے واقف ہے۔ میں تمہیں یوں زندہ نہیں چھوڑ سکتا تھا۔'' وہ مسکراتے ہوئے گویا ہوا۔

نیلوفر تکلیف سے بلک رہی تھی۔ اس کے منہ سے خون نکلنے لگا تھا۔ وہ زمین پہ ڈھیر ہو گئی تھی۔ وجود اب بھی تڑپ رہا تھا۔

"لیکن مجھے شرمندگی نہیں ہے۔ اتنا ہی پیار ہے نا اپنے رب سے تو جاؤ اس کے پاس۔" وہ نخوت سے بولا۔ اس کے چہرے سے خباثت ٹپک رہی تھی۔

نیلوفر کے جسم میں تکلیف کی زوردار لہریں ابھریں۔ وہ بلکنے لگی' تڑپنے لگی۔ یکدم اس کی آنکھوں میں خوف سا آیا۔ اس نے ایک ہچکی لی اور گہری سانس خارج کی۔ اس کا جسم ساکن ہوا۔ جسم نے حرکت کرنا بند کر دی۔ ساری تکلیف ختم ہو گئی تھی۔

نیلوفر کو رب مل چکا تھا۔ وہ اس رب کے پاس پہنچ گئی تھی۔

فیروز کے چہرے پر کڑواہٹ ابھری۔ نیلوفر کی لاش کو چھوڑ کر وہ قصر سے چلا گیا۔

وہ گاڑی پر سوار ہوا۔ اس کی اگلی منزل اسلام آباد انٹرنیشنل ایئرپورٹ تھی۔

☆☆☆

وہ اس وقت بتیس سال کا تھا۔

اس وقت تک عافیت زندگی کے مینجر کا عہدہ سنبھالنے لگا تھا۔

لیڈی اقتدار فیروز کے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ اس وقت کسی گہری سوچ میں نظر آ رہی تھی۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے۔

"میں کچھ سوچ رہی ہوں درانی۔"

فیروز نے لیڈی اقتدار پہ نظر ڈالی۔ اس کا چہرہ بالکل بجھا ہوا تھا۔ وہ قدرے بے چین سا نظر آرہا تھا۔

"ہاں بولیے۔" فیروز لاتعلق سے انداز میں بولا۔

"نیلوفر کو عافیت زندگی کا مینیجر بنانے کا سوچ رہی ہوں۔ وہ بہت ذہین ہے۔ اس کی ذہانت ضائع نہیں ہونی چاہیے۔ اور تم ہمارے خفیہ ہسپتال 'سنابل کو سنبھالو گے۔ اور وہاں پر تم ساری ڈیلنگز کیا کرو گے۔" وہ کسی گہری سوچ میں بولی۔

"جیسے آپ کو بہتر لگے۔" فیروز نے تھکے ہوئے سے انداز میں جواب دیا۔

لیڈی اقتدار فیروز کا بوجھل پن بھانپ کر تشویش میں مبتلا ہوئی۔

"کوئی مسئلہ ہے فیروز؟ تم مجھے بتا سکتے ہو۔"

فیروز نے ایک تھکی ہوئی سانس خارج کی۔

"میں تنگ آگیا ہوں۔ احمد اور درے اپنی زندگیوں میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ وہ اچھے سے اچھا کام کر رہے ہیں اور میں؟ میں بھلا کیا کر رہا ہوں۔ میں آج کل ان سے نظریں نہیں ملا پا رہا ہوں، لیڈی۔ بہت عجیب سا لگ رہا ہے مجھے۔ ایسا نہیں ہے میں اس دنیا کو چھوڑنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس دنیا سے محبت ہو گئی ہے۔ مجھے طاقت سے محبت ہو گئی ہے۔ مجھے اس کام سے محبت ہو گئی ہے۔ مگر پھر بھی زندگی میں کچھ خلش سی ہے، لیڈی۔ میں اس سب کے بعد پہلے جیسا کام نہیں کر پا رہا ہوں۔ میں آخر کیا کروں؟" اس نے اپنی مالکن کو ایک جھٹکے میں سب بتایا۔

لیڈی نے سوچ کر سر اثبات میں ہلایا۔

''اگر وہ لوگ اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے ہیں تو تم انہیں چھوڑ سکتے ہو۔ بس اپنے دھندے پر دھیان دو۔ ملک سے ملک سیر کرو۔ طاقت حاصل کرو۔ دولت کماؤ۔'' وہ ہاتھ ہلا کر تجویز دینے لگی۔

''میں انہیں ایسے ہی کیسے چھوڑ دوں؟'' فیروز کو عجب ہوا۔

لیڈی اقتدار کے چہرے پہ شیطانی مسکراہٹ در آتی ہے۔

''مشکل نہیں ہے۔ سب ہو جاتا ہے۔ تم ان کو چھوڑ کر زیادہ پر سکون رہو گے۔ اگر چاہو تو میں تمہارے سارے انتظامات کروا سکتی ہوں۔'' لیڈی اقتدار نے آفر دے کر شانے اچکا دیں۔

''کیا کریں گی آپ؟'' فیروز نے دلچسپی ظاہر کی۔

لیڈی اقتدار اسے سب کچھ بتانے لگی۔

فیروز کی گمشدگی کے کھیل کا بیج یہاں پر بو دیا گیا تھا۔

☆☆☆

فیروز نے اپنی گاڑی ایئرپورٹ کے باہر روکی۔ اس کے سر پر کالی ہیٹ تھی جو کہ ترچھی کر کے اس نے پہنی ہوئی تھی۔ اس نے ریسیپشن کی طرف قدم بڑھائے۔ چہرہ بلا تاثر تھا۔

''میں نے ایک ٹکٹ بک کروائی تھی' آن لائن۔ مجھے وہ دے دیجیے۔'' فیروز نے سرگوشیانہ انداز اختیار کیا۔

”اپنا شناختی کارڈ دیجیے، سر۔“

فیروز نے جیب سے اپنا والٹ نکالا اور شناختی کارڈ ریسیپشنسٹ کو تھمایا۔ ریسیپشنسٹ نے شناختی کارڈ کو بغور دیکھا۔ پھر وہ کمپیوٹر پر تیزی سے کچھ ٹائپ کرنے لگی تھی۔

”التمش سر، آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

فیروز۔ جو آج سے التمش بن گیا تھا۔ وہ فیروز سے جڑی تمام یادوں کو مسخ کیے نئی زندگی شروع کرنا چاہتا تھا۔

”سری لنکا!“ اس نے شاطر سا مسکرا کر جواب دیا۔

ایک نئی شروعات۔

ایک نئی زندگی۔

اس کی منتظر تھی۔

☆☆☆

دو دن بعد۔۔۔

احمد اس وقت اپنے کمرے میں اپنے بستر پہ سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ لیڈی اقتدار سے ایک ہفتے پہلے کی ملاقات کے بعد نہ وہ ٹھیک سے کھانا کھا پا رہا تھا نہ ہی کوئی کام کر پا رہا تھا۔ اندر ہی اندر وہ بہت ڈسٹرب سا تھا۔ زندگی کا سب سے بڑا سچ عیاں ہو جانے پہ دل جیسے بکھر گیا تھا۔ دل یقین کرنا نہیں چاہتا تھا کہ وہ سب سچ ہے۔ اس کا بھائی، جو بچپن سے اس کا رول ماڈل رہا وہ یہ سب بھی کر سکتا تھا۔

وہ درے سے بھی ٹھیک سے بات نہیں کر پاتا تھا۔بظاہر اپنے آپ کو وہ جتنا بھی پر سکون ظاہر کر لیتا لیکن اندر سے وہ بے حد بے قرار تھا۔

اس وقت گھر کی گھنٹی بجی تھی۔ احمد اپنے کمرے میں ہی بیٹھا رہا۔ آنکھیں خالی سی تھیں اور اندر سے بھی وہ اپنے آپ کو کھوکھلا محسوس کر رہا تھا۔جب بھی وہ اپنے بھائی کا سوچتا دنیا سے الگ تکلیف اس کے دل کو چیرتی۔وہ کچھ دیر آنکھیں بند کر کے لیٹا رہا۔

تب ہی اسے آوازیں آئیں۔ درے کے کچھ اونچا کہنے کی۔ اس کے تیز تیز قدموں کی۔ اس نے متجسس ہو کر اپنی آنکھیں کھولیں۔

کچھ دیر میں درے حواس باختہ سے عالم میں اوپر دوڑ کر آئی۔ احمد اس کا یہ عالم دیکھتے ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے بھنویں سکیڑیں۔ چہرے پر پریشانی لیے درے کو دیکھا جو کہ گہری گہری سانسیں لے رہی تھیں۔ آنکھیں اس کی بھیگی ہوئی تھیں۔

درے کے ہاتھ میں ایک خط تھا۔

”یہ سب کیا ہے احمد؟“ وہ گہری سانسیں لیتے بولی تھی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے رواں تھے۔
درے نے وہ خط احمد کی جانب بڑھایا۔ احمد نے کپکپاتے ہاتھوں سے وہ خط اپنے ہاتھوں میں تھاما۔ دل ہی دل میں وہ جانتا تھا وہ خط کس کا تھا۔

”احمد اور درے،

میں سنابل ہسپتال میں تم دونوں کا منتظر ہوں۔ مجھ سے ملنے آؤ۔

فیروز یوسف درانی"

احمد ہاتھ میں خط لیے کسی بت کی طرح اپنی جگہ پر منجمد رہا۔ درے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتی گئی۔

"یہ سب کیا ہے احمد؟ کچھ تو بتاؤ؟" درے زور دے کر بولی۔ احمد چونکا۔ اس نے بے بسی کے مارے آنکھیں میچیں۔ یہ راز خود تک محدود رکھا نہیں جا سکتا تھا۔ وہ اس راز کا بوجھ اکیلے قطعاً نہیں اٹھا سکتا تھا اسی لیے اس نے درے کو سب کچھ بتانے کا فیصلہ کیا۔

"بھائی زندہ ہیں، درے!" احمد بولا۔ درے سکتے میں آگئی۔ اس کی سانس اس کے حلق میں اٹکی۔ گردن نفی میں ہلاتے ہوئے اس نے دو قدم پیچھے بڑھائے۔

"کیا بات کر رہے ہو، احمد؟" آنسو درے کی آنکھوں سے روانہ ہوئے۔ احمد اپنے بستر سے اٹھا۔

"میرے ساتھ چلو۔ سب بتاتا ہوں۔" اس نے غسل خانے کا رُخ کیا۔

☆☆☆

گاڑی کی فضا میں ہر سو ہر دم سوگواریت پھیلی ہوئی تھی۔

خاموشی دونوں کے درمیان حائل تھی۔ سچ سننے کے بعد وہ کچھ بھی نہ بولی نہ ہی احمد نے کوئی بات کی۔ وہ دونوں سب کچھ جان گئے تھے۔ ضرورت سے زیادہ ہی۔ وہ اپنی زندگی کے سب سے بڑے سچ کو جان گئے تھے۔ لیکن صرف سچ کا جان لینا کافی تھا؟

اتنے سالوں سے درے جس بھائی کے زندہ ہونے کی دعائیں کرتی تھی۔ رورو کر، گڑگڑا گڑگڑا کر۔ آج وہ دل سے تمنا کر رہی تھی کہ کاش وہ مردہ ہی ہو۔ کاش وہ تین سال پہلے ہی مر گیا ہوتا۔

احمد نے گاڑی سنابل کی بوسیدہ عمارت کے باہر روکی۔ وہ دونوں سست قدم بڑھاتے ہسپتال کی راہداری میں چلنے لگے۔ ایک نرس ان کی طرف لپکی۔ اس نے چابی احمد کی طرف بڑھائی۔

"یہ لیں۔ اور ادھر چلے جائیں۔" نرس نے فیروز کے آفس کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

احمد اور درے نے ایک دوسرے کے اوپر تاسف بھری نگاہیں ڈالیں۔ دونوں کے دل زور سے دھڑک رہے تھے۔

قدم کمرے کی طرف اٹھ رہے تھے۔ آخر اس دروازے کے پار کون سا منظر ان کا منتظر تھا؟ کونسا نیا انکشاف ان کی تاک لگائے بیٹھا تھا؟ کیا فیروز ان کو ادھر ملنے والا تھا؟ وہ اس سے مل کر کیا کریں گے بھلا؟ ان ہی سوچوں میں گم صم یہ مختصر سا سفر طے ہوا۔

سنابل کے اس میلے فرش پر چلنا کانٹوں پر چلنے جیسا معلوم ہو رہا تھا۔

کمرے کا دروازہ مخصوص آواز کے ساتھ کھلا۔ کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ اگر فیروز وہاں نہیں تھا تو انہیں ادھر کیوں بلایا تھا؟ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔

ڈیسک پر ایک لاکر رکھا تھا۔ احمد نے اس لاکر میں چابی گھسائی اور اسے کھولا۔ اس لاکر کے اندر ان دونوں کو اب وہ سب نظر آیا۔

ادھر تصویریں تھی۔ بہت ساری۔ فیروز اور ان سب کی۔ کچھ میں وہ چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ خوش باش۔ کچھ میں بالغ۔ ایک میں درے فشاں اپنے گریجویشن گاؤن میں تھی۔ وہ صرف تصویریں نہیں تھی بلکہ ان کی زندگی کا ایک مخصوص حصہ تھا جو کہ اس لاکر میں قید تھا۔ فیروز ساری یادیں اس لاکر میں قید کر کے جا چکا تھا۔ احمد کی نظر اس خط پر پڑھی جو فیروز نے ان دونوں کے لیے چھوڑا تھا۔ احمد نے وہ خط در فشاں کو تھمایا۔

"اونچا پڑھنا۔" احمد بولا۔

درے نے سر کو جنبش دے کر وہ خط پڑھنا شروع کیا۔

"احمد اور درے۔

میں فیروز۔ تم دونوں کا بھائی۔ مجھے نہیں پتا کہ تم لوگ میری حقیقت سے واقف ہو یا نہیں۔ بہر حال میں خود ہی بتا دیتا ہوں۔ میں کبھی نہیں مرا تھا۔ میں تم لوگوں کی زندگیوں سے دور جانا چاہتا تھا کیونکہ میں ایک مجرم تھا۔ تم دونوں کی موجودگی میں میرا دم گھٹتا تھا۔ میں اپنے آپ سے نفرت کرنے لگا تھا۔ اپنا آپ تم دونوں کے سامنے بہت چھوٹا سا لگتا تھا۔ اسی لیے میں تم دونوں کو چھوڑ کر چلا گیا۔

یہ سب قرضوں سے شروع ہوا تھا۔ معاشرے سے موصول ہوتی طعن و تشنیع سے شروع ہوا تھا۔ لوگوں کے تلخ رویوں سے شروع ہوا تھا۔ اور ان ہی کی کڑوی باتوں سے شروع ہوا تھا۔ فاقوں کے خوف سے شروع ہوا تھا۔ مالی تنگی کے ڈر سے شروع ہوا تھا۔ اس سب نے مجھے یہ راستہ اختیار کرنے پر مجبور کیا جس کا میں آج تک مسافر ہوں۔ میں کوئی جسٹی فکیشن نہیں دوں گا۔ میں غلط تھا۔ غلط تو غلط ہی سہی۔ مگر اب میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا۔

اتنے سال تم سب لوگوں سے دور رہنے کے باوجود بھی تم لوگوں کو چھوڑ نہ سکا۔ میں ہمیشہ تم دونوں کے ساتھ تھا۔ تم دونوں پر نظر رکھواتا تھا۔ ایک دفعہ درے کے ہسپتال میں دو لڑکوں نے اسے ہراساں کیا تھا تو میں نے ان کا بھی علاج کر دیا تھا۔ میں ہر پل تم دونوں کے ساتھ تھا۔ ان تصویروں کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ جب یاد آتے تو ان تصویروں کو دیکھا کرتا تھا اور اپنا یہ دل بہلایا کرتا تھا۔ کیا کرتا، میرے بہن بھائی تھے، بچوں کی طرح عزیز تھے، یاد تو آتے تھے ناں!

مگر اب میں پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا چاہتا۔ میں واقعی تم دونوں کی زندگیوں سے چلا جانا چاہتا ہوں۔ میں ان تمام یادوں کو بھلا دینا چاہتا ہوں۔ اسی لیے میں ان تصویروں اور ان سے منسلک تمام یادوں کو چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ سری لنکا۔ اپنی کمائی دولت کے ساتھ۔ وہی کام کرنے جو ادھر کرتا تھا۔ میں اب اس کام کے علاوہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ مرتے دم تک یہ میرے مقدر میں لکھ دیا گیا ہے۔

اب تمہارا بھائی واقعی مر چکا ہے، احمد اور درے۔ اب میں واقعی تم دونوں کے لیے مر چکا ہوں۔ تم دونوں سے کوسوں دور ہوں۔ اب تمہارے خیال مجھے پریشان نہیں کریں گے۔ اور میں نہیں چاہتا کہ میرا خیال تم دونوں کو پریشان کرے۔ یہ سمجھ لو جیسے میں تم دونوں کی زندگیوں میں کبھی تھا ہی نہیں۔ فیروز مر چکا ہے۔ جان لو یہ بات۔

ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔ اگر نہیں بھی، تو بھلا یہ چیزیں کون سا معنی رکھتی ہیں؟"

آنسو اس کے گال کی حد پار کر کے اس خط پر ٹپک رہے تھے۔ احمد ششدر سا کھڑا، سن دماغی کے عالم میں درے کے ان لڑکھڑاتے لفظوں کو سنتا رہا۔ دونوں کے دلوں میں چبھن سی ہو رہی تھی۔ تکلیف

سی ہو رہی تھی۔ بے قراری اور بے چینی دونوں کے دلوں پہ سوار تھی۔ اس کمرے میں دم بخود سے ہو کر وہ ایک دوسرے کو دیکھتے گئے۔

غم اور رنج ان سے چمٹ چکا تھا۔ شدت بھری تکلیف دونوں کی روح پر سوار تھی۔

اور جس تکلیف میں دونوں مبتلا تھے' اس تکلیف سے وہ جلد نکلنے والے نہ تھے۔

دونوں کے لیے زندگی اب پہلے جیسی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

چھ مہینے بعد:

بہار کا موسم آ چکا تھا۔ آسمان پر بادل پھیلے ہوئے تھے جو کہ اسلام آباد کی سورج کی پر تپش کرنوں سے حفاظت کر رہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اسلام آباد کے احاطے پہ سوار تھے۔ پیڑ، پودے، پتے، چرند پرند، سب ہی اس خوشگوار موسم سے محظوظ ہو رہے تھے۔ رات بھر بارش کی وجہ سے مٹی گیلی تھی اور گیلی مٹی کی مہک سارے ماحول میں پھیلی ہوئی تھی۔

گیلی مٹی کی یہ خوشگوار سی مہک ان تینوں کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ عنایا، مہر اور شمائلہ۔ مہر شمائلہ کی وہیل چیئر گھسیٹ رہی تھی۔ وہ کافی تر و تازہ اور خوشحال نظر آ رہی تھیں۔ ان کے چہرے پہ رونق تھی۔ بیٹی کے سالوں بعد مل جانے سے وہ مکمل ہو گئی تھیں۔ ان کی ساری محرومیاں ساری تکلیفیں ان کی زندگی سے جا چکی تھیں۔

وہ تینوں قبرستان میں اپنا راستہ بنا رہے تھے۔ جلد ہی وہ اس قبر کے پاس پہنچ گئے۔ نیلوفر کاشف کی قبر کے پاس۔ شمائلہ نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی اور پھر سورہ فاتحہ کی تلاوت کی۔ وہ اب تک نیلوفر کو نہیں بھولی تھیں۔ انہوں نے اسے تڑپتے دیکھا تھا، اسے اپنے نفس سے جنگ لڑتے دیکھا تھا۔ وہ ان کے لیے بہت خاص تھی۔ ان کے دل میں اس کے لیے بے پناہ عزت واحترام تھا۔

"میری اللہ سے یہی دعا ہے کہ اللہ ان کو جنت نصیب کرے۔ ان کے سارے گناہ معاف کر دے۔" شمائلہ نے دل سے دعا کی۔

"آمین۔" مہر نے کہا۔ عنایا نے بھی اپنی ماں کی دیکھا دیکھی آمین کہہ دیا۔ عنایا کو یوں کرتے دیکھ کے شمائلہ اور مہر ہنس دیں۔

وہ لوگ اب قبرستان سے واپسی جا رہے تھے۔ اسی طرح سے۔ ساتھ ساتھ۔ باتیں کرتے ہوئے۔ چہکتے ہوئے۔

"سب کتنا اچھا چل رہا ہے، ماں۔" مہر کھوئے ہوئے انداز میں بولی۔ شمائلہ نرمی سے مسکرائیں۔

"جب تک چل رہا ہے بیٹی، اس پر شکر ادا کریں۔ ایک وقت تھا جب سب کچھ اتنا خوبصورت نہ تھا۔" شمائلہ بولیں۔ مہر کی آنکھوں کے سامنے سایہ سا لہرایا۔

"اب آپ مجھ سے خفا نہیں ہیں ناں۔" مہر اداس سے لہجے میں بولی۔ شمائلہ ہنس دی۔

"پچھلے چھ ماہ میں آپ نے ہم سے یہ کوئی دو ہزار مرتبہ پوچھا ہو گا، مہر۔ چھوڑ دیں سب کچھ۔ ہم اپنے آپ کو دنیا کی خوش قسمت ترین عورت سمجھتے ہیں۔ اور ویسے بھی، ہم نے شکایتیں کرنا چھوڑ دی ہیں۔

"وہ مسکرا کر بولیں۔ عنایا بھی مسکرا کے اپنی نانی اور ماں کو گفتگو کرتا دیکھ رہی تھی۔ یہ جملہ اسے بھی رٹ چکا تھا۔

وہ قبرستان سے باہر آ گئے تھے اور گاڑی میں سوار ہونے لگے تھے۔ عنایا پچھلی نشست میں بیٹھ گئی تھی۔

"آپ وہ غزل پڑھ سکتی ہیں۔ دل ناامید تو نہیں۔ میرا آپ کی آواز سننے کا دل چاہ رہا تھا۔"

مہر نے انہیں گاڑی میں بٹھاتے پوچھا۔ عنایا ستائش سے اپنی ماں کو دیکھنے لگی۔

"آپ ہمارے ساتھ پڑھیں گی؟" شمائلہ بولیں۔ مہر نے سر اوپر نیچے ہلایا اور ڈِگی میں وھیل چیئر رکھی۔ اب وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

"کیوں نہیں۔" مہر بولی۔

"دل ناامید تو نہیں۔۔" شمائلہ نے مہر کو دیکھا جو کہ ان کے پیچھے پڑھنا شروع ہوئی۔

"دل ناامید تو نہیں، ناکام ہی تو ہے۔" وہ دونوں آواز سے آواز ملا کر پڑھ رہی تھیں۔ آسمان پر چھائے کالے بادلوں کے ٹکرانے کا عمل جاری ہوا اور وہ ایک دفعہ پھر سے برسنے لگے تھے۔

"لمبی ہے غم کی شام، مگر شام ہی تو ہے۔" سطور ختم کر کے دونوں زور سے ہنس دیے۔ عنایا بھی ان دونوں کے ساتھ ہنسنے لگی تھی۔ سب کچھ حسین تھا۔ سب کچھ مکمل تھا۔ وہ تینوں، ایک پرفیکٹ تصویر کی طرح جو کہ ہر زاویے سے خوبصورت نظر آتی تھی۔

زندگی، ایک حسین داستان۔۔۔ زندگی ایک افسانہ۔



درفشاں حسام کے بنگلے کی سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ یہ وہی بنگلہ تھا جس میں شادی ہونے کے بعد وہ مہر کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ درفشاں سے شادی کے بعد وہ لوگ واپس ادھر آگئے تھے۔ لیکن پچھلی بار کے بر عکس اب مرینا بھی ان کے ساتھ آئی تھیں۔ وہ اپنی سابقہ غلطی دہرانا نہیں چاہتی تھیں۔

"کہاں جارہی ہو، درے۔" درے نیچے اتری تو مرینا بولیں۔ وہ کافی کمزور سی نظر آرہی تھیں۔

"حرر۔ آج کلنک کی چھٹی ہے اس لیے جلدی جارہی ہوں۔" مرینا کے چہرے پہ شریر سی مسکراہٹ بکھری جو انہوں نے فوراً ہی دبالی۔

درفشاں باہر نکلی تو حسام گاڑی سے پشت ٹکائے انتظار کر رہا تھا۔ چہرے پر گرم جوش مسکراہٹ لیے وہ اس کا استقبال کر رہا تھا۔

"کیسی لگ رہی ہوں؟" وہ اس کے مقابل پہنچ کر بولی۔

حسام نے اوپر سے نیچے اس کی تیاریوں کا جائزہ لیا۔ سفید شرٹ، جینز کی سکرٹ، اور ہاتھوں میں پتھروں کے کڑے۔ وہ بے اختیار مسکرایا۔ اس کا وزن پہلے سے کم ضرور ہوا تھا۔

"ہمیشہ کی طرح، خوبصورت۔" وہ مخمور لہجے میں بولا۔ درے نے اس طرح مسکراہٹ اچھالی جیسے حسام پر کوئی عنایتِ خاص کر رہی ہو۔

دونوں ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ حسام نے گاڑی چلانا شروع کی۔ دفعتاً اس کے چہرے پہ بھی مسکراہٹ بکھری جو کہ وہ دبا گیا۔ دل میں اس کے لڈو پھوٹ رہے تھے۔

"ارے، یہ حرر کا راستہ تو نہیں ہے۔" بیچ راستے میں درِّ فشاں کو اندازہ ہوا تو وہ بولی۔

"مجھے پتا ہے۔" حسام کا انداز شرارتی تھا۔ درے نے حسام کو ایک گھوری سے نوازا۔

"پھر کہاں جا رہے ہیں۔"

حسام نے گاڑی کے ڈیش بورڈ سے ایک لفافہ نکال کر درے کو تھمایا۔ درے نے آنکھوں میں ستائش لیے لفافے کو کھولا۔ اندر سے دو کاغذ نکالے اور بغور انہیں دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پہ خوش گوار مسکراہٹ پھیلی۔

"سوئٹزر لینڈ؟ سچی؟ ہمارا ویزا لگ گیا تھا؟" درے خوشگوار سے انداز میں بولی۔ حسام پرجوش سا ہو کر سر اثبات میں ہلانے لگا۔

درفشاں ہاتھ مٹھی میں بھینچ کر زور سے ہنسنے لگی۔ اس کے وجود میں یک دم سے خوشی کی لہریں دوڑنے لگی تھیں۔

"دنیا کو بچانا تو چلتا رہے گا۔ اس سے پہلے ایک بریک کیوں نہ لے لیا جائے؟" حسام بولا۔ درے بھرپور مسکرا دی۔

"بہترین!"

زندگی دنیا کے عجائب خانوں کو دریافت کرنے کا نام۔ زندگی ایک افسانہ۔



''آپ کو کیا لگتا ہے۔ آپ مجھے دھمکیاں دیں گے اور میں اسے واپس کر دوں گی۔ کبھی نہیں۔ اب ہم سیدھا کورٹ میں ملیں گے۔ اس بچی سے اپنا تعلق کورٹ میں ثابت کر کے جیے گا۔'' مناج حرر کے آفس میں کسی سے فون پر بات کر رہی تھی۔ اس کے ماتھے پر بل تھے۔ چہرے پر برہمی پھیلی ہوئی تھی۔

''میڈم۔ آپ کو پیسے چاہییں، ہم وہ بھی دے دیں گے۔ آپ اس منیرہ کو واپس دے دیں۔'' فون کے اس پار سے کسی مرد کی آواز گونجی تھی۔ مناج کے چہرے پہ غصیلا سا تاثر ابھرا۔ آنکھیں شعلہ باز ہوئیں۔

''منیرہ حرر کے محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ اب کوئی طاقت اسے حرر کے ہاتھوں سے نکال نہیں سکتی۔'' مناج دھاڑی تھی۔ اس نے کھٹ سے کال کاٹ دی۔

حرر کا یہ آفس اب زیادہ بڑا تھا اور کسی اور جگہ پر واقع تھے۔ یہاں کام کرنے والے بھی پہلے سے زیادہ تھے۔

''منیرہ کیسی ہے ویسے؟'' مناج نے مڑ کر ایک ایمپلائی سے پوچھا۔

''بہتر ہے۔ مگر بہت سہمی ہوئی ہے۔'' اس ایمپلائی نے جواب دیا۔

مناج نے افسوس سے گہری سانس خارج کی۔

''ٹھیک ہے۔ کوشش کرو کہ وہ جلد نارمل ہو جائے۔ درفشاں واپس آجائے تو میں اسے بھی اس کی مدد کرنے کا کہوں گی۔'' مناج کہہ کے حرر کے آفس سے باہر جانے لگی۔

اس کی زندگی بھی ایسی ہی ہو گئی تھی۔ مصروف سی۔ وہ اپنے کام کو مخلص ہو کر سرانجام دیتی۔ وہ اپنے کام میں ہی خوشی محسوس کرتی تھی اور اس میں کوئی برائی بھی نہیں تھی۔

وہ حرر کے آفس سے باہر آئی تو نیلی وردی میں ملبوس یونس اس کی راہ تک رہا تھا۔ وہ بھی اسی کی منتظر تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ چہرے پر پیشہ ورانہ مسکراہٹ لیے اس کی طرف بڑھی۔ یونس یک دم چوکنا سا ہو گیا۔

''جن گواہان کو ڈھونڈنے کا کہا تھا وہ مل گئے، یونس؟'' مناج نے پوچھا۔ یونس نے ادب سے سر کو اوپر نیچے ہلایا۔

''یہ ایک فائل ہے۔ اس میں کچھ اور چیزیں بھی ہیں جو ہماری مدد کریں گی۔ آپ انہیں دیکھ سکتے ہیں کیا؟ میں جانتی ہوں میں بہت تنگ کر رہی ہوں لیکن۔۔'' مناج کے الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے۔

یونس نے اس کے ہاتھ سے وہ فائل جھپٹ لی۔ مناج ذرا سا چونک گئی۔

''آپ درخواست نہ کیا کریں میڈم۔ بس حکم دیا کریں۔ آپ حکم کرتی اچھی لگتی ہیں۔'' وہ ایک ادا سے بولا اور سادگی سے مسکرا دیا۔ مناج بھی جواباً مسکرا دی۔ وہ اب اپنی گاڑی کی جانب جانے لگی۔ یونس اسے دیکھنے لگا۔

مناج کی محبت نے اسے بدل کر رکھ دیا تھا۔ وہ اس سے بہت متاثر تھا۔ وہ انصاف پسند تھی تو وہ بھی انصاف پسند بننا چاہتا تھا۔ وہ رشوت لینا چھوڑ چکا تھا۔ لیکن یہ محبت بیچ میں کہیں نامکمل سی تھی۔ مناج اب تک اسے اپنا دل نہیں دے سکی تھی۔ وہ ابھی اس سب کے لیے تیار نہ تھی۔ لیکن یونس کو کوئی حرج نہ تھا۔ وہ پوری زندگی اس کے انتظار میں گزار سکتا تھا۔

زندگی محبت کے مختلف رنگوں کا نام۔ زندگی ایک افسانہ۔



یہ دبئی کے ایک پولیس اسٹیشن کا منظر ہے۔

بھوری موچھوں والا، گوری رنگت والا پولیس افسر سربراہی کرسی پر براجمان تھا۔

مخالف سمت میں کوئی نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔

"کیا کیا جائے، عبد اللہ ؟" بڑی عمر کا پولیس افسر اس نوجوان سے بولا تھا۔ آواز میں پریشانی تھی۔ "یہ کیس تو ہماری سوچ سے بھی باہر جا رہا ہے۔"

"مسٹر جلیل۔ ہم ایک پرائیویٹ انویسٹی گیٹر کی مدد لے سکتے ہیں۔" عبد اللہ نے جواب دیا۔ جلیل صاحب نے خفگی سے سر نفی میں ہلایا۔

"ان لوگوں کے بہت نخرے ہوتے ہیں۔"

"لیکن شاید ہمارے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں بچا، سر۔ ہمیں اس سب سے نکلنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہو گا۔"

جلیل صاحب نے ہاری ہوئی سانس خارج کی۔

"کس کی بات کر رہے ہو تم؟"

"گھوسٹ۔(ghost)"

جلیل صاحب نے برا سا منہ بنایا۔

”کیا مطلب؟“ وہ تنک کر بولے۔

”کوڈ نیم ہے سر۔ تین سال پہلے اس نے پاکستان میں ایک آپریشن کیا تھا۔ اور ایک گودام بھی اس نے پکڑوایا تھا جس میں انسان قید تھے۔ اس نے یہ کام عبدالحمید کا نام استعمال کر کے کیا تھا۔ وہ ہر کام کے لیے ایک نیا نام استعمال کرتا ہے۔ پاکستان میں پچھلے سال جو آرگن مافیا پکڑا گیا ہے وہ بھی اسی نے پکڑوایا ہے۔ ہم اسے اس لیے جانتے ہیں کیونکہ اس نے منی لانڈرنگ میں ملوث بینک کو بے نقاب کرنے میں ہماری مدد کی تھی۔“ عبداللہ، جلیل صاحب کو بتائے جارہا تھا۔ جلیل صاحب غور سے اس کی پوری بات سن چکے تھے۔

”کیا پاکستانی ہے وہ؟“ انہوں نے پوچھا۔

”کوئی نہیں جانتا وہ کہاں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے بارے میں ہم صرف ایک ہی چیز جانتے ہیں کہ اس کا جامہ نام گھوسٹ ہے اور وہ ہر مشن سے پہلے اپنی شناخت بدل دیتا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ گھوسٹ سے رابطہ قائم کرو اور اسے سب کچھ سمجھاؤ۔ ہم اسے بھی آزما لیتے ہیں۔“ جلیل صاحب اٹل سے انداز میں فیصلہ سنانے لگے۔

”ٹھیک ہے سر!“ عبداللہ نے ادب سے جواب دیا۔



وہ دونوں ایک زیر تعمیر عمارت کے اندر داخل ہوئے۔ عمارت کسی اسکول کی لگتی تھی۔ وہ عمارت تین منزلہ تھی اور کافی پر تعیش نظر آتی تھی۔ فی الحال عمارت کی دیواروں پر پینٹ کیا جارہا تھا۔ احمد کے چہرے پہ فخریہ مسکراہٹ تھی اور مہر بھی کافی خوش نظر آرہی تھی۔

"کچھ مہینے اور بس' یہ جگہ چھوٹے چھوٹے بچوں سے بھر جائے گی جو کہ تعلیم حاصل تو کرنا چاہتے ہیں لیکن کر نہیں پارہے۔" مہر بولی۔ احمد شرارتی سا مسکرایا۔

"تم تو چورنی سے سیدھا پرنسپل بن گئی۔"

مہر مصنوعی سا خفا ہوئی۔

"آپ نے کبھی نہیں سدھرنا۔"

احمد زیر لب ہنس دیا۔

"شوہر سدھرا نہیں کرتے۔" اس نے محبت سے اسے دیکھتے کہا۔ مہر کے گالوں میں سُرخی دوڑی۔

وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ملائے عمارت کے اندر داخل ہوئے۔ مزدور جگہ جگہ کام کر رہے تھے۔

وہ مہر کے مستقبل کے آفس میں جارہے تھے۔ کمرے میں فنشنگ کا کام باقی تھا۔ کمرہ کافی خوبصورت اور جدید سے طرز پر بنا ہوا تھا۔

"ارے واہ! یہاں کام کروگی؟" احمد پورے کمرے کا جائزہ لیتے بولا تھا۔ مہر نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلایا۔

”بالکل۔ اور اس بار میں پورے دل سے کام کروں گی۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ احمد پھر سے شرارتی سا مسکرایا۔ وہ کچھ شریر کہنے ہی لگا تھا کہ اس کے موبائل پر کال آنے لی۔ یہ موبائل چھوٹا سا تھا، اور اس میں انکرپشن ہوئی تھی۔

احمد نے فون کان سے لگایا۔ مہر کے چہرے پہ معنی خیز مسکراہٹ بکھری۔

”گھوسٹ؟ کیا یہ گوسٹ بات کر رہے ہیں؟“ دوسری طرف سے تکلفانہ سی آواز گونجی۔ بات انگریزی میں کی جارہی تھی۔

”جی۔ کون ہے یہ؟“ احمد نے اکھڑ سے انداز میں جواب دیا۔ مہر سے مسکراہٹ چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

”ہم دبئی پولیس سے بات کر رہے ہیں۔ ایک کیس کے سلسلے میں آپ سے بات کرنا چاہ رہے تھے۔“ قدرے نرمی سے جواب آیا تھا۔

”رات آٹھ بجے کال کرلینا۔ ابھی مصروف ہوں۔“ اکھڑ سے انداز میں کہہ کے احمد نے کال کاٹ دی۔

مہر احمد کے بالکل سامنے کھڑی ہوگئی۔ چہرے پہ شریر مسکراہٹ سجائے وہ اسے دیکھنے لگی تو احمد بھی مسکرادیا۔ اس نے اس کے کندھے سے نادیدہ دھول جھاڑی۔

”ایک نئے ایڈونچر کے لیے تیار، پروگرامر صاحب؟“ وہ معنی خیز انداز میں بولی۔ احمد کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

''ہمیشہ سے!'' وہ خوشدلی سے بولا۔ ایک نیا ایڈونچر اس کا انتظار کر رہا تھا۔

زندگی کبھی نہ ختم ہونے والے ایڈونچر کا نام۔ زندگی ایک افسانہ۔

☆☆☆

اور اس پوری کہانی میں۔۔۔

صرف ہیروں کا ماجرہ تھا جو کہ آج تک نہ سلجھ سکا۔

وہ چار ہیرے۔ جنہوں نے اپنی چمک دمک سے سب کی عقل پر بٹہ لگا رکھا تھا۔

وہ چار ہیرے۔ جو آج اس اندھیری جگہ میں قید تھے۔

اس اندھیرے میں وہ بس عام سے پتھر کی طرح لگتے تھے۔

مشعل سے قربت درکار تھی۔

اور بس تم ان کے رنگ بدلتے دیکھتے۔

ان کے پیچھے انسانوں کے رنگ بدلتے دیکھتے۔

ان کو اپنی عقل سے ہاتھ دھوتے دیکھتے۔

نہ جانے اپنی چمک دمک سے کس کے ہوس کو دعوت دینے والے تھے؟

☆☆☆☆ تمت بالخیر ☆☆☆☆